مشرف عالم ذوقی

افسانے

نفرت کے دنوں میں

HaSnain Sialvi

نفرت کے دنوں میں

افسانے

مشرف عالم ذوقی

HaSnain Sialvi

نفرت کے دنوں میں

افسانے

مشرف عالم ذوقی

زیرِ اہتمام

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

HaSnain Sialvi

NAFRAT KE DINON ME

(Short Stories)

by

MOSHARRAF ALAM ZAUQUI

D-304, TAJ ENCALVE, GEETA COLONY

DELHI - 110031

Year of Edition 2013

ISBN 978-93-5073-226-7

₹ 490/-

نام کتاب : نفرت کے دنوں میں (افسانے)

مصنف : مشرف عالم ذوقی

E-mail: Zauqui2005@gmail.com, Mob. 9310532452

سنِ اشاعت : ۲۰۱۳ء

قیمت : ۴۹۰ روپے

سرورق : سمیع اللہ قنوجی

کمپوزنگ : سعید احمد 9560062765

مطبع : عفیف پرنٹرس، دہلی ۔ ۶

کتاب ملنے کا پتہ : D-304 تاج انکلیو، گیتا کالونی، دہلی - 110031

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)

Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540

E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com

website: www.ephbooks.com

انتساب

امی مرحومہ سکینہ خاتون

کے نام......

خوابوں کے اس پار

مجھے

ڈر لگتا ہے

نفرت کے دنوں میں

HaSnain Sialvi

فہرست

دو بھیگے ہوئے لفظ

'بہت تیز آندھی تھی۔ چھتیں اُڑ رہی تھیں۔ درخت ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ بھیانک منظر تھا۔ کچی دیواروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی کٹیا تھی۔ دو بوڑھے، بوڑھی تھے۔ باہر میدان میں اونچے اونچے پیڑوں کی دیکھ بھال کے لئے —— جیسے درخت نہیں ہوں، بچے ہوں اُن کے......

'دیکھو...... وہ درخت بھی...... آہ......' بوڑھی عورت چیخی۔ تم کچھ کرتے کیوں نہیں۔

'بھیانک طوفان —— کیا تم دیکھ نہیں رہی ہو......'

'ہاں، دیکھ رہی ہوں مگر......'

بوڑھی عورت، اپنے بوڑھے شوہر کا ہاتھ پکڑے اس خوفناک طوفان میں، اُسے لے کر باہر آگئی —— اور ایک جوان درخت کے پاس ٹھٹھک کر کھڑی ہوگئی ——

'میں نہیں جانتی۔ لیکن تمہیں اسے بچانا ہوگا......'

'دیکھو۔ کیسے ہل رہا ہے...... یہ درخت بھی گر جائے گا ——'

'تمہیں بچانا ہوگا —— 'بوڑھی عورت زور سے گرجی ——

دونوں نے موٹی رسیاں تیار کیں۔ درخت کو دونوں طرف سے لپیٹا —— اور اس زوروں کے طوفان میں، دونوں نے اپنے ہلتے لڑکھڑاتے وجود کے باوجود اُس درخت کو ٹوٹنے سے بچانے کے لئے ساری قوت لگا دی ——'

عرصہ پہلے یہ کہانی پڑھی تھی۔ خدا معلوم، کہانیوں کے دونوں بوڑھے کردار اُس درخت کو ٹوٹنے سے بچا پانے میں کامیاب ہوئے یا نہیں —— یا، اتنے سارے درختوں میں اُن کی ساری محنت صرف اسی درخت کے حصے میں کیوں آئی تھی —— ؟ شاید، انسانی کمزوری اور محبت

کے بہت سارے گوشے ایسے ہیں جسے علم نفسیات ابھی تک سمجھنے میں ناکام رہا ہے——

پتہ نہیں کیوں، کہانیوں کے انتخاب کی بات آئی تو اچانک کھلے چور دروازے سے اس کہانی نے دستک دی—— 'انتخاب کا مطلب جانتے ہو؟'

'ہاں؟'

'کن کہانیوں کو بچاؤ گے؟'

'مطلب؟'

'دیکھا نہیں وہ بوڑھے بوڑھی اتنے سارے درختوں میں، اُس ایک پیڑ کو بچانے کی کوشش کر رہے تھے......'

'ہاں، لگاؤ ہوگا'

'ادب میں لگاؤ سے بات نہیں بنتی۔'

کیسی سچی بات ہے—— آپ کا خوبصورت، سب سے پیارا بچہ زندگی کے امتحان میں، ہار جاتا ہے—— اُس کا بدصورت بھائی بازی مار جاتا ہے—— پریم چند کو کہانی 'کفن' کچھ زیادہ پسند نہیں تھی۔ اب 'کفن' کے بغیر اردو کہانی کی گفتگو آگے نہیں بڑھتی۔ ممکن ہے میرے بعد اگر کوئی دوسرا میری 500 سے بھی زیادہ کہانیوں میں سے 25 کہانیوں کے انتخاب کی ذمہ داری قبول کرے تو صورت بالکل مختلف ہو——

اس لئے کس کو 'بچانا' ہے کس کو نہیں——

کس کو رکھنا ہے اور کس کو نہیں——؟

میں نہیں جانتا، اس انتخاب میں مجھے کتنی کامیابی ملی۔ مگر اتنا ضرور کہنا چاہوں گا کہ اس انتخاب کے لئے مسلسل سوچتے اور غور کرتے ہوئے مجھے دو سال لگ گئے——

شاید ان کہانیوں کے انتخاب کا خیال ہی میرے ذہن میں نہیں آتا اگر میرے بھائی اور میرے مخلص دوست آصف فرخی نے یہ ذمہ داری مجھے نہیں سونپی ہوتی۔ یہ اُن کا بڑپن ہے اور محبت بھی——

اور اس محبت کے لئے میں انہیں سلام کرتا ہوں۔

ذوقی

اصل واقعہ کی زیراکس کاپی

''وہ جو،
ہر طرح کے ظلم، قتل عام اور بربریت/
کے پیچھے ہیں،/
تلاش کرو/
اور ختم کردو/
اس لئے کہ وہ اس نئی تہذیب کی داغ بیل/
ڈالنے والے ہیں/
جو تمہاری جانگھوں یا ناف کے نیچے سے ہو کر گزرے گی۔''

گرمی کی ایک چلچلاتی دوپہر کا واقعہ

سپریم کورٹ کے وسیع وعرض صحن سے گزرتے ہوئے اچانک وہ ٹھہر گیا۔ سامنے والا کمرہ جیوری کے معزز حکام کا کمرہ تھا۔ اس نے اپنی نکٹائی درست کی۔ خوبصورت سلیٹی کلر کے جیمنی بریف کیس کو، جسے اس نے سوئزرلینڈ کے 25 سالہ ورک شاپ سے خریدا تھا، داہنے ہاتھ میں تھام لیا اور اس جانب دیکھنے لگا جدھر سے پولیس کے دو سپاہی ایک مخنی سے آدمی کو ہتھکڑی پہنائے لئے جا رہے تھے۔

سموئل یہ بھی آدمی ہے...... وہ بے اختیار ہو کر ہنسا ـــــــ جیسے اس دبلے پتلے سے آدمی کو ہتھکڑیوں میں دیکھتے ہوئے ہنسنے کے علاوہ دوسرا کوئی کام نہیں کیا جا سکتا۔

''آدمی...... تم کیا سمجھتے ہو سموئل، اس نے کوئی جرم کیا ہوگا۔ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔ یہ آدمی ایک مکھی بھی نہیں مار سکتا۔

''آپ کا دعویٰ صحیح ہے یور آنر، سموئل نے قدرے کھل کر اس کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔۔''

''یہ مکھی بھی نہیں مار سکتا۔ مگر پچھلے دنوں آپ نے وہ چرچا سنی ہوگا۔ ایک شخص نے اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ...... اپنی سگی دو بیٹیوں کے ساتھ......''

''کیا یہ شخص......''

سموئل نے سر کو جنبش دی۔ ''یور آنر، یہ وہی شخص ہے۔''

OO

منحنی سا دبلا پتلا آدمی۔ چہرہ عام چہرے جیسا۔۔۔۔۔ آگے کے بال ذرا سا اُڑے ہوئے۔۔۔۔ بالوں پر سفیدی نمایاں ہو چکی تھی۔ سانولا رنگ، کرتا پائجامہ پہنے۔ ایک ہاتھ سے اپنے چہرے کو بہت ساری چبھنے والی نگاہوں سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ سپاہی اسے لے کر کورٹ روم میں داخل ہو گئے۔

اس نے گھڑی دیکھی۔ ''بینک تو بارہ بجے بند ہوتا ہے نا......

''لیس یور آنر''

''مجھے یور آنر مت کہا کرو۔ میں ہوں نا، ایک بہت عام سا آدمی۔ معمولی آدمی، کہتے کہتے وہ ٹھہرا۔۔۔۔ تم نے کبھی اس طرح کا کوئی مقدمہ دیکھا ہے سموئل؟

''نہیں میں نے نہیں دیکھا۔''

'آہ۔ میں نے بھی نہیں دیکھا۔'

میں سمجھ سکتا ہوں سر،...... سموئل جھک جھک کر سر ہلا رہا تھا......

OO

اب وہ کورٹ روم میں تھے۔ جیوری کے ممبر موٹی موٹی کتابوں، فائلوں کے ساتھ اپنی جگہ لے چکے تھے۔ بیچ بیچ میں کوئی وکیل اٹھ کھڑا ہوتا۔ جج درمیان میں بات روک کر گمبھیر آواز میں کچھ کہتا۔ جیوری کے ممبر نظر اٹھا کر اس منحنی سے شخص کو دیکھ کر کچھ اشارہ کرنے لگتے۔

پھر بہت ساری نظریں کٹہرے میں کھڑے ہوئے ملزم کی جانب اٹھ جاتیں۔ وہ آدمی،

وہ سر جھکائے کھڑا تھا۔ وہ چہرے سے عیاش اور 'پاجی' بھی نہیں لگ رہا تھا۔ وہ چہرے سے اس قماش کا قطعی نہیں لگ رہا تھا۔ چہ میگوئیوں، شور کرتی آوازوں کے بیچ دو لڑکیاں اپنی جگہ سے اٹھیں۔ ایک کی عمر کوئی سترہ سال کی ہوگی۔ دوسری کی پندرہ سال—— دونوں کے چہرے پر ایک خطرناک طرح کا تیور تھا جیسے کسی زمانے میں افریقی نسل کے سیاہ فام 'جمپانا' نام کے بندر کے چہرے پر پایا جاتا تھا۔

اسے وحشت سی ہوئی—— چلو سموئل۔ باہر چلتے ہیں......

'مگر یور آنر'...... سموئل کے چہرے پر ہلکی سی ناراضگی پل بھر کو پیدا ہوئی—— جسے حسب عادت اپنی مسکراہٹ کے ساتھ وہ پی گیا...... 'جیسی آپ کی مرضی یور آنر۔'

OO

دونوں سڑک پر آ گئے۔ اس کی آنکھوں میں سراسیمگی اور حیرانی کا دریا بہہ رہا تھا۔

''تم وہاں رکنا چاہتے تھے سموئل۔ کیوں؟ میں سمجھ سکتا ہوں اس نے سر کو جنبش دی، مگر بتاؤ، آخر کو وہ آدمی—— کیوں تمہارے ہی جیسا تھا، نا......؟''

''سموئل گڑبڑا گیا—— پھر فوراً سنبھل کر بولا۔ ''ہاں بالکل سر، ہمارے آپ کے جیسا...... آدمی—— جیسے سبھی آدمی ہوتے ہیں......''

''چہرے پر ملال ہوگا۔ ہونا چاہئے...... ہوگا ہی...... تم نے دیکھا نا، سموئل، وہ کٹہرے میں کیسا نظریں بچائے کھڑا تھا۔''

''یس یور آنر......''

''میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی سموئل—— آخر خود پر لگائے گئے الزامات کی وہ کیا صفائی بیان کر رہا ہوگا۔ وہ کہہ رہا ہوگا کہ''...... اس کے چہرے کے تیور بدل رہے تھے—— آدمی کو ایک زندگی میں ایک ہی کام کرنا چاہئے۔ یا تو بس اپنے کام سے جنون کی حد تک پیار ہو یا پھر شادی کر کے گھر بسا لینا چاہئے۔ دونوں میں سے ایک کام—— یہ کیا...... کہ شادی ہوئی اور ماں کی گود سے کود کر بچی دندناتی ہوئی تاڑ جتنی لمبی ہوگئی—— اور لوگوں کی نگاہوں میں ٹینس بال کی طرح پھسلنے لگی۔ ادھر...... کبھی ادھر......

سموئل ہنسا، وہ دیکھئے سر!

سامنے سے دو کانونٹ کی پراڈکٹ ٹھہا کہ لگاتی ہوئی گزر گئیں۔ ایک پل کو اس کی

نگاہیں چار ہوئیں۔ جسم میں ایک تیز ابلی ہلچل ہوئی۔ بجلی کوندی —— گرجی اور خاموش ہوگئی۔

"ایسی لڑکیاں...... ہم آپ کسی نظر سے دیکھیں مگر میرا دعویٰ ہے...... ان کا ایک باپ ہوگا۔ گھر میں چائے پیتا ہوا۔ اخباروں پر جھکا۔ بیوی سے کسی نامناسب بحث میں الجھا ہوا —— اور بیٹیوں کو دیکھ کر اشارتاً کوئی بے معنی سا سوال پوچھتا ہوا۔ یا...... بریک فاسٹ لنچ، ڈنر یا چائے بنا دینے کی بے چارگی بھری فرمائش کرتا ہوا۔ ایک عام باپ...... جیسا کہ وہ تھا...... جیسا کہ اسے ہونا چاہئے...... اور جیسا کہ سب ہوتے ہیں......"

سموئل نے داڑھی کھجلائی —— پھر یوں چپ ہوگیا جیسے ابھی غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے جو بھی بول پھوٹے ہیں وہ اس کے لئے شرمسار ہو...... اس نے بھی دھیرے سے گردن ہلائی جیسے گہرے صدمے سے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کر رہا ہو۔

اس نے کچھ سوچتے ہوئے دوبارہ گردن ہلائی اور جیسے، آنکھوں کے آگے بہت کچھ روشن ہوگیا۔ ماں کے 'حمل' سے کود کر، آن میں کودتی پھاندتی تاڑ جتنی بڑی ہو جانے والی لڑکی......

یہ لزا بار بار آنکھوں کے آگے کیوں منڈلاتی ہے اور وہ...... ایک لاچار باپ...... چھپ کیوں نہیں سکتا۔ نہیں دیکھے اسے۔ ایک بار بھی —— بچپن میں اُچک کر کندھوں پر سوار ہو جانے والی لزا —— اچانک ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی ہوئی، کتنی ڈھیر ساری بہاروں کے ساتھ ہوا کے رتھ پر سوار ہوگئی تھی —— نہیں لزا، یہاں نہیں۔ یہاں مت بیٹھو...... یہاں میں ہوں نا...... جاؤ اپنا ہوم ورک کرو۔ اپنے کمرے میں جا کر اسٹڈی کرو لزا۔ یہاں سے...... یہاں سے جاؤ، پلیز...... عمر کے پاؤں پاؤں چلتی ہوئی لڑکی کے بڑے ہوتے ہی باپ اچانک نظریں کیوں چرانے لگتا ہے...... ہوٹل، کلب، ریستوران کے ڈھیر سارے جانے انجانے لمس کے بیچ یہ رشتے کی نازک پتنگ اسے پریشان کیوں کر دیتی ہے۔ کیوں کر دیتی ہے...... کہ ایک باپ ہونے کے ناطے اسے سمجھانا پڑتا ہے خود کو...... ایک اچھا لڑکا...... ایک عمدہ آدمی......"

"یہ عمدہ آدمی کہاں بستا ہے...... کہاں ملتا ہے —— کیوں سموئل!"

سموئل نے کوئی جواب نہیں دیا —— وہ کسی اور سوچ میں گم تھا —— عمدہ آدمی...... بہتر آدمی، بے لوث، بے غرض، مخلص، ہمدرد اور عمدہ آدمی —— روانڈا کی سڑکوں پر بھی ایسے کسی آدمی سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی۔ لندن، پیرس، برلن کی گلیوں میں بھی اسے سے ایسا کوئی آدمی نہیں ٹکرایا۔ افریقہ کی سڑکوں پر بھی نہیں —— جہاں دھوپ سے جھلسے سیاہ فام چہروں پر اس نے 'یتیک'

کی نظم لکھی دیکھی تھی......

''اس دھرتی پر......

ہم اپنے سفید دانتوں سے ہنستے ہیں۔

اس وقت بھی......

جب ہمارا دل لہولہان ہو رہا ہوتا ہے۔''

کمپالا (یوگانڈا) کے ہوٹل میں سیاہ فام نگونگی نے اس کے بدن سے کھیلتے ہوئے اچانک پوچھا تھا۔ سر، ایک لمحے کو سوچئے اگر میں آپ کی سگی بیٹی ہوتی تو...... وہ بستر سے چھلانگ لگا کر اتر گیا تھا۔ ننگ دھڑنگ...... وہ کانپ رہا تھا۔ نگونگی ایک بے شرم سفاک مسکراہٹ کے ساتھ اس کے بوکھلائے چہرے کو دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی......

''سموئل، ہم یہ کمینہ پن کیوں کرتے ہیں؟''

''ہم...... تھک جاتے ہیں سر...... تھک جاتے ہیں اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے پرے ہو جاتے ہیں۔''

اس نے گہرا سانس کھینچا...... ''ٹھیک کہتے ہو...... ہم تھک جاتے ہیں...... اس جسم میں کتنی طرح کی لذتیں دفن ہیں سموئل؟ ہاں دفن ہیں...... اس نے پھر سانس کھینچا...... کتنی طرح کی لذتیں...... کتنے ملکوں کی...... نرم...... گرم اور...... ہم کچھ بھی نہیں دیکھتے...... یہ کہ چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے اور ہم ایک غیر جسم سے چپکے ہوئے ہیں۔ کھیل رہے ہیں—— جب ہم اپنے گلاس میں اسکاچ انڈیلتے ہیں...... کاکروچ مارتے ہیں...... لوگ مر رہے ہیں...... ہر لمحہ...... ہندوستان میں...... پاکستان میں...... کوئی سا بھی ملک—— باقی نہیں ہے۔ جب ہم اپنی ٹائی درست کرتے ہیں...... لوگ مر رہے ہیں...... امریکہ، روس، جاپان، ویتنام...... ایٹم بم اور میزائلس سے باہر نکلو تو وہی ایک جسم آ جاتا ہے...... لوگ مر رہے ہیں...... اور لوگ اپنی سگی بیٹیوں کے ساتھ......''

''یور آنر، بینک آ گیا ہے۔''

مہنگے ہوٹل کی ایک رات اور ٹرائل

''اچھا، وہ کیا جرح کر رہا ہوگا سموئل! ذرا سوچو، اس کے پاس اپنے دفاع میں کہنے کے

لئے کیا رہ جاتا ہے۔ اچھا ایک منٹ کے لئے مان لو...... وہ آدمی میں ہوں...... تم وکیل ہو جج ہو یا کچھ بھی مان لو...... ماننے کو تو کچھ بھی مانا جا سکتا ہے سموئل...... یوں پاگلوں کی طرح مجھے مت گھور کر دیکھو...... مان لو...... اور سمجھ لو، ٹرائل شروع ہوتا ہے...... اگر شروع ہوتا ہے تو کیسے......؟''

''یور آنر۔ سموئل نے کچھ کہنے کے لئے حامی بھری، اس نے روک دیا ــــــ

''نہیں، یہاں یور آنر تم ہو سموئل...... اور سمجھو مقدمہ شروع ہو چکا ہے۔ جیوری کے ممبر بیٹھ چکے ہیں۔ کٹہرے میں، میں کھڑا ہوں ــــــ ایک لاچار اپاہجی باپ جس نے اپنی سگی بیٹیوں سے...... نہیں مجھے یہ جملہ ادا کرنے میں دشواری ہو رہی ہے سموئل...... تاہم...... میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ......''

اس نے آنکھیں بند کیں۔ جیسے اپنے تمام تاثرات چہرے پر لا کر جمع کر رہا ہو۔

''ہاں تو میں...... ایک لاچار کمینہ باپ...... کسی ایک جبر و کشمکش کے لمحے کے ٹوٹ جانے کے دوران...... نہیں...... مجھے اعتراف ہے کہ ــــــ وہ حوا کی کوکھ سے نہیں، میرے خون سے نکلی تھی۔ جنی تھی ــــــ مجھے اعتراف ہے کہ ــــــ نہیں، مجھے کہنے نہیں، آرہا...... اور کیسے آ سکتا ہے...... آپ سب مجھے ایسے گھور رہے ہیں...... سب کی نگاہیں ــــــ عیاشی کی اس سے بھدی مثال اور کمینگی کی اس سے زیادہ انتہا اور کیا ہو سکتی ہے۔ مجھے سب اعتراف ہے۔ مگر...... میں کیسے سمجھاؤں...... بس ایک جبر و کشمکش کے ٹوٹ جانے والے لمحے کے دوران......''

''آرڈر...... آرڈر...... ملزم جذباتی ہو رہا ہے ــــــ ملزم کو چاہئے کہ اپنے جذبات پر قابو رکھے۔''

سموئل کے چہرے پر کٹھورتا تھی۔

''مور کھتا۔ ملزم جب وہاں اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پایا تو یہاں ــــــ خیر، میں کہہ رہا تھا ــــــ میں پچھلے دنوں ویتنام گیا تھا۔ سیاحت میرا شوق ہے...... تو میں کہہ رہا تھا کہ میں ویتنام......''

''اس پورے معاملے کا ملزم کے ویتنام جانے اور سیاحت سے کوئی تعلق نہیں ہے......''

''میں مانتا ہوں می لارڈ...... مگر جو واقعہ یا حادثہ ایک لمحے میں ہو گیا۔ ایک بے حد کمزور لمحے میں ــــــ اس کے لئے مجھے ویتنام تو کیا، فلسطین، ایران، عراق، امریکہ، روس، روانڈا سب جگہوں پر جانے دیجئے ــــــ میں گیا اور میں نے دیکھا...... سب طرف لوگ مر رہے ہیں......

مر رہے ہیں...... ہر لمحے میں...... جب ہم ہنستے ہیں روتے ہیں ــــ باتیں کرتے ہیں، قہوہ یا چائے پیتے ہیں ــــ قتل عام ہو رہے ہیں......لوگ مر رہے ہیں...... مارے جا رہے ہیں......

سموئل نے ناگواری سے دیکھا ــــ بیوقوفی بھری باتیں۔ کوری جذباتیت ــــ اس کیس میں ایک ریپ ہوا ہے......ریپسٹ ایک...... باپ ہے۔ جس نے اپنی...... کہیں تم گے (GAY)، لیسبین (Lesbian) یا فری کلچر کے حق میں تو نہیں ہو......؟

''نہیں۔ آہ تم غلط سمجھے سموئل، اس نے گردن ترچھی کی ــــ شاید میں سمجھا نہیں پا رہا ہوں...... ابھی تم نے جن کلچرز کا ذکر چھیڑا، وہ سب دکھ کی پیداوار ہیں......دکھ...... جو ہم جھیلتے ہیں ــــ یا جھیلتے رہتے ہیں ــــ مہاتما بدھ کے مہان بھشکر من سے لے کر بھگوان کی آستھاؤں اور نئے خداؤں کی تلاش تک ــــ پھر ہم کسی روحانی نظام کی طرف بھاگتے ہیں ــــ کبھی اوشو کی شرن میں آتے ہیں...... کبھی گے (GAY) بن جاتے ہیں تو کبھی لیسبین۔ قتل عام ہو رہے ہیں...... اور بھاگتے بھاگتے اچانک ہم شدبد کھو کر کنڈوم کلچر میں کھو جاتے ہیں ــــ ہم مر رہے ہیں سموئل اور جو نہیں مر رہے ہیں وہ جانے انجانے ایچ آئی وی پازیٹیو (H.I.V. POSITIVE) کی تلاش میں بھاگ رہے ہیں......''

''ہمارا ملزم اپنا دفاع نہیں کر پا رہا ہے۔ اس لئے مقدمہ خارج۔''

وہ غصے سے سموئل کی طرف مڑا ــــ ایک باپ پشیمانی کی انتہا پر کھڑا ہے اور تم اسے اپنی بات مکمل کرنے کا موقع بھی نہیں دینا چاہتے۔ ویدک ساہتیہ کو لو۔ دھرم کے بعد کام کا ہی استھان ہے۔ موکش کا نمبر اس کے بعد کا ہے۔ گیتا میں کہا گیا ہے، شری کرشن سب جگہ ہیں...... انسانوں کے اندر وہ کام کے روپ میں موجود ہیں ــــ کھجوراہو کے مندروں میں سمبھوگ کے چتر اس بات کے ثبوت ہیں کہ سمبھوگ پاپ نہیں ہے ــــ اگر پاپ ہوتا، اپوتر ہوتا تو اسے مندروں میں جگہ کیوں کر ملتی سموئل ــــ؟

''بھیانک...... بہت بھیانک......''

''مان لو کوئی کہتا ہے...... فلاں چیز میری ہے...... میں جو چاہوں کروں...... تم اس بارے میں کیا جواب دو گے سموئل...... مثلاً کوئی کہتا ہے کہ بیوی میری ہے...... فرج میری ہے...... میں جو چاہوں کروں......''

''بھیانک...... بہت بھیانک...... سموئل کے چہرے کے رنگ بدل رہے تھے۔

''اور مان لو سموئل دنیا ختم ہو جاتی ہے بس ایک ایٹم بم یا اس سے بھی کوئی بھیانک ہتھیار...... ویتنام کے شلعے تو سیگون ندی سے اٹھ کر آسمان چھو گئے تھے۔ مان لو، صرف دو ہی شخص بچتے ہیں اور دنیا کا سفر جاری رہتا ہے۔ ایک باپ ہے اور دوسری......''

بہت بھیانک...... سموئل چیخا ___ بس کرو...... میں اور تاب نہیں لا سکتا......''

وہ جبر، کشمکش کا ٹوٹ جانے والا لمحہ اس سے بھی کہیں زیادہ بھیانک ہو سکتا ہے سموئل ___ ایک بچی ___ 'چھوٹی ہے...... باپ اسے دلار کر رہا ہے ___ پیار کر رہا ہے، بڑی ہوتی ہے ___ اسکول جاتی ہے...... بیل کی طرح بڑھتی ہے ___ کونپل کی طرح پھوٹتی ہے ___ گاہے بہ گاہے باپ کی نظریں اس پر پڑتی ہیں ___ وہ اس سے بچنا چاہتا ہے...... بچنے کے لئے وہ شادی کی بات چھیڑتا ہے ___ وہ کئی کئی طرح سے اسے رخصت کرنے کی بات سوچتا ہے ___ اور بس چھپنا چاہتا ہے...... بچنا چاہتا ہے ___ پھر ڈرنے لگتا ہے اپنے آپ سے...... جیسے ایک نئی صبح شروع کرنے والے اخبار اور اخبار کی خون اگلتی سرخیوں سے......''

''تم ایک گناہ کی وکالت کر رہے ہو ___ '' سموئل پھر چیخا۔

''نہیں، اس نے جھرجھری بھری ___ '' جنگ ہمیں تباہ کر رہی ہے سموئل...... اور کنڈوم ہمیں اپنی طرف کھینچ رہے ہیں......''

وہ جیسے ہی چپ ہوا، کچھ دیر کے لئے دونوں طرف خاموشی چھا گئی۔

اختتام

معزز قارئین! اگر آپ اسے سچ مچ کہانی مان رہے ہیں تو اس کہانی کا اختتام بہت بھیانک ہے...... بہتر ہے آپ اسے نہ پڑھیں اور صفحہ پلٹ دیں۔

مقدمہ ختم ہوا تو دونوں اپنے معمول میں لوٹ آئے......

اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی...... بدلی بدلی سی مسکراہٹ...... ''سموئل، ہر مقدمے کا ایک فیصلہ بھی ہوتا ہے...... میں سمجھتا ہوں، تمہیں فیصلہ ابھی اسی وقت سنانا چاہئے......''

''یس یور آنر...... سموئل بے دردی سے ہنسا۔ ذرا توقف کے بعد اس نے ایک بوتل کھول لی۔ اس کی طرف دیکھ کر بولا...... '' دو پیگ بناؤں یور آنر......

''فیصلہ کا کیا ہوا......؟'' اس کی آنکھوں میں مدہوشی چھا رہی تھی......

سموئل نے دو پیگ تیار کر لئے۔ پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چیز نکالی۔ وہ اسے دکھا کر مسکرایا۔ یہ امریکن کمپنی کا بنا ہوا کنڈوم کا پیکٹ تھا۔ وہ مسکرایا...... تو یہ ہے فیصلہ یور آنر...... وہ آ چکی ہے...... آواز لگاؤں......''

''تم ایسے ہر معاملے میں، بہت دیر کرتے ہو سموئل...... کہاں ہے وہ......؟''

اس نے گلاس ٹکرائے...... سموئل نے دروازہ کی طرف دیکھا۔ منہ سے سیٹی بجانے کی آواز نکالی۔ اسی کے ساتھ دروازے سے ایک لڑکی برآمد ہوئی......

معزز قارئین! ذرا ٹھہر جایئے۔ اس انجام کے لئے میرا دل سو سو آنسو رو رہا ہے مگر...... اس لڑکی کو آپ بھی پہنچانتے ہیں......!

باپ اور بیٹا

(۱)

باہر گہرا کہرا گر رہا تھا—— کافی ٹھنڈی لہر تھی۔ میز پر رکھی چائے برف بن چکی تھی۔ کافی دیر کے بعد باپ کے لب تھرتھرائے تھے...... 'میرا ایک گھر ہے' اور جواب میں ایک شرارت بھری مسکراہٹ ابھری تھی۔ 'اور میں ایک جسم ہوں—— اپنے آپ سے صلح کرلو گے تب بھی ایک جنگ تو تمہارے اندر چلتی ہی رہے گی۔ ذہن کی سطح پر، ایک آگ کے دریا سے تو تمہیں گزرنا ہی پڑے گا۔ اپنے آپ سے لڑنا نہیں جانتے۔ گھر...... بچے...... ایک عمر نکل جاتی ہے......'

باپ اس دن جلدی گھر لوٹ آئے تھے۔ شاید، ایک طرح کے احساس جرم سے متاثر، یہ ٹھیک نہیں...... وہ بہت دیر تک اندھیرے کمرے میں اپنی ہی پرچھائیوں سے لڑتے رہے۔ کمرے میں اندھیرا اور سکون ہو تو اچھا خاصا میدان جنگ بن جاتا ہے۔ خود سے لڑتے رہو...... میزائلیں چھوٹتی ہیں—— توپیں چلتی ہیں—— اور کبھی کبھی اپنا آپ اتنا لہولہان ہو جاتا ہے کہ...... تنہائیوں سے ڈر لگنے لگتا ہے...... مگر تھکے ہوئے پریشان ذہن کو کبھی کبھی انہیں تنہائیوں پر پیار آتا ہے۔ یہ تنہائیاں قصے "جنتی" بھی ہیں اور قصے سنتی بھی ہیں——

کمرے میں اتری ہوئی یہ پرچھائیاں دیر تک باپ سے لڑتی رہی تھیں...... پاگل ہو...... تم ایک باپ ہو...... ایک شوہر ہو...... باپ گہری سوچ میں گم تھے۔ جسم کی مانگ کچھ اور تھی شاید۔ مگر نہیں...... شاید یہ جسم کی مانگ نہیں تھی۔ جسم کو تو برسوں پہلے اداس کر دیا تھا انہوں نے—— بس ایک کھردری تجویز—— جیسے بوڑھے ہونے کے احساس سے خود کو بچائے رکھنے کی ایک

ضروری کارروائی بس—— زندگی نے شاید اداسی کے آگے کا، کوئی خوبصورت سپنا دیکھنا بند کردیا تھا——

اور ایک دن جیسے باپ نے زندگی کی دور تک پھیلی گپھا میں اپنے مستقبل کا اختتامیہ پڑھ لیا تھا...... 'بس...... یہی بچے...... انہی میں سمائی زندگی اور...... یہی اختتام ہے...... فل اسٹاپ؟'

وہ اندر تک لرز گئے تھے۔

باپ اس کے بعد بھی کئی دنوں تک لرزتے رہے تھے۔ دراصل باپ کو یہ روٹین لائف والا جانور بننا کچھ زیادہ پسند نہیں تھا۔ مگر شادی کے بعد سے، جیسے روایت کی اس گانٹھ سے بندھے رہ گئے تھے۔ بس یہیں تک۔ پھر بچے ہوئے اور اندر کا وہ رومانی آدمی، زندگی کی ان گنت شاہراہوں کے بیچ کہیں کھوگیا، باپ کو اس کا پتہ بھی نہیں چلا۔

(۲)

باپ کے اس بدلاؤ کا بیٹے کو احساس تھا۔ ہوسکتا ہے، گھر کے دوسرے لوگ بھی باپ کی خاموشی کو الگ الگ طرح سے پڑھنے کی کوشش کررہے ہوں، مگر باپ اندر ہی اندر کون سی جنگ لڑ رہے ہیں، یہ بیٹے سے زیادہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ یہ نفسیات کی کوئی ایسی بہت باریک تہہ بھی نہیں تھی، جسے جاننے یا سمجھنے کے لئے اسے کافی محنت کرنی پڑی ہو۔ باپ کی اندرونی کشمکش کو اس نے ذرا سے تجزیے کے بعد ہی سمجھ لیا تھا......

باپ میں ایک مرد لوٹ رہا ہے؟

شاید باپ جیسی عمر کے سب باپوں کے اندر، اس طرح سوئے ہوئے مرد لوٹ آتے ہوں؟

باقی بات تو وہ نہیں جانتا مگر باپ اس 'مرد' کو لے کر الجھ گئے ہیں—— ذرا سنجیدہ ہو گئے ہیں۔ تو کیا باپ بغاوت کرسکتے ہیں۔؟

بیٹے کو احساس تو تھا کہ باپ کے اندر کا مرد لوٹ آیا ہے مگر وہ اس بات سے ناآشنا تھا کہ باپ گھر والوں کو اس مردانگی کا احساس کیسے کرائیں گے؟ باپ کو، گھر والوں کو اس مردانگی کا احساس کرانا بھی چاہئے یا نہیں——؟

ہوسکتا ہے آپ یہ پوچھیں کہ بیٹے کو اس بات کا پتہ کیسے چلا کہ باپ کے اندر کا 'مرد' لوٹ آیا ہے؟...... تاہم یہ بھی صحیح ہے کہ باپ میں آنے والی اس تبدیلی کو گھر والے طرح طرح کے معنی دے رہے تھے۔ جیسے شاید ماں یہ سوچتی ہو کہ پنکی اب بڑی ہوگئی ہے، اس لئے باپ ذرا سنجیدہ ہوگئے ہیں۔

لیکن بیٹے کو اس منطق سے اتفاق نہیں اور اس کی وجہ بہت صاف ہے۔ باپ کی حیثیت بیٹے کو پتہ ہے ___ دس پنکیوں کی شادی بھی باپ کے لئے کوئی مسئلہ نہیں، باپ کے پاس کیا نہیں ہے، کار، بنگلہ اور ایک کامیاب آدمی کی شناخت ___ لیکن بیٹے کو پتہ ہے اس شناخت کے بیچ، اچانک کسی تنہا گوشے میں کوئی درد اتر آیا ہے۔

باپ کے اندر آئی ہوئی تبدیلیوں کا احساس بیٹے کو بار بار ہوتا رہا...... جیسے اس دن...... باپ اچانک رومانٹک ہوگئے تھے۔

●●

''تمہیں پتہ ہے، باتھ روم میں یہ کون گا رہا ہے؟'' اس نے ماں سے پوچھا تھا، ایک بے حد روایتی قسم کی ماں۔

ماں کے چہرے پر سلوٹیں تھیں۔

''میں نے پاپا کو کبھی اتنا خوش نہیں دیکھا، کیوں ماں؟''

ماں کے چہرے پر بل تھے......

''وہ ٹھیک تو ہیں نا؟'' ماں کے لہجے میں ڈر تھا۔

''کیوں؟''

''انہیں کبھی اس طرح گاتے ہوئے......''

بیٹے کو ہنسی آگئی۔ ''کمال کرتی ہو تم بھی ماں ___ یعنی باپ کو کیسا ہونا چاہئے۔ ہر وقت ایک فکر مند چہرے والا، جلاد نما...... غصیلا، آدرش وادی''...... بیٹا مسکراتے ہوئے بولا...... ''باپ میں بھی تو جذبات ہوسکتے ہیں'' بیٹے نے پروا نہیں کی۔ ماں اس کے آخری جملے پر دکھی ہوگئی تھی...... شاید ماں کو اس کے آخری جملے سے شبہ ہوا تھا۔ پورے بیس سال بعد۔ باپ کے تئیں...... کہیں باپ میں......

ماں نے فوراً ایک ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی تسلی کا سامان کیا تھا...... 'کوئی زوردار رشوت ملی ہوگی۔' ماں کو پتہ تھا کہ کسی سرکاری افسر کو بھی اتنا سب کچھ آرام سے نہیں مل جاتا، جتنا کہ اس کے شوہر نے حاصل کیا ہوا تھا۔

باپ اس دن رومانٹک ہو گئے تھے۔ پھر بعد میں کافی سنجیدہ نظر آئے—— جیسے تپتی ہوئی زمین پر بارش کی کچھ بوندیں برس جائیں۔ بیٹا دل ہی دل میں مسکرایا تھا...... ہو نہ ہو یہ مینہ برس جانے کے بعد کا منظر تھا۔ باپ کی زندگی میں کوئی آ گیا ہے۔ پہلے باپ کو اچھا لگا ہوگا اس لئے باپ تھوڑے سے رومانی ہو گئے ہوں گے۔ پھر باپ کو احساس کے آکٹوپس نے جکڑ لیا ہوگا...... بیٹے کو اب باپ کی ساری کارروائیوں میں مزہ آ رہا تھا۔

(۳)

باپ کو یہاں تک، یعنی اس منزل تک پہنچنے میں کافی محنت کرنی پڑی تھی—— جدوجہد کے کافی اوبڑ کھابڑ راستوں سے گزرنا پڑا تھا۔ بیٹے کو پتہ تھا کہ باپ شروع سے ہی رومانی رہا ہے—— جذباتی—— آنکھوں کے سامنے دور تک پھیلا ہوا چمکتا آسمان۔ بچپن میں چھوٹی چھوٹی نظمیں بھی لکھی ہوں گی۔ ان نظموں میں اس وقت رچنے بسنے والے چہرے بھی رہے ہوں گے۔ تب گھر کے اداس چھپروں پر خاموشی کے کوے بیٹھے ہوتے تھے۔ باپ کو جلد ہی اس بات کا احساس ہو گیا کہ خوشبوؤں کے درختوں پر رہنے والی رومانی تتلیوں کی تلاش میں اسے ذرا سا پریکٹیکل بننا ہوگا۔ باپ ہوشیار تھا۔ اس نے پتھریلے راستے چنے—— نظموں کی نرم ونازک دنیا سے الگ کا راستہ۔ ایک اچھی نوکری اور گھر والوں کی مرضی کی بیوی کے ساتھ زندگی کے جزیرے پر آ گیا۔ مگر وہ رومانی لہریں کہاں گئیں یا وہ کہیں نہیں تھیں...... یا اس عمر میں سب کے اندر ہوتی ہیں—— باپ کی طرح۔ اور سب ہی انہیں اندر چھوڑ کر بھول جاتے ہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں کبھی کوئی سیلاب نہیں آتا تھا۔ مگر باپ کی آنکھوں میں سیلاب آ چکا تھا، اور وہ بھی اچانک—— اور وہ بھی ایسے وقت جب پنکی جوان ہو چکی تھی اور بیٹے کی آنکھوں میں رومانی لہروں کی ہلچل تیز ہو گئی تھی۔ ٹھیک بیس سال پہلے کے باپ کی طرح۔ لیکن بیس سال بعد کا یہ وقت اور تھا، باپ والا نہیں۔

بیٹے کے ساتھ باپ جیسی اداس چھپر کی داستان نہیں تھی۔ بیٹے کے پاس باپ کا بنگلہ

تھا۔ایک کارتھی۔کار میں ساتھ گھومنے والی یوں تو کئی لڑکیاں تھیں، مگر سمندر کی بہت ساری لہروں میں سے ایک لہر اسے سب سے زیادہ پسند تھی۔ بیٹے کو سب سے زیادہ گدگداتی تھی...... اور بے شک بیٹا اس کے لئے، اس کے نام پر رومانی شاعری بھی کر سکتا تھا۔

بیٹے کے سامنے مشاہدہ 'منطق اور تسلیوں کے سب دروازے کھلے تھے۔ بیٹا، انٹرنیٹ، کلون اور کمپیوٹر پر گھنٹوں باتیں کر سکتا تھا، اسے اپنے وقت کی ترقی کا اندازہ تھا۔ بہت ترقی یافتہ ملک کا شہری نہ ہونے کے باوجود، خود کو ترقی یافتہ سمجھنے کی بہت سی مثالیں وہ گھڑ سکتا تھا۔

ہاں، یہ اور بات ہے کہ کبھی کبھی وہ پھسل بھی جاتا تھا۔ جیسے، اس دن...... اس خشک شام...... کافی شاپ میں بیٹے کی نظر اچانک اس طرف چلی گئی۔اس طرف —— مگر جو وہ دیکھ رہا تھا وہ صدفی صد سچ تھا۔اس نے دانتوں سے انگلیوں کو دبایا۔نہیں جو کچھ وہ دیکھ رہا تھا، وہ قطعی طور پر نظروں کا دھوکہ نہیں تھا—— اس کے ٹیبل کے بائیں طرف والی ٹیبل، ٹیبل پر رینگتا ہوا ایک مردانہ ہاتھ...... کافی کی پیالیوں کے بیچ تھرتھراتا ہوا ایک زنانہ ہاتھ...... سخت کھردری انگلیاں، دھیرے سے ملائم انگلیوں سے ٹکرائیں۔

''چھپکلی!'' بیٹے کے اندر کا ترقی یافتہ آدمی سامنے تھا۔

''کیا؟'' لڑکی اچھل پڑی تھی۔

''نہیں......''

''تم نے ابھی تو کہا......''

''نہیں...... کچھ نہیں بس یہاں سے چلو''

بیٹا سیٹ چھوڑ کر اٹھ گیا تھا۔لڑکی حیران تھی——

''کیوں چلوں، ابھی ابھی تو ہم آئے ہیں۔''

لڑکی کی آنکھوں میں شرارت تھی—— ''کوئی اور ہے کیا؟''

اٹھتے اٹھتے، پلٹ کر لڑکی نے اس سمت دیکھ لیا تھا، جہاں......

دونوں باہر آ گئے۔باہر آ کر لڑکی کے لہجے میں تلخی تھی——

''کون تھا وہ؟''

''کوئی نہیں''

''پھر باہر کیوں آ گئے؟''

''بس یوں ہی......''

''یوں ہی نہیں۔سنو'' ــــ لڑکی اس کی آنکھوں میں جھانکتی ہوئی مسکرا رہی تھی......

''کوئی تمہاری جان پہچان کا تھا؟''

وہ چپ رہا......

لڑکی کی آنکھوں میں ایک پل کو کرسی پر بیٹھے اس شخص کا چہرہ گھوم گیا ــــ

''سنو اس کا چہرہ کچھ جانا پہچانا سا لگا''

''تم ناحق شک کر رہی ہو''

''سنو، وہ تم تو نہیں تھے؟'' لڑکی ہنس دی۔

''پاگل!'' لڑکے کا بدن تھرتھرایا۔

''اچھا، اب میں جان گئی کہ اس کا چہرہ جانا پہچانا کیوں لگا'' لڑکی زور زور سے ہنس پڑی......اور میں نے یہ کیوں کہ کہا کہ......وہ تم تو نہیں تھے''

''پھر......'' لڑکے کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمک اٹھیں ــــ

''کیوں کہ وہ تمہارے......تمہارے ڈیڈ تھے، تھے نا؟ اب جھوٹ مت بولو مگر ایک بات سمجھ نہیں سکی۔تم بھاگ کیوں آئے......؟''

لڑکی حیران تھی......''تمہاری طرح تمہارے ڈیڈ کو، یا ہمارے پیرینٹس کو یہ سب کرنے کا حق کیوں نہیں؟''

بیٹے کو اب دھیرے دھیرے ہوش آنے لگا تھا۔''آؤ کہیں اور بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔''

(۴)

باپ ان دنوں عجیب حالات سے دوچار تھا۔باپ جانتا تھا کہ ان دنوں جو کچھ بھی اس کے ساتھ ہورہا ہے، اس کے پیچھے ایک لڑکی ہے۔لڑکی جو بیٹی کی عمر کی ہے تاہم باپ جیسا اسٹیٹس (Status) رکھنے والوں کے لئے اس طرح کی باتیں کوئی خبر نہیں بنتی ہیں، مگر باپ کی بات دوسری تھی۔باپ اس معاشرے سے تھا، جہاں ایک بیوی اور ایک خوشگوار گھریلو زندگی کا ہی سکہ چلتا ہے۔یعنی جہاں ہر بات کسی نہ کسی سطح پر خاندانی پن سے جڑ جاتی ہے۔زندگی کے اس الجھے

ہوئے پل سے گزرتے ہوئے باپ کو اس بات کا احساس ضرور تھا کہ وہ لڑکی یونہی نہیں چلی آئی تھی۔ دھیرے دھیرے ایک ویکیوم یا خالی پن اس میں ضرور سما گیا تھا جس کی خانہ پری کے لئے کسی چور دروازے سے وہ لڑکی، اس کے اندر داخل ہو کر اس کے ہوش وحواس پر چھا گئی تھی۔ کہیں ایک عمر نکل جانے کے بعد بھی ایک عمر رہ جاتی ہے، جو زندگی کے تپتے ریگستان میں کسی امرت یا کسی ٹھنڈے پانی کے جھرنے کی آرزو رکھتی ہے۔ باپ نے سب کچھ تو حاصل کر لیا تھا، مگر اسے لگتا تھا، سب کچھ پا لینے کے باوجود وہ کسی مشینی انسان یا روبوٹ سے الگ نہیں ہے —— اور یہ زندگی صرف اتنی سی نہیں ہے۔ وہ ایسے بہت سے لوگوں کی طرح زندگی بسر کرنے کے خلاف تھا، جن کے پاس جینے کے نام پر کوئی بڑا مقصد نہیں ہوتا۔ یا جو اپنی تمناؤں اور آرزوؤں اور زندگی کے تئیں سبھی طرح کے رومان کو سلا کر اداس ہو جاتے ہیں —— باپ کے نزدیک ایسے لوگوں کو بس یہی کہا جا سکتا تھا۔ ایک ناکام آدمی! لیکن اچانک باپ کو لگنے لگا تھا...... کیا وہ بھی ایک ناکام آدمی ہے؟

دراصل باپ کے اندر 'تبدیلی' لانے میں اس سپنے کا بھی ہاتھ رہا تھا...... کہنا چاہئے وہ ایک بھیانک سپنا تھا اور باپ کے لئے کسی ذہنی حادثے سے کم نہیں۔ کیا ایسے سپنے دوسروں کو بھی آتے ہیں یا آ سکتے ہیں؟ دنیا سے اگر اچھائی برائی، گناہ وثواب جیسی چیزیں ایک دم سے کھو جائیں تو؟ اس سے زیادہ ذلیل سپنا۔ نہیں، کہنا چاہئے باپ ڈر گیا تھا، وہ ایک عام سپنا تھا —— جیسے سپنے عنفوان شباب میں عام طور پر آتے رہتے ہیں۔ سپنے میں کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی، بلکہ بہت ہی معمولی سا سپنا۔ جو بہت سے ماہرین نفسیات جیوی ریڈلس، پیٹر ہاوز اور فرائڈ کے مطابق۔ ناآسودہ خواہشات والے بوڑھے شخص کے لئے یہ کوئی غیر معمولی حادثہ نہیں —— یعنی سپنے میں کسی سے زنا بالجبر —— باپ سے سپنے میں ایسے ہی جرم کا ارتکاب ہوا تھا —— لڑکی خوف زدہ حالت میں پیچھے ہٹتی گئی تھی۔ باپ پر پاگل پن سوار تھا...... چر...... ر...... سے آواز ہوئی، خوف زدہ لڑکی کا گداز جسم اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ تپتے ریگستان میں جیسے ٹھنڈے پانی کی ایک بوند۔ بوند...... ٹپ سے گری......

سقراط اور ارسطو سے لے کر سگمنڈ فرائڈ تک، سبھی کا یہ ماننا ہے کہ...... سپنوں میں کہیں نہ کہیں دبی خواہشات اور جنسی افعال رہتے ہیں...... تو کیا جو کچھ سپنے میں ہوا...... وہ......

تو کیا یہ باپ کی کوئی دبی خواہش تھی؟ ناآسودہ خواہشات فقط جنسی ہیجانات ہی ہوتے ہیں، باپ کو پتہ تھا۔

سپنوں کے بارے میں باپ کا کوئی گہرا مطالعہ تو نہیں تھا پھر بھی اپنی دلچسپی کے لحاظ سے باپ ایسی باتوں سے آشنا تھا۔ کلیئر وائینٹ، ٹیلی پیتھی، پریکا گنیشن، ریٹرو کا گنیشن سے لے کر سپنوں میں ہونے والی جنسی خواہش وغیرہ کے بارے میں اسے مکمل جانکاری تھی، باپ کو لگا، عصمت دری کا مرتکب شخص وہ نہیں، کوئی پریت آتما ہے؟ (ایسی پریت آتماؤں کو پیرانفسیاتی زبان میں انکیو بی اور سکیو بی نام دیئے گئے ہیں۔ یہ شیطانی روحیں عورت اور مرد میں سوئی روحوں کے ساتھ اپنی جنسی خواہشات کی تکمیل کرتی ہیں...... تو کیا وہ سچ مچ باپ نہیں تھا...... وہ کوئی بد روح تھی؟)

لیکن یہ تسلی کچھ زیادہ جاندار نہیں تھی۔ اس نے نفسیات اور پیرانفسیات کے سارے چیتھڑے بکھیر دیئے تھے۔ باپ کے لئے یہ سب کچھ ناقابل برداشت تھا۔ اس لئے کہ سپنے میں جس لڑکی کے ساتھ باپ نے زنا بالجبر کیا تھا، وہ لڑکی پنکی تھی......

دیر تک باپ کا بدن کسی سوکھے پیڑ کی مانند تیز ہوا سے ہلتا رہا تھا۔ انسان کے ذہنی حرکات وسکنات کو قابو کرنے والے جذبے کا نام ہے LIBIDO —— یہ مرد، عورت کے ملن سے ہی ممکن ہے۔ اپنے من چاہے ساتھی کے ساتھ جنہیں اس خواہش کی تکمیل میسر ہوتی ہے وہ ذہنی اعتبار سے صحت مند ہو جاتے ہیں —— اپنی پسند کی تسکین حاصل نہ ہو تو ذہن میں دبی خواہش ڈراونے خوابوں کو جنم دیتی ہے۔ تو کیا باپ ناآسودہ تھا؟ بہت دنوں تک عورت کے بدن کی شبیہیں جیسے اوکھلی، دوات، کمرا، کنواں وغیرہ اس کے سپنوں میں ابھرتے رہے اور ان سپنوں کا خاتمہ کہاں ہوا تھا...... وہ بھی ایک ایسے ''زانی'' کے ساتھ۔ اس نے پوری ننگی عورت کے ساتھ مباشرت کی تھی ——

باپ گہرے سناٹے میں تھا۔ ایسے گہرے سناٹے میں، جہاں اس طرح کے تجزیے بھی غیر ضروری معلوم ہونے لگتے ہیں کہ...... وہ ابھی تک صحت مند ہے؟ جوانی ابھی اس میں باقی ہے...... ابھی تک اس میں پت جھڑ نہیں آیا۔ بیوی کی طرح...... وہ کسی ٹھنڈے سوکھے کنویں میں نہیں بدلا۔ جانگھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جسم میں، خون کی تمام لہروں پر اس کی نظر رہتی ہے۔ ایک گرم جسم شاید اس کے جوان بیٹے سے بھی زیادہ گرم، بیوی نے برسوں پہلے جیسے یہاں، سکھ کے اس مرکز پر دیوار اٹھا دی تھی۔ اس کے پاس سب سے زیادہ باتیں تھیں پنکی کے بارے میں، پنکی

کے لئے اچھا سا شوہر ڈھونڈنے کے سپنے کے بارے میں شاید بیوی کے پاس مستقبل کے نام پر کچھ اور بھی بوڑھے سپنے رہے ہوں، مگر......

اس دن پنکی شاور سے نکلی تھی، نہا کر۔ شاید باپ کسی ایسے ہی کمزور لمحے میں، وقت سے پہلے اپنی بیٹی کی شادی کا فیصلہ کرلیتا ہے۔ باپ نے نظر نیچی کرلی تھی پنکی کے جسم سے میز ائلیں چھوٹ رہی تھیں۔ اس نے شلوار اور ڈھیلے گلے کا جمپر پہن رکھا تھا۔ وہ سر جھکائے تولیے سے بال سکھا رہی تھی۔ پہلی ہی نظر میں اس نے آنکھ جھکالی تھی، آہ! کسی بھی باپ کے لئے ایسے لمحے کتنے خطرناک اور چیلنج سے بھرپور ہوتے ہیں......

تو کیا اس اَن چاہے سپنے کے لئے یہ منظر ذمہ دار تھا، یا...... اس کے اندر دبی خواہش نے اسے ظالم حکمراں میں بدل دیا تھا......

خالی دماغ شیطان کا گھر —— باپ خود کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنا چاہتا تھا۔ گزرے ہوئے بہت سارے خوبصورت لمحوں یا بچھڑی ہوئی اس رومانی دنیا میں ایک بار پھر اپنی واپسی چاہتا تھا۔ اپنی حدوں کو پہچاننے کے باوجود...... شاید اسی لئے لڑکی کی طرف سے ملنے والی لگاتار دعوتوں کو ٹھکرانے کے بعد، اس دن، اس نے، اسے پہلی بار منظوری دی تھی......

(۵)

''چلو! کہیں باہر چائے پینے چلتے ہیں۔''

بیٹا کچھ دیر تک خاموش رہا۔

لڑکی کے لئے تجسس کا موضوع دوسرا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''تمہیں پہلی بار کیسا لگا اپنے باپ کو دیکھ کر۔'' وہ تھوڑا مسکرائی تھی۔ ''عشق فرماتے ہوئے دیکھ کر؟''

''باپ ہمیں دیکھ لیتے تو، کیسا لگتا انہیں''۔

لڑکی کو یہ جواب کچھ زیادہ پسند نہیں آیا——

لڑکا کچھ اور سوچ رہا تھا۔ ''اچھا مان لو، وہ باپ کی گرل فرینڈ نہ ہو۔ وہ بس باپ کے دفتر میں کام کرنے والی ایک عورت ہو......''

''عورت نہیں۔ ایک کمسن، جوان اور خوبصورت لڑکی، جیسی میں ہوں'' —— لڑکی ہنسی۔ ''میری عمر کی......؟''

''کیا اس عمر کی لڑکیاں دفتروں میں کام نہیں کرتیں؟''

''کرتی کیوں نہیں۔ باپ جیسے لوگ ان کے ساتھ چائے پینے بھی آتے ہوں گے، مگر وہ...... میرا دعویٰ ہے، جس طرح تمہارے پاپا نے...... اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تھا، میرا یقین ہے، وہ تمہارے پاپا کی گرل فرینڈ ہی ہوگی۔''

''اچھا بتاؤ، مجھے کیسا لگنا چاہئے تھا؟''

''مجھے نہیں پتہ......''

''اچھا بتاؤ۔ اگر وہ تمہارے پاپا ہوتے تو......؟''

لڑکی نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''میرے پاپا ممی میں طلاق ہو چکی ہے۔ میں ممی کے ساتھ رہتی ہوں، اس لئے کہ پاپا کی زندگی میں کوئی اور آ گئی تھی۔ ہوسکتا ہے وہ اس کے ساتھ ایسے ہی گھومتے ہوں جیسے......''

''اس حادثے کے بعد تمہارے ممی نے کسی کو نہیں چاہا؟''

''نہیں، لیکن یہ ممی کی غلطی تھی جو یہ سوچتی ہیں کہ جوان ہوتی لڑکی کی موجودگی میں کسی کو چاہنا گناہ ہے۔ کبھی کبھی مجھے ممی پر غصہ آتا ہے۔ صرف میرے لئے ایک پوری زندگی انہیں دیوداسی کی طرح گزارنے کی کیا ضرورت تھی۔ میرے لئے، میرے ساتھ رہنے والی زندگی کا خاتمہ اس طرح ہو جائے، یہ مجھے گوارا نہیں۔''

''مان لو اگر تمہاری ممی کا کوئی رومانس شروع ہو جاتا تو......؟''

''ایک سدیش انکل تھے...... ممی کا خیال رکھتے تھے مگر ممی نے سخت لفظوں میں انہیں آنے سے منع کر دیا......''

''کیا تمہیں یقین ہے کہ ممی کے اندر، تمہاری طرح ایک جوان عورت بھی ہوگی؟''

''مجھے یقین ہے کہ ممی سدیش انکل کو بھولی نہیں ہوں گی اور یہ کہ...... ان کے اندر کوئی نہ کوئی بھوک ضرور دبی ہوگی۔ میں جانتی ہوں، ممی اس بھوک کو لئے ہوئے ہی مر جائیں گی۔''

بیٹے کی آنکھوں میں اُلجھن کے آثار تھے۔ تو کیا باپ بھی اسی طرح برسوں سے اپنی بھوک دبائے ہوئے ہوں گے؟

''تمہاری ممی کیسی ہیں؟''

''ہمارے لئے بہت اچھی۔ ہاں! پاپا کے لئے نہیں...... لگتا ہے۔ ممی اس عمر میں صرف

ہمارے لئے رہ گئی ہیں۔وہ پاپا کے لئے نہیں ہیں۔''

لڑکی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔''پاپا کی زندگی میں 'کئی' آجائیں تو بھیا تک بات نہیں۔ایسے بہت سے مرد ہمارے سماج میں ہیں۔سچائی یہ ہے کہ بہت سی گھر والیاں بھی یہ سب جانتے ہوئے چپ رہ جاتی ہیں۔اس سے گھر نہیں ٹوٹتا۔باپ کی زندگی میں کوئی دوسرا آجائے، تب خطرے کی بات ہے۔اس دوسرے کے آنے سے گھر ٹوٹ بھی سکتا ہے۔جیسا، میرے باپ کے ساتھ ہوا......''

''پتہ نہیں، باپ کیا کریں گے......''لڑکے کو فکر تھی۔''لیکن ایک بات کہوں یہ دہرے پن کا زمانہ ہے، دہرے پن کا۔''

لڑکی ہنسی—— سیدھی سچی بات کہوں تو ''دوغلا بن کر ہی جی سکتے ہو تم۔آرام سے——زندگی میں بیلینس کے لئے دوہرے پن کا کردار ضروری ہے یعنی آپ ایک وقت میں دو جگہ ہو سکتے ہیں۔الگ الگ اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے۔سیدھے سیدھے کہوں تو، اگر آپ بیوی ہیں تو آپ کو بھولنا ہوگا کہ گھر سے باہر آپ کا شوہر کیا کرتا ہے اور اگر شوہر ہیں تو بھول جائیے کہ باقی وقت آپ کی بیوی کیا کرتی ہے۔اس مارکیٹنگ ایج میں اگر آپ اخلاقی اقدار یا روایات کی بات کریں گے تو خسارہ آپ کا ہی ہوگا۔''

لڑکا بولا۔''شاید اتنا کچھ قبول کرنا سب کے لئے آسان نہ ہو......''

''تمہارے باپ کی زندگی میں ایک لڑکی آچکی ہے، یہ قبول کرتے ہوئے تمہیں کیسا لگے گا؟''

لڑکے نے بہت سوچنے کے بعد کہا—— ''ابھی اس میز پر بیٹھ کر میں اس کا جواب صحیح طور پر نہیں دے پاؤں گا۔''

OO

باپ کے لئے یہ ایک غیر متوقع سمجھوتہ تھا۔یعنی اس بیٹے سے اس لڑکی تک کا سفر۔لڑکی کا ساتھ پا کر جیسے اس کا پورا جسم گنگنا اٹھا تھا۔نہیں، اس سے بھی زیادہ۔باپ کا جسم جیسے اچانک وائلن میں بدل گیا ہو اور وائلن کے تار جھنجھنا کر مستی بھری دھنیں پیدا کر رہے ہوں۔

لڑکی کم عمر تھی، باپ نے پوچھا——

''تم نے اپنی عمر دیکھی ہے؟''

''ہاں۔'' لڑکی ڈھٹائی سے مسکرائی۔ ''اور تم نے؟''

''ہاں''

''تمہاری جیسی عمر کو میری ہی عمر کی ضرورت ہے''

''اور تمہاری عمر کو......؟'' باپ اس فلسفے پر حیران تھا۔

لڑکی مدہوش تھی۔ ''نئے لڑکے ناتجربہ کار ہوتے ہیں —— مورتی کی تراش خراش سے واقف نہیں ہوتے۔ اس عمر کو ایک تجربہ کار مرد کو ہی سوچنا چاہئے۔ جیسے تم۔'' لڑکی ہنسی تھی۔

گھر آ کر بھی باپ کو لڑکی کی ہنسی یاد رہی۔ اس دن لڑکی کے صرف ہاتھوں کے لمس اور خوشبو نے، گھر میں طرح طرح سے اس کی موجودگی درج کرادی تھی۔ جیسے ڈائننگ ٹیبل پر کھانا کھاتے ہوئے دفعتاً غیر شعوری طور پر اس کے ہاتھ 'طبلہ' بن گئے تھے۔ جیسے باتھ روم میں وہ یونہی گنگنانے لگا تھا۔ جیسے......اور بھی بہت کچھ ہوا تھا۔ مگر شاید اب وہ یاد کرنے کی حالت میں نہیں تھا...... کیونکہ اب اس لمس یا خوشبو سے گزرتے ہوئے وہ ساری رات اپنی 'اگنی پریکشا' دینے پر مجبور تھا۔ پتہ نہیں، بیوی کو اس بدلاؤ پر حیران ہونا چاہئے تھا یا نہیں؟ مگر بیوی ڈر چکی تھی یہ سوچتے ہوئے کہ اس کا شوہر کسی سخت ذہنی الجھن میں گرفتار ہے۔ وہ اپنے باپ کے گھر کی روایت کو نبھانے یا بیوی کا دھرم نبھانے پر مجبور تھی —— اور وہ بار بار شوہر کے آگے پیچھے گھوم کر کچھ ایسی مضحکہ خیز صورت حال پیدا کر رہی تھی جیسے کسی چھوٹے بچے پر پاگل پن کا دورہ پڑا ہو اور ماں اپنی مکمل ممتا بچے پر انڈیل دینا چاہتی ہو۔ شوہر کے بدلاؤ پر اس کا ذہن کہیں اور جانے کی حالت میں نہیں تھا۔

''پنکی کے لئے پریشان ہو؟''

باپ کی مٹھیاں سختی سے بھنچ گئیں۔ ابھی ابھی تو وہ یک ڈراؤنے سپنے کے سفر سے واپس لوٹا تھا۔

''مت سوچو زیادہ''

''نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں''

''قرض چڑھ گیا ہے؟''

''نہیں''

''نوکری پر......کوئی......''

''کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' باپ کا لہجہ ذرا سا اکھڑا ہوا تھا۔

''لاؤ سر میں تیل ڈال دوں۔''

باپ نے گھور کر دیکھا۔ بیوی کے چہرے کی جھریاں کچھ زیادہ ہی پھیل گئی تھیں۔ سر پر تیل بھی چپڑا ہوا تھا۔ تیل ڈالنے سے سر کے بال اور بھی چپک گئے تھے۔

''نہیں، کوئی ضرورت نہیں ہے، اس وقت مجھے اکیلا چھوڑ دو۔''

دوسرے دن بھی ماں پریشان رہی۔

بیٹے نے ماں کو دیکھ کر چٹکی لی...... ''تم نے کچھ محسوس کیا؟''

''نہیں۔''

''تم محسوس کر بھی نہیں سکتی ہو!''

''کیوں؟'' ماں کے لہجے میں حیرانی تھی۔

''کیونکہ تمہارے مقابلے میں، باپ ابھی تک جوان ہے۔''

ماں کو خوفزدہ چھوڑ کر بیٹا آگے بڑھ گیا......

اسی دن شام کے وقت بیٹے نے اپنی محبوبہ سے کہا۔

''سب کچھ خیال کے مطابق ہی چل رہا ہے''

''کیسا لگ رہا ہے تمہیں؟''

''کہہ نہیں سکتا، مگر لگتا ہے، کشش کے لئے ہر عمر ایک جیسی ہے......''

''یا ہر عمر کی کشش ایک جیسی ہوتی ہے''

''شاید...... مگر شاید میں اتنے تذبذب میں نہ ہوتا باپ کی عمر میں پہنچ کر''

''ہر عمر ایک جیسی ہوتی ہے۔ حادثات اپنا چہرہ بدلتے رہتے ہیں'' بدلتے صرف حادثات ہیں لڑکی بولی۔ ''خیر اس دن میں نے تم سے پوچھا تھا...... تمہارے باپ کی زندگی میں ایک لڑکی آچکی ہے یہ قبول کرتے ہوئے تمہیں کیسا لگے گا؟''

''ابھی تک کچھ سوچ پانے کی حالت میں نہیں ہوں''

لڑکی پھر ڈھٹائی سے ہنس دی......''اور شاید آگے بھی نہ ہو اس لئے کہ باپ پر غور فکر کرتے ہوئے تم صرف باپ پر غور نہیں کر رہے ہو بلکہ باپ کے ساتھ اپنے، پنکی، ماں اور صورت حال پر بھی غور کر رہے ہو۔ ان سب کو ہٹا کر صرف باپ کے بارے میں سوچو۔''

''لیکن ایسا کیسے ممکن ہے......؟''

لڑکی نے پتہ نہیں کس سوچ کے تحت کہا۔''اسے ممکن بناؤ ورنہ ایک بار پھر یہ دنیا جڑنے کے بجائے ٹوٹ جائے گی۔''

(۶)

باپ کو کوئی فیصلہ نہیں لینا تھا۔ بلکہ اندر بیٹھے بوجھل آدمی کو ذرا سا خوش کرنا تھا۔ کسی کا ذرا سا ساتھ اور بدلے میں، بہت سی خوشیاں یا بے رنگ کاغذ پر نقاشی کرنی تھی۔ ایک کامیاب آدمی کے اندر چھپے ناکام اور ڈرپوک آدمی کو ٹھنڈے اور خوشگوار ہوا کے جھونکے کی تلاش تھی اور یہ کوئی ایسی بے ایمانی بھی نہیں تھی۔ اس میں کوئی مکر و فریب بھی نہیں تھا۔ ریگستان کی تپتی زمین پر جیسے کسی امرت بوند کی تلاش۔ شاید اسی نا آسودہ جنسی خواہش نے اس اذیت ناک سپنے کو جنم دیا تھا۔ باپ اس نئی رفاقت کو کامیابی کی کنجی بھی مان سکتا تھا کہ تسکین میں ہی کامیابی چھپی ہے۔ تسکین ذہنی طور پر اسے غیر صحتمند نہیں رہنے دیتی۔ وہ آرام سے پنکی کی شادی کرتا۔ بیوی سے دو چار اچھی بری باتیں، بیٹے کے ساتھ تھوڑا ہنسی مذاق اور زندگی آرام سے گزرنے والی سیڑھیاں پہچان لیتی۔

مگر باپ کی آزمائش بھی یہیں سے شروع ہوئی تھی۔ وہ بھیانک اذیت سے گزر رہا تھا۔ صرف ایک لمس یا خوشبو سے وہ خود اپنی نظروں سے کتنی بار ننگا ہوتے ہوتے بچا تھا۔ اس کی عمر، کی تفصیل اس کے اصول، اس کا خاندانی پن۔ باپ کئی راتیں نہیں سویا، اس کے بعد باپ کئی دنوں تک اس لڑکی سے نہیں ملا۔

ظاہر ہے، آزمائش میں باپ ہار گیا تھا۔ مکمل شکست، باپ کا جرم ثابت ہو چکا تھا۔ باپ کو پھر سے گھر والوں کی نظر میں پہلے جیسا بننا تھا۔ باپ کو اس 'غیر انسانی زاویے' سے باہر نکلنا تھا۔

اور باپ دھیرے دھیرے باہر نکلنے بھی لگا تھا اور کہنا چاہئے......

(۷)

''باپ نارمل ہو چکا ہے۔''

بیٹے نے اس کہانی کا کلائمکس لکھتے ہوئے کہا۔

''کیا؟'' لڑکی چونک گئی تھی۔

''ہاں، اس میں توازن لوٹ آیا ہے۔ وہ برابر برابر ہنستا ہے یعنی جتنا ہنسنا چاہئے، وہ برابر برابر...... یعنی اتنا ہی مسکراتا ہے، جتنا مسکرانا چاہئے اور کبھی کبھی، کسی ضروری بات پر اتنا ہی سنجیدہ ہو جاتا ہے، جتنا......''

''یعنی وہ لڑکی اس کی زندگی سے دور جا چکی ہے؟''

''یا اسے باپ نے دور کر دیا؟''

لڑکی کی آنکھوں میں جیسے گھنگور اندھیرا چھا گیا ہو۔ وہ ایک لمحے کے لئے کانپ گئی تھی۔ شاید ایک قطرہ آنسو اس کی آنکھوں میں لرزاں تھا——

''کیا ہوا تمہیں؟''

''کچھ نہیں۔ ماں کا خیال آ گیا''

''اچانک۔ مگر کیوں......؟''

لڑکی نے موضوع بدل دیا۔ ''اب سوچتی ہوں میری ماں مکمل کیوں نہیں ہو سکی۔ میری ماں بدنصیب ہے۔''

○○○

دادا اور پوتا

(اپنے پانچ سالہ بیٹے عکاشہ کے لئے جس کی خوبصورت اور 'خطرناک' شرارتوں سے اس کہانی کا جنم ہوا)

(۱)

کچھ دنوں سے بڈھے اور پوتے میں جنگ چل رہی تھی۔ بڈھا چلاّتا رہتا تھا اور پوتا اس کی ہر بات نظر انداز کر جاتا تھا......

'سنو، میرے پاس وقت ہیں۔'

'کیوں وقت نہیں ہے؟'

'بس کہہ دیا نا، وقت نہیں ہے۔'

'ایک ہمارا بھی زمانہ تھا......'

بڈھا کہتا کہتا ٹھہر جاتا۔ بھلا جوان پوتے کے پاس اتنا سب کچھ سننے کے لئے وقت ہی کہاں تھا۔ بڈھا اس وقت پیدا ہوا تھا جب لوگوں کے پاس وقت ہی وقت تھا اور پوتے نے اس وقت آنکھیں کھولی تھیں جب دنیا تیزی سے بدلنے لگی تھی......

OO

بڈھے کو پوتے پر رشک آتا تھا اور بیٹے سے اسی قدر اکتاہٹ محسوس ہوتی تھی......اس کی امید کے برخلاف بیٹا ذرا سا بھی موقع پاتے ہی اس کے آگے پیچھے گھومتا ہوا فرمانبرداری ثابت کرنے میں جٹ جاتا......

'ابا، آپ کو چائے ملی؟'

'مل گئی......'

'کھانا ہو گیا'

'ہاں'

'کچھ چاہئے تو نہیں آپ کو؟'

'نہیں'

'طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی؟'

'میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم جاؤ، اپنا کام کرو۔

○○

بڈھے کو بیٹے کی بات سے کوفت محسوس ہوتی۔ اسے لگتا، بیٹا درمیان کی اڑان میں کہیں پھنسا رہ گیا ہے—— اور پوتا، اس کی اڑان کا تو نہ کوئی اُور ہے نہ چھور—— بیٹا ایک محدود زمین میں رہ کر اپنی ذمہ داریاں ادا کر رہا ہے۔ پوتے کے سامنے ایک کھلا آسمان ہے...... بیٹا، اپنی، اس کی (یعنی بڈھے کی) نسل اور ان دونسلوں کی اخلاقیات کے بیچ کہیں الجھ کر رہ گیا ہے...... اور پوتا، اس کی نظروں میں ایسا شاطر پرندہ، جو ایسی تمام بندشوں کے پر کترنا جانتا ہو۔ بڈھے کو بیٹے پر رحم آتا تھا اور پوتے کے لئے اس کے اندر ایک خاص طرح کا جذبہ رقابت تھا، جواب جوش مارنے لگا تھا۔

○○

بڈھے کو احساس تھا، وہ غلط وقت میں پیدا ہوا ہے۔ تب کتنی معمولی معمولی چیزیں اس کے لئے خوشی بن جایا کرتی تھیں۔ وہ ایک مدت تک دھوپ، ہوا، آنگن اور آنگن کے پیڑ کو ہی دنیا سمجھتا آیا تھا۔ باہر کی سب چیزیں ایک لمبی مدت تک، یعنی اس کے کافی بڑا ہو جانے کے بعد تک جادوگر کا بن ڈبہ ہی رہیں۔ یعنی جس کے بارے میں وہ سوچ سکتا تھا۔ خوش ہو سکتا تھا، چونک سکتا تھا اور مچل سکتا تھا—— اماں، ابا، بھائی بہنوں کی فوج، اس کی کل کائنات بس اتنی تھی...... اور کیا چاہئے...... بڈھا اسی دنیا میں گم رہا کہ اس وقت کے سارے بچے اسی دنیا میں گم تھے...... وہ اسی کائنات میں غوطہ کھاتا رہا کہ اس وقت کے سارے بچے......

دھوپ، ہوا، آنگن اور پیڑ...... ایک دن گھر کی دیوار اونچی اٹھ گئی ____ دھوپ رخصت ہوگئی ____ ہوا کا آنا بند ہوگیا۔ آنگن پاٹ دیا گیا اور پیڑ کاٹ ڈالا گیا ____

بڈھے نے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا۔ اب وہاں ایک پختہ کار مرد تھا اور دنیا دھیرے دھیرے بدلنے لگی تھی......

لیکن شاید نہیں۔ یہ بڈھے کا وہم تھا۔ دنیا اسی طرح اپنے محور پر ٹکی ہوئی تھی، جیسے پہلے تھی...... جیسے بڈھے کے باپ کے وقت میں تھی۔

○○

تو بڈھا 'ان' بہت سارے لوگوں میں سے ایک تھا جو بہت چھوٹی چھوٹی چیزوں پر خوش ہوجایا کرتے ہیں۔ پھر اس نے یہی چھوٹی چھوٹی خوشیاں ورثہ میں اپنے بیٹے کے حوالے کردیں۔ بیٹے کے زمانے میں وقت صرف اس قدر بدلا تھا کہ زمین زیادہ پتھریلی ہوگئی تھی۔ بڈھے باپ کی طرح اسے سب کچھ آسانی سے نہیں مل گیا تھا...... اسے باپ سے زیادہ مشقت کرنی پڑی۔ کچھ زیادہ جدوجہد کرنی پڑی...... تب اس کے چھوٹے سے شہر میں تھوڑی تھوڑی تبدیلیاں آنے لگی تھیں...... خاندان کے بڑھنے پر بٹوارہ اور گھر کا چھوٹا ہونا لازمی تھی۔ یہی وہ چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں جسے بڈھا ____ دنیا کے ایک دم بدل جانے کے طور پر دیکھ رہا تھا..

لیکن دراصل دنیا تب بدلی تھی جب......

○○

بیٹا اپنی آدھی زندگی کی ناؤ کھے چکا تھا۔ بڈھا اب اکیلا تھا۔ بیوی گزر چکی تھی۔ بیٹے کو مشقت اور جدوجہد کے بدلے میں ایک اچھی زندگی ملی تھی ____ مگر نیا شہر ملا تھا۔ نئے شہر میں کالونیاں تھیں۔ ان میں کہیں ایک گھر بیٹے کا بھی تھا۔

اس گھر میں آنگن نہیں تھا ____

اس گھر میں پیڑ نہیں تھے ____

اس گھر میں دھوپ کم کم آتی تھی۔ ہوا کا گزرنا بھی کم کم ہوتا تھا ____

پوتے نے اسی گھر میں آنکھ کھولی تھی...... آنگن، پیڑ، ہوا، دھوپ نہ ہوتے ہوئے بھی پوتے نے زبردست ہاتھ پاؤں نکالے تھے۔

پوتے کا ہر دن ایسا تھا جو اس کے بیٹے کی زندگی میں نہیں آیا تھا۔
جو بڈھے کی زندگی میں نہیں آیا تھا......
پوتا بلا خطر کچھ بھی کرسکتا تھا...... اور شاید اسی لئے، اسے دیکھتا، پڑھتا ہوا بڈھے قدم قدم پر اس سے کڑھتا رہتا تھا......

(۲)

اور حقیقت ہے، پوتے نے جب آنکھیں کھولیں، اس وقت دنیا بے حد تیزی سے بدلنے لگی تھی۔

پوتے نے بے حد چھوٹی نازک عمر میں ہی اپنے پر نکال لئے۔ ایک دن پڑھتے پڑھتے وہ تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکلا۔

'کہاں جارہے ہو؟ بڈھے نے پوچھا۔

'کھیلنے جارہا ہوں'

بڈھے نے بیٹے سے کہا...... 'اسے روکو...... وہ کھیلنے جارہا ہے......'

بیٹے نے آنکھیں پھیرتے ہوئے کہا ''وہ نہیں مانے گا...... وہ اپنی مرضی کا مالک ہے آپ دیکھتے نہیں......''

'ہاں، میں سب دیکھ رہا ہوں'

بڈھے نے گہرا سانس بھر کر کھلے دروازے کو دیکھا۔ پوتا نظر سے اوجھل ہو چکا تھا۔

○○

بے حد ننھی، کچی سی عمر میں اور اس کالونی میں یہ پوتے کا پہلا دن تھا۔ جب نرسری میں پڑھتے ہوئے اس نے اپنی آزادی کا اعلان کیا تھا...... اس دن بڈھا دیر تک سوچتا رہا بچپن میں ایسی آزادی اس کے حصے میں کیوں نہیں آئی؟'

وہ پہلا دن تھا، جب بڈھے نے پوتے سے جلن محسوس کی تھی۔

○○

پوتا تھوڑی دیر بعد کھیل کر واپس آیا، تو بڈھا دروازے پر اس کا راستہ روک کر کھڑا

ہو گیا۔

اس کی متجسس آنکھوں میں سوالات تھے ____

'تمہارے پاس کیا ہے جو میرے پاس نہیں ہے'

'ہٹو، جانے دو'

'نہیں، پہلے بتاؤ...... تمہارے پاس کیا ہے جو میرے پاس......'

پوتے نے پھر دہرایا...... نہیں جانے دو گے؟'

'نہیں......'

'ٹھینگا'

پوتا مست ہوا کے جھونکوں کی طرح دوبارہ بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ بڈھا دیکھتا رہ گیا...... شاید فرار کے اتنے راستے، بغاوت کا یہ مادہ، جو پوتے میں تھا، بڈھے میں نہیں آیا تھا...... وہ دیر تک دو قدم آگے بڑھ کر پوتے کو سیڑھیوں سے نیچے اتر کر دوڑ کر، سرپٹ بھاگتے ہوئے دیکھتا رہا____

یہ سلسلہ دراز ہوتا رہا......

انحراف، احتجاج اور بغاوت کی کشادہ سڑک پر پوتے کے قدم بھاگتے رہے۔ بڈھا خود سے دریافت کرنے میں مصروف رہا۔

'اس میں ایسا کیا ہے، جو میرے پاس نہیں ہے'

اور کہنا چاہئے، بار بار اٹھنے والے اسی ایک سوال نے اسے پوتے کے بہت قریب کر دیا تھا...... اور پوتا بھی اسی دشمنی، رقابت کے پردے میں بڈھے کو 'کچھ' بھی بتاتے یا پوچھتے ہوئے گھبراتا یا شرماتا نہیں تھا...... مثلاً جیسے پوتا پوچھتا......

'تم اپنے وقت میں ایسے نہیں تھے؟'

'نہیں۔'

'پھر تم کرتے کیا تھے؟'

'ہم چپ رہتے تھے۔ بڑوں کے سامنے بولنا منع تھا۔'

اور......؟'

'پیدا ہوتے ہی ہمیں ایک ٹائم واچ دے دی جاتی تھی۔ اس وقت اٹھنا ہے، فلاں وقت میں یہ کام انجام دینا ہے......'

'اور لڑکی......؟'

پوتا ہنستا ہے۔

بڈھا آنکھیں تریرتا ہے...... ''ہمیں چھت پر بھی جانا منع تھا۔ تمہارا باپ بھی چھت پر نہیں جا سکتا تھا۔ لڑکی کا نام لینا تو بہت دور کی چیز ہے۔''

'تم لوگ گھامڑ تھے ــــ' اس بار پوتے کو غصہ آتا ہے۔

OO

دادا جوابی کارروائی کے طور پر، گفتگو کے ہر نئے موڑ پر بیٹے کے ساتھ شیئر کرتا ــــ

'ــــ وہ اڑ رہا ہے۔'

'یہ عمر اس کے اڑنے کی ہی ہے ــــ' بیٹا اپنے کام میں مصروف رہتا۔

'ــــ وہ ہنس رہا ہے۔'

'وہ ہنس سکتا ہے...... یہ عمر ہی......'

'ــــ نہیں، وہ ایسے نہیں ہنس رہا ہے جیسے ہم لوگ......'

بڈھا کہتے کہتے غصہ ہوتا ہے......'وہ اڑ رہا ہے...... وہ بڑا ہو رہا ہے...... وہ پھسل رہا ہے......'

بیٹا ہر بار اپنی مصروفیت میں آنکھیں جھکائے، ویسے ہی جواب دیتا ــــ

'وہ ایسا کر سکتا ہے......'

ظاہر ہے، ایسے موقع پر بڈھے کو اپنے غصے کو چھپانا، ناممکن ہو جاتا...... اور جیسے ایسے ہر موقع پر غصہ ور بڈھا خود سے دریافت کیا کرتا۔

'آخر اس میں ایسا کیا ہے، جو اس کے پاس نہیں تھا۔'

(۳)

بڈھے کے دیکھتے ہی دیکھتے پوتے میں جوانی کے پر نکل آئے۔ تیزی سے بدلتی فاسٹ فوڈ (Fast food) کی اس دنیا میں اب وہ ایک آزاد مرد جوان کی حیثیت سے تھا اور یہ سب، کہ اس میں کیسے کیسے اور کتنے پر نکلے، یا یہ کہ خالی وقت میں وہ کیا کیا کرتا رہا ہے، ان معاملات کے لئے

بیٹے کے پاس وقت نہیں تھا۔ مگر بڑھے کی گدھ نگاہیں ہر دم اس کے آگے پیچھے گھومتی رہتی تھیں اور حقیقت یہ ہے کہ صرف گھومتی ہی نہیں رہتی تھی بلکہ قدم قدم پر چونکتی اور پریشان بھی ہوتی رہتی تھیں......

مثلاً یہ کہ وہ...... بہت زیادہ دوڑ رہا ہے، اڑ رہا ہے——

مثلاً یہ کہ وہ...... نئے پن کی تلاش میں، خواہ وہ نیا پن کیسا بھی ہو، بلا خوف، بے جھجک 'جنون' میں مبتلا ہو رہا ہے——

مثلاً یہ...... کہ اب اسے دیکھ پانا، ہاں دیکھ پانا روز بروز ایک مشکل امر ہوا جا رہا ہے۔

بڑھا ہمت جٹا کر اپنے مصروف بیٹے کے پاس آتا——

'——اس نے اول جلول کپڑے، پہنے ہیں......'

'اس کے دوست بھی پہنتے ہوں گے'...... بیٹے کی نگاہیں اپنے کام میں مصروف ہوتیں۔

'——اس کے کانوں میں چھلے ہیں......'

'نیا فیشن ہوگا......'

'——وہ راتوں کو دیر سے آتا ہے......'

'کلب اور دوستوں میں دیر ہو جاتی ہوگی'

'——وہ......'

بیٹے کے پاس ہر بات کا جواب موجود تھا۔ لیکن ویر یور ائی ٹیوڈ (Wear your attitude) والا لہجہ بڑھے کو ہضم نہیں ہوتا تھا اور پوتے کے We are like this only یعنی ہم تو ایسے ہی ہیں، جیسے ریمارک پر اس کا ننک چڑھاپن اور بھی بڑھ جاتا تھا——

○○

پوتا جوشیلا تھا، تیز طرار تھا۔ نگاہیں ملا کر بات کرتا تھا۔ وہ ہر لمحہ خود کو نئے Attitude میں ڈھال رہا تھا۔ رنگ برنگے بال، کانوں میں چھلے، پھٹی ہوئی جینس —— کبھی کبھی تیز تیز آواز میں گانے لگتا۔ بڑھے کی ہر بات کا پوتے کے پاس ایک ہی جواب تھا۔

'ہم اپنی مرضی کے مالک ہیں۔'

'——چاہے تم جتنی بھی تیز آواز میں ناچو، گاؤ۔'

'ہاں'

'— کسی کی موجودگی کا خیال بھی نہ کرو۔'

'ہاں......'

'— کسی کے دکھ، پریشانی کا۔'

'ہاں......ہم صرف اپنے بارے میں سوچتے ہیں— اس لئے کہ we are like this only......'

'— ہم اپنے زمانے میں......، بڈھے کا لہجہ کھوکھلا تھا۔

'تم لوگ آخر اتنے دبو کیوں تھے۔ اس لئے کہ تم لوگ ڈر ڈر کر جی رہے تھے......'

یہ ایک بھیانک حقیقت تھی۔ یا یہ ایک ایسا کنفیشن تھا جسے کرتے ہوئے بوڑھے نے ہمیشہ ہی خوف محسوس کیا تھا...... بڈھے کو اپنا زمانہ معلوم تھا۔ بڈھے کی غلطی یہ تھی کہ اس کے بیٹے کو بھی یہی زمانہ وارثت میں ملا— بڈھا اپنے زمانے میں کسی لڑکی سے بات کرتے ہوئے بھی گھبراتا تھا— فرق اتنا تھا کہ بیٹے کی زندگی میں ایک لڑکی آئی تھی......لیکن ایک خاموش رومانی کہانی، شروع ہونے سے پہلے ہی بھیانک طوفان میں بکھر گئی...... بڈھے کو سب کچھ یاد تھا......وہ پاگلوں کی طرح اپنی خاندانی عزت کو بچانے کے لئے ساری ساری رات کمرے میں ٹہلتا رہا تھا......ایسا تو اس کی سات پشتوں میں سے کسی نے نہیں کیا...... صبح کا دھندلکا ہونے سے پہلے ہی بیٹے کو نیند سے جگا کر اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا......

'ایسا کرنا میرے لئے ممکن نہیں— تم چاہو تو بغاوت کر سکتے ہو؟'

بیٹے کا چہرہ ایک لمحے کو کانپا۔ پھر جھک گیا۔

بڈھے کو یقین سا ہے، کہ اس موقع پر بغاوت کے خاتمے کے اعلان پر اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکان ضرور نمودار ہوئی تھی۔ پھر بیٹے نے وہی کچھ کیا جو کچھ اس بڈھے نے چاہا...... یا جیسا کہ اس کے پہلے والی نسل کے لوگ کرتے آئے تھے......

(۴)

لیکن پوتا، اپنی اس دنیا سے کتنا خوش تھا، یہ وہی بتا سکتا تھا۔ وہ ایک ایسے کامیاب آدمی

کا بیٹا تھا جن کے پاس بیکار کی باتوں کے لئے وقت نہیں رہتا۔ پوتے کے پاس اپنی ایک اسپورٹس کار تھی جس میں وہ اپنی دوست لڑکیوں کے ساتھ سیر سپاٹا کرسکتا تھا۔ ایک پلاسٹک کارڈ یا کریڈٹ کارڈ تھا۔ ایک موبائل، جس میں زیادہ تر اس کی دوست لڑکیوں کے فون آیا کرتے تھے۔ وہ الٹی بیس بال ٹوپی پہنتا تھا۔ ڈھیلی ڈھالی باکسر شرٹس اس کی پہلی پسند تھی۔ وہ فاسٹ فوڈ کا شیدائی تھا اور ریڈی میڈ رومانس میں ہی اس کی دلچسپی تھی۔ یعنی کچھ دن ہنسے، بولے پھر کپڑے بدل دیئے۔ جس دن پوتے نے پہلی بار اپنے ننگے بدن پر ''گودنے'' گدوائے تھے، اس دن بڈھا بری طرح اچھلا تھا۔

'۔۔۔۔ یہ سب کیا ہے؟'

'آپ دیکھتے نہیں، یہ سانپ ہے...... یہ مچھلی ہے...... یہ سیڑھیاں ہیں......'

''۔۔۔۔ لیکن یہ سب کیوں ہے؟'

'کیوں کہ ہمیں یہی اچھا لگتا ہے۔'

'۔۔۔۔ لیکن اس کے بعد......'

'سوچا نہیں ہے۔'

OO

بڈھا ایک بار پھر اپنے مصروف بیٹے کے پاس تھا......

'۔۔۔۔ اسے روکو......'

بیٹا خاموش رہا......

'۔۔۔۔ اسے سمجھنے کی کوشش کرو'

'بیٹے نے اس بار بھی اپنی نظریں جھکائے رکھیں......'

بڈھے کے چہرے پر تناؤ تھا......

'میں تمہارا باپ ہوں۔ تم سے ایک نسل بڑا...... پھر مت کہنا کہ مجھے خبر نہ ہوئی...... اس نے آزادی چاہی۔ اسے آزادی ملی...... وہ آزادی جو مجھے اور تمہیں نہیں ملی تھی۔ تم اسے روکتے، وہ تب بھی نہیں رکتا، تم اسے بندشوں میں جکڑنے کی کوشش کرتے، تو وہ یہ زنجیریں توڑ دیتا۔ کیونکہ وہ بہر صورت تمہاری طرح بزدل نہیں ہے۔ ایک معمولی محبت کے لئے بھی بغاوت نہیں کرنے

والا...... سن رہے ہو، نا۔'

بات ویسے ہی سر جھکائے فائلوں میں مصروف رہا......

بڈھے نے کہنا جاری رکھا۔' اس نے سب سے پہلے اپنی حدیں توڑیں۔ سمجھ رہے ہو ناہ حدیں...... وہ گھر سے باہر رہا۔ ساوی ساری راتیں باہر...... شراب، جوئے اور لڑکیوں میں...... لیکن یہ سب وہ باتیں تھیں جو بہت آؤٹ ڈیٹیڈ تھیں...... یعنی جن کے بارے میں زیادہ باتیں کرنا تمہارے جیسے لوگوں کے لئے تضیع اوقات ہے۔ اس نے اپنی اڑان جاری رکھی...... بال منڈوائے، گودنے گدوائے، الٹی ٹوپی پہنی اور زمانے بھر سے الٹا ہوگیا...... تم سمجھ رہے ہو میں کیا کہہ رہا ہوں......'

بیٹا ویسے ہی مصروف رہا، جیسے بڈھے کی باتیں اس کے سمجھ میں نہیں آرہی ہو ——

''میں نے سمجھا ہے انہیں۔ تم سے زیادہ۔ اس لئے کہ پل پل میں تم سے زیادہ ان کے قریب رہا ہوں۔ سنو...... غور سے سنو...... یہ بہت تیز طرار ہیں۔ غضب کے اڑان والے —— انہیں زندگی اور وقت پر بھروسہ نہیں ہے۔ یہ سب کچھ وقت سے پہلے کر لینا چاہتے ہیں —— ہم اور تم تھوڑا تھوڑا کر کے سفر آگے بڑھاتے تھے۔ اس لئے عمر کا ایک بڑا حصہ ڈھل جانے کے بعد بھی ہمارے پاس بہت وقت رہ جاتا تھا۔ مگر ان کے پاس۔''

بڈھے کا لہجہ ڈراونا تھا......' جب یہ سب کچھ کرلیں گے تو؟ یعنی اس چھوٹی سے عمر میں ہی —— تو باقی عمر کا کیا کریں گے یہ......؟ بڈھا کھانس رہا تھا...... غم اسی بات کا ہے کہ یہ باقی عمر کی پرواہ نہیں کریں گے۔ مت سنو تم...... جہنم میں جاؤ......'

OO

پوتے کے اندر آنے والی یہ وہ تبدیلیاں تھیں، جس کے بعد بڈھے نے خود سے سوال کرنا چھوڑ دیا...... کہ آخر اس میں (پوتے) ایسا کیا ہے جو اس کے پاس نہیں ہے۔ بڈھا کے پاس اپنے پوتے کی ذہنی سطح کے لئے بس ایک ہی جملہ تھا —— یعنی ہیجان کی آخری سطح......!

اس کے بعد......؟

بڈھے کو سوچ سوچ کر خوف آتا تھا...... بڈھے کے اندر پوتے کے لئے اب رقابت نہیں بلکہ ترحم کا جذبہ جاگ اٹھا تھا۔ اسے رہ رہ کر پوتے پر افسوس آتا تھا...... اس دن پوتے کے

ساتھ ایک نئی لڑکی تھی۔ پوتا لڑکی کے ساتھ کمرے میں بند ہو گیا...... بڈھے کی آنکھوں میں ایک پل کو شعلہ سا چمکا...... پھر پتہ نہیں کیا سوچ کر یہ شعلہ بجھ سا گیا۔

لڑکی کے جانے کے بعد وہ پوتے کے پاس آیا۔

'—— کون تھی یہ لڑکی؟'

'نہیں معلوم'

'—— تمہارے ساتھ پڑھتی ہے؟'

'نہیں۔'

'—— دوست ہے؟'

'شاید...... نہیں۔'

'—— کنفیوزڈ ہو تم۔ ورنہ اتنی چھوٹی سی بات کے لئے 'شاید' اور 'نہیں' کا سہارا نہیں لیتے۔

'تم نے کیا سمجھا، کون ہے یہ؟' پوتے نے پلٹ کر پوچھا۔

'—— میں نے سمجھا، شاید تمہاری سپاٹ زندگی میں ایک کرن چمکی ہے۔'

'تم بڈھے ہو گئے ہو۔'

'—— نہیں۔ مجھے تم پر ترس آتا ہے......'

'مجھ پر ترس کھانے کی ضرورت نہیں۔'

'—— ضرورت ہے—— بڈھے کو مزہ مل رہا تھا۔ اس لئے کہ اگر وہ لڑکی وہی ہوتی، جیسا میں نے سوچا تھا...... تو......'

'تو کیا......؟'

'—— اب سوچتا ہوں۔ تمہارے باپ کے زمانے میں، میں کتنا غلط تھا۔ بہت ممکن تھا، وہ محض ایک پیسہ کمانے والی مشین ثابت نہیں ہوتا۔ آدمی، ایک متوازن آدمی ہونا بہت مشکل کام ہے اور یقیناً محبت یہ کر سکتی ہے......'

'محبت۔ شٹ—— 'پوتے کے ہونٹوں میں مضحکہ خیز ہنسی تھی۔

'—— نہیں۔ تم نہیں جانتے کہ ابھی ابھی جو لڑکی تمہارے کمرے سے نکل کر گئی ہے۔ تم اس کے نزدیک کیا تھے۔ سنو، تم لوگوں نے مجھے اتنا ایڈوانس تو بنا ہی دیا ہے کہ میں یہ کہہ سکتا

ہوں، تم اس لڑکی کے لئے صرف ایک اسٹریپر تھے۔ ایک میل اسٹریپر۔'
بڈھا ہنسا..... 'مجھ پر غصہ نہیں ہو۔ اپنے آپ کو سمجھو۔ ورنہ اندر کا یہ اندھیرا تمہیں تباہ کر دے گا.....'

پھر وہ ٹھہرا نہیں۔ تیزی سے باہر نکل گیا۔

اور اس کے ٹھیک دو ایک روز بعد ہی رات کے اندھیرے میں بڈھے نے محسوس کیا، پوتے کے کمرے سے تیز تیز سسکیوں کی آوازیں گونج رہی ہیں......

(۵)

اس واقعہ کے کچھ دنوں بعد ـــــ بڈھا ایک بار پھر اپنے مصروف بیٹے کے سامنے کھڑا تھا۔

'سنو، وہ چپ ہو گیا ہے۔'

بیٹا شانت تھا۔

'ـــــ وہ کچھ بولتا نہیں۔'

بیٹا بے اثر رہا۔

'ـــــ وہ کھویا کھویا رہنے لگا ہے، وہ راتوں کو روتا ہے۔ ساری ساری رات جاگتا رہتا ہے۔

بیٹے نے ذرا سی نگاہ اوپر اٹھائی۔

'آپ ذرا سی بات کو طول دے رہے ہیں۔ اس میں نیا کیا ہے؟'

'ـــــ نیا ہے آہ! تم ابھی بھی نہیں سمجھے ـــــ بڈھا فرط حیرت سے چلاّیا۔ وہ سب کچھ کر گزرا ہے اپنی اس چھوٹی سی عمر میں...... جو ہم تم اتنی عمر گزار کر بھی نہیں سوچ سکتے تھے۔

'یہ نئی نسل ہے۔ جیٹ رفتار...... یہ ایسی ہی ہے......' بیٹے کی آواز بوجھل تھی ـــــ 'نہیں......' بڈھا غصے سے اُچھلا...... اس نسل کے پاس سے فنتاسی ختم ہو گئی ہے اور فنتاسی کو پانے کے لئے یہ نسل کچھ بھی کر سکتی ہے۔

''مثلاً''

'یہ نسل آتنک وادی بن سکتی ہے۔'

'یہ بھی نہ ہو، تو......؟'

'___ سنو، ہیجان کی آخری منزلوں میں، یہ نسل کسی کی جان بھی لے سکتی ہے۔ تمہاری بھی۔'

'اور اگر یہ دونوں ممکن نہیں ہوا تو'

'___ آخری فنتاسی کے طور پر یہ اپنی جان لینا چاہے گی یعنی خودکشی؟'

بڈھا کمرے سے نکل گیا تھا......

بیٹا پہلی بار حیران سا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا___

(۶)

پوتے کے ہاتھوں میں چرمی بیگ تھا۔ جس میں اس نے ضروری کپڑے، سامان وغیرہ رکھ لئے تھے، جو آگے کے سفر میں اس کے کام آسکتے تھے...... اس نے ایک ڈھیلا ڈھالا 'پیڈل پشر' پہن رکھا تھا...... فل جینس کی جگہ ایک آدھی پھٹی ہوئی ہاف جینس تھی۔ آنکھوں میں ایسی انوکھی چمک تھی جسے بڈھا اور بیٹا پہلی بار دیکھ رہے تھے۔

'___ تو تم نے ارادہ کرلیا ہے، بیٹے کا لہجہ اداسی سے پر تھا۔

'ہاں، یہ ہم تمام دوستوں کا ارادہ ہے۔'

'___ تم کتنے لوگ جارہے ہو۔'

'ہم پانچ چھ دوست ہیں۔'

'___ صرف لڑکے۔'

'___ نہیں ایک لڑکی بھی ہے۔'

'___ وہاں برف کے گلیشیر بھی ہوں گے۔' باپ کے لہجہ میں تھرتھراہٹ تھی۔

'ہم گلیشیر کی نچلی سطح پر پانی جمع ہوتا ہے۔ یخ پانی، کبھی کبھی وہاں اچھے بھلے آدمیوں کی بھی قبر بن جاتی ہے۔' بڈھے کا لہجہ پوتے کو سفر کے ارادے سے روکنے کا تھا۔

پوتے کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی ___ 'ہم کبھی گلیشئر کو پگھلتے نہیں دیکھا۔''

'___ تم لوگ سب سے پہلے کہاں جاؤ گے،...... باپ کے لئے یہ جاننا ضروری تھا۔
یہ ایک اسکی رسارٹ (Ski-Resort) ہے۔ ہم برف کی کسی ایک اونچی چٹان پر کھڑے ہو جائیں گے___ وہاں سے رسی کا ایک سرا مضبوطی سے ان چٹانوں میں باندھ دیں گے۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا...... 'پوتا دلچسپی سے اپنے کھیل کے بارے میں بتا رہا تھا۔ آئس ہاکی یا اسکیٹنگ جیسے کھیلوں نے بھی لوگ اکتا چکے ہیں۔ رسی کا دوسرا سرا ہم اپنے جسم میں باندھیں گے اور اونچائی سے برف کی آغوش میں لیں گے۔ ایک لمبی اندھی چھلانگ___ '

بڈھے نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ بیٹے کے بدن میں تھرتھری ہوئی......
'___ لیکن اس میں خطرہ تو ہے۔ اس میں تو بہت سے لوگ مر بھی جاتے ہوں گے۔'
'ہاں ایسا بہت ہوتا ہے۔' پوتے کے ہونٹوں پر ہنسی تھی...... اس نے بہت عام انداز میں اپنا جملہ پورا کیا___ مرنا جینا تو لگا رہی رہتا ہے۔ لیکن ہے یہ ایک دلچسپ کھیل، ایک لاجواب فنتاسی۔'

بڈھے نے بس اتنا پوچھا۔
'___ کب جاؤ گے۔؟'
'کل صبح ہونے سے پہلے ہی ہم لوگ نکل جائیں گے۔'
'___ یعنی ایک دن ہمارے پاس ہے۔ بڈھا دھیرے سے بڑبڑایا___ ایک دن۔ بس ایک دن۔ پھر۔ ایک اندھی چھلانگ۔ موت کی چھلانگ...... پوتا اگر واپس نہیں لوٹتا ہے تو......'
بڈھے نے اپنے آپ سے پوچھا۔
'اس کے (بڈھے) کے پاس ایسا کیا ہے جو پوتے کے پاس نہیں تھا......'

(۷)

رات ہوئی۔ بڈھا چپ چاپ چلتا ہوا پوتے کے کمرے میں آیا۔
'___ چلو، کالونی کی چھت پر چلتے ہیں۔'
'کیوں؟'
'وہیں سوئیں گے، بات کریں گے۔'

'لیکن بات یہاں بھی تو ہو سکتی ہے۔'

'—— نہیں وہاں چھت ہوگی، کھلی کھلی چھت —— سر پر آسمان ہوگا۔ کھلا آسمان، تم نے برسوں سے آسمان دیکھا ہے؟'

'نہیں......'

'—— میں نے بھی نہیں دیکھا...... یہ سب شہر کی ہجرت کے راستے کھو گئے۔ نیلا آسمان۔ ستاروں کی چادر، چمکتا ہوا دودھیا چاند، بہتی ہوئی تیز ہوا اور......

'فولڈنگ لے چلوں؟'

'نہیں چادر بچھالیں گے۔'

OO

بڈھے نے چادر بچھالی...... بڈھا اور پوتا کالونی کی چھت سے کچھ دیر تک شہر کا نظارہ کرتے رہے۔ یہاں سے شہر کیسا نظر آتا ہے۔ دور تک چمکتی ہوئی روشنیوں کی قطار...... کالونی کے بند فلیٹ میں یہ چمک ایک دم سے دفن کیوں ہو جاتی ہے!

'پوتے نے ٹوکا —— یہاں کیوں لائے؟'

'—— تمہیں کیا لگا؟'

'مجھے لگا، اپدیش دو گے۔ روکو گے۔ زندگی، موت اور گھر کا واسطہ دو گے ——'

'ایسا کرنے سے کیا تم رک جاتے؟'

'نہیں۔'

'اس لئے بس تم سے باتیں کرنے کے لئے ہی ہم چھت پر آئے ہیں۔ کیونکہ یہ باتیں ہم کمرے کے اندر نہیں کر سکتے تھے۔'

پوتے کو الجھن تھی۔ کون سی باتیں؟'

'کل تو تم چلے ہی جاؤ گے...... اور ایک وہ تمہارا مصروف باپ ہے —— کسی سے کچھ بھی بات کرنے کے لئے مجھے بس آج کی ہی رات ملی ہے...... تم چلے گئے تو پھر باتیں کرنے کے لئے میرے پاس کون ہوگا......؟

پوتا لیٹ گیا......

بڈھے کو کچھ یاد آرہا تھا۔ چھت پر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی...... بڈھا کسی خیال میں گم تھا...... اس نے آہستہ آہستہ کچھ یاد کرنا شروع کیا......

'...... جب ہم چھوٹے تھے تب دنیا اس قدر نہیں پھیلی تھی۔ تب ہمارے پاس وقت ہی وقت تھا۔ دیکھنے، محسوس کرنے اور گزارنے کے لئے وقت ہی وقت...... اور سچ تو یہ ہے کہ ہم میں سے بہتوں کو وقت کا استعمال کرنے بھی نہیں آتا تھا کہ اتنا ڈھیر سارا وقت...... آگے دور تک پھیلی عمر کی سیڑھیاں...... اتنا بڑا خاندان...... اتنے سارے رشتے دار...... آتے جاتے لوگ...... نصیحتیں، ڈانٹ پھٹکار...... اور بس بات ہی بات...... نہ بات ختم ہوتی تھی نہ مکالمے کم پڑتے تھے...... تب دن بھی لمبے تھے...... راتیں بھی...... مہینے اور سال تو بہت لمبے ہوتے تھے...... یہاں تک کہ ہر روز گننے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتے تھے......''

پوتے نے پہلو بدلا......

'...... ایک ابا تھے...... ذرا ذرا سی بات پر ڈانٹ دیتے تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر غصہ ہو کر پیٹ دیتے تھے۔ میں روتا ہوا اماں کے پاس آنچل میں سمٹ جاتا تھا۔ کچھ دیر بعد ابا مجھے نہ پا کر مجھے ڈھونڈھتے ہوئے اماں کے پاس پہنچ جاتے...... کہیں دیکھا ہے اپنے منے کو...... اماں کی یہی غلطی تھی۔ اماں کے اندر کوئی بات نہیں پچتی تھی...... اماں ہنس دیتی تھیں۔ ابا مجھے سینے سے لپٹا لپٹا کر پیار کرتے۔ مارنے کے عوض مجھے ٹافیاں انعام میں ملتیں۔''

پوتے نے اس بار دادا پر اپنی نگاہیں پیوست کر دیں____

'____ ایک دن میں کھیل رہا تھا...... گاؤں، قصبے اور چھوٹے شہروں میں ان دنوں کھیل ہی کیا تھے...... گلی ڈنڈا...... گلی زور کا جھٹکا کھاتی میری آنکھوں کے پاس لگی تھی۔ ڈھیر سا خون نکلا تھا...... مجھے یاد ہے۔ اس رات____ ساری رات، سارا گھر مجھے گھیر کر بیٹھا تھا۔ ابا کو اتنا گھبرائے ہوئے میں نے پہلی بار دیکھا تھا......'

○○

'چپ کیوں ہو گئے؟' یہ پوتے کی آواز تھی۔

'یاد کر رہا ہوں'____ بڈھے کا لہجہ بھاری تھا۔

'اس وقت کے لوگ کتنے جذباتی تھے۔ جذباتی____ پوتے کے لہجے میں آہ تھی۔

'بہت کچھ یاد آرہا ہے اور سناتے ہوئے اچھا بھی لگ رہا ہے......آج تمہیں سب کچھ سناؤں گا......مگر تمہیں نیند آ گئی تو......؟'

'نہیں تم سناؤ۔ نیند نہیں آئے گی......'

'— اچھا سنو، کیسی کیسی شرارتیں یاد آرہی ہیں۔ پرانا گھر۔ دنیا بھر کے لوگ۔ معصوم شرارتیں...... پٹنے کے واقعات...... اسکول کے قصے......اچھا، پہلے تم بتاؤ......'

بڈھے نے گھور کر پوتے کو دیکھا۔

'یہ سب قصے جو میں نے تم کو بتائے، کس دور کے ہیں۔'

'مطلب؟' پوتا چونک کر بولا......

'میں نے پوچھا ہے۔ یہ سب قصے میرے کس زمانے کے ہیں۔'

'میں نے سمجھا نہیں—'

'میرا مطلب ہے، یہ قصے کب کے ہو سکتے ہیں؟'

پوتے نے جلدی سے کہا...... 'بچپن کے۔'

دوسرے ہی لمحے اس کے ہونٹوں پر ایک افسردہ سی مسکان تھی...... 'میں نے بچپن نہیں دیکھا۔'

بڈھے نے چونک کر پوتے کو دیکھا، جو مسلسل ایک ٹک آسمان کو گھورے جارہا تھا۔

(۸)

دوسرے دن پوتا چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد بڈھا خاموشی سے چلتا ہوا، بیٹے کے پاس آکر ٹھہر گیا۔ بیٹے کا سر ابھی بھی جھکا ہوا تھا۔

'— وہ چلا گیا۔' بڈھے کی آواز بھاری تھی......تم اسے روک سکتے تھے۔'

'کیا وہ رک جاتا؟'

بڈھا اچانک چونک پڑا، اسے ایک لمحے کو بیٹے پر ترس آیا—

'— وہ رک جاتا، کیا تمہارے ذہن میں پہلے کبھی یہ خیال آیا تھا؟'

'کہہ نہیں سکتا۔ لیکن کیا ساری غلطی......؟' بیٹا کہتے کہتے ٹھہر گیا۔ اس نے عجیب نظر سے بڑھے کو دیکھا۔

بڑھے کے چہرے پر ایک خوشگوار حیرت تھی۔

'—— نہیں غلطی کسی کی نہیں ہے۔ شاید وہ تمہارے کہنے سے بھی نہیں رکتا۔ اس لئے کہ بہت دیر ہو چکی تھی۔'

'دیر ہو چکی تھی......؟ بیٹا کسی لمبے 'محاسبے' کے پل سے ایک لمحے کو گزر گیا——

'ہاں، کیونکہ تم دیکھنے میں تو خاموش لگ رہے تھے۔ لیکن تم ہر بار ہمارے، پوتے کے اور اپنے تجزیے میں مصروف تھے—— اور یہی تم غلطی کر رہے تھے...... جبکہ ہم آسان سی زندگی گزار رہے تھے۔'

بیٹا نے اور زیادہ سر جھکالیا——

ذرا توقف کے بعد وہ بولا۔ 'کیا وہ واپس آئے گا——؟'

'—— پتہ نہیں۔'

بڑھے کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ وہ چپکے سے کمرے سے نکل گیا—— لیکن اس کا دماغ ابھی بھی پوتے میں الجھا ہوا تھا۔ جیسے ابھی، اس وقت وہ کیا کر رہا ہوگا۔

(۹)

وہ پانچ چھ نوجوان تھے۔ سرتاپا گرم کپڑوں سے ڈھکے ہوئے۔ پاؤں میں ان فیلشن، کے نئے اور ایسے ماڈرن جوتے تھے جو آج کل کے بچے ایسی تفریح گاہوں کے لئے استعمال کرتے تھے۔ برف پر چلنے یا برفیلی چٹانوں پر چڑھنے میں اس سے آسانی ہوتی تھی—— ان میں پوتا بھی تھا—— ان کے چہروں سے ان کا جوش اور ارادہ ٹپکتا تھا۔ آگے کی منزل کچھ بھی ہو سکتی تھی۔ بہت ممکن ہے، موت کی منزل۔ مگر یہ خوف زدہ نہیں تھے۔ ان میں سے کوئی بھی موت کی بات نہیں کر رہا تھا۔ اس کے برخلاف ان کا چہرہ کسی ایسے شگفتہ پھول کی مانند ہو رہا تھا جو موسم سرمایا بہار کی آمد یا دھوپ کی پہلی کرن سے اچانک کھل اٹھا ہو——

پوتے کے چہرے پر جنگلی پودوں جیسی شادابی تھی...... 'وہ لمحہ کب آئے گا——؟'

قافلے میں موجود وہ واحد لڑکی تھی۔ لڑکی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی...... 'وہ لمحہ آچکا

ہے۔ وہ دیکھو'

OO

برف کی اونچی چوٹیوں سے انہوں نے نیچے کی طرف جھانکا۔ ہزاروں فٹ نیچے کی گہرائی میں برفانی ندی، موجوں کے الہڑ رقص میں محو حیراں تھی۔ دور تک برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں اب پُر اسرار معلوم نہیں ہو رہی تھیں۔ نوجوانوں نے گننا شروع کیا—— جہاں وہ کھڑے تھے، اس کے اطراف پہاڑوں کی اٹھارہ بیس چوٹیاں ہوں گی۔ پوتا اور ساتھی ان سرکاری اشتہاروں کو بھی نظر انداز کرتے ہوئے آئے تھے جو ان کے قدموں کو آگے کے خطرات سے روکنے کے لئے، لگائے گئے تھے۔

انہوں نے اپنے اپنے چرمی بیگ اتارے، کپڑوں کا بھاری بھرکم وزن کم کیا۔ برفیلی چٹانوں سے گزرتی۔ یخ ہوائیں سنسناتی ہوئی بدن سے ہو کر گزر رہی تھیں۔ انہوں نے جوتے اتارے—— چرمی بیگ سے ہزاروں فٹ گہرائی تک لے جانے والی رسیاں کھولی گئیں۔ ان کے چہرے ایسے چمک رہے تھے جیسے برفانی پہاڑیاں دھوپ کی کرن سے جگمگا اٹھتی ہیں۔

'ہم یہاں پہلے کیوں نہیں آئے؟'

گھانسوں پر اُگے ہوئے خودرو پھول ہنس رہے تھے۔ کائی دار پہاڑیوں کے کنارے سرخ اسٹابیری کی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں...... پہاڑ کے اس پار سے برفیلی ہوائیں پگھلے گلیشیرس اور پتھروں سے گزر کر نیچے بہتی ہوئی ندی میں پہنچ رہی تھیں۔ برف گلیشیر میں پتلی پتلی دھاروں میں تبدیل ہو رہے تھے......

'اب بہت دیر ہو رہی ہے۔ مجھے رہا نہیں جاتا......' پوتے کے چہرے پر ایک سفاک مسکراہٹ تھی۔

'—— نیچے پہلے کون جائے گا——؟'

'پہلے میں۔'

لڑکی نے بے دھڑک رسّی کا ایک سرا اپنے کمرے سے بندھی ہوئی آئرن بیلٹ سے جوڑ لیا تھا۔

'—— نہیں تم نہیں۔' دوسرے ساتھی نے لڑکی کا ہاتھ تھام لیا۔

'کیوں؟ لڑکی کے چہرے پر خفگی تھی۔

'کیوں کہ اس ایڈونچر پر سب سے پہلا اختیار میرا ہے۔'

رسّی کا سرا اب پوتے کے ہاتھ میں تھا...... ''کیوں کہ یہ آئیڈیا بھی میرا تھا۔ تم لوگوں کو یہ آئیڈیا سب سے پہلے میں نے ہی بتایا تھا۔'

ایک برفیلی لہر بدن کو چیرتی گزر گئی۔ ہزاروں فٹ نیچے کھائی ہیں، پگھلتے ہوئے، گلیشیر ندی کے پانی میں گھل رہے تھے۔

○○

لڑکی کا چہرہ بجھ گیا تھا۔ اپنی اپنی باری کے انتظار میں سب امید بھری نظروں سے پوتے کو دیکھ رہے تھے، جس نے رسی کا ایک سرا پہاڑی کے ایسٹ پول میں پھنسا کر، دوسرا سرا اپنے آئرن بیلٹ سے جوڑ لیا تھا۔ اب وہ چمکتی نگاہوں سے، چمکتی برفیلی چٹانوں اور اپنے دوستوں کا چہرہ پڑھ رہا تھا۔

'اچھا مان لو، تم واپس نہیں آئے تو؟' ایک ساتھی نے مسکرا کر دریافت کیا۔

'—— کیا واپس آنا ضروری ہے؟' پوتے کے لہجے میں ہنسی تھی۔

'نہیں' دوست شرمندہ تھا۔

'—— پھر ہم کہاں ملیں گے؟'

'کیا پھر ملنا ضروری ہے——؟ پوتا اس بار زور سے ہنسا۔

'نہیں'

'—— لیکن! اس کے باوجود، ہم ملیں گے۔ اگر واپس نہیں آئے تو؟'

'کہاں؟'

پوتے نے اشارہ کیا...... ''وہاں—— گلیشیرس میں—— ٹھنڈی موجوں میں—— بہتے پانی میں......اور چمکیلی برف میں......''

پوتے نے اس بار ہنسنے سے پہلے ہی چھلانگ لگا دی۔

نیچے ہزاروں فٹ کھائی میں، گلیشیر ابھی بھی پگھل پگھل کر ندی میں گھل رہا تھا۔

○○

انکیوبیٹر

(اپنی بٹیا صحیفہ کے لئے ___ جو دو برس کے سفر میں
اتنا کچھ دے گئی، جو پوری زندگی پر بھاری ہے)

نرسری

سیمون دبووار (Simone De Beauvoir) نے کہا تھا۔

'عورت پیدا نہیں ہوتی، بنائی جاتی ہے۔'

لیکن، نیل پیدا کہاں ہوئی تھی۔ نیل تو بن رہی تھی۔ نیل تو ہر بار بننے کے عمل میں تھی۔ شاید اسی لئے، پیدا ہوتے ہی وہ ایک اسپتال سے دوسرے اسپتال بھیج دی گئی تھی۔ اُسے میں نے نہیں دیکھا تھا۔ ماں نے نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ کہنا چاہئے ڈاکٹروں کو چھوڑ کر، جو آپریشن کے وقت یقیناً پاس پاس لیبر روم میں موجود ہوں گے، یا جیسے ڈاکٹروں نے بھی ہنستے ہوئے کہا ہوگا......
''وشواس کیجئے ___ ہم نے بھی نہیں دیکھا۔ لیکن وہ ہے۔ اور سانس چل رہی ہے۔'

اور......ڈاکٹروں کے مطابق نیل پیدا ہو چکی تھی اور سانس بھی چل رہی تھی......اور اب صرف اس کے بچائے جانے یعنی زندہ رکھنے کی کارروائی باقی تھی۔ جس اسپتال میں نیل پیدا ہوئی، وہاں نرسری کا کوئی اچھا انتظام نہیں تھا۔ اس لئے ڈاکٹروں نے ایک چھوٹی سی ایمرجنسی میٹنگ کے بعد نیل کو ایک دوسرے اسپتال شفٹ کر دیا تھا۔

نیل اسپتال سے گھر نہیں آئی۔ نیل ایک اسپتال سے دوسرے اسپتال چلی گئی......جس

ایمبولنس میں اسے دوسرے اسپتال شفٹ کیا گیا، اس میں نیل کے ساتھ رشتے کے ایک بھائی کو بٹھایا گیا۔ واپسی میں اس بھائی سے پوچھا گیا......

تم نے اسے دیکھا؟

نہیں......

کیوں؟ تم تو ایمبولنس میں اس کے پاس ہی بیٹھے ہو گے نا؟

ہاں بیٹھا تو پاس ہی تھا، مگر!......

مگر کیا؟......

وہ نہیں تھی۔ میرا مطلب ہے......

بھائی سر کھجا رہا تھا۔ آنکھیں چرانے کی کوشش کر رہا تھا......

○○

مدر نرسری میں سب کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اسپتال کی پانچویں منزل پر یہ نرسری آباد تھی۔ نومولود، ابھی ابھی پیدا ہوئے بچے کی آرام گاہ...... یہ پورا ہال ہی ائیر کنڈیشنڈ تھا...... اندر شیشے کی بنی ہوئی ایک چھوٹی سی دنیا...... شیشے کے اس عجیب وغریب ڈزنی لینڈ میں چھوٹے چھوٹے لاتعداد انکیوبیٹر پڑے تھے...... چھوٹے چھوٹے شیشے کے گھروندے...... ان گھروندوں میں ایسے نومولود بچوں کے لئے ایک نقلی دنیا آباد تھی۔ یعنی جیسی دنیا وہ آنکھیں جھپکاتے ماں کی کوکھ میں دیکھتے یا محسوس کرتے ہوں گے۔ شیشہ کی اس چھوٹی سی دنیا کے اندر کا ٹمپریچر بھی وہی تھا جو ماں کی کوکھ میں بچہ محسوس کرتا تھا...... انکیوبیٹر میں آکسیجن کی ٹیوب بھی لگی تھی۔ مگر دور سے، شیشے کے بڑے دروازے سے جھانکنے پر، یہ ڈھیر سارے چھوٹے چھوٹے گھروندے ہی لگتے تھے......

'نیل کہاں ہے؟'

مدر نرسری دکھانے والا، ڈاکٹر جوش میں ہاتھ کے اشارے سے کچھ دکھانے کی کوشش کر رہا تھا......

'وہ......وہ رہی نا......'

......وہ......موٹا سا بچہ......

'نہیں اس کے پاس والا......'

......اچھا۔ وہ، جو بے بی الٹی پڑی ہے......

'نہیں، اس کے دائیں طرف دیکھئے۔'

......وہ۔ مگر وہ انکیو بیٹر تو......

'خالی ہے'......ڈاکٹر مسکرا رہا تھا۔ وہ بن رہی ہے۔ وہ ہے اور آپ کو فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'

OO

واپس اسپتال آ کر میں نے اس کی ماں کو یہ مژدہ سنا دیا۔ ماں کو اب ہوش آ چکا تھا۔ بیٹی ہونے کی اطلاع ڈاکٹر اسے دے چکے تھے۔ یہ بھی بتایا جا چکا تھا، کہ وہ مدر نرسری بھیج دی گئی ہے۔ مجھے دیکھ کر ماں کی آنکھوں میں تجسس کے دیئے ٹمٹا اُٹھے۔

......تم نے دیکھا۔

ہاں

......کیسی ہے، وہ......؟

وہ......ہے......یعنی کہ......

کس پر گئی ہے......

......گئی نہیں ہے۔ بن رہی ہے۔ گھبراؤ نہیں، جب تک تمہیں مکمل طور پر گھر جانے کی اجازت مل جائے گی، وہ بن چکی ہوگی......

''مطلب۔؟''

......فکر مت کرو۔ وہ بن رہی ہے اور دیکھتے دیکھتے۔ ہاں تمہیں پتہ بھی نہیں چلے گا، وہ تمہارے سامنے آ کر کھڑی ہو جائے گی۔ وہ خوب زور سے چیخے گی اور تم چہرے کو انتہائی سنجیدہ بنا کر کہو گی......نیل۔ بی ہیو یور سیلف۔

لیکن، ماں شاید اب کچھ بھی سن نہیں رہی تھی۔

ماں ایک لمبی خاموشی میں ڈوب گئی تھی۔

ترپتی مینن کے دو رنگ (ادب اور آرٹ)

ترپتی مینن...... ایک ایسی خاتون جن کے بارے میں، میں بار بار الگ نظریے گڑھتا تھا اور نظریے کچی مٹی کے گھڑے کی طرح ٹوٹ جاتے تھے...... نہیں، مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ ہماری پہلی ملاقات کہاں ہوئی تھی۔ یا ترپتی مینن میں یاد رکھی جانے والی کون سی ادا یا بات تھی کہ میں نے پہلے پہل اپنی نوٹ بک میں...... پھر آہستہ آہستہ اس کی 'اول جلول' اداؤں کو دل کی گرہ میں باندھ لیا......

'چلو خالی وقت کا ایک سامان تو ہوا'......

پہلی بار میں ہم بہت کم بولے تھے...... مجھے یاد ہے، اس وقت بھی ہمارے مکالمہ کا عنوان عورت تھی۔ وہ ایک ہندی میگزین میں اپنی کہانی چھپوانے آئی تھی۔ میگزین کے ایڈیٹر میرے بزرگ دوست تھے...... آنکھوں پر کالا چشمہ۔ بڑھی ہوئی داڑھی...... نام تھا، رادھیکا رمن۔ رادھیکا جی درویش صفت منش ہیں۔ مگر کچھ ایسی عورتیں بھی ہوتی ہیں۔ بقول رادھیکا جی، کہ 'چٹکی' لینے کی خواہش زور پکڑنے لگتی ہے...... چائے آگئی تھی۔ ترپتی مینن آہستہ آہستہ چائے کی سپ لے رہی تھی۔ دھیان کہیں اور تھا۔ آنچل ذرا سا ہٹ گیا تھا۔ سانولی باہیں...... نیم عریاں، آدھی سوئی ہوئی بہار کے قصے سنا رہی تھی۔ چہرے پر ایک تیکھی مگر بچوں جیسی مسکراہٹ تھی۔ ترپتی بار بار رادھیکا جی کے مذاق کی عادت پر پسری جا رہی تھی۔

عورت میں ہر بار ایک نئی عورت آجاتی ہے...... یہ رادھیکا جی تھے۔

عورت میں ہر بار ایک عورت گم ہو جاتی ہے...... یہ میں تھا۔

عورت...... آپ لوگ اسے عورت کیوں نہیں رہنے دیتے...... یہ ترپتی تھی۔

○○

میں نے پہلی بار اداؤں میں ڈوبے اُس کے جسم کا جائزہ لیا۔ اس جسم میں کتنی بہاریں قید ہوں گی۔ چالیس...... چالیس بہاریں۔ مگر ترپتی جانتی تھی، خزاں سے پہلے اس بہار کی کیسے حفاظت کرنی ہے۔ مگر ہر بار نوخیز اداؤں کی گرفت میں اس کا پورا وجود ایک 'جوکر' میں تبدیل ہوا جا رہا تھا۔

تم اپنی عمر کو نہیں بھولی ہو...... رادھیکا جی نے پھر چٹکی لی۔

''عمر کو......''

میں آہستہ آہستہ مسکرا رہا تھا......

'میں سمجھی نہیں......' ترپتی کے سانولے چہرے پر بجلی دوڑ گئی تھی۔

''سب سمجھتی ہو تم۔ گھر سے چلتے ہوئے عمر کو کسی لاک اَپ میں بند کر کے آتی ہو......
پھر واپس آ کر جب عمر کو لاک اَپ سے نکالنے کی کوشش کرتی ہو تو......'' رادھیکا رمن مسکرائے......
یہ صرف تمہارا مسئلہ نہیں ہے ترپتی۔ تمہاری جیسی تمام عورتوں کا مسئلہ ہے۔

'نہیں۔ سر، میرا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'

'اور مینن؟'

'ہم نے لو میرج کی ہے......'

'لو (Love) تم نے کیا تھا یا مینن نے کیا تھا......''، رادھیکا رمن زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے بولے......

نیم عریاں شانے پر اس نے آنچل پھر سے بار بار کر دیا تھا......''اب......اب میں چلوں گی سر۔ کہانی دیکھ لیجئے گا'

چہرے پر ناراضگی تھی۔

'ارے بیٹھو......'

'نہیں سر۔ آج آپ کچھ زیادہ ہی مذاق کر رہے ہیں۔'

'اس نے کرسی خالی کر دی۔ گولڈن کلر کا بیگ شانہ سے لٹکایا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دروازے سے اوجھل ہو گئی......

'ترپتی ناراض ہو گئیں......' میرے لئے یہ پہلا اتفاق تھا۔

رادھیکا رمن ہنس رہے تھے......''پاگل مت بنو۔ ترپتی کو تم نہیں سمجھو گے..ہو ہو..وہ یہی کرتی ہے۔ عادت ہے اس کی..ہو ہو..دراصل وہ چاہتی بھی یہی ہے۔''

'کیا'

'جو میں نے کیا......' وہ مسکرا رہے تھے۔

'مطلب؟'

'ارے۔ اس میں حیرانی کی بات کیا ہے۔ اپنشدوں میں کہا گیا ہے۔ ناری کو نہ سمجھو تو

بہتر ہے...... ناری سمجھنے کی وستو نہیں ہے۔ رہسیہ ہے۔ گھور رہسیہ...... ترپتی اسی رہسیہ کا حصہ ہے...... ایسا نہیں کرو تو وہ ناراض ہو جاتی ہے۔ ناراضگی پر کیوں جاتے ہو۔ اس میں پراکرتک سوندریہ، کیوں نہیں، دیکھتے۔...... اس آیو میں بھی...... تم نے دیکھا...... سانولے جسم میں سارے سمندر کی 'سنہلی'، مچھلیاں ایک ساتھ کہاں جمع ہوتی ہیں...... ان ساری 'سنہلی' مچھلیوں کو جوڑ کر ترپتی ایک بہت لمبی 'سنہلی' مچھلی بن گئی ہے۔''

وہ ہنس رہے تھے...... اس مچھلی کے پیچھے دوڑو گے...... بولو......؟'

○○

لیکن مجھے زیادہ دور تک دوڑنے کی ضرورت نہیں پڑی......

یہ ترپتی سے میری دوسری ملاقات تھی۔

وہ کارلٹن آرٹ گیلری میں کھڑی تھی...... ایک لمحے کو میں نے اس سے چھپنے کی کوشش کی۔_____ وہ کسی کو اپنے بارے میں بتا رہی تھی۔

'انسٹی ٹیوٹ آف آرٹ اینڈ کرافٹس سے کمرشیل ڈیزائن کا کورس کیا ہے۔ آرٹ میرا شوق نہیں ہے۔ زندگی ہے۔ سانسیں ہیں۔ آئل ان کینوس کے علاوہ آئل آن پلائی وڈ، واٹر کلر پیسٹل، پین اینڈ انک، پلاسٹر آف پیرس، سیمنٹ آن گلاس وغیرہ میڈیمز میں کام کر چکی ہوں'۔

درمیان میں اس کی کھنکدار ہنسی گونجی_____

'پچھلی بار فیسٹیول آف ویمن سیریز میں، میں نے بھی اپنی کچھ تصویروں کی نمائش لگائی تھی'۔

میں ایک دم سے چونک گیا تھا......

موٹے بھدے جسم والی خاتون نے حیرت سے دریافت کیا...... 'آپ...... یعنی آپ بھی'۔

'کیوں' ترپتی مسکرائی ہے...... '' آئل ان کینوس۔ کبھی کبھی کینوس پر صرف آئل بچتا ہے اور عورت آئل کی طرح پوچھ ڈالی جاتی ہے...... نہیں؟ ایک کورا کینوس...... میں نے عورت کے 'رحم' کو دکھانے کی کوشش کی تھی۔

'رحم'......؟'

رحمِ مادر یعنی 'Womb'...... جہاں نو مہینہ تک بچے کے روپ میں ایک مرد سڑتا ہے۔ پتہ ہے۔ میرے شوہر تک جب اس نمائش کی بات پہنچی تو وہ پانچ مہینے تک مجھ سے غصہ رہے تھے۔ بات چیت کمپلیٹلی بند۔ میں نے بھی کوشش نہیں کی...... عورت کا ننگا بدن۔ آپ دکھانا ہی چاہتے ہیں تو وہ جگہ کیوں نہیں دکھاتے جہاں سے سرشٹی، یعنی ایک عورت Creator بنتی ہے۔ رچیتا۔ مرد کو جننے والی۔ خالق۔ اب یہاں دیکھئے نا......

وہ آرٹ کے عریاں فن پاروں کو دکھا رہی تھی۔

'دکھانا ہے تو عورت کو پورا پورا ننگا کرنے سے کیا حاصل۔ بس وہ جگہ دکھا دو، جو مرد دیکھنا چاہتا ہے۔'

'مائی گاڈ۔ ترپتی۔ تم میں کتنا دکھ بھرا ہے۔ Leave it یار۔ پینٹنگس دیکھتے ہیں۔'

ترپتی اچانک مڑی تھی...... مڑی اور چونک گئی۔ میری طرف دیکھا۔ مسکرائی۔ ہاتھ نہیں بڑھایا۔

'آپ'؟

'مجھے نہیں ہونا چاہئے تھا......!'

'نہیں۔ ہونا کیوں نہیں چاہئے تھا' وہ جھینپ رہی تھی...... کب آئے؟

شاید وہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ آپ دیر سے تو نہیں ہیں۔ ہماری بات تو نہیں سن رہے تھے۔ میں نے جھوٹ بولنے ہی میں عافیت سمجھی......

'بس۔ ابھی آیا'

'اوہ' ترپتی کو تسلی ملی تھی...... موٹے جسم والی عورت سے پیچھا چھڑاتے ہوئے اب وہ میرے ساتھ پینٹنگس پر اپنی تنقیدی نظر ڈال رہی تھی۔

'اچھی ہیں نا......'

'ہاں'

'دراصل'، وہ کہتے کہتے ٹھہری...... 'مجھے موڈس والی پینٹنگس کچھ زیادہ ہی پسند ہیں۔ ایچنگ ورک، فیگر یٹو ورک اور ریئلسٹک اپروچ مجھے پسند ہیں۔ ان تصویروں میں امپریشن ازم کے پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

’کیوں‘...... میں تعجب سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ ایک سانس میں اپنی معلومات کی توپ چھوڑتی چلی گئی۔ وہ کمپوزیشن اچھا ہے۔ فلاں غلط۔ وہاں کینواس کی سطح کم گاڑھی ہونی چاہئے تھی۔ فلاں تصویر میں Base بناتے ہوئے ٹیکسچر دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ ناہموار سطح پر پاورفل اسٹروکس کے ذریعہ رنگوں کا خوبصورت استعمال کیا جانا چاہئے تھا......‘

’رنگ......‘ میں نے ایک لمبی آہ کھینچی تو وہ چونک گئی۔

’زندگی سے رنگ جھڑ جائیں تو......؟‘

’’آرٹ گیلری سے باہر بھی ملاقات کا ایک راستہ جاتا ہے۔‘

وہ اداس ہوگئی تھی۔ ......Sorry‘

’Sorry کیوں؟‘

تمہارا نمبر ہے؟‘‘

’نمبر۔‘

’میں فون کرلوں گی۔‘

اس کے جسم میں تھرتھراہٹ تھی...... پرانی ترپتی غائب تھی...... میں ایک نئی ترپتی کو دیکھ رہا تھا۔ جوڈر رہی تھی...... یا ڈرنے کی ایکٹنگ کر رہی تھی۔

رادھیکا جی کے لفظ کانوں میں گونج رہے تھے۔ ناری گھور رہسیہ ہے۔ ترپتی اسی رہسیہ کا حصہ ہے......‘

میں نے ترپتی کو نمبر لکھوا دیا......

آرٹ گیلری سے سڑک دو الگ الگ دشاؤں میں مڑ گئی تھی۔

آثار قدیمہ اور ترپتی کا تیسرا رنگ (میوزک)

صحافیوں کے لئے یہ دنیا ایک سیپ کی طرح ہے۔ یہ بات کس نے کہی تھی، یاد نہیں۔ لیکن فرصت کے اوقات اس بارے میں سوچتا ہوں تو اپنی ذات سیپ کی ’ڈگی‘ میں بند ’گھونگھے‘ سے زیادہ نہیں لگتی...... بس بھاگتے رہو...... بھاگتے بھاگتے تھک جاؤ تو اپنی چھوٹی سی دنیا میں بند ہو جاؤ اور آپ جانئے...... فری لانس جرنلسٹ کو کیسے کیسے محاذ پر لڑنا ہوتا ہے...... اس دن طبیعت ناساز تھی لیکن میگزین کی طرف سے بھارت سنگاپور اتسو، میں شامل ہو کر اس کی رپورٹ تیار کرنی تھی۔

بانسری کا مجھے کبھی شوق نہیں رہا۔ بچپن کے دنوں میں ہونٹوں سے لگایا ہو، اب یاد نہیں۔ لیکن ہری پرساد چورسیا میں میری دلچسپی ضرور تھی...... اور یہی دلچسپی مجھے اس اُتسو میں کھینچ کر لے گئی تھی...... فکّی آڈیٹوریم کا مین ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کسی نے مجھے ذرا سا دھکا دیا اور تیز تیز اندر کی طرف قدم بڑھائے۔ میں غصہ میں کچھ بولنا چاہتا تھا کہ ٹھہر گیا۔

'ترپتی۔'

OO

یہ ترپتی سے میری تیسری ملاقات تھی۔ شو شروع بھی ہوا اور ختم بھی ہو گیا۔ میں برابر اس پر نظر رکھے ہوا تھا۔ وہ ہال میں ہو کر بھی ہال میں نہیں تھی۔ کسی چور جیسی، اپنی سیٹ پر دُبکی ہوئی تھی...... بلی کی طرح سہمی ہوئی۔ آہٹ سے ڈر ڈر جانے والی۔ شو ختم ہونے کے بعد میری نظروں نے اس کا تعاقب کیا۔ گیٹ کے پاس ہی میں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

'آہ ترپتی۔ یہاں بھی تم۔'

'ہاتھ چھوڑو......' اس کے لہجہ میں سختی تھی...... میں نے تمہیں دیکھ لیا تھا۔ میں خود تم سے ملنے والی تھی۔

میں نے ہاتھ ہٹا لیا...... 'شو کیسا لگا تمہیں؟'

وہ ابھی بھی کہیں اور تھی۔ بھیڑ سے الگ ہم باہری گیٹ سے دوسری طرف کھڑے ہو گئے۔ نکلنے والی گاڑیوں کا شور انسانی شور سے کہیں زیادہ تھا۔

'بہلانے آئی تھی خود کو۔ مگر بور...... انڈین اوشن کے اس 'بینڈ' کو دیکھا تم نے......' اس کے لہجے میں کڑواہٹ تھی...... فن مر گیا ہے۔ ہم دو سنسکرتیوں کو ملا دینا چاہتے ہیں۔ یہ سب کیا ہے؟ ایک جھوٹا تماشہ۔ تمہیں لکھنا چاہئے۔ بھارتیہ سروں کا یہ کیسا میل ہے۔ جاز، ریگے، راک، پاپ اور بھارتیہ سنسکرتی کا بریک فاسٹ ملا دیا۔ مکچر تیار۔ کلچرل موٹف کو نئے ماڈرن ڈھانچہ میں ڈال دیا اور نیو جنریشن کے سامنے پروس دیا۔ یہی 'فیوزن ہے...... سکڑتی سمٹتی دنیا کو، پاگل بنا دینے والی میوزک کمپنیوں کا دیا ہوا دیشی تحفہ ______

'تمہیں فیوزن سے چڑھ کیوں ہے؟'

آپ اسے ویسے کا ویسا رہنے کیوں نہیں دیتے، جیسا کہ وہ ہے۔ لیکن نہیں۔ بات

پروفیشنل منافع کی ہے—— کنزیومر ورلڈ کی ہے—— بازار کی ہے—— آپ وہی تہذیب فروخت کریں گے، جس کی ودیشوں میں مانگ ہے۔'

اس کی ہرنی جیسی آنکھیں اب بھی سہم سہم کر اِدھر اُدھر دیکھ لیتی تھیں...... سنو،'

اس نے آہستہ سے میرا ہاتھ تھاما......

'مینن ایک ہفتہ کے لئے باہر گئے ہیں—— ساؤتھ—— کل آسکتے ہو۔'

'کس وقت؟'

'شام کے وقت۔'

تیزی سے آتے ہوئے آٹو کو اس نے ہاتھ دے کر روک لیا تھا...... مینن غلطی سے گاڑی کی چابی اپنے ساتھ لے گئے۔ آؤ گے نا؟'

اس نے آہستہ سے میرا ہاتھ دبایا۔ آٹو پر بیٹھی اور آٹو روانہ ہوگیا۔ میرے ہاتھ میں ایک چھوٹے سے کاغذ کی پرچی تھی۔ جس پر اس کا ایڈریس لکھا ہوا تھا۔ لیکن یہ ایڈریس اس نے کب لکھا۔ جب وہ ہال میں تھی۔ یا۔ مجھے دیکھ کر وہ پہلے سے ہی مجھ سے ملنے کا من بنا چکی تھی۔

'ناری گھور رہسیہ ہے دستو ہے'...... مسکراتے ہوئے میں نے کاغذ جیب کے حوالے کردیا۔

OO

کال بیل کی پہلی آواز پر ہی دروازہ کھل گیا۔ شاید وہ میرے انتظار میں تھی۔ میرے اندر آتے ہی اس نے 'کھٹاک' سے دروازہ بند کردیا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ترپتی کے چہرے پر اب بھی ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

''مینن صاحب کب آئیں گے؟''

''پتہ نہیں''

میں نے گھر کی سجاوٹ پر ایک نظر ڈالتے ہوئے پوچھا...... 'مینن صاحب کرتے کیا ہیں؟

ترپتی بجھ گئی تھی۔ آہستہ سے بولی۔ ان کا تعلق محکمۂ آثار قدیمہ سے ہے۔

ترپتی مینن کی آواز اس بار برف کی طرح سرد تھی...... 'وہ ہر بار کچھ نہ کچھ برآمد کرلیتے

ہیں۔ محنتی اور سخت ــــــ صرف اور صرف اپنے کام پر یقین رکھنے والے ــــــ لیکن ہر بار......
مجھے تعجب ہوتا ہے۔ کچھ نہ کچھ......'

'جیسے؟'

'کوئی......قدیم تہذیب ــــــ قدیم شہر......' ترپتی مینن نے اپنی زلفوں کو جھٹکا دیا ــــــ آنچل اُس کے سیاہ جمپر سے پھسل کر گود میں آگرا تھا ــــــ لیکن ترپتی نے آنچل کو اٹھانے کی زحمت نہیں کی۔ اُس کی عریاں بانہیں نمایاں تھیں۔ 'صندلی' برہنہ بازؤں کے گوشت آہستہ آہستہ چنگاریاں دینے لگے تھے۔ ترپتی کسی سوچ میں ڈوب گئی تھی۔

OO

''وہ ہر بار کچھ نہ کچھ برآمد کر لیتا ہے۔ لیکن مجھے تعجب ہے۔ وہ آج تک مجھے برآمد نہیں کر پایا۔ اپنی بیوی کو......'

ترپتی نے جیسے اپنے آنسو پونچھے ہوں! دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے جذباتی لہجے پر قابو پالیا تھا۔ ارے میں تو بھول ہی گئی۔

'کیا؟'

'آپ پہلی بار آئے ہیں۔ اور شاید......' اس کا لہجہ داس تھا۔

'مینن صاحب ہوتے تو......'

'میں ہمت تو کجا، سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔'

'کیوں؟'

پتہ نہیں۔ وہ مسکرائی...... 'پہلے چائے۔ آپ چائے لیں گے یا کافی۔'

'کچھ بھی چلے گا۔'

OO

ترپتی کیبن میں گئی تو میں نے اس کے کمرے کا جائزہ لیا۔ دیوار پر دو خوبصورت بچوں کی تصویریں آویزاں تھیں۔ کمرے میں ایسا بہت کچھ تھا، جو ترپتی کے ذوق وشوق کی کہانیاں بیان کر رہا تھا ــــــ دیوار پر ٹنگی تصویروں میں ایک بچہ کم از کم تیرہ سال کا ہوگا۔ دوسرا دس کے آس

پاس۔ترپتی تو اتنی عمر کی نہیں لگتی۔کیا پتہ۔ساؤتھ کے رتی رواج اور کلچر کے بارے میں ہم ابھی بھی کتنے انجان ہیں۔

ترپتی کافی لے کر آئی تو میں نے دیوار کی تصویر کی طرف اشارہ کیا ____

'میرے بچے ہیں۔' ترپتی نے سر جھکا لیا۔

تمہارے یا مینن کے؟' میری آنکھیں اس کی آنکھوں میں سما گئی تھیں۔

مینن کے۔میں ان کی دوسری بیوی ہوں۔پہلی بیوی اتفاقیہ طور پر......

اس کا گلا بھر آیا تھا......

'تم نے کہا تھا، مینن سے تمہاری لو میرج ہوئی تھی۔'

وہ سامنے بیٹھ گئی۔کافی آہستہ آہستہ سڑکتی رہی...... ہاں لو میرج کی تھی۔کسی کسی لمحے کا بوجھ ساری زندگی ڈھونا پڑتا ہے۔انہی دنوں مینن کی پتنی کا دیہانت ہوا تھا۔وہ گھر آئے تھے۔بابوجی سے ملنے۔اُن دنوں...... بزنس میں مسلسل گھاٹے کی وجہ سے سارا گھر پریشان چل رہا تھا۔بابوجی نے مینن کے بارے میں بتایا۔یہ بھی، کہ وہ آثار قدیمہ میں ہیں۔سامنے بیٹھا ہوا آدمی مجھے ایسا ہی کچھ لگ رہا تھا...... کسی کھنڈر یا قدیم تہذیب سے نکلا ہوا...... بس میں آہستہ سے مسکرا دی۔'

'پھر سودا ہو گیا......؟'

'ہاں۔تم اسے سودا بھی کہہ سکتے ہو...... گھر والوں کو صرف میری فکر تھی۔میرا کیا ہوگا۔میں دودھ سے بالائی کی طرح ہٹا دی گئی تو سارا نقصان پورا ہو گیا۔میں مینن کے ساتھ خوش تھی مگر......'

کافی کا پیالہ اس نے میز پر رکھ دیا۔میں نے اسے بغور دیکھا۔اس نے ہلکے نیلے رنگ کی نائیٹی پہن نہیں رکھی تھی...... نائیٹی کے 'وی' شیپ سے گولائیوں کی پہاڑی جیسی ڈھلانیں ایک بے حد خوبصورت منظر کی عکاسی کر رہی تھیں۔نیلے پربتوں کے درمیان ایک ہلکی سی کھائی برانگیختہ کرنے والی تھی...... اس نے نظر جھکا لیا تھا۔

'تحفہ میں دو بچے ملے تھے۔ان بچوں کی اپنی زندگی تھی...... اس زندگی میں، میں نہیں تھی۔میں ایک نقلی عورت بن کر اس زندگی میں داخل ہونے کی کوشش تو کرتی رہی ____ شاید

مینن کو خوش کرنے کے لئے۔ مگر...... بچوں نے صاف کہہ دیا۔

''ماں بننے کی جستجو میں دوسری عورت ایک فاحشہ بن جاتی ہے۔ فاحشہ......''

مجھے وہ لمحہ یاد ہے۔ دن تاریخ یاد ہے...... چودہ فروری ویلنٹائن ڈے ـــــ رات ساتھ بج کر بیس منٹ...... فاحشہ...... بچوں کے لفظ چہرے پر آ کر جھریاں بن گئے ـــــ پل میں خوشیوں کے انگور سوکھ کر کشمش ہو گئے ـــــ مجھے لگا، بچوں نے ریوالور کی تمام گولیاں میرے بدن میں اتار دی ہیں۔ میں چیختی ہوئی غصے سے پلٹی تو وہیں کنارے میز پر ـــــ جلتے ہوئے لیمپ کی روشنی میں مینن بہت سے کوڑے کباڑ کو تحسین آمیز نظروں سے دیکھ رہا تھا......

'تم نے سنا،' میں روتی چیختی ہوئی زور سے گرجی تھی۔

'ہاں سنا۔ مگر یہ دیکھو...... یہ......، اس کے چہرے پر ذرا بھی شکن نہیں تھی...... میں سانسوں کے رتھ پر سوار تھی...... جیسے لکڑی کے 'سانچے' سے ـــــ لحاف میں روئی بھرنے والے ـــــ روئی دُھنکتے ہیں۔ میں سانسیں دُھنک رہی تھی...... مینن کہہ رہا تھا۔ یہ دیکھو......'

میں دیکھ رہی تھی۔ میز پر کباڑ پڑا تھا...... ہاں کباڑ۔ جیسے کچرا یا گندہ نالا صاف کرنے والے پرانی ٹوٹی پھوٹی اشیاء کو دھو پونچھ کر رکھ لیتے ہیں......

میں سانسیں دُھن رہی تھی...... ''ان بچوں نے مجھے......''

'رنڈی کہنے سے کوئی رنڈی نہیں ہو جاتا...... سنا ہے......' اس کا چہرہ تاثر سے عاری تھا۔ میں نے ایک تیز چیخ ماری...... غصے میں میز الٹ دی۔ دوسرے ہی لمحے مینن کے لات جوتوں کی زد میں تھی۔ وہ مجھے ویسے ہی دُھن رہا تھا جیسے لحاف میں پرانی روئی بھرنے والے...... وہ مجھ پر سڑی گلی گالیوں کی بوچھار کر رہا تھا۔ بچے مشینی انداز میں، پڑھائی کرنے میں لگے تھے۔

مینن چیخ رہا تھا...... 'جاہل عورت۔ پتہ ہے تم نے کیا کر دیا ـــــ تہذیب۔ قدیم تہذیب...... ارے آرکیالوجیکل سروے سے ملی تھی یہ نادر چیزیں ـــــ بدقسمت عورت۔ برسوں کی کھوج کے بعد تو یہ خزانہ ملا تھا۔ ہم جس کے لئے مدتوں بھٹکتے رہے ہیں۔ تال سے پاتال تک...... اسٹوپڈ...... ڈاٹر آف سوائن۔ بچ...... اس نے مجھے دیوار کی طرف ڈھکیلا...... شکل دیکھی ہے...... بچے ٹھیک کہتے ہیں۔ بچے کوئی غلط نہیں کہتے......''

'میں فاحشہ ہوں'...... ترپتی، اچانک میرے سامنے آ کر تن گئی تھی ـــــ اتنے قریب کہ میں سانسوں کی سرگم سننے لگا تھا...... میں فاحشہ ہوں...... میرے بدن کے 'تاروں' سے روئی کے گولے بکھرتے چلے گئے۔ اس نے نائیٹی ہوا میں اڑا دی...... میں نے اسے مضبوط بانہوں کے شکنجے میں لے لیا۔

'روئی دھننے والے' کی آواز آہستہ آہستہ مدھم مدھم ہوتی ہوئی ایک دم سے کھو گئی ـــــ وہ اٹھی۔ نائیٹی پہنی۔ دل کھول کر مسکرائی۔ میرے گالوں کو پکڑ کر زور سے بوسہ لیا۔ آہستہ سے بولی ـــــ تھینک یو۔ واش بیسن پر پانی کے دو چار چھینٹے چہرے پر مارے۔ پھر مسکراتی ہوئی سامنے آ کر بیٹھ گئی......

میں نے آہستہ سے پوچھا۔

'وہ بچوں کو بھی لے گیا......'؟

'ہاں۔ میرے پاس اکیلے رہنے سے وہ اور بچے دونوں ہی خود کو ان سیکور فیل کرتے ہیں۔'

'شاید اسی لئے تمہاری آتما بھٹکتی رہتی ہے۔ کبھی میگزین کا دفتر۔ کبھی آرٹ گیلری، کبھی میوزک ورکشاپ ـــــ'

میں ایک آتر پت آتما ہوں۔ وہ ہنس رہی تھی...... شاید اسی لئے ماں باپ نے مذاق کے طور پر میرا نام ترپتی رکھ دیا۔

میں نے کپڑے پہن نہیں لئے تھے ـــــ وہ اچانک اٹھی۔ بے اختیار ہو کر ایک بار پھر میرے جسم سے لگ گئی۔ وہ رو رہی تھی۔

'ترپتی...... ترپتی'...... میرے ہاتھ بارش بن گئے تھے...... اُس کے جسم کے لئے...... اس کے تھرتھراتے مچلتے جسم کے لئے۔ وہ ہر جگہ برس رہے تھے۔ بوسوں کی بارش کر رہے تھے...... پھر جیسے بجلی تیزی سے گرجی۔ اسے جیسے غلطی کا احساس ہوا ہو۔ وہ تیزی سے پیچھے ہٹی۔ میری طرف دیکھ کر ہنسی...... پھر بولی......

'' آخر اسے ایک تہذیب مل گئی۔ جس کی کھوج میں وہ برسوں سے لگا تھا۔ ایک قدیم

تہذیب...... یہ اس ڈراونے ویلنٹائن ڈے کے چوتھے دن بعد کا قصہ ہے۔ مسوری، ہماچل وغیرہ میں برف گری تھی شاید۔ سردی اچانک تیز ہوگئی تھی...... وہ رات کے 3 بجے آیا۔ میں سوگئی تھی۔ عام طور پر جب میں اکیلے ہوتی ہوں۔ بیڈروم میں ــــ تو برائے نام لباس پہنتی ہوں...... وہ مجھے اٹھا رہا تھا۔ جانوروں کی طرح......

''ہوہو..اٹھو..اٹھو''

میں نے سمجھا، ایک جانور پیاسا ہے۔ عام طور پر وہ اسی طرح، ایک بے حس جانور کی طرح اپنی بھوک مٹاتا تھا۔ رات کے تین بجے اُٹھا کر اس نے مجھے صوفہ پر بیٹھا دیا۔ وہ خوشی سے جھوم رہا تھا۔ 'جھومر' کی طرح مسکراہٹ اس کے پور پور سے روشنی دے رہی تھی۔

'بولو۔ اُٹھایا کیوں۔ میں گہری نیند میں تھی۔''

'مل گیا۔ یوریکا۔'' اسے میرے لفظوں کی، نیند کی فکر نہیں تھی...... ''تمہیں یاد ہے...... وہ کمرے میں ٹہل رہا تھا ــــ میں نے بتایا تھا نا، 1991ء کے آس پاس جرمن سیاحوں کو آلپس کی پہاڑیوں پر ٹہلتے ہوئے انسانی اعضاء ملے تھے۔ یاد ہے؟ وہ بیسویں صدی کی سب سے عظیم دریافت تھی ــــ سب سے عظیم دریافت۔ گیارہ برس بعد ــــ اس کے ٹھیک گیارہ برس بعد۔ آہ تم یقین نہیں کروگی۔ مگر ہم دنیا بدل دیں گے۔ تاریخ نئے سرے سے لکھی جائے گی۔ میں ان کچھ لوگوں میں سے ایک تھا ــــ گجرات کے ساحل سے 30 کلومیٹر دور کھمباٹ کی کھاڑی میں ایک عظیم خزانہ ہاتھ آگیا ہے۔ سونوفوٹوگرافی۔ تمہیں یاد ہے نا، چار دن پہلے......

'جلتے ہوئے گجرات میں، عظیم خزانہ......'

'ہاں' مجھے یاد ہے'...... میرے لہجہ میں ناگواری تھی...... چار دن پہلے، ویلنٹائن ڈے کے دن جو کچھ ہوا میں اسے کبھی بھول نہیں سکتی۔'

'بھولنا بھی نہیں چاہئے......' مینن کے لہجہ میں کہیں بھی دکھ یا اداسی کی جھلک نہیں تھی۔ 'جھومر' جیسے اندھیرے میں سوچ کی حرکت سے روشنی کی طرح بکھر گیا تھا...... 'سونوفوٹوگرافی سے نکلی تصویریں جب لیب سے باہر آئیں تو ہمیں اچانک احساس ہوا ــــ سمندر میں 40 میٹر نیچے دفن قدیم ترین تہذیب اچانک رنگین ستاروں کی طرح ہماری قسمت سے جوڑ دی گئی ہو...... ایک قدیم شہر، موہن جداڑو کی طرح رہائشی مکانات ــــ سیڑھیوں کی طرح نیچے اترتے پوکھر ــــ تالاب۔

''اور سب کچھ اُسی گجرات کے ساحلی علاقے میں......''

میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہورہی تھیں۔ میں دیواروں کا خیال رکھتے ہوئے چیخی۔ ''میں بھی ایک عظیم پوکھر ہوں۔ ایک عظیم تالاب ہوں اور انتہائی قدیم۔ تمہیں اس عظیم پوکھر میں بہتے پانیوں کے اشارے کیوں نہیں ملتے۔'؟

اس نے میری آواز کو نظر انداز کیا...... وہ بتا رہا تھا۔ تہذیبیں کہیں جاتی نہیں ہیں۔ وقت کے ڈائنا سور انتہائی خاموشی سے انہیں نگل جاتے ہیں ــــ تہذیبیں 'ممی' سے باہر نکلنے کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ آہ، تم نہیں جانتی...... میں کس قدر خوش ہوں۔ سمندر کے گہرے پانی میں 90 کلومیٹر کے دائرے تک، اس قدیم تہذیب کی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں ــــ قدیم شہر ــــ ایک پورا شہر ندی میں سما گیا ــــ سندھو گھاٹی کی تہذیب کی طرح۔ یہ شہر اسی طرح کا ہے۔ جیسے ہڑپا کے برامدات میں پایا گیا تھا ــــ مٹی کی بنی ہوئی نالیاں۔ کچی سڑکیں۔ چھوٹے چھوٹے مٹی کے گھر۔ پتھر کے تراشے اوزار۔ گہنے ـــــ مٹی کے ٹوٹے پھوٹے برتن ـــــ جواہرات ــــ ہاتھی کے دانت اور...... وہ مسکرا رہا تھا۔ سب کچھ یعنی 7500 ق۔م۔ یعنی قبل مسیح کا۔

'یہ سب مجھے کیوں سنا رہے ہو'؟

وہ آگے بڑھا۔ میرے جسم پر یوں بھی کپڑے اس وقت برائے نام تھے...... 'اس نے باقی بچے کپڑے بھی جسم سے الگ کردیئے...... اس لئے کہ...... ''میری آثار قدیمہ...... تمہیں اب انہیں کھنڈروں میں بیٹھانا چاہتا ہوں...... لیکن اس سے پہلے تمہارے ان کھنڈروں پر ریسرچ کرنا چاہتا ہوں...... اس نے ایک بھدّی گالی دی۔ مجھے بستر تک کھینچنا چاہا اور شاید......''

وہ ہانپ رہی تھی...... یہ اس کے ساتھ مسلسل، گزر رہے لمحوں کا جبر تھا کہ میں نے الٹا ہاتھ اس کے گال پر جڑ دیا۔

'کتیا......' وہ ہانپ رہا تھا...... ''ایک بہت قدیم تہذیب برآمد کرنے کے بعد مجھے تمہارے ٹوٹے پھوٹے کھنڈر کی ضرورت نہیں ہے۔''

اس نے مجھے دھکا دیا اور خود کو بستر پر سونے کے لئے ڈال دیا ــــ میں زمین کے تنہا گوشہ میں دیر تک اپنے آنسوؤں کا شکار ہوتی رہی......

OO

''پھر کیا ہوا، اس نے تمہیں ڈیورس دے دیا؟''

'نہیں۔' وہ مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی...... ایسے لوگوں کو جانتی ہوں۔ جان گئی ہوں۔ ایسے لوگ، ڈرپوک ہوتے ہیں۔ زندگی کے بارے میں بہت دور تک دھوپ اور سایہ دیکھنے والے...... ایسے لوگ قدم قدم پر ان سیکوریٹی کے مارے ہوتے ہیں ____ مینن بھی ایسے ہی جذبہ سے دوچار تھا ____ میرے بعد......؟ اپنی، جسمانی اور بچوں کی...... ترپتی مینن میری طرف مڑ گئی تھی۔ تمہیں کیا لگتا ہے ایسے لوگ جیت سکتے ہیں؟ نہیں...... کسی ایک لمحے کا ____ بولا گیا سچ ان کی اپنی ذات پر بھاری پڑتا ہے۔ دوسرے دن وہ ایک سدھا، ہوا بلڈاگ بن گیا تھا ____ میرے قدموں پر لوٹتا ہوا۔ بچے اسکول جا چکے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

ترپتی آگے بڑھ کر کھڑکی کے پٹ کھول رہی تھی۔ باہر رات کی سیاہی مکمل طور پر چھا چکی تھی۔ ٹھنڈ بڑھ گئی تھی۔ تیز ہوا کے جھونکے کھڑکی کھولتے ہی اندر ہمارے جسموں میں داخل ہو گئے۔

''ہوا تیز چل رہی ہے، نہیں؟''

'ہاں۔'

باہر کہرے کے 'آبشار' گر رہے تھے۔ وہ کھڑکی کے پاس اپنے منہ کو لے گئی۔ پھر میری طرف پلٹی۔ ہلکی سانس چھوڑی۔ چہرے کو اپنی ہتھیلیوں سے خشک کیا۔

''کہرے کا احساس چہرے پر کیسا لگتا ہے۔ آں؟ جیسے ایک نم سی ٹھنڈی، روئی آپ کے چہرے پر رکھ دی گئی ہے...... ہے نا؟''

وہ پھر مسکرائی ____ میں کہاں تھی۔ ہاں، یاد آیا۔ وہ ایک سدھے ہوئے بلڈاگ کی طرح اپنے نتھنے، میرے جسم پر رگڑ رہا تھا۔ کتا ____ مجھے ابکائی آ رہی تھی۔ تیز نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سیکس کے بخار میں جل رہا تھا۔

'پتہ نہیں کیا ہو جاتا ہے مجھے۔ کل رات...... معاف کر دو ترپتی'...... اس کے رکھڑے، بن ماس جیسے ہاتھ میرے جسم پر مچل رہے تھے۔ وہ میرے کپڑے کھول رہا تھا۔ میں نے کوئی

احتجاج نہیں کیا۔ میمنے ، کی طرح معصومیت سے ، اپنے غصّے کو دبائے اس کے جانور نما ، پنجوں کا کھیل دیکھتی رہی...... جب وہ میرے کپڑے اتار چکا اور کسی جنگلی بھیڑیے کی طرح اپنی ہوس پوری کرنے کے لئے تیار تھا...... ایک دم اسی وقت ، میں کسی جنگلی بلی کی طرح غرائی...... دھب سے زمین پر کودی...... غصّے میں اسے پرے ڈھکیلا...... کپڑے پہنے اور چلائی۔

یو ، سن آف بلڈی سوائن۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی......؟

وہ جل رہا تھا۔ وہ اپنے بدن کی آگ میں جل رہا تھا۔ وہ گڑگڑا رہا تھا۔ وہ اپنے بھوکے بدن کی دہائیاں دے رہا تھا۔ میں کسی فاتح کی طرح مسکرائی۔ اس بار اسے سیراب کرنے کے لئے ، میں نے سکندر بادشاہ کی طرح فتح کا سہرا اپنے سر لکھ لیا تھا......

ترپتی نے کھڑکی بند کردی...... 'چلو ، اس حادثے کو بھی بھول گئی میں...... بھولنا پڑتا ہے۔ وہ چلتی ہوئی میرے قریب آئی۔ میری جانگھوں پر بیٹھ گئی۔

'سنو۔ تمہارے یہاں کون کون ہیں؟''

'ملوگی؟'

'ہاں۔ ملنا چاہوں گی۔'

'مینن آگئے تو؟'

'اب میں اسے ڈرانا چاہتی ہوں...... وہ میرے شرٹ کے بٹن سے کھیل رہی تھی۔ کھیلتے کھیلتے خود بولی......

'ایک بیوی ہوگی!؟'

'ہاں'

'اسے بتاؤ گے کہ تم سے ایک ندی کی لہر ٹکرائی تھی...... '

'نہیں'

'ڈرتے ہو۔'

'ڈرنا پڑتا ہے۔ بیویاں صرف ایک سمندر...... سمندر کی صرف ایک لہر سے واقف ہوتی ہیں...... دوسرے لفظوں میں کہوں تو وہ ساری لہروں پر خود ہی حکومت کرنا چاہتی ہیں۔'

وہ ہنس رہی تھی...... اور کون ہے۔

'ایک بیٹا'

'کتنے برس کا؟'

'آٹھ برس کا'

اور......'

میں نے اسے جانگھوں سے پرے کیا۔ شریانوں میں گرم گرم طوفان کی آمد سے خود کو بچانا چاہتا تھا۔

'تم نے بتایا نہیں۔ اور کون ہے......'

'ایک بیٹی ہے۔ مگر......'

'مگر......؟'

'نہیں۔ وہ ہے نہیں۔ میرا مطلب ہے، وہ بن رہی ہے......بس وہ بن رہی ہے اور ایک دن یقین جانو وہ پوری طرح بن جائے گی۔'

'اس نے چونک کر تعجب سے مجھے دیکھا'

'پہلیاں مت بجھاؤ'

'دراصل......میں نے اپنا جملہ مکمل کیا......وہ انکیوبیٹر میں ہے اور مسلسل بننے کے عمل میں ہے......'

'کیا مجھے ملواؤ گے؟'

ترپتی نے اپنا بدن ایک بار پھر میرے بدن پر ڈال دیا تھا____

○○

لفٹ پانچویں فلور پر رک گئی تھی۔ یہ اسپتال کا نرسری وارڈ تھا۔ فل ائیر کنڈیشنڈ____ باہر ایک لمبی راہداری چلی گئی تھی۔ ترپتی نے آہستہ سے میرا ہاتھ تھام لیا____ شیشے کے بنے دروازوں سے گزرتے ہوئے ہم 'مارتو سدن' کے بورڈ کے آگے ٹھہر گئے____

'یہاں جوتے اتارنے ہوں گے۔'

ترپتی کے پاؤں جاپانیوں اور چینی عورتوں کی طرح چھوٹے اور ملائم تھے۔ گیٹ کیپر

نے دروازہ کھول دیا۔ دروازے کے اندر شیشے کی ایک عجیب سی دنیا تھی۔ ترپتی حیرت سے شیشے کے اس پار دیکھ رہی تھی۔ شیشے کے اس پار بھی، شیشے کے کتنے ہی چھوٹے چھوٹے گھروندے بنے ہوئے تھے ـــــ ایسے ہر گھروندے میں نیلے بلب جل رہے تھے۔

'نیل کہاں ہے؟ ترپتی کی آنکھوں میں تجسس تھا۔'

وہاں ان گنت انکیو بیٹرس تھے۔ ترپتی کی انگلیاں تیر رہی تھیں۔ وہاں......

'نہیں؛ نہیں؟'

'وہ......'

'وہ بھی نہیں......'

'اچھا وہ......دائیں طرف......'

'نہیں......'

'پھر نیل کہاں ہے؟'

'نیل وہ رہی'

'مگر۔ وہ انکیو بیٹر تو خالی ہے...... ترپتی چونک گئی تھی۔

'خالی نہیں ہے۔ غور سے دیکھو۔'

'خالی ہے! ترپتی کا لہجہ اُداسی سے پُر تھا۔

'ہے نا...... میں نے کہا تھا۔ وہ بن رہی ہے ـــــ 'میں نے ترپتی کا ہاتھ زور سے تھام لیا تھا...... یاد ہے ترپتی۔ میں نے کہا تھا، عورت ہر بار بننے کے عمل میں ہوتی ہے۔ ایک بے چین آتما...... ایک یونانی دنت کتھا میں پڑھا تھا ـــــ عورت کی جون میں پرویش سے پہلے، آتما دھرتی کی سو پریکرمائیں پوری کرتی ہے۔ تمہاری آتما بھی بے چین تھی۔ کبھی ساہتیہ۔ کبھی آرٹ اور کبھی......'

ترپتی میری طرف تیزی سے مڑی۔ ہنستے ہوئی بولی......

'سنو۔ اس انکیو بیٹر میں مین کو ڈال دوں؟'

'نہیں۔'

میرا لہجہ نپا تُلا تھا...... 'سب سے پہلے ابھی تمہیں اس انکیو بیٹر سے باہر نکلنا ہے'

میں نے اس کی طرف نہیں دیکھا...... اس کا ہاتھ تھام کر باہر آ گیا...... لفٹ کے بٹن پر انگلیاں رکھتے ہوئے بھی میں نے اس کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا ____

ممکن ہے وہ انکیوبیٹر میں رہ گئی ہو...... یا ممکن ہے، شوہر کے آثار قدیمہ میں بھٹک رہی ہو!

OOO

لینڈ اسکیپ کے گھوڑے

(پیارے دوست اس۔ ال۔ حسین کے نام)

سب سے بُری خبر

''نہیں، اس گھوڑے کے بارے میں نہیں پوچھئے۔ برائے مہربانی'' ۔وہ زور زور سے ہنس رہا تھا۔ برائے مہربانی اور جیسا کہ میں نے کہا، آپ یقین کیجئے۔ وہ گھوڑا۔ با...... بابا...... ایک بے حد دلچسپ کہانی اور جیسا کہ میں ہوں۔ کیا آپ مجھ پر یقین کریں گے۔ ہاں آپ کو کرنا چاہئے...... اور وہ گھوڑا اچانک کورے کینواس سے چھلانگ لگا کر میرے سامنے آ کھڑا ہوا تھا......''

کالے چشمہ کے اندر حسین کی پتلیاں تیزی سے حرکت کر رہی تھیں۔ نہیں۔ مجھے مغالطہ ہوا تھا۔ کسی بھی انسانی آنکھ کی پتلیوں میں یہ جوش میں نے کم دیکھا تھا...... حسین کی پتلیاں ٹھہرتی نہیں تھیں...... وہ شرارتی کنچے، کی گولیوں کی مانند تھیں۔ ادھر سے ادھر چمکیلے فرش پر تیرنے والی...... اور مجھے لگتا ہے باتیں کرتے ہوئے بھی حسین ان پتلیوں کو وقفے وقفے آپ کی نظر بچا کر اپنی ہتھیلیوں میں تھام لیتا ہے...... گو، ایسا کرتے ہوئے وہ پریشان بھی ہوا تھا ہے کہ پتہ نہیں سامنے بیٹھا ہوا آدمی اس کے اس عمل کو کیا نام دے؟ مگر...... کنچے کی گولیوں کی طرح اس کی آنکھوں کی شراتی پتلیاں...... اور گھوڑے۔

شراب کے دو ایک گھونٹ کے بعد ہی ہو وہ جذباتی حد تک فلسفی بن جاتا ــــــ 'دوست، سب سے بُری خبر ابھی لکھی جانی باقی ہے۔' وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہل رہا ہے۔

مجھے معلوم ہے۔ حسین کو چڑھ گئی ہے۔ چڑھنے کے بعد حسین کے اندر سنبھال کر رکھا ہوا، بوجھل آدمی مر جاتا ہے اور ایک حساس، جذباتی اور پاگل آدمی زندہ ہو کر سامنے آجاتا ہے۔

''دوست، ابھی سب سے بُری خبر لکھی جانی باقی ہے۔ لیکن یہ بُری خبر آہستہ آہستہ لکھی جائے گی اور ممکن ہے۔ ممکن ہے...... اس کے لکھے جانے کا سلسلہ شروع ہو چکا ہو۔''

حسین پھر اپنی کرسی پر واپس آکر بیٹھ گیا ہے۔

'کیا یہ خبر تم سے جڑی ہے؟'، میں ہنسنا چاہتا ہوں۔ حسین کو چھیڑنے کا منشا ہے۔ مگر۔ حسین کے اندر کا آدمی دکھ گیا ہے۔

''سب سے بُری خبر...... سب سے بُری خبر کا تعلق محبت سے ہوگا دوست۔ سب سے بُری خبر ہوگی کہ محبت کرنے والے نہیں رہیں گے۔ سب سے بُری خبر ہوگی کہ محبت پر کچھ بھی تحریر نہیں کیا جائے گا۔ سب سے بُری خبر ہوگی......''

حسین بہک رہا ہے۔

میں اپنے دل کو سمجھاتا ہوں۔ حسین، جیسے بہت دیکھے ہیں...... بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سارے پینے والے ہی حسین ہوتے ہیں۔ پی کر، خود پر قابو نہیں رکھنے والے...... اپنے آپ کو بھول جانے والے۔ پھر۔ اندر کا فریڈیشن مزے لے لے کر آپ کو ایک بیوقوف قسم کے جوکر میں بدل دیتا ہے...... یعنی جیسے آپ آئینہ کے سامنے کھڑے ہوں اور اپنے عکس کو دیکھ کر عجیب عجیب حرکتیں کر رہے ہوں۔ فرق اتنا ہے کہ پینے کے بعد آپ اپنی عجیب عجیب حرکتوں کے لئے تو بچ جاتے ہیں لیکن اپنے آپ کو نہیں دیکھ پاتے۔ پھر بے سر پیر کی کہانیاں اور فلسفے شروع ہو جاتے ہیں اور شراب کا نشہ ہرن ہونے تک، فلسفے بھی شیمپئن کے جھاگ کی طرح بہہ جاتے ہیں۔

لیکن۔ سب سے بُری خبر۔

○○

مجھے اس خبر نے چونکایا تھا تو کیا اس آدمی نے، اس پچاس باون سالہ جذباتی خبطی آدمی نے محبت کا روگ بھی لگایا ہوگا...... نہیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس پچاس باون سالہ آدمی نے...... ایک انتہائی تجربہ کار، حساس اور جذباتی آدمی نے ــــــ سوچنے کے آخری لمحے میں میں نے حسین سے اپنے دل کی بات پوچھ لی تھی۔

''آپ کی سب سے حسین پینٹنگ کون ہے؟''

''جو میں نے اب تک نہیں بنائی''......

اس کی آنکھوں کی پتلیاں، پھر سے کنچے کی گولیاں بن گئی تھیں۔

اور جو کچھ حسین نے بتایا

یہ کہانی یوں بھی شروع ہو سکتی تھی کہ ایک تیس سال کا پینٹر تھا اور ایک دبئی یا کسی بھی عرب ممالک میں رہنے والی لڑکی تھی۔ لیکن حسین کے لئیصرف لڑکی ہونا، محبت کے لئے کافی نہیں تھا۔ اور وہ بھی تب۔ جب ایک عمر نکل جانے کے بعد بھی ایک عمر آپ میں چھپی بیٹھی رہ جاتی ہے۔ یہ پوچھنے کے لئے کہ میں ہوں تو مجھے جیتے کیوں نہیں ہو۔

'وہ کیسے ملی......؟'

حسین کے لفظوں میں...... پہلی بار لگا، وہ لڑکی دیکھتے دیکھتے میرے سامنے ایک پینٹنگ میں بدل گئی ہو۔ ایزل، کینواس، برش، رنگ...... اس پینٹنگ میں سب کچھ تھا۔ لیکن لڑکی غائب ہو گئی تھی۔ لڑکی کی جگہ......'

'گھوڑے نے لے لئے تھے۔' میں مسکرایا۔ دلّی کی نمائش گاہ میں اس کی جس پینٹنگ کی، میں نے سب سے زیادہ داد دی تھی، وہ وہی دو گھوڑے تھے۔ دو وجیہہ گھوڑے۔ حسین ایرانی گھوڑے...... آپس میں گلے ملتے ہوئے...... کاغذ کے کینواس پر پنسل کی باریک لکیروں سے، ان دو گھوڑوں نے جنم لیا تھا۔

'کیا یہ تم ہو، حسین؟'

''آہ نہیں۔ لیکن تم قریب قریب پہنچ رہے ہو۔''

'کیا ان میں سے ایک گھوڑا ہندستانی ہے اور ایک......'

'نہیں...... حسین پر اس بار پینٹنگ والی لڑکی حاوی ہو گئی تھی......''اس سے پہلے میں نہیں جانتا تھا۔ عورتیں، مردوں کی کمزوری سے کس حد تک واقف رہتی ہیں...... اور شاید وہ اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی بھی کوشش کرتی ہیں۔ لیکن شاید اپنی ان کمزوریوں کو مرد بھی پہچانتا ہے۔ مرد ان کمزوریوں سے واقف رہتا ہے...... اس وقت بھی جب عورت اس کی کمزوری کا فائدہ اٹھا رہی ہوتی ہے...... لیکن آہ، عورت کبھی مرد کی اس طاقت کو نہیں پہچان پائی...... جس کے بارے

میں وہ جان لے تو شاید عورتوں کا کوئی مسئلہ ہی نہیں رہے۔ کیونکہ ان کی پہچان کا ایک راستہ مرد کی طاقت سے بھی ہو کر گذرتا ہے۔ حسین کہتے کہتے ٹھہر گئے تھے۔

''وہ میرے دوست کی بہن تھی اور اس دن، میرا دل بار بار کہہ رہا تھا، حسین کچھ ہونے والا ہے...... یہ اندر کے گھوڑے کی بے چینی تھی، جس نے اپنے علاج کے لئے ڈاکٹر دوست کا گھر دیکھ لیا تھا۔

''میں اپنے اسی لباس میں تھا۔ کرتا پانجامہ اور جیسا کہ میں عام طور پر پہنتا ہوں۔ کرتے پر کالے رنگ کی ایک صدری یا بنڈی۔ آپ جو بھی نام دے دیں۔ کال بیل پر اُنگی رکھتے ہوئے بھی میرے ہاتھ لرز رہے تھے۔''

اور وہ آئی...... وہ سامنے کھڑی تھی۔ تصویر ساکت تھی۔ وہ مجسم، میری اس پینٹنگ میں بدل گئی تھی، جو میں نے اب تک نہیں بنائی تھی۔ کیا یہ کیوپڈ کا تیر تھا؟ لمحہ رک گیا تھا اور پینٹنگ ساکت تھی۔

ایک بہت ہی عام چہرہ جیسا کہ میں ہوں......

اور ایک بے حد خاص چہرہ جیسا کہ وہ تھی......

ایک بے حد عام سا مرد...... اور بے حد خاص سی لڑکی......

ہم دونوں دروازے پر تھے۔ ایک دروازے پر ہاتھ رکھے...... اور دوسرا دروازے کے باہر۔

خاموش ان لمحوں کا جادو ایسا تھا کہ کسی حسین پینٹنگ کی طرح میں اسے آنکھوں کے کینواس پر قید کر رہا تھا۔ بکھری ہوئی زلفیں۔ آسمانی رنگ کی شلوار قمیض...... اسی رنگ سے میچ کرتا ہوا دوپٹہ...... دوپٹہ ہڑبڑاہٹ میں، اس کے کندھے سے ہوتا ہوا سینے پر جھول گیا تھا۔ وینس دی میلو۔ خوبصورت آدھے کٹے ہاتھوں والی عورت اور اس کا بُراق حسین سینہ۔ وہ سینہ مصفّٰی وہ دو قبہ نور...... یقیناً وہ حسین تھے اور بھرے بھرے۔ اس کے ہونٹ موٹے تھے۔ موٹے ہونٹ میری کمزوری ہیں۔ موٹے اور رسیلے۔ وہ تو وینس دی میلو تھی۔ لیکن میں کیا تھا......؟

وہ مجھ میں کیا دیکھ رہی تھی۔

میں اس پر نثار ہو رہا تھا اور چاہتا تھا، وہ اپنے لئے میری اس کمزوری کو محسوس کرے۔

''عمر۔ عمر کیا ہوگی اس کی؟''

ان جادوئی خاموش لمحوں میں، میں اس کی عمر کی، رواں سڑک سے گزر رہا تھا۔ سولہ، اٹھارہ یا زیادہ سے زیادہ بیس...... یا عمر کہیں کسی سرکش گھوڑے کی طرح ٹھہر گئی تھی...... ندی بہہ رہی تھی۔

پھر ندی ایک دم سے ٹھہر گئی۔

وینس کو اپنے ہونے کا احساس ہو گیا تھا......

'دیکھئے۔'

میں نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ ''میری طبیعت خراب ہے۔ اس وقت بھی بخار سے جل رہا ہوں۔ فرقان میرے دوست ہیں اور آپ کے ملک میں میرا ساتواں دن ہے...... آنے سے قبل، پاکستان سے فرقان سے میری فون پر بات ہوئی تھی''

اس کی آنکھوں میں نشہ تھا۔ وہ ہرن کی طرح لہرائی...... ندی کی لہروں کی طرح گھومی...... دوپٹہ کو ریشم کی ڈوری کی طرح نچایا...... اپنی 'لانبی' گردن کو جنبش دی۔

مجھے اندر آنے کے لئے جگہ دیا۔ مسکرائی۔

''آجائیے۔ فرقان میرے بڑے بھائی ہیں''۔

ڈاکٹر فرقان، پینٹنگ اور وہ

' وہ بات بات پر ہنس پڑتا تھا۔ یا یوں کہیے، اسے ہنسنے کی بیماری تھی۔ یا یوں کہیے، ہنسنا اس کے لئے مریضوں کو 'رجھانے' کا ایک شغل بن چکا تھا۔ مجھے یقین تھا وہ رات میں سوتے سوتے بھی بلاواسطہ ہنستا ضرور ہنستا ہوگا۔ تو یہ ڈاکٹر فرقان تھا۔ (نہیں، آپ اس آدمی یا اُس کی کہانی پر تعجب مت کیجئے، جس کے بارے میں، بعد میں معلوم ہوا کہ فرضی اور جعلی ڈگریوں کے حوالے سے اس نے نہ صرف میڈیکل کی ڈگری حاصل کی۔ بلکہ دبئی تک کا سفر بھی کر آیا۔ بہر کیف ان باتوں کا کہانی سے کوئی زیادہ تعلق نہیں ہے) مجھے تعجب تھا، اتنی حسین لڑکی ڈاکٹر فرقان کی بہن کیسے ہو سکتی ہے اور اس سے مسلسل، باتیں کرنے کے دوران مجھے یہ خیال بھی پیدا ہو رہا تھا کہ اس جیسے کسی ڈاکٹر کو یعنی جس کا تاثر چہ کرنے والا پیشہ اس کے چہرے پر بھی لکھا ہوتا ہے، کی کوئی بہن نہیں ہونی

چاہئے......بہن اور وہ بھی اتنی خوبصورت۔

'ہو..ہو...ڈاکٹر فرقان پھر ہنسا......تو اب بھی تمہاری وہی عادت ہے، یعنی آڑی ترچھی لکیریں..ہوہو..

وہ ہنس رہا تھا۔

وہ سامنے آکر کھڑی ہوگئی تھی۔ مسکرا رہی تھی۔

''تو آپ پینٹنگ بناتے ہیں؟''

ہو..ہو۔ڈاکٹر فرقان کو اپنی بے کار کی ہنسی پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔

'آیئے۔آپ سے کچھ پینٹنگ کے بارے میں باتیں کرتے ہیں......کھڑے کھڑے

اس نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔ انتہائی شفاف۔ لانبی مخروطی انگلیاں......کیا یہ وینس دی میلو کی انگلیاں ہیں۔آج اس کا دوپٹہ غائب تھا۔ کھلے گلے سے 'قبہ نور' کے دیدار کے لئے آج اس نے میری مسحور نظروں کو روکا یا ٹوکا نہیں تھا۔ جی بھر کر دیکھنے دیا تھا۔ اس کی انگلیاں گرم تھیں۔ ہتھیلیاں، آگ کا گرم انگارہ بن گئی تھیں۔

ڈاکٹر فرقان ہنس رہا تھا...... پینٹنگ۔ ہوہو..جاؤ میری بہن اس موضوع پر تم سے کچھ زیادہ اچھی باتیں کرسکتی ہے......ہوہو..

اس نے ہاتھ تھامے ہوئے اپنی بہن کو کچھ ایسی نظروں سے دیکھا، جیسے عام طور پر وہ اپنے مریضوں کو دیکھتا ہوگا۔

اس کی آواز سرد تھی۔ جیسے کسی گہرے کنویں سے آرہی ہو۔

'بھیا ایسے ہی ہیں...... ہمیشہ سے۔ یعنی پورے ڈاکٹر......'

ہم بالکونی میں تھے۔ پلاسٹک کی کرسیوں کے پاس کی جگہ ایک چھوٹے سے گارڈن کا نمونہ پیش کر رہی تھی۔ جہاں ہم بیٹھے تھے، وہاں سے آسمان پتوں کی قطار سے جگمگاتا ہوا، کچھ زیادہ ہی گہرا نیلا ہوگیا تھا۔ اس نے نظر جھکائی۔ بائیں ہاتھ کی انگلیوں کو دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے تھام لیا۔ وہ اپنے ناخنوں پر لگی پالش سے کھیل رہی تھی۔

''تہذیب نے آرٹ کو جنم دیا اور آرٹ نے تہذیب کے لئے راستے پیدا کئے...... پہلے تہذیب پیدا ہوئی یا پہلے آرٹ؟ پہلے بیج پیدا ہوا یا پہلے درخت؟...... مجھے لگتا ہے، پہلے پہلے

ایموشنس ،رہے ہوں گے۔ جذبات......دو آنکھوں، دو دریا اور دو دلوں کے بیچ...... جیسے ندی میں کنکری پھینکو۔ پہلے پہلے کسی نے اس کنکری کی چیخ سنی ہوگی......اور اس چیخ کو'پاشان' والوں نے کسی درخت کے کھوکھل یا زمین کے ماتھے پر لکھ دیا ہوگا۔ آرٹ پہلے آیا اور تہذیب......؟''

اس نے کنچوں والے جھولتے گل دستے سے ایک پتہ توڑ لیا...... ''تہذیبیں کتنی آگے نکل گئیں۔ اسٹون، کوپر اور آئرن ایج کے انسان نے اپنے ہر کرشمہ کے لئے آرٹ کو آواز دی ہوگی......؟ ہے نا؟'' وہ میری طرف گھومی تھی۔

''تم پینٹر، عورت میں کیا دیکھتے ہو......؟''

وہ جھکی تو اس کے قبہ نور کے شعلے انگاروں کی بارش کرنے لگے۔ اس نے مجھے اپنے جادو میں تیرنے دیا۔ ذرا توقف کے بعد وہ پھر بولی۔

''تم نے جواب نہیں دیا۔ تم لوگ عورت میں کیا ڈھونڈھتے ہو۔؟' ایک ننگا جسم؟ وہ میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی...... گداز بانہیں، حسین چکنے پاؤں، جیسے ایک چکنی سڑک اور......وہ مسکرا رہی تھی۔

پھر اس کی مسکراہٹ کچھ زیادہ ہی گہری ہوگئی......

'کیا تم مجھے دیکھنا چاہو گے......؟'

اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ وہ اٹھی۔ میرا بدن لرز رہا تھا......اٹھتے اٹھتے میں نے دیکھا اس نے جھولتے گلدستہ سے جو پتہ توڑا تھا۔ اس کے ٹکڑے زمین پر بکھر گئے تھے۔

ڈاکٹر فرقان! میرے لب تھرتھرائے۔

'نہیں۔ وہ مریضوں کو دیکھنے جا چکے ہیں اور شام کے 8 بجے سے قبل لوٹیں گے بھی نہیں۔'

وہ مجھے اپنے بیڈروم میں لے آئی تھی۔ آگے بڑھ کر پچھم کی طرف کھلنے والی کھڑکی اس نے بند کردی۔ پردہ کھینچ دیا۔ بلب روشن کردیا۔ مجھے صوفہ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر میز پر، کتابوں کے درمیان سے کچھ تلاش کرنے کی کوشش کرتی رہی...... پھر تیز تیز میرے قریب آکر، البم سے ایک تصویر نکال کر ہنس پڑی۔

''پہچانو۔''

تصویر میں ایک سال کی بچی، نہانے والی بالٹی کے پاس کھڑی رو رہی تھی۔ ایک عورت ہاتھ میں پانی کا مگ لئے کھڑی مسکرا رہی تھی......

''یہ میں ہوں، اس نے بچی کی طرف اشارہ کیا......'' اور یہ ماں ہے۔'' اس کے چہرے پہ معصوم شرارت تھی۔

'دیکھ لیا مجھے۔ اس بچی کو ایک پینٹنگ میں کتنا بڑا کر سکتے ہو؟...... میرے برابر؟...... پھر وہ یہ رہی۔ یا یہ میں بن گئی......؟''

''اس بچی نے کچھ بھی نہیں پہنا ہوا ہے۔'

'اور میں لباس سے ہوں'۔

وہ ہنس رہی تھی...... کمال تو تب ہے جب تم اس بچی کو ربر کی طرح کھینچ کر پینٹنگ میں ڈال دو۔ ڈال سکتے ہو......؟

مجھے گھبراہٹ ہو رہی تھی

'تو کیا یہ میں ہوں گی حسین......؟ یعنی، میں جو بھی ہوں۔ یا وہ بچی ہوگی، جو اس تصویر میں ہے اور جو نہانے کے نام پر رو رہی ہے۔ برہنہ''

'تم یہ بات کس طرح جاننا چاہتی ہو؟'

'پتہ نہیں۔'

'اس بچی کو اگر ربر کی طرح کھینچا جائے تو......' میں بچی اور اس کے چہرے کو تول رہا تھا ''بچی میں تم نہیں ہو اور تم میں بچی نہیں ہے''۔

—— 'یہ میری بات کا جواب نہیں ہوا'

اس بار میرا لہجہ سخت تھا—— سنو، پریم پجاری...... امتحان مت لو میرا۔ پینٹنگ کی زبان میں یہ دونوں الگ چہرے اور جسم رکھتے ہیں۔ تمہیں چھوٹا کروں تو اب کی تم کل والی اس بچی میں داخل نہیں ہو سکتی...... اور بچی کو ربر کی طرح کھینچوں تو، یہ تمہاری طرح آگ نہیں بن سکتی۔'

''پینٹنگ کی زبان چھوڑ کر زندگی کی زبان میں بات کرو تو......'' وہ مسکرا رہی تھی۔

''بچی کے ساتھ سیکس کا خیال نہیں ابھرتا اور تمہارے ساتھ''

اس نے گرم ہتھیلیاں میرے ہونٹوں پر رکھ دیں——

قبۂ نور، کو اب لباس کی ضرورت نہیں تھی——

وہ ناچی، اچھلی، تڑپی اور میرے جسم میں سما گئی......

یہ پہلے گھوڑے سے میری ملاقات تھی......

○○

کمرے میں ٹپ ٹپ بارش رک چکی تھی۔

''برسوں پہلے موہن جوداڑو کی کھدائی سے ـــــــ تمہیں یاد ہے...... سفید چادر میں اس کے ہلتے پاؤں نے میرے ننگے پاؤں پر اپنا گداز بوجھ ڈال دیا تھا ـــــــ تمہیں یاد ہے حسین، وہ آرکائیو والوں کے لئے یقیناً ایک انوکھی، قیمتی اور مہنگی چیز تھی۔ مجھے یاد کرنے دو......ایک عظیم بھینسا، رانجھس جیسا...... بڑی بڑی سینگیں...... لیکن چھوٹا سر...... دونوکیلی سینگیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں...... میں نے یہ تصویر کسی امریکن میگزین میں دیکھی تھی...... لیکن، مجھے یاد رہ گئی۔ پتہ ہے، وہ عظیم بھینسا کون تھا۔ وہ تم تھے حسین!''

وہ اچھلی...... سفید چادر اس کے اجلے نرم ملائم بدن سے پھسل کر اس کی جانگھوں تک چلی گئی تھی ـــــــ

''تم اس وقت بھی تھے۔ موہن جودڑو کی تہذیب میں۔ ایک عظیم بھینسے کی صورت میں۔ لیکن اس وقت میں کہاں تھی حسین......؟''

وہ تارکول کی طرح میرے بدن پر پھسل رہی تھی...... ''میں بن رہی تھی شاید...... ہر بار بننے کے عمل میں تھی۔ عیسیٰ قبل کئی صدیاں پہلے یونان میں...... کبھی 'پارتھنیان'، کے آدھے گھوڑے آدھے انسانی مجسمے کی صورت...... کبھی وینس اور 'اپالو' کی پینٹنگ میں...... کبھی لیونارڈو دی ونچی کی مونالزا اور جن آف راکس، دی میڈونا اینڈ چائلڈ اور باچیوز میں...... اور کبھی رافل، رمبراں اور جان اور میر کی تصویروں میں......''

وہ کچھوے کی طرح پھدکی۔ میرے پاؤں کے انگوٹھے کو اپنے ہونٹوں میں بھرا...... پھر اچھل کر میرے پاؤں کے بیچ و بیچ آ کر بیٹھ گئی......

''سچ کہنا، مونالزا کا صرف چہرہ مسکراتا تھا اور میرا جسم......''

''لیونارڈ دی ونچی نے تمہیں نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے وہ جسم کی ایسی کسی مسکراہٹ سے واقف نہیں تھا۔''

''کیا میں مائیکل انجلو کا تصور ہوں؟''

''تم ایک حسین بدن کا تصور ہو''

''کیا میں......''

میں نے اپنے چیختے بدن کو ایک بار پھر اس کے حوالے کر دیا تھا......

''تم ایک گھوڑا ہو اور یقیناً یہ گھوڑا پارتھینان کے گھوڑے سے مختلف ہے......''

اور اسی کے ساتھ میں نے اس کے جسم کے دریا میں چھلانگ لگا دیا تھا......

خالی کینواس، ننگا بدن اور چھلاوہ

اس رات، بلکہ یوں کہیے ساری رات میں خود سے لڑتا رہا......'ایزل' کسی ایرانی گھوڑے کی طرح تنا ہوا، کورے کینواس کا بوجھ اٹھائے تھا......اور کینواس کا 'کورا بدن' میرے ہاتھوں کی انگلیوں کے تعاقب میں تھا۔ رنگ بھرے جانے تھے۔ لیکن رنگ کون بھرتا۔ پینسل کا پورا ڈبہ بلیڈ کی حیوانیت کی نذر ہو چکا تھا۔ سفید کاغذ پر دھبے جمع ہو رہے تھے۔ پارتھینان کا آدھا گھوڑا، آدھا انسان۔ ایک سرکش ندی کا بدن......خیال آ رہے تھے۔ مچل رہے تھے......اور اس کے مخملی بدن سے پھسلتے ہوئے لوٹ جا رہے تھے۔ آدھی جل مچھلی، آدھا گھوڑا......یہ بھی نہیں۔ مکمل گھوڑا۔ یہ بھی نہیں۔ اس کا بولتا بدن......چیختا بدن......اس کے موٹے، پھل کے رس سے بھرے ہونٹ۔ میں بار بار اس کی زندہ پینٹنگ میں دفن ہوا جا رہا تھا۔ پھر میں نے سوچ لیا۔

''کیا؟''

میں یہاں رہا۔ تو میں مر جاؤں گا۔ ٹھیک اپنے کینواس کی طرح —— کورا......میں اس کا جسم بن جاؤں گا۔ کیونکہ سمندر کو، ندیوں کو ضم کرنے کا حق حاصل ہے......وہ سمندر تھی اور 'تم ندی تھے؟......'

''میں ندی بھی نہیں تھا۔ میں ندی کی معمولی لہر بھی نہیں تھا......اور وہ......بلا خیز طوفان تھی۔ اس نے مجھے......آسمان سے باتیں کرنے والا، دو عظیم سینگوں والا بھینسا غلط کہا تھا۔ دراصل''۔

''مطلب......؟''

''موہن جوداڑو کی تہذیب سے نکلے جس مجسمے کی تصویر کو اس نے امریکن میگزین میں دیکھا تھا'' وہ...... وہ خود تھی۔ وہ مجھے خوش کر رہی تھی۔ سمندر ندیوں کو پی کر مہان بننے کا ہنر جانتا ہے۔ یہ ایک طرح سے ایگو پرابلم تھا۔ میں ایسی کوئی ندی نہیں بننا چاہتا تھا جسے سمندر آسانی سے ہضم کر ڈالے۔ ندی سہی، لیکن میں ندی بن کر ہی اپنے آرٹ کو زندہ رکھنا چاہتا تھا۔''

''پھر۔؟''

''اس سنسنی خیز حادثے کے بعد میں وہاں دو دن اور رہا۔ دو دنوں میں، میں نے اپنی واپسی کی پوری تیاری کر لی۔ اس درمیان ڈاکٹر فرقان کے کئی فون میری تلاش میں آئے۔ لیکن میں کسی بھی طرح اپنی واپسی کی اطلاع کو اس سے چھپا کر رکھنا چاہتا تھا۔'

''تو کیا یہ ممکن ہوا۔؟''

''آہ۔ نہیں۔ فلائیٹ میں چار گھنٹے باقی رہ گئے تھے۔ دو بڑے بڑے سامان پیک ہو کر دروازے کے پاس رکھے تھے۔ بیل بجی۔ میں نے دروازہ کھولا...... سامنے، سمندر کی شانت لہریں میری طرف دیکھ رہی تھیں...... اسے میرے واپس جانے کی خبر مل گئی تھی......

''جاؤ''......

وہ ایک بے حد ''اچھالدار'' لہر تھی...... ''مگر یاد رکھو، میرا بدن تمہارے بدن میں رہ گیا ہے۔ کیا اس بدن کو بھول سکو گے؟۔''

جانے سے پہلے وہ پلٹی...... ''اور یاد رکھو۔ یہ پارتھینان کے آدھے انسان کا بدن یا وینس دی میلو نہیں ہے۔''

''سنو۔''

جانے سے پہلے، اسے آخری بار دیکھ کر، میں نے اپنے آنسو چھپا لئے تھے ــــــ ''برسوں پہلے تمہارے جنم میں میں نے اپنا جنم رکھ دیا تھا...... آواگون کو مانتی ہو تو ہم پہلے بھی ملے تھے اور ہم...... پھر ملیں گے......''

دروازے پر کوئی نہیں تھا۔

میری فلائیٹ کا وقت قریب آ چکا تھا۔

دو گھوڑے

قارئین!

سب سے پہلے میں آپ کی توجہ ایک بے حد خاص موقع کے لئے، بنائی گئی اس بے حد خاص پینٹنگ کی طرف مبذول کرانا چاہوں گا...... اس پینٹنگ میں دو گھوڑے ہیں۔ دو حسین گھوڑے۔ یہ گھوڑے جوناتھن سوئفٹ، کے خیالی گھوڑوں کی طرح خوبصورت بھی ہیں اور وجیہہ بھی...... یعنی دو بے حد حسین ایرانی نسل کے شاندار گھوڑے...... ان کے دو پاؤں دھرتی پر اور دو ہوا میں معلق ہیں...... اس طرح جیسے یہ کوئی بہت اہم پیغام لے کر ایک دوسرے کے گلے مل رہے ہوں۔ یہ پینٹنگ میری ڈرائنگ روم کی زینت ہے۔ یعنی ایک بے حد خاص موقع کے لئے بنائی گئی...... پینٹنگ...... اور ایک بے حد خاص دوست کی طرف سے ____ اور جیسا کہ پہلی بار دلّی کی نمائش گاہ میں جیتے جاگتے ان دو گھوڑوں کے ملاپ پر، شیشے کے اوپر سے ہاتھ پھیرتے ہوئے میں نے حسین سے پوچھا تھا......

''کیا ان میں سے ایک ہندستان ہے؟''

حسین کی آنکھوں میں چمک تھی......

''اور دوسرا پاکستان......؟''

اور جواب کے طور پر حسین نے کہا تھا...... ''آہ نہیں، لیکن اب تم قریب قریب صحیح جگہ پہنچنے کی کوشش کر رہے ہو۔''

پاکستان جانے سے پہلے حسین کا ایک مختصر دستی خط مجھے ملا تھا۔ ''آپ کی پینٹنگ چھوڑے جا رہا ہوں۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے، یہ پینٹنگ آپ کو وہیں رفیع مارگ، اسی بلڈنگ میں مل جائے گی جہاں میری تصویروں کی نمائش لگی تھی۔''

اور اس طرح، قارئین، بے حد خاص موقع پر بنائی گئی وہ پینٹنگ میرے گھر، میرے ڈرائنگ روم کی زینت بن گئی...... لیکن یہ کہانی چونکہ انہی وہ گھوڑوں کی مدد سے شروع ہوئی ہے اور اس کے خالق حسین ہیں، اس لئے حسین کے بارے میں کچھ اہم اطلاعات آپ تک پہچانا ضروری

ہے۔

تقسیم وطن کے دو ایک سال بعد، جب مارکاٹ میں کچھ کمی آ گئی تھی، ہندستان، پاکستان دو آزاد ملکوں کے طور پر اپنے قدم مضبوطی سے جمانے کی تیاریاں کر رہے تھے...... یہ وہی وقت تھا جب نوابوں کے شہر لکھنؤ کی ویران بستیوں میں حسین کا جنم ہوا تھا۔ ویران بستیاں...... مجھے اپنے الفاظ پر شرمندگی ہے۔ لٹا تو پورا ملک تھا، بلکہ بٹوارے میں تو دل اور دماغ بھی بٹ گئے تھے...... لیکن لکھنؤ کی تہذیب کا خون کچھ زیادہ ہی ہوا تھا____ یہ ایک الگ کہانی ہے کہ لکھنؤ چھوڑ کر حسین کا خاندان پاکستان کیوں آباد ہو گیا____ ظاہر ہے، کچھ تو وجہ رہی ہوگی۔ امین آباد کی انہی سونی گلیوں میں سے ایک میں ڈاکٹر فرقان کے والد، والدہ کا گھر آباد تھا، جن سے بچپن میں حسین کے مراسم تھے...... ہاں 'پاکستان جانے تک وہ لڑکی، جس کا ذکر کہانی کے شروع میں بار بار آیا ہے، کا دور دور تک وجود نہیں تھا____ فرقان پانچ ساتھ برس، حسین سے بڑے ہوں گے____ اور پاکستان سے دبئی جاتے ہوئے حسین کو اتفاقیہ طور پر ان کا پتہ ملا تھا...... لیکن حسین کو کیا خبر تھی کہ اس غیر ملک میں ایک بہت عجیب خبر، ایک بے حد خاص خبر میں بدلنے کے لئے ان کا انتظار کر رہی ہے۔

تو میں اس پینٹنگ کی بات کر رہا تھا، جو میرے ڈرائنگ روم میں آویزاں ہے۔ (اور پینٹنگ کے پہلے گھوڑے کی کہانی آپ حسین کی زبانی آپ سن چکے ہیں۔)

''دوسرا گھوڑا......''

ہم ہوٹل جن پتھ کے 'بار' میں تھے۔ یہ حسین کے واپس جانے سے دو دن قبل کا واقعہ ہے۔ حسین تین پیک لے چکے تھے اور حقیقتاً، کہنا چاہئے آنکھوں کی تھرکتی پتلیاں، ایک بار پھر کانچ کی گولیاں بن گئی تھیں۔

''قصوں سے کہیں زیادہ پُر اسرار ہوتی ہیں سچی کہانیاں''

''بچپن میں لکھنؤ چھوڑا۔ پاکستان آباد ہو گیا۔ 80ء کے آس پاس دبئی گیا۔ یعنی اچھے کام کی تلاش میں۔ تب عمر ہو گئی یہی کوئی تیس کے آس پاس...... ڈاکٹر فرقان کی بہن ٹکرائی...... اور میں واپس پاکستان لوٹ گیا''

''پھر......''

حسین نے ایک بڑا سا پیگ بنایا۔ اس کی آنکھوں میں نشہ اتر رہا تھا۔

OO

یعنی یہ پچھلے سال گرمیوں کا ذکر ہے...... سن 2001ء کے اگست ستمبر کا مہینہ...... اس خوبصورت حادثہ کے 22-20 برس بعد 'پیس مشن' سلسلہ میں حسین کو ہندستان کے دوسرے فنکاروں کے ساتھ ویزا ملا تھا۔ ویزا کے مطابق وہ دلّی کے علاوہ اپنے وطن لکھنؤ جا سکتے تھے۔ سیاسی سطح پر ہندو پاک کے تعلقات اس حد تک خراب ہو چکے تھے کہ فنکار اور دانشوروں کا طبقہ ان دنوں لگاتار پاکستان سے پیس مشن پر ہندستان آ رہا تھا____

لیکن۔ کیسا پیس مشن......؟ جہاں دلوں کو سیاسی دیواروں نے بانٹ رکھا ہو، وہاں شانتی اور امن کے پیغام بھی بے معنی لگنے لگتے ہیں...... شاید اسی لئے ان دو گھوڑوں کی محبت بھری ادا کو دیکھ کر میں نے پوچھا تھا۔ ان میں سے ایک ہندستان ہے اور دوسرا......'

نمائش گاہ سے باہر نکل کر حسین نے مجھے چونکا دیا تھا۔ ''یقین کرو گے یہ میری تازہ پینٹنگ ہے۔''

''یعنی......''

''دوبئی میں اس رات جو کینواس ادھورا رہ گیا تھا، وہ لکھنؤ مسعود نیّر کے شہر سے واپسی پر کل رات میں نے پورا کیا۔

''مسعود نیّر؟''

'فرقان کو مذاق مذاق میں، ہم لوگ مسعود نیّر بھی کہتے ہیں۔ (اور جس کے، میڈیکل کی جعلی ڈگری لے کر دبئی آنے کا تذکرہ آپ پہلے سن چکے ہیں)

''ممکن تھا، میں اس رات جانے کا ارادہ ترک کر چکا ہوتا۔ ممکن تھا، میں نے پینٹنگ بنائی ہوتی۔ لیکن میرا یقین ہے۔''

حسین نے زور سے میز پر ایک مکا مارا۔ بار میں بیٹھے دوسرے لوگوں نے پلٹ کر حسین کی طرف دیکھا۔ حسین کی آنکھوں میں دھیرے دھیرے مدہوشی چھانے لگی تھی۔

''شاید میرا اپیس مشن پر آنا کامیاب ہو گیا تھا۔ تمہیں یاد ہے نا؟ وہ ہماری آدھی ملاقات تھی جب اس نے کہا تھا، کیا تم اس بدن کو بھول سکو گے۔ ہاں، مجھے اس کی ایک ایک بات یاد رہی اور پورے بیس بائیس برسوں تک ـــــ پاکستان کی آمرانہ فوجی حکومت...... سیاسی اتھل پتھل اور زندگی کے ہنگاموں کے دوران کا ہر لمحہ...... وہ چہرہ میری آنکھوں کے سامنے رہا...... وہ لفظ میرے کانوں میں گونجتے رہے......' یہ پارتھنیان کے آدھے انسان کا بدن یا وینس دی میلو نہیں ہے...... میں جینے کی کوشش کرتا تھا اور سمندر کی لہریں اچانک اچھلتی، گرجتی چاروں طرف سے۔ مجھے اپنے قبضہ میں کر لیتی تھیں...... میں نے سوچا تھا، اس سے دور جا کر میں جیت جاؤں گا...... مگر نہیں۔ شاید 22-20 برسوں تک...... اس سے الگ کی ایک لمبی زندگی ـــــ شاید میں سچ مچ ندی تھا اور سمندر کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ مجھے اپنے میں ضم کر لے...... وہ دور رہ کر بھی سمندر رہی...... اور میں اتنے طویل برس لگاتار اسی سمندر میں تیرتا ابھرتا رہا...... ہاں پارتھینان کے آدھے گھوڑے والے حصے کو اپنی ناکامی کے طور پر کاغذ کے کینواس پر رنگ دے چکا تھا مگر......

''دوسرا گھوڑا......؟''

حسین مسکرائے...... بوتل خالی پڑی تھی۔ گلاس بھی خالی تھا۔ نیپکن سے ہاتھ پوچھتے ہوئے حسین نے گلاس پلٹ کر ٹیبل کر رکھ دیا۔

''لکھنؤ گیا تو معلوم ہوا مسعود نیّر دبئی کی پریکٹس چھوڑ کر واپس آ گیا ہے۔ (واپس آنے کی وجہ وہی جعلی ڈگری تھی۔ یعنی مسعود نیّر نے زندگی بھر جو کچھ کمایا وہ سب جعلی ڈگری کے عوض تھا)۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا، وہ بیمار رہ رہا ہے۔ میں اس کی عیادت کے لئے گیا اور...... لکھنؤ میں امین آباد کی، انہی ویران گلیوں میں سے ایک میں، ذرا سا پوچھتا چھ کرنے پر اس کا مکان مل گیا۔ میں نے دروازہ پر دستک دی اور مسعود نیّر کے دروازہ کھولنے کے انتظار میں کھڑا رہا......

کیا آپ......؟

حسین کے چہرے پر نشہ کا دور تک نام نہیں تھا...... کیا آپ جنم جنمانتر کا بندھن یا آواگون پر یقین رکھتے ہیں؟ مجھے میرے لفظ یاد آئے، جو میں نے آخری بار اس کے واپس جاتے قدموں کو روک کر ادا کئے تھے۔ ''برسوں پہلے تمہارے جنم میں، میں نے اپنا جنم رکھ دیا تھا......''

دروازہ کھولنے والی وہی تھی...... وہ ذرا سی بجھ گئی تھی۔ لیکن 22-20 برس کے فاصلے کو بہت زیادہ اس میں محسوس نہیں کیا جاسکتا تھا...... اس نے 'ول پال' کی پینٹنگ کی طرح بہتے ہوئے پانی اور بہتی ہوئی ہوا کو ہاتھ کے اشارے سے، آدھے میں ہی روک رکھا تھا____ مجھے دیکھ کر اسے ذرا بھی تعجب نہیں تھا۔ یہ سب کچھ ایسا تھا، جیسے میں اپنے ہی گھر میں، صبح آفس سے گیا گیا شام کو واپس گھر لوٹ آیا تھا۔ ہاں، اس کی آنکھیں تھکی تھکی تھیں۔ لیکن ان آنکھوں میں اس نے ایک لمبا انتظار رکھ دیا تھا____ تو اس نے دروازہ کھولا۔ میری طرف دیکھا اور میرا، آخری ملاقات میں بولا گیا، میرا ہی جملہ میرے سامنے رکھ دیا......

''آواگون کو مانتی ہوں۔ ہم پہلے بھی ملے تھے اور ہم پھر مل رہے ہیں۔''

''کون ہے؟'' اندر سے ڈاکٹر کی آواز آئی تھی۔

''ہو ہو..ہو..آڑی ترچھی لکیریں..ہو ہو...... آدھی ہنسی کے راستے میں دمہ کے مرض نے اسے بے چین کر دیا تھا...... کم بخت کھانسی۔

''تم لوگ باتیں کرو'...... اندر جاتے ہوئے میں نے ڈاکٹر فرقان کا غور سے جائزہ لیا۔ ان برسوں نے اسے ایک بدنما شخصیت میں تبدیل کر دیا تھا۔ پھولا پیٹ۔ بدن پر چڑھی ہوئی کچھ زیادہ چربی۔ آنکھوں پر کالا چشما اور پیشانی پر سجدے کا داغ۔

سامنے آکر اس نے اپنی ہتھیلیاں میری طرف بڑھائیں۔

'یہ میرے دوسرے گھوڑے کا چہرہ تھا'۔

OO
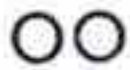
اور اس کے ٹھیک دو دن بعد ہی، میرے لئے ایک دستی خط اور ایک، دو گھوڑوں کا پورٹریٹ چھوڑ کر حسین پاکستان واپس لوٹ گئے تھے____ خط میں ایک جملہ اور بھی تھا، جسے میں نے جان بوجھ کر کہانی کے حسین اختتام کے لئے آپ سے چھپا کر رکھا تھا____ اصل میں حسین کے آنا فانا پاکستان بھاگنے کے پیچھے بھی ایک راز تھا اور اسی لئے خط کے آخر میں حسین نے تحریر کیا تھا...... ''مائی ڈیر، وہ لڑکی مجھ سے شادی کے لئے راضی ہو چکی ہے...... پاکستان جا کر بہت سے کام مکمل کرنے ہیں۔ میں بہت جلد واپس آؤں گا۔ عقد مسنونہ کے لئے۔ میرے لئے اپنے انتظار

کو سنبھال کر رکھنا۔ بس الٹی گنتی شروع کر دو۔ میں پہنچنے ہی والا ہوں۔ تمہارے ملک......اپنے ملک......"

دہشت گردی بنام جنگ اور حسین کی آمد

یہ وہ اُنہی دنوں کا واقعہ ہے جب ای میل سے مجھے حسین کا پیغام ملا تھا۔ میں آ رہا ہوں۔ میں بہت جلد تم سے ملوں گا۔ بائیس برسوں کی مسافت کم نہیں ہوتی یار......اور جب آپ نے محسوس کیا ہو کہ وہ برس تو آپ نے خرچ ہی نہیں کئے۔ دراصل ہم دونوں نے وہ 22 برس اپنی اپنی ذات کی تحویل میں رکھ کر، کنجی وقت کے والے کر دی تھی......وقت نے اب جا کر یہ کنجی ہمیں واپس کی ہے۔ یقین جانو، یہ ایک انوکھی شادی ہوگی۔"

○○

اور آپ جانئے، یہ انہی دنوں کا واقعہ ہے، جب دنیا کی تقدیر میں دہشت کے نئے باب لکھے جا رہے تھے۔ قارئین! یہ کہانی کی مجبوری ہے کہ یہ اپنے وقت اور حالت کے تجزیے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی......'پرانے ہزارہ' کے تاریخی دھماکے ابھی کم بھی نہیں ہوئے تھے کہ نئے ہزارہ کی چیخوں نے انسانیت کی کتاب میں کتنے ہی لہولہو اب کا اضافہ کر دیا......11 رستمبر ورلڈ ٹریڈ سینٹر اور پنٹاگن پر دہشت گردوں کے ہنگامے کے بعد ہندو پاک کے درمیان کشیدگی بڑھتی چلی گئی......
پھر 13 ردسمبر ہندستانی پارلیامنٹ پر دہشت پسندوں کے حملے کے بعد صورت حال آہستہ آہستہ جنگ میں تبدیل ہوتی چلی گئی......نتیجہ کے طور پر اپنی اپنی سطح پر دونوں ہی ملکوں نے کئی بھیانک قدم اٹھائے۔ ــــــ ہندستان نے نہ صرف اپنا سفارت خانہ بند کیا بلکہ اپنے ہائی کمشنر بھی واپس بلا لئے......فضائیہ اڑانوں پر بھی پابندی لگا دی گئی......ابھی تعلقات کی سرحدوں پر آخری کیل ٹھوکنے کی کارروائی باقی تھی۔

اور وہ کارروائی تھی......ہندستان سے پاکستان جانے والی سمجھوتہ ایکسپریس اور بسوں کو بند کرنے کی کارروائی......

قارئین! ان پابندیوں کا وقت وہی تھا، جب حسین، اپنی بائیس برسوں کی گمشدہ محبت کو نیا عنوان دینے کے لئے ہندستان آنے والے تھے...... یعنی سمجھوتہ ایکسپریس سے باراتیوں کا قافلہ آنے والا تھا۔

سرحدیں بارود اُگل رہی تھیں۔ واگہہ باڈر سے دلّی بس اڈے تک گھنا کہرا چھایا ہوا تھا۔ باہر سرد لہر چل رہی تھی۔ میں اپنے ڈرائنگ روم میں تھا۔

اچانک یوں ہوا...... پورٹریٹ سے حسین کے دونوں گھوڑے کودے اور میرے سامنے آکر کھڑے ہو گئے...... میں نے غور سے دیکھا۔ یقیناً یہ پارتھینان کے آدھے حصے والے گھوڑے نہیں تھے۔ یہ گھوڑے اپنے حسن میں مکمل تھے۔ لیکن یہ گھوڑے ٹھہرے نہیں، بلکہ پلک جھپکتے ہی ڈرائنگ روم سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے ڈرائنگ روم میں، دیوار پر آویزاں پورٹریٹ کی طرف دیکھا...... وہاں ایک خالی کینواس پڑا تھا۔ مجھے حسین کے الفاظ شدت سے یاد آرہے تھے۔

''سب سے بُری خبر لکھی جانی ابھی باقی ہے۔ سب سے بُری خبر یہ ہوگی کہ محبت کرنے والے نہیں رہیں گے۔ سب سے بُری خبر کا تعلق محبت سے ہوگا دوست۔''

اور میں نے جوابی کارروائی کے طور پر کہا تھا...... ''سب سے بُری خبر آہستہ آہستہ لکھی جائے گی۔ جنگ اور دہشت کے ماحول میں''......

ooo

فزکس، کیمسٹری، الجبرا......

(اپنی بیٹی صحیفہ کے نام ___ کوئی نہ جانے ___ تم کو کیسے کیسے سوچا
میں نے ___ کیسے کیسے جانا میں نے ___!)

'نہیں انجلی۔ یہاں نہیں۔ یہاں میں پڑھ رہا ہوں، نا۔ یہاں سے جاؤ ___'
'لیکن کیوں پاپا'
'بس۔ میں نے کہہ دیا نا۔ جاؤ۔ کبھی کبھی سن بھی لیا کرو ___'
'پاپا۔ مجھے یہاں اچھا لگ رہا ہے۔'
'نہیں۔ میں نے کہہ دیا نا۔ میں کچھ ضروری کام کر رہا ہوں۔ سنا نہیں تم نے۔'
'پاss پاss' آواز میں ہلکی سی خفگی تھی ___ تمہارے پاس اچھا لگتا ہے مجھے۔'

OO

ہمت جتا تا ہوں۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کے قریب آتا ہوں۔ بن ماں کی بچی۔ دل میں بہت سارا پیار اُمڈتا ہے ___ اندر کے غصّے کو اس کے معصوم چہرے پر ہولے، سے رکھ دیتا ہوں ___ جیسے 'دیا سلائی' کے ننھے سے شعلے پر موم کو...... پتہ نہیں کتنا پگھلا ہوں ___؟ یا شاید پگھل گیا ہوں ___ اس کے سر پر آہستہ آہستہ انگلیاں پھیرتا ہوں۔

'میں تمہارے سامنے پڑھتی ہوں تو اس طرح ناراض کیوں ہوتے ہو؟'
انجلی 'ہنپا' ہے...... 'جاؤ نہیں بولتی۔'
'اچھا۔ ناراض نہیں ہو، نا ___ 'میں ہنس دیتا ہوں۔

'ہٹو' انجلی خوش ہو کر بچوں کی طرح مجھ پر بچھنا چاہتی ہے۔ میں پیچھے ہٹتا ہوں۔ اس کے ہاتھوں کو ـــــ نہیں۔ اس کے جسم کو ـــــ خود سے دور رکھنا چاہتا ہوں۔

'نہیں۔ نہیں انجلی۔ ٹھیک ہے...... بچپنا نہیں۔ اب بڑی ہو رہی ہو تم...... سمجھ گئی...... بڑی ہو رہی ہو۔'

''ہونہہ۔ پپا کے سامنے بڑے، بچے ہی رہتے ہیں۔'

'لیکن تم......'، بچی ہو ـــــ کہتے کہتے ٹھہر جاتا ہوں۔ انجلی حیرانی سے میرا منہ تکتی ہے۔

'تم کیا پاپا......'

مسکرانے کی کوشش کرتا ہوں ـــــ 'تم نہیں سمجھو گی، انجلی۔

انجلی منہ بچکاتی ہے ـــــ 'میں اب بڑی ہو گئی ہوں۔ میں اب سب سمجھتی ہوں پاپا۔ کبھی کبھی تم سمجھ میں نہیں آتے پاپا۔ لو، میں تمہارے پاس سے جا رہی ہوں۔ لیکن سنو، اکیلے کمرے میں مجھے ڈر لگتا ہے۔ اب میں تمہارے پاس ہی سویا کروں گی، پاپا ـــــ تمہارے ہی کمرے میں۔'

'میرے کمرے میں؟'

'کیوں، سب بچے سوتے ہیں۔'

'نہیں۔ میں نے اس لئے پوچھا کہ میں رات بھر لائٹ جلا کر کچھ نہ کچھ آفس کا کام کرتا رہتا ہوں۔'

'مجھے لائٹ ڈسٹرب نہیں کرے گی پاپا ـــــ' انجلی مسکرائی ہے۔' کل سے یہیں سو جاؤں؟'

'نہیں۔ بس کہہ دیا نا۔ اب تم بڑی ہو رہی ہو۔ اس سے زیادہ سوال نہیں۔'

انجلی کے معصوم چہرے پر سوالوں کی سلوٹیں بکھر جاتی ہیں۔ میں جاتے جاتے اس کے الفاظ میں دکھ محسوس کر لیتا ہوں۔

'کوئی بات نہیں پاپا'

انجلی اپنے کمرے میں واپس لوٹ گئی ہے۔ اس کی سلوٹوں بھری سوالیہ آنکھیں اب بھی کمرے میں موجود ہیں۔ یہ آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں۔

'انجلی کو کیوں بھیج دیا؟

میز پر آفس کی کچھ بے حد ضروری فائلیں بکھری پڑی ہیں۔ لیکن ابھی، اس لمحے مجھے ان فائیلوں کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔

'انجلی کیوں گئی؟ میں نے اسے اپنے کمرے میں کیوں بھیج دیا۔؟

پتہ نہیں ـــــ لیکن شاید یہ میرے اندر کا سناٹا ہے، جو مجھ سے لڑ رہا ہے۔ کیا ہو جاتا ہے تمہیں۔ کیا ہو جاتا ہے تمہیں۔ اچھے خاصے آدمی سے اچانک 'لڑکی' کے باپ کیوں بن جاتے ہو۔ بن جاتے ہو ـــــ چلو کوئی بات نہیں۔ لیکن اپنی ہی لڑکی سے ڈرنے کیوں لگتے ہو......

ایک بزدل آدمی جرح کرتا ہے ـــــ 'نہیں۔ جھوٹ ہے۔ ڈروں گا کیوں؟'

سناٹا ہنستا ہے ـــــ 'دیکھو، اپنے آپ کو غور سے دیکھو۔ تم ڈر گئے تھے۔ کیونکہ......'

اندر کا سناٹا ایک انتہائی فحش سا جملہ اچھالتا ہے ـــــ تم اسے عموماً ایسے لباسوں میں نہیں دیکھ پاتے۔ ہے ناsss یار، وہ کانونٹ میں پڑھتی ہے۔' سناٹا قہقہہ لگاتا ہے۔ کانونٹ یا نئے زمانہ کی لڑکیاں اب آنچل یا اوڑھنی کا استعمال نہیں کرتیں۔ وہ اپنے بدن پر کپڑوں کا بہت زیادہ بوجھ ڈالنا نہیں چاہتیں۔ تو کیا ہوا۔ وہ تمہاری بیٹی ہے۔'

'بس ڈر جاتا ہوں۔'

'لیکن کیوں؟'

لمبی لمبی سانس لیتا ہوں۔ کہہ نہیں سکتا۔

'بیٹی میں لڑکی تو نہیں دیکھنے لگتے؟'

اندر کا سناٹا دیر تک ہنستا رہتا ہے۔

(2)

اس دن مسز ڈھلن سے یہی تو پوچھا تھا میں نے......

'بیٹیوں میں لڑکیوں کا جسم کیوں آجاتا ہے۔'

'کیا؟' مسز ڈھلن زور سے چونکی تھیں..... لڑکیوں کا جسم..... ہنستے ہنستے چائے کے کپ پران کے ہاتھ تھرتھرائے تھے..... 'آپ شادی کرلو، آپ کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں..... '

'بیٹی میں لڑکی کا جسم۔ میں نے بہت معمولی بات کہی ہے، مسز ڈھلن۔ یہ لڑکیاں کیوں آجاتی ہیں بیٹی میں..... لڑکیاں۔ پرائی لڑکیاں۔ پرائی لڑکیوں کے جسم پر، مدھومکھی کے چھتوں کی طرح، گرتی ہوئی پرائی آنکھیں..... یہ بیٹیاں بس بیٹیاں کیوں نہیں رہتیں..... بغیر جسم والی..... نہیں، سنو مسز ڈھلن! قصور آپ کا نہیں —— یقیناً آپ میری بات نہیں سمجھ سکتیں..... لیکن بیٹیوں میں یہ لڑکیوں والا جسم نہیں آنا چاہیے..... ہے، نا؟'

OO

شاید سب کچھ اچانک بدلا تھا —— اچانک ——

ہاں، شاید سب کچھ اچانک ہی بدل جاتا ہے۔ گھر میں خوشیوں کا ایک روشندان تھا میرے پاس —— سنہری کرنیں آیا کرتی تھیں —— یہ سنہری کرنیں مسکراتیں تو گھر جگ مگ، جگمگ کرنے لگتا.....

وہ انجلی کی ماں تھی..... روشن دان سے چھن چھن جھانکنے والی روشنی کی کرن.....

'تمہیں پتہ ہے، پہلی بار اسکیٹنگ کرنے والوں کو برف کیسی لگتی ہے؟'

'نہیں'

'چکنی اور خوبصورت۔'

یہ اس کے لئے میرا پہلا کمپلی منٹ تھا.....

وہ زور سے ہنسی تھی..... ''کیا یہ تمہاری پہلی اسکیٹنگ ہے؟'

'اگر ہاں کہوں تو؟'

یقین کرلوں گی۔'

''تو پھر یقین کرو۔ اس سے پہلے کبھی برف پر چلنے کا خیال ہی نہیں آیا۔'

'برف پر.....' اس کے موتیوں جیسے دانت ہنس رہے تھے..... اُف کتنے شفاف اور قرینے سے رکھے ہوئے ——

'کیا یہ سارے ہیرے میرے ہیں؟' میں نے اس کے ہونٹوں کا بوسہ لیا۔

'ہاں'۔۔۔۔۔ وہ پھر دلکش انداز میں ہنسی تھی...... 'اس کے لئے جو پہلی بار اسکیٹنگ سیکھ رہا ہے......'

○○

پھر یہ 'اسکیٹنگ' جیسے زندگی کا ایک حصہ بن گئی۔۔۔۔۔ گھر میں خوشیوں والا روشندان کھل گیا......

وہ مسکراتی تھی......

'اب کہیں اسکیٹنگ کرنے جاتے ہو یا نہیں؟'

'اب تو تم سے ہی فرصت نہیں ملتی'

'اب کروگے بھی نہیں۔ اس لئے کہ تمہیں اسکیٹنگ سے روکنے والی آرہی ہے......'

○○

یہ انجلی تھی۔۔۔۔۔ جس کے بارے میں شروع سے ہی اس کا خیال تھا۔ بچی ہوگی۔

'کیوں۔'

'زیادہ تر بچیاں اپنے لئے سردیاں پسند کرتی ہیں۔ میں خود سردی کے موسم میں پیدا ہوئی تھی۔۔۔۔۔ سنو۔ اگر بیٹی ہوئی اور بیٹی نے تمہاری طرح اسکیٹنگ کرنی چاہی تو......؟'

میرا چہرہ ایک لمحے کو فق ہوگیا تھا۔۔۔۔۔

وہ زور سے ہنسی...... بس ہوگئی نا چھٹی۔ تم مردوں میں ہر وقت ایک چور مرد کیوں رہتا ہے۔ بیٹا ہو تو تاڑ پر چڑھا دو۔ دس گناہ معاف۔ کچھ بھی پہن لے۔ دس دس محبوباؤں کے ساتھ گھومتا رہے۔ مگر بیٹیاں۔'

وہ میرے چہرے پر جھک گئی تھی......

'ساری...... میں کھیل کر رہی تھی......' اس کی مخروطی، جلتی انگلیاں میرے برف جیسے چہرے پر موم کے شعلوں کی طرح اپنی آنچ دے رہی تھیں...... میں جانتی ہوں، تم ایسے نہیں ہو...... تم اپنی بیٹی سے بھی ویسی ہی محبت کروگے، جیسے...... ہے نا...... بیٹی اگر میری طرح ہوئی تو......'

میں نے پھونک مار کر شعلہ بجھا دیا تھا——

'بیٹی تمہاری طرح نہیں ہونا چاہئے'

'کیوں'

میں شاید خاموش رہ گیا تھا—— بیٹی اگر بڑی ہوئی تو......؟ وہی خاموشی سے ڈس جانے والا کمپلیکس......'یہ بدن کچھ جانا پہچانا سا ہے...... یہ چہرہ کچھ......!'

(3)

شاید اسی لئے انجلی کی پیدائش پر میں زور سے ڈرا تھا۔ نومولود بچوں کا چہرہ اتنا زیادہ ماں یا باپ سے نہیں ملتا۔ لیکن انجلی میں اس کی ماں مسکرا رہی تھی......انجلی کو نہارتے ہوئے میں اچانک زور سے چیخا تھا۔

"نیکر......نیکر کہاں ہے؟"

'شی......جاگ جائے گی؟' اس کے چہرے پر خفگی تھی۔ زور سے چلائے کیوں—— وہ ہنسی......'شوشو ہوگئی تھی اس لیے۔ دیکھو۔ وہاں میز پر نیکر پڑا ہے۔ بدل دونا پلیز......'

پتہ نہیں۔ لیکن شاید بہت کچھ بدلنے کی ابتدا ہو چکی تھی......

میں نے میز سے نیکر اٹھا لیا۔

مگر میرے ہاتھ کیوں کانپ رہے تھے۔

'سنو، تم بدل دو۔'

'کیوں—— اِتا سا کام بھی تم لوگوں سے نہیں ہوتا—— تم مردوں سے۔ بس بیوی ہی نو مہینے تک پاگل بنی رہے۔ تمہارا بچہ ہے۔ تم کیوں نہیں نیکر بدل سکتے......سنو......'

وہ انجلی کا نیکر بدل رہی تھی۔ میں کہیں اور دیکھ رہا تھا۔

'سنو۔ انجلی کے آجانے سے میرے بھی کام بڑھ جائیں گے—— تم بزی رہتے ہو۔ لیکن سنو—— انجلی کو صبح صبح تم ہی نہایا کرو گے۔ ٹھیک ہے نا؟

'نہیں۔'

سردیوں کے موسم میں جیسے دانت بجتے ہیں—— اندر کنوئیں سے کوئی صدا اوپر تک

آتے آتے تھم گئی تھی۔

'کیسے باپ ہو، اپنے بچے کو گود میں تو لو؟'

اس نے انجلی کو اچانک اٹھا کر میری گود میں ڈال دیا تھا۔ وہ ہنس رہی تھی۔

'کیسا عجیب سا لگ رہا ہے۔ ہے نا؟ جیسے میں ننھی سی ہو کر تمہارے ہاتھوں میں سمٹ گئی ہوں......

مجھے زور کا کرنٹ لگا تھا......

OO

انجلی کے ایک سال کے ہونے تک یہ سب سلسلے چلتے رہے۔ یہ لڑکیاں صفائی کے معاملے میں پیدائش سے ہی بڑی Sensitive ہوتی ہیں۔ انجلی زیادہ اسی وقت روتی تھی، جب اس نے شوشو کر دیا ہو۔ کبھی کبھی وہ کچن میں مصروف ہوتی تو وہیں سے ڈانٹ لگاتی۔

'نیکر بدل دو______'

شاید وہ پہلا واقعہ تھا۔ نہیں حادثہ...... نہیں، واقعہ کہنا ہی بہتر ہوگا...... وہ شاید شاپنگ کے لئے گئی تھی اور انجلی زور زور سے روئے جا رہی تھی۔ مجھ میں ایک باپ جاگ چکا تھا۔

لیکن کیا، ہمت کی کمی تھی مجھ میں؟

اور کیوں______؟

پیشاب سے چپ چپاتے پھلیے سے، میں نے اسے اٹھا تو لیا۔ مگر میرے ہاتھ پیشاب میں سنے نیکر اتارتے ہوئے کانپ رہے تھے...... اس کے ننھے ننھے سے پاؤں میں دوبارہ صاف ستھری نیکر پہنانے تک، میں نے ایک لمحے کے لئے بھی اس کی طرف دیکھنا گوارہ نہیں کیا تھا۔ لیکن کیوں؟

ایک سہمے سہمے سے باپ کو آخر اتنا سمجھانا کیوں پڑتا ہے؟

بچی ہنس پڑی تھی۔ اب میں نے اسے غور سے دیکھا۔ ہولے سے، 'منے' سے ہاتھوں کو چھوا...... پاؤں میں چاندی کے کڑے تھے...... وہ آسمان سے اترا ہوا فرشتہ لگ رہی تھی۔

بیساختہ اسے میں نے گود میں اٹھالیا۔ پیشانی پر چمی لی۔

'میری بیٹی۔ میری بیٹی'

وہ شاید پہلے ہی آچکی تھی ——— لیکن چھپ کر یہ تماشہ دیکھ رہی تھی۔ اس نے زور سے تالیاں بجائیں......

'گڈ آج سے تم باپ بن گئے۔ اب میری ضرورت نہیں رہی۔'

'ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟'

'کیونکہ تم میں ایک باپ آگیا ہے؟ وہ ہنس رہی تھی...... 'سنو، اس باپ کو بزدل نہیں ہونا چاہئے......سنو، میں اس باپ کو بزدل نہیں دیکھ سکتی......'

وہ دوڑ کر آئی ——— اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے......

'دیکھو...... انجلی ہنس رہی ہے۔ ہنس رہی ہے نا......؟'

○○

شاید اس نے صحیح کہا تھا۔

مجھ میں ایک باپ جاگ گیا تھا اور شاید اس لئے وہ ہمیشہ کے لئے سونے چلی گئی......

اس رات کی نیند اتنی گہری تھی کہ وہ کبھی نہیں جاگی...... انجلی میری گود میں تھی...... اور میں آسمان کے کنارے تلاش کر رہا تھا۔ اس کنارے سے اس کنارے تک پھیلا ہوا آسمان...... ایک لمبی زندگی اور معصوم سی، مٹھی بھر ہاتھوں میں سما جانے والی انجلی۔

انجلی بڑی ہو رہی تھی۔ باپ ڈر رہا تھا...... باپ دوست بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن، لڑکی یا عورت کے بدن سے جڑی ہوئی کچھ ایسی 'خفیہ' کہانیاں بھی ہوتی ہیں، جو اچانک پُر اسرار راتوں کی طرح جاگ جاتی ہیں۔ کبھی کبھی، سہمی سہمی راتیں مجھ میں ڈر پیدا کر دیتیں...... خاص کر سرما جیسے موسم میں ——— ایک ہی لحاف میں...... انجلی کے بدن سے لپٹے ہوئے ہاتھ اچانک، خرگوش سے سانپ جیسے بھیانک ہو جاتے......

میں لیمپ روشن کر دیتا۔ کمرے کو اپنی لمبی لمبی، گہری گہری سانسیں سونپ دیتا ہوں۔

یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔ انجلی بیٹی ہے۔ بیٹی ہے۔ دو ایکم دو۔ دو دونی چار...... انجلی بیٹی ہے...... بیٹی ہے...... بیٹی ہے...... دو ایکم دو۔ دو دونی چار/ انجلی بیٹی ہے...... بیٹی ہے...... بیٹی ہے...... میں اپنی سانسوں سے الجھنے کی کوشش کر رہا ہوں......

انجلی میری بیٹی ہے۔ میری جانو...... یار ــــــ یہ بیٹیوں میں، اچانک لڑکی جیسا بدن کیوں آجاتا ہے......؟

شاید اپنے آپ کو مضبوط کر رہا ہوں۔ مسکراتا ہوں۔ انجلی کی پیشانی کا بوسہ لیتا ہوں...... پاکیزگی سے بھرا بوسہ...... لحاف اوڑھاتا ہوں۔ ٹھنڈک بڑھ گئی ہے...... لیمپ بجھاتا ہوں۔

لیکن انجلی کے لحاف میں گھسنے کی ہمت نہیں ہوتی۔

کیوں؟

لحاف کے اندر انجلی کا بدن جل رہا ہے...... میں ٹھٹھر رہا ہوں۔ باہر ٹھنڈک بڑھ گئی ہے...... کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا آرہی ہے...... سگار، ایش ٹرے ــــــ، اندھیرے میں یہ ہاتھ میں سب کچھ تلاش کر لیتے ہیں۔ ریوالونگ چیئر پر بیٹھ گیا ہوں...... سگار کا دھواں اور لحاف کے اندر جلتی ڈلتی ہوئی انجلی......

شاید یہ اسی فیصلے کی گھڑی تھی......

'نہیں انجلی، اب تمہیں بستر الگ کرنے ہوں گے...... سمجھ رہی ہونا...... اب بڑی ہو رہی ہو تم...... اور...... پڑھائی بھی تو کرنی ہے تمہیں......!'

OO

'انجلی کی کیا عمر ہو گئی ہو گی اب ــــــ؟'

یہ مسز ڈھلن تھیں...... فائل پر جھکی ہوئی نگاہیں ــــــ

'چہ...... چودہ......' کہتے کہتے ٹھہر گیا ہوں ــــــ

'مائی گاڈ...... مسز ڈھلن کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی ہے۔ ''چودہ کی ہو گئی انجلی...... اب آپ کی ذمہ داریاں بڑھ جائیں گی سر۔ گھر میں اور کون کون ہے...... میرا مطلب، عورت......

'پہلے ایک آیا تھی......'

'تھی......؟'

'ہٹا دیا......'

'کیوں ــــــ؟'

'وہ انجلی سے زیادہ مجھ میں دلچسپی لیتی تھی۔'

'اوہ نو......' فائل سے اوپر اٹھی ہوئی نگاہیں......انجلی کو اس عمر میں عورت کی ضرورت ہے سر۔'

'عورت کی ہے؟'

'Obviously......عورت کی سر......'مسز ڈھلن ہنستی ہیں—— میں کیسے سمجھاؤں آپ کو......آپ......'

ایک خوفزدہ باپ اپنی منہ لگی اسسٹنٹ کے سامنے چپ ہے......پریشان سا......

'کیا بات ہے مسز ڈھلن'

'آپ کی زبان میں سمجھاؤں سر—— وہ ہنستی ہے۔ اس عمر میں ایک خوبصورت حادثہ، لڑکی کا انتظار کر رہا ہوتا ہے......خوبصورت—— نہیں سمجھ میں آنے والا اور دماغ کی رگیں چٹخانے والا......کیونکہ لڑکی جوان ہو رہی ہوتی ہے......

'جوان......' سناٹے میں میزائل چھوٹی۔

'یس سر——'

مسز ڈھلن نے فائل بند کر دی۔ 'بہتر ہے آپ اس آیا کو پھر سے بلالیں......'

مسز ڈھلن پر آہستہ سے چیختا ہوں—— آپ کہنا کیا چاہتی ہیں......

'پی......پی ریڈ۔ اس عمر میں لڑکیوں کو......'

مسز ڈھلن آگے بڑھ جاتی ہیں——

مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا ہے......کمرے کا رنگ اچانک سرخ ہو گیا ہے......لال لال......کھڑکیوں پر چڑھے ہوئے شیشے...... دیواریں...... اور زمین...... سب لال لال...... سرخ سرخ......میری آنکھوں کے آگے......اندھیرا بھی لال اور سرخ—— میں سر تھامنے کی کوشش کرتا ہوں......

'انجلی'

یہ بیٹیوں میں لڑکیاں کیوں آ جاتی ہیں......

OO

'اس دن میں، دفتر سے گھر جلد لوٹ آیا تھا____ دروازے پر داخل ہوتے ہی زور سے چیخا......

انجلی!

مگر کوئی نہیں۔ دروازے کے پٹ کھلے تھے۔ سیڑھیاں خاموش تھیں...... اندھیرے میں، اسکرین پر الفریڈ ہچکاک کی کوئی فلم شروع ہوگئی تھی۔ سسپینس اور تحیر سے بھری ہوئی فلم...... انجلی......

باپ الگ الگ دروازے پر دستک دیتا ہے...... چلاتا ہے...... انجلی...... وہ 'بڑی سی انجلی' کو اچانک دریافت کر لینا چاہتا ہے۔ مگر اس اچانک دریافت کے بعد...... سرخ سناٹے____ جیسے ذہن کو چیونٹیوں کی طرح کاٹے جا رہے ہیں...... انجلی...... یہاں بھی نہیں...... اس کمرے میں بھی نہیں۔ کہاں گئی۔ بیک گراؤنڈ سے تیز میوزک...... دروازہ کھلا ہے۔ انجلی نہیں ہے____ کہاں گئی ہوگی...... کہیں گئی ہوگی یار...... بیٹیاں اچانک جوان ہو جاتی ہیں۔ کشمکش بھرے لمحے میں خود کو دی جانے والی تسلیاں...... کہیں گئی ہوگی۔ مگر۔ اس طرح۔ گھر کو کھلا چھوڑ کر...... اور...... وہی ......سرخ انقلاب......

ذہن میں چکر آ رہے ہیں......

بالکنی پر آ گیا ہوں...... یہ سانسیں دھونکنی کی طرح کیوں چل رہی ہیں...... تیز تیز...... شاید مجھے کچھ ہو رہا ہے____ نظروں کے آگے یہ کیسا سرخ انقلاب مجھے پریشان کئے جا رہا ہے۔

ایک بار پھر زور سے چلاتا ہوں...... انجلی!

سرخ منظر ایک ایک کر کے 'لیزر' کرنوں کی طرح انجلی کے بدن میں داخل ہوتے چلے جا رہے ہیں...... سامنے اسکرین پر انجلی کا بدن روشن ہے...... اور لیزر کرنیں...... سرخ لیزر کرنیں......

مجھے شاور کی ضرورت ہے...... اس بدن کو ہٹاؤ...... انجلی کے بدن کو ہٹاؤ......

میں دونوں ہاتھوں سے سر تھامتا ہوں۔ باتھ روم کی طرف تیزی سے بھاگتا ہوں...... دروازہ کھولتا ہوں اور......

باتھ روم کا دروازہ کے کھلتے ہی____ ہینگر پر لپٹے ہوئے سانپ، جیسے زور سے

اُچھل کر مجھے ڈس لیتے ہیں ــــــ چیخنا چاہتا ہوں ــــــ مگر چیخ جیسے اندر گھٹ کر رہ گئی ہے......
میرا جسم تھر تھر کانپ رہا ہے۔ باتھ روم کی ہر ایک شئے میری نگاہوں کے سامنے ہے۔ سرخ ٹائلس ــــــ ان کے درمیان اسی کلر سے میچ کرتا باتھ ٹب...... ہلکا ہلکا کھلا ہوا شاور...... شاور کے چھید سے ٹپکتے ہوئے قطرہ قطرہ پانی کی بوندیں...... اور اُدھر شاور کے داہنی طرف بے ڈھنگے پن سے ہینگر کے سرخ 'رڈ' میں 'کھوئی' گئی انجلی کی برا اور پینٹی ــــــ

شاور کے چھید سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی ہیں...... ٹپ...... ٹپ......

میری آنکھیں سہم گئی ہے......

بدن لرز رہا ہے......

گلہ سوکھ گیا ہے......

جسم کے اندر بھونچال آ گیا ہے......

ریزہ ریزہ کانپ رہا ہے......

کیمرہ باتھ روم میں نہ اب کہیں Pan ہو رہا ہے ــــــ نہ ٹلٹ اَپ ــــــ نہ ہی ٹلٹ ڈاؤن...... وہ جیسے اُسی منظر پر Freeze ہو گیا ہے...... انجلی کے کپڑے اور......

شاور کے چھید سے ٹپکتی ہوئی پانی کی بوندیں

انجلی!

جیسے بجلی کا کرنٹ لگتا ہے۔

میرے منہ سے ایک زور کی چیخ نکلتی ہے...... تھر تھر کانپتا ہوا کمرے میں آتا ہوں...... بستر پر رکھا ہوا کمبل اٹھاتا ہوں...... نہیں، مجھے ایک شکار کرنا ہے...... باتھ روم میں سانپ آ گیا ہے...... یہ کمبل نہیں ہے، شکاری کا پھندہ ہے......

پھر وہی باتھ روم...... سرخ ٹائلس...... اور میرا شکار ہے...... آنکھیں خوفزدہ ہو کر دوسری طرف کرتا ہوں۔ کمبل ایک جھٹکے سے انجلی کے اندر پہنے جانے والے لباس پر پھینکتا ہوں...... پکڑ لیا چور...... ہاتھ لرز رہا ہے۔ بدن میں خون کی گردش بڑھ گئی ہے۔ پاؤں کانپ رہے ہیں...... ہاتھ میں چوہے دانی ہے ــــــ اور اندر حرکت کرا ہوا چوہا...... لو پکڑ لیا...... انجلی کا کمرہ ہے...... اس کا وارڈ روب...... آنکھ بند کر کے کمبل کھولتا ہوں...... اور یہ گیا چوہا...... کمبل وہیں پھینک کر باتھ روم کی طرف دوڑتا ہوں۔ شاور چلاتا ہوں...... آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ پانی کی تیز

بوند سر پر پڑتی ہے۔ ایک ذرا سا، خیالوں کی برہنہ گپھاؤں سے باہر نکلا ہوں......

یہ مجھے کیا ہو گیا تھا......

میں انجلی کی آواز سن رہا ہوں...... پاپا...... پاپا......

انجلی آ گئی ہے......

پانی میں ارتعاش پیدا ہوا ہے...... میں اپنے جسم کو نارمل ٹمپریچر پر لانے کی کوشش کر رہا ہوں......

پاپا...... پاپا......

انجلی بیٹی ہے...... بیٹی...... میری پیاری بیٹی...... دو ایکم دو۔ دو دونی چار...... بیٹی ہے...... بیٹی ہے......

○○
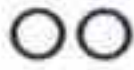
'پاپا چیخ کیوں رہے تھے؟'

'تم گئی کہاں تھی؟'

'جاؤں گی کہاں۔ مینو سے نوٹس مانگنے گئی تھی۔'

'مینو؟'

'ہاں۔ وہ پڑوس والے شرما انکل کی بیٹی۔ لیکن تم چیخ کیوں رہے تھے...... پتہ ہے۔ دروازہ رکھلا رہ گیا تھا، اس لئے ــــــ ساری پاپا۔ مجھے خیال نہیں رہا......

'کوئی بات نہیں،

میں مسکرانے کی کوشش کرتا ہوں۔ انجلی بیٹی ہے۔ دو دونی چار...... دو ایکم دو......

'ایسے کیا دیکھ رہے ہو پاپا'

'کچھ نہیں'

'نہیں۔ کچھ تو ہے۔'

'دیکھ رہا ہوں کہ اب میری بیٹا بڑی ہو گئی ہے۔'

'تو؟ اب میری شادی کرو گے؟' انجلی مسکرا رہی ہے۔ یہ ایک دم سے باپ کیوں بن جاتے ہو ــــــ اولڈ فیشنڈ۔' آگے بڑھ کر اس نے میرے گلے میں پیار سے اپنی بانہیں ڈال دی

ہیں۔ 'تم ایک دوست ہو پاپا۔ میرے لئے ---- پاپا سے زیادہ دوست۔'

'ہاں بیٹا' میں تمہارا دوست ہی ہوں۔'

انجلی کے ماتھے پر Kiss کرتا ہوں.... 'دوست ہوں۔ لیکن تمہیں اچانک اتنا بڑا نہیں ہو جانا چاہئے تھا.....'

مسز ڈھلن کے لفظ چاروں طرف سے مجھے گھیر رہے ہیں ---- ایک خاص طرح کا ساؤنڈ ایفیکٹ ECHO..... انجلی کو دیکھ کر میں مسکرانا چاہتا ہوں مگر وہی.....

..... ہر زور ظلم کی ٹکر میں انصاف ہمارا نعرہ ہے۔

سرخ سرخ انقلاب......

مسز ڈھلن کے بجتے ہوئے لفظ...... ''اس عمر میں ایک خوبصورت حادثہ لڑکی کا انتظار کر رہا ہوتا ہے..... خوبصورت اور نہیں سمجھ میں آنے والا..... پھر دھماکہ ہوتا ہے ---- دھماکہ ---- تیز دھماکہ..... جیسے ایک ملک نے دوسرے پر بمباری شروع کر دی ہو ---- دھائیں دھائیں ----

اپنی دنیا میں واپس آنے تک، ایک اٹ پٹا سا سوال کر دیتا ہوں ----

'تم ٹھیک تو ہو بیٹی۔ میرا مطلب ہے رات میں؟'

'رات میں......'

'ر..... ا ..... ت ---- 'رات میرے ہونٹوں پر آکر ---- طلسم ہوش ربا کی پتھر بنانے والی ساحرہ بن گئی ہے ---- ہاں، رات میں..... ٹھیک ہو نا ---- میرا مطلب ہے ----'

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے رات وات میں کچھ نہیں ہوتا ہے ---- دیکھو۔ میں بالکل فٹ ہوں۔'

انجلی میرے سامنے تن گئی ہے۔

میں مسکرانے کی کوشش کرتا ہوں ---- اندھیرے میں، آسمان پر چمکتے ایک پیارے سے تارے کو ہونٹ سے چھو لیتا ہوں..... نہیں..... میں بالکل ٹھیک ہوں اور صحتمند ----

(5)

کیا میں پروورٹیڈ ہوں؟

نہیں۔ مجھے یقین ہے ---- میں پروورٹیڈ نہیں ہوں۔ میں گندے ذہن کا آدمی نہیں

ہوں۔ ویسا آدمی، جیسا ہمارے ماحول میں عام طور پر 40 کے بعد کے مرد ہو جاتے ہیں...... انہیں کہیں بھی دیکھ لیجئے۔ بس اسٹاپ سے کلب اور اپنے خوبصورت دفتر کے 'رعب دار' کمرے میں اپنی حسین سکریٹری کو ڈکٹیشن دیتے ہوئے...... وہ اس بات پر دل کھول کر ہنستے ہیں کہ بغیر کرسیوں والے باس کے کمرے میں، باس کے 'بیٹھ جاؤ' کہنے پر نئی نئی آئی ہوئی سکریٹری نے اِدھر اُدھر کرسیاں تلاش کرنے کے بعد پوچھا تھا — کہاں بیٹھوں سر، یہاں تو کرسیاں ہی نہیں ہیں......'

وہ بہت کچھ گھر سے اپنے ساتھ لے کر آتے ہیں...... پرانی بیوی کا اداس بستر...... اس کے ڈھلتے جسم کی 'سدابہار' جوانی — اور پہلے جن پتھ Kiss کے نان ویج لطیفے...... جانتا تھا، یہ سب اندر کا فرسٹریشن ہے اور کچھ نہیں...... ان ڈھلتی ہوئی عمر کی پائیدان پر کھڑے مردوں کے لئے جوانی کا اشتہار، بن جانے کی روایت کوئی نئی نہیں ہے...... جسم سونے لگتا ہے تو ہونٹ بولنے لگتے ہیں اور آنکھیں زہریلی ہونے لگتی ہیں......

لیکن......

انجلی کی ماں کے مرنے کے بعد سے لے کر اب تک، کسی Psychiatrist یا Sexologist کے پاس جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ میں کبھی بھی گندی ذہنیت کا قائل، کبھی نہیں رہا...... 'ڈھلان' پر کی ڈھلان باتیں — نان ویج لطیفے...... میں ان لطائف میں انجلی کی ماں کا مذاق نہیں اڑا سکتا تھا...... عورت میرے لئے دیوی یا تقدس کی مورتی نہ سہی، لیکن لائق احترام شئے ضرور رہی، اس لئے مجھے ہمیشہ خود پر ناز رہا...... میں ان ڈھلتی عمر کے بوڑھوں میں سے نہیں ہوں...... جو اندر کچھ باہر کچھ ہوتے ہیں......

لیکن یہ سب اچانک......

یہ میرے لئے عمر کا ایک نیا موڑ ہے — یار، یہ بیٹیوں میں ایک دم اچانک سے، لڑکیاں کیوں آجاتی ہیں......

''چلئے۔ مان لیا میں پروورٹیڈ نہیں تھا۔ پھر انجلی کے اندر گارمنٹس کو دیکھ کر ڈر کیوں گیا تھا......؟ حواس باختہ...... میری چیخ کیوں نکل گئی تھی —؟

بیٹی مقدس شئے ہے تو اس کے کپڑے بھی مقدس ہوئے...... پھر......؟ میں ڈر کیوں گیا تھا؟ چوہے کو جال میں چھپانے جیسا، کمبل ڈالنے کا واقعہ کیوں پیش آیا — شاید، انسانی سائیکی ابھی بھی اپنے اندر کا بہت کچھ سراغ لگا پانے میں ناکام ہے......

مگر......سرخ انقلاب اور

○○

'انجلی بڑی ہو رہی ہے......'

'کتنے کی......چودہ......چودہ کی ہوگئی، نا انجلی......' مسز ڈھلن میری آنکھوں میں جھانک رہی ہیں......ان کی آنکھوں میں شرارت ہے۔

'آپ کو......آپ کو ہشیار رہنا چاہیے سر۔'

'کیوں؟'

'بس' کچھ دیا نا——'یہ عمر ہی ایسی ہے۔'

'یعنی 14......14 کی عمر......'

'سب سے سنسنی خیز——لڑکیوں کے لئے سب سے سنسنی خیز عمر یہی ہوتی ہے......

اس عمر میں لڑکیاں Love Letter بھیجنا شروع کر دیتی ہیں......

'لو......لیٹر——' میری سانس رک رہی ہے......انجلی کا چہرہ ایک پل کو، آنکھوں کے آگے دوڑ جاتا ہے۔ یہ معصوم سی بچی......آنکھوں کے پردے پر چھوٹے چھوٹے انجلی کے ہاتھ ہیں......نہیں، یہ ہاتھ محبت بھرے خط نہیں لکھ سکتے......'

'کیا سوچ رہے ہیں سر؟ مسز ڈھلن مسکراتی ہیں۔ لیکن آپ کے لئے۔ آپ کے لئے کیا غلط ہے سر......آپ تو اس معاملے میں بہت لبرل ہیں......یعنی......مجھے لگتا ہے، آپ اس معاملے میں بھی انجلی سے شیئر کریں گے......کیوں سر......زمانہ بدل رہا ہے۔ بس انجلی کو پھسلنا نہیں چاہئے......سمجھ رہے ہیں نا سر۔ بس اسی جگہ تھوڑا سا ہشیار رہنے کی ضرورت ہے......'

لیکن کیوں ضرورت ہے مجھے——؟ بڑے ہوتے ہی ہم اپنا زمانہ کیوں بھول جاتے ہیں۔ انجلی کی جگہ لڑکا ہوتا تو؟ تب تو چلا چلا کر اس کی پہلی پہلی محبت کی خوشی میں فائیو اسٹار میں ڈنر دیتا......لوگ پوچھتے معاملہ کیا ہے؟ تو چلا کر کہتا......میرے بیٹے کو پہلی بار کسی سے محبت ہوئی ہے......میرے......بیٹے کو......

انجلی کی محبت پر پارٹی کیوں نہیں دے سکتا......؟

نہیں۔ انجلی لڑکی ہے۔ انجلی کو محبت نہیں کرنا چاہئے۔ لڑکیوں کے معاملے الگ ہوتے

ہیں۔مسز ڈھلن بتاتی ہیں۔جب ان کی بیٹی سات سال کی ہوئی تھی اور مسٹر ڈھلن بہت پیار کرنے والی اپنی بیٹی کو باتھ روم سے نہلا کر —— ٹاول باندھ کر باہر لائے تھے —— تو ان کی ممی نے اسے سمجھایا تھا۔

Not, not again. اب بیٹی کو تم ہی نہلایا کرو۔

'لیکن کیوں ممی۔وہ باپ ہے۔'

'باپ ہے تو کیا ہوا۔ ہے تو مرد'

مرد......؟ باپ کو مرد نہیں ہونا چاہئے...... بیٹی۔سگی بیٹی...... باپ کتنی کتنی باتوں سے محروم ہو جاتا ہے یا کر دیا جاتا ہے۔

مسز ڈھلن نے پوچھا تھا......

'آپ۔آپ کیا کرتے ہیں سر۔'

'میں انجلی کو سات آٹھ سال کی عمر تک خود ہی......'

مسز ڈھلن نے قہقہہ لگایا تھا......وہی......آپ نے کہا تھا، ناسر —— یہ بیٹیوں میں لڑکیاں کیوں آجاتی ہیں —— ماں غسل دیتی ہے تو بیٹیوں میں لڑکیاں نہیں آتیں —— بیٹیوں میں بیٹیاں ہی رہتی ہیں مگر......'

مسز ڈھلن نے کتنی آسانی سے یہ سچ اگل دیا تھا......اور حقیقت تھی کہ انجلی کے پھیلتے جسم کے ساتھ ہی، تقدس کے رشتے نے، قدم قدم پر اپنی Limitations کی دیوار اٹھانی شروع کر دی تھی...... یہ جوان ہوتی لڑکیوں کا جسم اچانک لاؤڈ اسپیکر کی طرح چیخنے کیوں لگتا ہے......!

اور یہ چیخ میرے اندر اتر رہی تھی۔ایک کمزور باپ کی آتما میں...... کیا انجلی کسی کو لیٹر لکھ سکتی ہے۔

'نہیں۔'

'کیوں؟'

'بس نہیں لکھ سکتی'

'کیوں نہیں لکھ سکتی؟'

'اس لئے کہ میری بیٹی ہے۔'

لیکن اس نے اگر لکھنا شروع کر دیا تو —— ؟ کالج ہے...... سارا دن اکیلے رہتی ہے...... اس نے کبھی اس بارے میں پوچھا نہیں —— وہ اپنی تنہائیاں کس کے ساتھ شیئر کرتی ہے...... سارا دن کس طرح اپنا دل بہلاتی ہے...... کالج میں کیا کرتی ہے...... کالج سے کتنے بجے گھر واپس آتی ہے......

سوچ کی رفتار رک نہیں پا رہی تھی......

اور اس دن گھر میں داخل ہوتے ہی ایک بار پھر وہ نازیبا واقعہ رونما ہو گیا تھا ——

(6)

وہ اپنے کمرے میں تھی —— وارڈ روب کے، ہینگر میں لپٹے کپڑے اس کے بستر پر پھیلے تھے —— مجھے سامنے دیکھ کر وہ ڈر گئی تھی —— اس نے اپنے ہاتھوں کو اچانک پیچھے کر لیا تھا...... چھپا کر...... مسز ڈھلن کے لفظ میرے اندر چیخ رہے تھے......

'کیا...... کیا بات ہے پاپا......'

وہ چوکنا تھی —— اس کی نظریں مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھیں۔' یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟'

'کچھ نہیں۔'

'کچھ نہیں کچھ...... لاؤ دکھاؤ۔'

'نہیں پاپا......'

'دکھاؤ......'

'میں نے کہہ دیا نا، کچھ نہیں ہے پاپا۔'

'پھر چھپا کیوں رہی ہو۔'

بس ایسے ہی۔

'لاؤ دکھاؤ، میں غصے کا مظاہرہ کرتا ہوں۔ وہ بستر سے چھلانگ لگاتی ہے...... یقیناً لو لیٹر...... اشارہ سے دکھانے کو کہتا ہوں۔ وہ پیچھے دیوار کی طرف، میری طرف منہ کیے ہٹتی ہے......

'نو...... نو پاپا...... کچھ نہیں ہے۔ آپ جاؤ......'

'نہیں......لاؤ......'

اور......اب دیوار ہے۔ وہ پیچھے نہیں جاسکتی۔ وہ دیوار کے پار نہیں ہوسکتی۔ میں چیختا ہوں ـــــ اور وہ چور خط میرے سامنے کھول دیتی ہے......انجلی کی آنکھیں بند ہیں۔ بدن تھر تھر کانپ رہا ہے۔ کھلے ہوئے ہاتھوں پر اس کی 'برا' اچانک سانپ کے پھن کی طرح میرے سامنے تن جاتی ہے......

'نہانے جارہی تھی......'

'کیا......؟'

وہ اچھلی......باپ کے سامنے جوان ہوتی عمر کے چغلی کھانے کا احساس اُسے اچھا نہیں لگا تھا ـــــ انجلی نے براکو پھر سے مٹھیوں میں جکڑ لیا تھا اور باتھ روم بھاگ گئی تھی......

OO

میں سرتاپا لرز رہا تھا۔

اس کی کھلی مٹھی میں جگنو نہیں تھے ـــــ تارے نہیں تھے ـــــ محبت بھرے خط نہیں تھے......دھماکہ تھا......اشتعال تھا۔ سنسنی خیزی تھی......وہ شئے تھی، جس کے احساس سے ذہن، بدن کے خطوط ناپنے لگتا ہے......

انجلی کی کھلی مٹھیاں......انجلی کی بند آنکھیں......پھر انجلی کا اچھل کر بھاگنا......

یہ۔ یہ کیا ہوگیا......کیا سمجھا ہوگا انجلی نے......کتنا Guilt محسوس کیا ہوگا......اس کا ذہن تناؤ کا شکار ہے۔ رگیں پھٹ رہی ہیں......

میزائلیں مسلسل چھوٹ رہی ہیں......

بدن۔ بارش۔ شاور......اور کھلی ہوئی ہتھیلیاں ـــــ اور کھلی ہتھیلیوں کا چور ـــــ

مجھے کچھ کرنا ہوگا۔ اپنے آپ کو شانت کرنے کے لئے مجھے کچھ کرنا ہوگا......

لیکن کیا کرنا ہوگا۔

انجلی۔ بدن۔ بارش۔ شاور اور کھلی ہتھیلیوں کا چور......مجھے کچھ کرنا ہوگا......

واتسائن اور انجلی

انجلی اور واتسائن......

مجھے کچھ کرنا ہوگا ــــ

ٹہلتا ہوں۔ تیز تیز سانسوں کو دل کے کبوتر خانے میں جکڑنے کی کوشش کرتا ہوں ...

سانسوں کی لہروں کو سمجھاتا ہوں۔ اتنا تیز مت بہو ......

کیوں ......

مت بہو اتنا تیز ......

انجلی بیٹی ہے۔ دو ایکم دو۔ دو دونی ...... انجلی بیٹی ہے ...... ٹہلتے ہوئے انجلی کی میز تک آ گیا ہوں ...... کتنی گندی ہو رہی ہے یہ میز۔ کتابیں بکھری پڑی ہیں ـــ یہ آنکھیں ــــ ان کتابوں پر جمانے کی کوشش کرتا ہوں ......

فزکس۔ کیمسٹری۔ الجبرا ......

موٹی موٹی کتاب کے صفحات میرے ہاتھوں کالمس جذب کرتے ہیں۔ کتنی مدت ہوگئی۔ انجلی کو ساتھ پڑھانے بھی نہیں بیٹھا۔ کبھی پوچھا بھی نہیں۔ دسویں پاس کرنے کے بعد کیا لیا ...... سائنس یا آرٹس ــــ بس کالج اور ٹیوشن کے پیسے دیتا ہوں ...... اور یہ کتابیں ــــ فزکس۔ کیمسٹری۔ الجبرا ...... میز کتنی گندی ہو رہی ہے۔ روشنائی بھی گر گئی ہے۔ میز صاف کر رہا ہوں ــــ فزکس، کیمسٹری ...... الجبرا ......

انجلی کی کھلی ہتھیلیاں اور بند آنکھیں ذہن کی Retina پر Freeze ہو جاتی ہیں۔ انڈر گارمنٹس۔ پینٹی، برا اور ...... فزکس۔ کیمسٹری ......

پینٹی برا ......

فزکس، کیمسٹری ......

کتابوں کو قرینے سے سجا رہا ہوں ......

یہ انجلی کی کتابیں ہیں اور وہ ...... انجلی کے انڈر گارمنٹس۔

فزکس، کیمسٹری، الجبرا ......

پینٹی اور برا ......

میں وہیں کرسی پر بیٹھ گیا ہوں ــــ ان میں فرق کیا ہے۔ کتابوں میں اور کپڑوں میں۔ دونوں انجلی کے ہیں ......

انجلی میری بیٹی ہے ......

کتابیں میز پر سجا سکتا ہوں تو بیٹی کے انڈر گارمنٹس چھوتے ہوئے بدن میں زلزلہ کیوں آجاتا ہے......

مقدس باپ کے ذہن میں کہیں کوئی ایک چور دروازہ بھی ہوتا ہے کیا...... ؟

اس چور دروازے سے ہو کر بیٹی لڑکی کیوں بن جاتی ہے......

فزکس......کیمسٹری......

کیمرہ پین ہوتا ہے ـــــ سرخ ٹائلس۔ باتھ روم...... باتھ روم کی دیواریں۔ سرخ بیسن۔ باتھ ٹب...... ایک بار پھر شاور کے پاس ہی ہینگر سے جھولتے انجلی کے انڈر گارمنٹس...... پینٹی اور برا...... فزکس، کیمسٹری...... الجبرا......

ملٹ شاٹ ـــــ کلوز میں، میں ہوں۔ میں نے ہاتھ بڑھا دیا ہے اور یہ کیا ـــــ میرے ہاتھوں سے سانپ کے پھن غائب ہو گئے ہیں...... کلوز میں میرا ہنستا ہوا چہرہ ڈیزالو......

انجلی کپڑے بدل کر کمرے میں آجاتی ہے...... سجی ہوئی میز کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکراتی ہے......

I am proud of you, my papa ـــــ تم نے میری میز صاف کر دی۔

'کیوں؟' اس میں Proud کی بات کیا ہے؟'

'ہے کیسے نہیں؟'

'کیسے ـــــ؟'

'میری سہیلیوں کے پاپا ایسا نہیں کر سکتے۔'

'کیوں نہیں کر سکتے۔'

'بس نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ وہ میرے پاپا نہیں ہیں۔

وہ اُچھل کر اپنی بانہیں میرے گلے میں حمائل کرتی ہے۔ I love you papa

'فزکس، کیمسٹری...... الجبر......'

میں مسکراتا ہوا، اس کو اپنی بانہوں میں لیتا ہوں ـــــ

انجلی میری بیٹی، تم اپنی ماں سے کتنی ملنے لگی ہو۔'

'ماں سے؟' وہ ہنستی ہے۔۔۔ "مسکراتی ہے۔اسی لئے پیار ہو رہا ہے۔کیونکہ مجھ میں ماں آگئی ہے۔"

انجلی پیار بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی ہے۔۔۔۔وقت نے یہ منظر یہیں فریز کر دیا ہے۔۔۔۔

ooo

فریج میں عورت

(i)

وہ چپ چاپ اس بات کا اعتراف کر لیتا تھا...... ''ہاں، میرے فریج میں ایک عورت ہے''۔

......فریج میں عورت؟'

......' کیوں۔ عورت فریج میں نہیں ہو سکتی۔ میں جب چاہوں، اسے فریج سے باہر بلا لیتا ہوں۔ کمرے میں یار، اس کے ساتھ ہنستا ہوں۔ باتیں کرتا ہوں۔ دل بہلاتا ہوں۔'

OO

فریج والی عورت پہلی بار اس کے کمرے میں کب آئی یا اس کے کمرے نے پہلی بار فریج کا منہ کب دیکھا، یہ ایک لمبی کہانی ہے...... ممکن ہے آپ اس کہانی پر کچھ زیادہ یقین بھی نہ کریں، یا یہ کہانی آپ کو بے وقوفی سے بھری ہوئی ایک من گھڑنت کہانی نظر آئے۔ تسلیم! اس کے باوجود میں کہوں گا آپ اس کہانی کا مطالعہ ضرور کریں......

بہار کے موتیہاری ضلع کے رہنے والے نر بھے چودھری کو دلّی میں جگہ کیا ملی، قسمت کھل گئی۔ عام طور پر مہانگر میں آنے کے بعد آنکھیں چوندھیا جاتی ہیں۔ مگر نر بھے چودھری کا رویہ دوسرا تھا۔

'' کا ہے، موتیہاری اب کم ہے کا۔ ارے اب یہاں بھی شوٹنگ ہوتی ہے۔ بڑے بڑے ہیرو ہیروئین آتے ہیں۔''

ان دنوں موتیہاری میں شول فلم کی شوٹنگ ہوئی تھی، اور نر بھے چودھری کے اپنے لفظوں میں......''یار روینہ کو تو دیکھ کے ہم پگلئے...... گئے......''

آپ مانیں یا نہ مانیں، ہر آدمی کے دماغ کے اندر ایک رنگین گلیمر کی دنیا ہوتی ہے۔ سو یہ دنیا ہمارے ہیرو نربھے چودھری کے ذہن میں بھی موجود تھی......غلط پہاڑ ارٹنے کی باری تب آئی جب اپنے نربھے چودھری کو کچھ دنوں تک جے این یو یعنی جواہر لال نہرو یونیورسٹی رہنے کا اتفاق ہوا۔ پیسوں کی تنگی ہوئی تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کمپیوٹر میں گھس گئے......کمپیوٹر کے آئیں۔بائیں۔ شائیں، بٹنوں پر کمانڈ نہیں ہوا تو، ایئر کنڈیشن، والوں کو جوائن کرلیا...... ائیر کنڈیشن کی ٹھنڈک برداشت نہیں ہوئی تو واشنگ مشین بنانے والی ایک نئی کمپنی میں سلیس مین ہوگئے۔ یہ نوکری بھی نہیں پچی تو کچھ دنوں تک ٹیوشن پڑھانے کا کام شروع کیا...... یہاں تک کہ ساؤتھ ایکس جیسی پاش کالونی میں ایک لڑکی کو پڑھانے کا کام مل گیا۔ آخر ایم اے پاس تھے۔ لیکن 'بہاری' میں انگریزی بولنے کی وجہ سے، یہ ''ریسپیکٹیڈ'' کام بھی ان کے ہاتھوں سے نکل گیا...... ان کی دقت یہ تھی کہ:......

''ایاں لوگ انگریزی نہیں جانتے ہیں نا۔ بڑ بک۔ ہم کو بہاری کہتے ہیں۔ بتایئے بہار کوئی انڈیا سے باہر کا ہے۔؟ بڑے قابل بنتے ہیں۔ ارے ہم جو انگریزی بول دیں گے۔ ای کا بولیں گے۔ گاندھی جی بھی موتیہاری گئے تھے۔ پتہ ہے۔''

ڈھنگ کی نوکری کیا ملتی، چپل گھستے گھستے دور درشن کے لئے سیریل بنانے والے پروڈیوسر اجے گوسوامی سے ملاقات ہوگئی۔ کریٹیو ریلس......بن گئے۔ کریٹیو ریلس کے پروڈکشن منیجر۔ ویزیٹنگ کارڈ بھی چھپ گیا۔ جمنا پار علاقے میں سستے ریٹ پر ایک چھوٹا سا کمرہ بھی مل گیا۔

تو گلیمر کی جو رنگین سی دنیا کبھی فلم ریل کی طرح ذہن کے پردے پر چلتی تھی، اب آنکھوں کے سامنے تھی......شوٹنگ، ایکشن، کٹ، لائٹس، لڑکے، لڑکیاں......اور مزے کی بات یہ، کہ چاروں طرف دوڑتے ہوئے ہمارے نربھے چودھری۔ کہیں اکڑتے ہیں۔ کسی لائٹ والے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پیار سے باتیں کرتے ہیں۔ کبھی ''ہیروئین'' کے سامنے ٹھمکا لگاتے ہیں......

کچھ چاہئے تو نہیں آپ کو......؟

ہیروئین مسکرا کر پوچھتی۔ 'آج آپ بڑے خوش نظر آرہے ہیں۔'

جواب ملتا۔ 'آپ کو دیکھ کر کون خوش نہیں ہوگا'

'ہو s s ہو'...... ہیروئین قہقہہ مار کر ہنستی......

پیک اپ کے بعد جب چار یار شراب کی بوتلیں کھول رہے ہوتے، تو یہ باتیں ایک دم سے فنتاسی کی طرح نربھے چودھری کو پاگل بنا دیتی ـــــ عورت...... سیکس...... سچویشن۔ یہاں گفتگو میں صرف اور صرف عورتیں ہوتیں۔ چور دروازے سے دل میں داخل ہونے والی عورتیں...... ان عورتوں کو لے کر ہزاروں قصے تھے ـــــ اور ایسا ہر قصہ نربھے چودھری کو زخمی کر جاتا تھا۔

○○

رات گئے شوٹنگ کے خاتمے کے بعد نربھے چودھری جب اپنے کمرے میں پہنچتے تو خالی کمرے کا اندھیرا انہیں ڈسنے لگتا...... گفتگو والی عورتیں...... تنہائی اور خاموشی کی بین کی آواز پر ناگن جیسی لہرانے لگتیں...... بین کی آواز تیز ہوتی جاتی۔ پھر یہ ناگ ناگن تیز تیز لہراتے ہوئے ایک دم سے نربھے چودھری کے جسم میں داخل ہو جاتے۔ کافی دیر بعد جب اندر کا طوفان تھم جاتا تو نربھے چودھری کو لگتا...... اس کی زندگی میں ایسی ہریالی کب آئے گی؟ کب تک عورت کے بغیر رہنا ہوگا۔

○○

اجے گوسوامی...... نربھے چودھری کی نگاہ میں دنیا کا سب سے خوش قسمت آدمی تھا۔ آخر کو پروڈیوسر تھا۔ لڑکیاں اس سے چپکی رہتی تھیں۔ زندگی ہو تو ایسی، نربھے چودھری کو، اجے گوسوامی یعنی اپنے ہونہار آقا پر رشک آتا تھا......

لیکن بھائی، پیٹ کا اپنا 'اتہاس' ہے...... اور کبھی کبھی جب پیٹ کا جغرافیہ بگڑتا ہے نا، تو حالت بڑی بے رحم ہو جاتی ہے۔ کہنے کو تو نربھے چودھری فلمی دنیا کے آدمی بن گئے تھے، مگر اصل میں تھے کیا خاک پتی...... نہ لاکھ پتی...... نہ ہزار پتی۔ بک بک جھک جھک کے بعد تو اجے گوسوامی کی گانٹھ سے بندھے ٹکے دو۔ چار۔ پانچ سو روپے نکلتے تھے ـــــ 'کیا کہوں بھائی۔ دوردرشن کی حالت خراب ہے۔ ٹونٹی پرسنٹ تک دینے کو تیار نہیں۔ اب تم لوگوں کو دوں تو کہاں سے دوں......'

یہ الگ بات ہے کہ پروڈیوسر کو دھکا دھک ٹرپل فائیو پینے کے پیسے مل جاتے تھے......
کبھی کبھی نربھے چودھری عجیب عجیب حساب لگاتا۔ ایک آدمی کے کھڑے ہونے میں کتنے پیسے درکار ہیں؟ شادی کرنے میں کتنا خرچ بیٹھے گا؟ شادی کے بعد کے خرچ میں کیا ہوں گے؟ اور اگر بچے آگئے تو؟ یعنی کم پیسے میں ایک ایسی دنیا جسے طے کرنے میں قطب مینار کی بلندی تک کے فاصلے پسینے نکال دیتے تھے......'نا بھائی...... وہ ساری زندگی شادی نہیں کر سکتے۔ نا نو من تیل ہوگا، نا رادھا ناچے گی......'

نربھے چودھری گھبرا جاتے تو اجے گوسوامی کے بیڈروم میں منڈرانے والی لڑکیاں چپکے چپکے ان کے دل و دماغ پر قبضہ کرنے بیٹھ جاتیں...... ہری ہری لڑکیاں۔ آسمان سے اتری ہوئی پریاں...... جیسے ایک دھند ہوتی ہے...... جیسے اس گھنی دھند میں کچھ بھی آگے پیچھے دیکھنا ممکن نہیں ہوتا ہے—— لیکن نربھے چودھری اپنی پریشانی کی کینچلی اتارتے ہوئے دھند میں چپکے چپکے اتر جاتے۔

OO

گھر سے خط آرہے تھے۔ پیسے چاہئیں۔ اجے گوسوامی سے ڈرتے ڈرتے پیسے مانگے تو ناراض ہوگئے۔ ''پیسے کیا ڈال میں پھلتے ہیں''
نربھے چودھری کے جسم میں سنسنی سی پھیل گئی۔ لہجہ کمزور ہوا...... دھیرے سے بولا
''ڈال میں تو نہیں۔ لیکن ہمارے بنتے ہیں۔ ہمیں ضرورت ہے۔''
اجے گوسوامی نے ایک پل کو انہیں دیکھا۔ پھر ٹھٹھا کر ہنسے۔
'کتنے دن سے شیو نہیں بنایا ہے؛ وہ پھر ہنسے...... پروڈکشن میں ہو۔ ایسے چہرہ بگاڑ کر رہو گے تو لڑکیاں گھاس نہیں ڈالیں گی۔ سنو، تم کہہ رہے تھے کہ ٹھنڈے پانی کی تکلیف ہے۔ کہہ رہے تھے نا؟

OO

گودریج کمپنی کا ایک پرانا سا فریج اس نے ڈرائنگ روم کے پاس والے کباڑ خانے

میں دیکھا تھا۔ ایک دم علاء الدین کے چراغ جیسا...... کبھی کبھی اس میں بوتلیں بھی رکھی دیکھی تھیں...... دو ایک بار اس نے خود اس میں سے بوتل نکال کر پانی پیا تھا۔ خشک گلے کو تر کیا تھا۔ اسے یاد آ گیا۔ اے جی گوسوامی اسے ٹٹولتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

'اچھا فریج ہے۔ پینٹ کرا لو تو کوئی مانے گا نہیں کہ سترہ ہزار سے کم کا ہے۔ صرف اندر کی لائٹ نہیں جلتی...... 'ڈھبری؛ ڈھبری کہتے ہو نا۔ وہ پھر ہنسے...... مگر کیا روشنی میں موم بتی ڈھونڈنا ہے...... ارے کھانا رکھو۔ چار دن بعد کھاؤ۔ تازہ ملے گا۔ ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پیو۔ برف جماؤ۔ شربت لسی بناؤ، کیوں، فریج چاہئے......؟'

اور اس طرح علاء الدین کے چراغ جیسی وہ فریج کب کیسے، نربھے چودھری کے کمرہ میں آ گئی، اس واقعہ کا ذرا تاریخ یاد نہیں ہے۔ لیکن فریج ان کے کمرہ نما دنیا میں آ چکی تھی اور یہیں سے اس کہانی کی شروعات ہوئی تھی...... جس نے نربھے چودھری کے مکمل وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

(2)

بہت پیچھے چھوٹا ہوا ایک گھر...... گھر کے کسی تنگ کمرے اور تنگ کمرے کے کسی گرد آلود طاقچے پر رکھی ہوئی کچھ آدھی ادھوری خواہشیں...... مٹی کے مرجھائے پودے والے گملوں میں رکھے ہوئے کچھ خواب...... شہر کی تنگ ویران گلیوں میں، اب اکیلے مٹر گشتی کرنے والے دوستوں کی جماعتیں۔

گھر سے چٹھی آتی تو جیسے یادوں کا ایک کارواں چل پڑتا...... اور جیسے سب نربھے چودھری کو گھیر کر بیٹھ جاتے...... ''وہاں موتیہاری میں سب کچھ چھوڑ کر آئے ہو۔ یہاں تیر مار لیا؟
نربھے چودھری کو پرچھائیاں گھیر کر بیٹھ جاتیں......

اس دن گھر سے پھر چٹھی آئی تھی...... چٹھی میں ایک ماں کا خواب بند تھا...... وہی پرانی داستاں کے بوسیدہ صفحے...... باپ ریٹائر ہو رہا ہے۔ بہن جوان ہے...... فکر کے چھوٹے چھوٹے طاقچوں سے گزرتے مسئلے......
نیند نہیں آ رہی تھی نربھے چودھری کو......
آسماں کے نیلگوں پردے پر رات بکھر چکی تھی۔ اچانک کمرے میں سرسراہٹ سی

ہوئی...... پہلے چھم سے کوئی پائل بجی۔

نربھے چونک گئے......کون؟

نقرئی سا قہقہہ گونجا۔

نربھے چودھری اچھل گئے۔

'کون۔؟''

''میں...... میں ہوں'

وہاں روشنی تھی۔ روشنی کے دائرے میں ایک بلا کی قیامت کھڑی تھی ــــــ قیامت کے بدن پر کپڑے بھی قیامت کے تھے۔ چہرہ ایسا کہ خوبصورتی نے اپنی حدوں کو چھولیا ہو...... دبس اس سے زیادہ نہیں' ــــــ بدن کے نقوش اتنے تیکھے کہ دنیا کی ساری حسین عورتوں کے بدن بھی شرما جائیں ــــــ کپڑے اتنے باریک کہ شاہی مخمل وکمخواب کے خزانے بھی ماند پڑ جائیں۔

اپنے نربھے چودھری خاصہ ہکلا رہے تھے۔

ــــــ 'کہاں...... کہاں سے آئی ہو؟'

ــــــ 'وہاں...... فریج سے!'

ــــــ 'فریج سے؟'

ــــــ 'ہاں......'

ــــــ 'کیوں......؟'

ــــــ 'کیوں!' عورت کے ہونٹوں پر بلاخیز تبسم تھا...... 'بوتل سے جن آسکتا ہے فریج سے عورت نہیں آسکتی؛

ــــــ 'لیکن کیوں آئی ہو؟'

جواب میں عجیب سی بے تکلفی شامل تھی۔

ــــــ 'تمہارے لئے؛

ــــــ 'میرے لئے!'

ــــــ 'ہاں۔ تمہارے لئے'

یقیناوہ دنیا کی سب سے خوبصورت مسکراہٹ تھی جو اس کے ہونٹوں پر بجی تھی۔

......'صرف تمہارے لئے'

......'مجھے......یقین کیوں نہیں ہو رہا ہے''

_____ 'پاگل ہو، فریج والی عورت ہنسی۔ دیکھو میں صرف تمہارے لئے ہوں۔'

......تو کیا میں تمہیں چھو سکتا ہوں_____؟

نقرئی قہقہہ پھر گونجا_____ 'دریا سے صرف قطرے کی تمنا رکھتے ہو......ارے آگے بڑھو۔ میں تمہاری ہوں صرف تمہاری......''

اس نے ہلکی سی انگڑائی لی...... کمرے میں یوں ہلچل ہوئی جیسے آندھی سے گھر کی کھڑکیاں۔ دروازے ہلنے لگے ہوں۔ یقیناً یہ ایک تو بہ شکن انگڑائی تھی......سرخ پھولے ہوئے ہونٹ......لمبی گردن......کپڑوں سے انگاروں کی بارش کرتا ہوا نوخیز بدن......

وہ والہانہ طریقے سے ہنسی......''بڑھو، نا......آگے بڑھو......''

اور ایک جھٹکے سے اس نے کپڑوں کے ہوک کھول دئے تھے......اندھیرے کمرے میں روشنی کے گول دائرہ کے بیچ ایک برہنہ جسم دعوت نظارہ دے رہا تھا۔

''یار! یہ صرف تمہارا ہے......دریا سے صرف قطرے کی توقع رکھتے ہو......!''

نر بھے چودھری کے بدن میں لرزش ہوئی۔ جسم میں ایک طوفان سا آیا۔ شریانوں میں خون کے گرم گرم لاوے دوڑ گئے۔ تو کیا یہ کوئی خواب تھا۔ مگر نہیں......وہ مجسم سامنے کھڑی تھی......اور ایسا تو بہ شکن، پُر کشش بدن انہوں نے کبھی خوابوں خیالوں میں بھی نہیں دیکھا تھا۔

پھر جیسے چاند کی کشتی میں ہلچل ہوئی......اور کشتی چاند کی برفیلی سطح کو پگھلاتے پگھلاتے دھند کی سرنگ میں ڈوب گئی......

وہ ہوش میں آئے تو سانس تیز تیز چل رہی تھی...... کپڑے ادھر ادھر بکھرے تھے......عورت غائب تھی......فریج کا دروازہ بند تھا......مگر، کمرے میں ایک عجیب سی خوشبو پھیلی تھی......اور اس سے بھی زیادہ بدن ایک عجیب سی لذت میں ڈوبا ہوا تھا۔

(3)

''سنو یہ کیا کہہ رہا ہے۔'' اجے گوسوامی زور زور سے قہقہہ لگا رہے تھے...... 'نہیں

بھائی، مجھے...... مجھے مت روکو...... ہنسنے دو...... یعنی کہ فریج میں عورت...... فریج میں...... اور کہیں نہیں ملی ss ہو s...... ہو ہو sss...... یعنی کہ چوکی کے نیچے، نہیں، ٹب کے اندر نہیں...... ss انٹرنیٹ کی عورت سنی ہے ss ٹیلی فون کال والی عورت کے بارے میں سنا ہے۔ نمبر ملایئے مستی بھری باتیں کیجئے...... یہ سب ٹھیک...... مگر فریج میں، ہو ہو؟ یار تم سچ مچ پگلا گئے ہو...... s

اجے گوسوامی کے ساتھ بیٹھے ہوئے دوسرے لوگوں نے بھی ٹھہا کہ لگایا۔ اس وقت ان کے گھر نئی اسکرپٹ کو لے کر میٹنگ چل رہی تھی۔ نربھے چودھری نے بس یونہی دریافت کیا تھا...... یار فریج ٹھیک سے کام کر رہا ہے نا؟

'کام کیا کر رہا ہے...... فریج میں عورت آگئی ہے۔'

نربھے چودھری کے منہ سے یہ جملہ نکل تو گیا لیکن ماحول پر جیسے اس جملے کا پہلی بار میں کوئی اثر نہیں ہوا۔ اجے گوسوامی رائٹر کے ساتھ اسکرپٹ کی بات چیت میں لگا رہا۔ ہاں پاس بیٹھے آدمی نے چٹکی لی۔

''نربھے جی! شادی نہیں کرو گے تو فریج میں عورت ہی رہے گی۔ سامان تو نہیں رہیں گے نا......''

''اب لو جیسے ہم جھوٹ کہہ رہے ہیں۔ عورت آگئی ہے تو سامان کہاں رکھیں بھائی۔''

اجے گوسوامی نے ڈانٹا...... ''اپنا بہاری غصہ یہاں مت دکھاؤ...... کہہ دیا نا، پیسے مل جائیں گے...... شوٹنگ شروع ہونے والی ہے۔ تم آرٹ ڈائرکٹر، سیٹ ڈیزائنر، کسٹیوم، میک اَپ مین، کی ڈیٹل تیار رکھو...... اور ہاں۔ وہ رائٹر کی طرف دیکھتے ہوئے ہنستے تھے۔ ''شادی کرلو...... کہو تو اس سیریل کی ہیروئین سے کروادیں۔ کیوں؟''

رائٹر نے بھی ٹھہا کہ لگایا۔ ''پھر فریج سے عورت نہیں آئے گی۔''

''آپ سمجھتے ہیں کہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں۔ پیسہ مانگنے کے لئے اپنی جھنجھلاہٹ دکھا رہے ہیں۔ سمجھئے...... آپ کی مرضی...... لیکن ہم جھوٹ نہیں بول رہے ہیں۔ ہنمان جی...... جے بجرنگ بلی، جس کی چاہیں قسم لے لیجئے۔ وہ عورت تھی۔ ہاڑ مانس کی عورت، ارے، پری لوک میں ایسی کیا عورت ہوگی۔ جو وہ تھی...... ہم تو آواز سنتے ہی سکپکا گئے۔''

کمرے میں ہنسی کا دورہ پڑا......

ایک آواز ابھری...... 'پھر وہ فریج کھول کر آپ کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔'

'ہاں ایسا ہی ہوا۔ بالکل ایسا ہی......'

'پھر تو آپ نے......'

اس کے بعد ہنسی کے دورے نے رکنے کا نام ہی نہیں لیا۔

''ہنسئے آپ لوگ۔ ہنسئے۔ میرے پاس بے کار کا وقت نہیں ہے۔ آپ کی ہنسی میں شریک ہونے کے لئے......میں جا رہا ہوں۔''

نربھے چودھری غصّے کے عالم میں ہنسی ٹھہا کہ کے بیچ کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔

مگر......جاتے کہاں؟

ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ کیا سچ مچ رات جو کچھ ہوا وہ خواب نہیں تھا......فریج میں سے عورت......جیسے آسمان سے دودھیا چاند، خاموشی سے ایک رات آپ کے ساتھ رہنے کے لئے آجائے......نہیں نربھے چودھری، وہم ہوا ہے تمہیں......وہم......!

OO

نربھے شام گئے تک آوارہ سڑکیں ناپتے رہے۔ سڑکوں پر ناچتی تتلیاں......لیکن فریج والی تتلی......شام کے گھنے سائے پھیل گئے تھے۔ ڈھابے میں کھانا کھایا......تب تک رات کے نو بج چکے تھے۔ اب ایک ہی منزل تھی، گھر——پھر وہی راستے......وہی کمرہ......وہی تنہائی......مگر......

دروازے کا تالا کھولتے تک، نئے احساسوں والا کپڑا بدل چکے تھے نربھے چودھری——کیوں؟ اس کا جواب نہیں دے سکتے تھے۔ بس دروازے......اور تالا کھولنے تک کوئی پختہ ذہن کا آدمی ان کے اندر سما گیا تھا۔ کہیں سے خوشبو کا تیز ریلا اٹھا تھا۔ ایک جانی پہچانی سی خوشبو......یہ خوشبو ان کے پورے جسم، پورے وجود کو معطر کر رہی تھی——لیکن کیوں؟ دل دھڑک رہا تھا۔ اس طرح کی بے چینی سے پہلے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا——اور یہ سب کل ملا کر ایسا تھا، جیسے ابھی حال میں ان کی شادی ہوئی ہو۔ گھر پر نئی نویلی دلہن انتظار کر رہی ہو......

وہ دروازہ کھول کر اندر گئے اور جیسے سہم گئے......چھنا کہ سا ہوا......

کمرے میں روشنی تھی۔ بتی جلی ہوئی تھی۔ ایک خالی میز جو کافی دنوں سے بیکار پڑی تھی۔ صفائی کر کے اسے سنگھار میز میں بدلا جا چکا تھا۔ کمرے میں جیسے عطر کا چھڑکاؤ ہوا تھا۔ نیا

بستر...... نئی چادر، چادر پر خوشبو دیتے پھول بھی بکھرے تھے۔ سنگھار میز کے پاس وہ دنیا جہان سے بے نیاز اپنے سنگھار میں یوں ڈوبی تھی، جیسے نئی نویلیاں دلھے کے آنے کے انتظار میں دنیا جہان سے بے خبر ہو جایا کرتی ہیں۔

اس نے نظر اٹھائی۔ مسکرائی ــــــ کان کے جھمکے کی کیل درست کی...... آئینے میں فخر سے اپنا چہرہ دیکھا...... پھر جیسے جل ترنگ کو دھیرے سے چھوڑ دیا گیا ہو......!

......'آگئے تم؟'

......'میں......' زبھے پسینے پسینے تھے......

......'ہاں تم...... تم'

وہ آہستہ سے ہنسی...... جسے موسیقی سناتی لہروں کو، موسیقار نے اچانک ایک نئی دھن دے دی ہو...... وہ آگے بڑھی...... آج اس نے ریشمی ساڑی پہن رکھی تھی۔ ہلکی، آسمانی رنگ کی...... اس پر سانولی دھوپ کے رنگ کی لکیریں جھلملا رہی تھیں ــــــ اس سے میچ کرتا بلاؤز تھا...... وہ اس کے بلکل قریب آ کر ٹھہر گئی...... اتنے قریب کہ وہ اس کے سانسوں کے سرگم سن سکتا تھا...... اتنے قریب کے وہ دھڑکنوں کا حساب لگا سکتا تھا...... وہ ہنس رہی تھی......

......کیا آج بھی تمہیں سب کچھ خواب سا لگ رہا ہے۔

......ہاں!

......'پاگل ہو...... دیکھو۔ میں کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ کہہ سکتے ہو، یہ وہی کمرہ ہے جہاں تم رہتے تھے۔'

......نہیں!

......'وہ پینٹنگس دیکھی؟'

......'پینٹنگس؟'

......''ہاں، وہ ہنسی...... وہ دیکھو...... 'ناریوفو'، کی پینٹنگس...... خواب دیکھتی عورت کے ہاتھ میں ایک مرا ہوا بچہ......''

......بچہ مر کیوں گیا ہے؟''

میں نہیں بتاؤں گی۔ تم بولو...... میں تو فریج سے آئی ہوں اور یہ پینٹنگ تمہاری دنیا، تمہارے لوگوں کے لئے ہے...... لیکن سچائی یہی ہے کہ عورت خواب دیکھ رہی ہے اور بچہ...... بچہ

مر چکا ہے......!'

...... ''بچہ مر کیوں گیا ہے......؟'' وہ پھر بوجھل آواز میں بولا۔

'اس لئے کہ عورت خواب دیکھ رہی ہے...... جانتے ہو...... تاریو فو نے یہ غیر معمولی پینٹنگ کب بنائی تھی؟ 1942ء کے آس پاس۔ جب تم دنیا کو دوسری عالمی جنگ میں جھونک چکے تھے۔ کیا نہیں......؟ یاد آیا اور خود تم لوگ کیا تھے...... آزادی مانگ رہے تھے۔ بھکاریوں کی طرح...... مٹھی بھر لوگ جو تمہارے گھر پر قبضہ کر چکے تھے۔ تم ان سے چلے جانے کی مانگ کر رہے تھے...... ہے نا، وہ بھی بھکاریوں کی طرح...... ایسے ہی ہو تم......' اس نے ٹھنڈا سانس بھرا......

''ایک پُر اسرار تہذیبی شہر کی تعمیر کرنے والے اور ایک جھوٹی جذباتیت کا استقبال کرنے والے...... ہے نا......'' وہ کہتے کہتے پھر ہنسی......

...... 'لیکن یہ سب تم......؟'

...... 'تمہارے لئے لائی ہوں۔ گھبراؤ مت۔ چوری نہیں کی ہے۔ چوری کر بھی نہیں سکتی ہوں...... بازار سے لائی ہوں؟

...... 'تم بازار گئی تھی؟'

...... ہاں، کیوں؟'

...... نہیں میں سمجھ رہا تھا......'

...... تم زیادہ سمجھنے کی کوشش مت کیا کرو...... سنو مجھے اس طرح گندے میں رہنا پسند نہیں ہے...... سنا تم نے۔ اس لئے میں صفائی کی...... عطر کا چھڑکاؤ کیا...... دیواروں پر پینٹنگس لگائی۔ پھر تمہارے آنے کی راہ تکنے لگی اور تم آ گئے......''

اس نے گلے میں بانہیں ڈال دیں......

شاید وہ دنیا کی سب سے خوبصورت لڑکی کی سب سے خوبصورت انگلیاں تھیں...... ایسی انگلیاں...... جن کے لئے الفاظ اور محاورے بھی کم پڑ جاتے ہیں۔

پشت پر اس کی گرم گرم ہتھیلیوں کا رقص، جسم میں عجیب سی سنسناہٹ پیدا کر رہا تھا۔ پھر جیسے 'تابڑ توڑ' اپنے گرم گرم بوسے سے اس نے زبھے کی آتما کے اندر تک، عجیب سی سنسنی پھیلا دی...... ایک لمحہ کو ٹھہری۔ پھر بارش کے آخری قطرے تک اسے شرابور کرتی چلی گئی......

'سنو!'

'کیا ہے...... نر بھے کی آواز جیسے ہزاروں فٹ نیچے کنویں میں چھوٹ کر رہ گئی تھی......

'سنو؛ جب تم چلے جاتے ہو، تو بڑے یاد آتے ہو۔ اتنا انتظار کیوں کراتے ہو......'

قسم سے۔ وہ دنیا کے سب سے مدھر، سب سے ذائقہ دار، سب سے حسین اور سب سے زیادہ جلتے ہوئے ہونٹ تھے...... جس نے اپنی تپش سے ایک بار پھر اس کے لئے جنت کے دروازے کھول دیئے تھے......

''چلو منہ ہاتھ دھولو...... تم کتنے کمزور ہو گئے ہو۔ گھبراؤ مت...... اب تمہارا پورا خیال رکھوں گی...... میں...... مگر......''

''مگر...... مگر کیا......؟''

'ابھی نہیں...... اوہ...... تم میں کچھ بھی جاننے کی بے چینی کس قدر ہے۔ شاید تم نہیں جانتے...... انہیں باتوں نے...... ہاں، انہیں باتوں نے تو...... اوہ...... آئی لو یو نر بھے......''

جیسے زمین چلتے چلتے رک گئی ہو...... آسمان تھم سا گیا ہو...... کوئی چونکانے والا، جذباتیت سے بھرا فلمی نظارہ ہو...... پہلی بار اس لڑکی کے ہونٹوں پر نر بھے کا نام آیا تھا...... نر...... بھے —— پہلی بار...... دلّی کے بازار، کنزیومر کلچر میں آہستہ آہستہ یہ نام کتنا عجیب، کتنا بے رس اور کتنا بدنما لگنے لگا تھا...... جیسے 'موتیاری کی ایک خاص خوشبو اس کے نام سے لپٹی ہوئی ہو...... وہ اس نام کو بار بار دلّی کے رنگ میں بدلنے کا خواہشمند تھا۔ مگر آج...... جیسے اس نام سے زیادہ خوبصورت کوئی دوسرا نام ہو ہی نہیں سکتا تھا......

'چائے'...... وہ اچھانک جیسے خواب سے جاگا......

...... اتنی دیر میں اس نے چائے بھی بنالی تھی...... چائے نر بھے کے ہاتھ میں کانپ رہی تھی...... وہ اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

'ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟' وہ مسکرائی

'کیا یہ خواب ہے؟'

'کیوں؟'

'سوچ رہا تھا' ہم جیسوں کے لئے خواب ہی کیوں ہوتے ہیں؟ زندہ رہنے کے لئے بھی خواب...... محبت کرنے کے لئے بھی خواب......'

'لیکن یہ خواب نہیں ہے......'

'پتہ نہیں'

'خواب کا جسم نہیں ہوتا ہے......اس کی نقرئی ہنسی کمرے میں پھیلتی چلی گئی......وہ اٹھ کر سنگھار میز کے قریب کھڑی ہوگئی......وہ جیسے اپنے عکس کو بے حد پُرکشش انداز میں دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی......پھر جیسے کمرے کی تنہائی میں شعلہ بھڑکا......رات اسٹوب گیس' کی طرح چیخی......اور کمرے میں آگ کی تیز لپٹیں اٹھنے لگیں......اس نے بلاؤز کے ہوک کھول دیئے تھے......ریشمی ساڑی، دنیا کے سب سے حسین جسم سے الگ ہوکر، اس کے بستر پر، بے ترتیبی سے پھیل گئی تھی____ کمرے میں جیسے 'لیزر ریز' کا رقص چل رہا ہو......گداز بانہیں، صدیوں کی پیاس اور عقیدت کی حد تک، میناروں کے سفید گنبد کی طرح، تنے ہوئے مصفہ سینے......یا......دو قبۂ نور......دنیا کے سب سے حسین پاؤں......اس کی آنکھوں کی کشتیوں میں اس وقت وہی کشش تھی جو شاید خالق دو جہاں کو، سب سے خوبصورت 'تصور' گڑھنے کے دوران ہوئی ہو____! اس نے اپنی بانہیں بچھائیں......

'آؤ......'اس کی آواز میں 'ہیجان' کی حد تک سنسنی خیزی، آگئی تھی____ '......آؤ......' اوہ......تم دیر کر رہے ہو......آؤ۔ اس سچ کے لئے، جس کے لئے ہم پیدا ہوئے ہیں......اُس سچ کے لئے جس کے لئے آخری سانس تک ہم اپنے جینے کی آس قائم رکھتے ہیں۔

اور نربھے چودھری۔ جیسے آنکھیں بند تھیں____ جیسے خوابوں سے جنت کی طرف ایک خوشبو لٹاتی، کھڑکی کھل گئی ہو......جیسے ہوا میں تیرتا ہوا ایک رتھ ہو......اور رتھ، زندگی کے سب سے خوبصورت ذائقے کو پور پور میں اُتارتا ہوا اڑتا جاتا ہو......

......جیسے ہوا تھم گئی......سانسیں رُک گئیں......اُس کے بدن پر دنیا کا سب سے خوبصورت ننگا جسم اور......تمام تر ہیجان خیزیاں لٹا کر تھکا ہارا......اس کے جسم کے گوشت سے 'عبادت' کی ایک نئی عبارت لکھنے میں مصروف تھا____ اس کی آنکھوں میں شوخیاں تھیں......

'سنو'

اس کے بدن کی بے کراں موجیں، اس کے بدن کے ساحل سے ٹکرا ٹکرا کر لوٹ رہی تھیں......

'سنو۔ اب میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔' آواز میں تھرتھراہٹ تھی......

'ہاں پیسے۔ جو تھے سب ختم ہو گئے۔ پینٹنگس...... عطر، چادریں اور...... جو پیسے تھے۔ وہ تمہارے گھر کی خریداری میں لگ گئے......

'ہاں'

'مجھے چاہتے ہو تم؟'

'ہاں'

'میری سانسوں سے پیار ہے؟'

'ہاں'

'میرے جسم سے؟'

'ہاں؟'

'اور مجھ سے؟'

'ہاں'

'اور یہ بھی چاہتے ہو کہ میں کہیں نہیں جاؤں۔ میں ہمیشہ تمہارے پاس رہوں——"

'ہاں'

'تو پھر تمہیں میرا خیال رکھنا ہوگا۔'

وہ اپنے بدن کی 'بے کراں موجوں' کو سنبھالے، اس کے بدن کے ساحل سے ہٹ گئی تھی......

"سمجھ رہے ہو نا، نر بھے چودھری...... تمہیں میرا خیال رکھنا ہوگا......"

وہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنی ریشمی ساڑی کی 'شکنوں' میں کھو گئی تھی——

'تمہیں مجھے خوش رکھنا ہوگا۔ میری...... میری فرمائشیں پوری کرنی ہوں گی——سن رہے ہو، نر بھے چودھری...... میرے لئے......'

اس کی نقرئی، لڑکھڑاتی آواز کا 'جل ترنگ' کمرے میں گونج رہا تھا......

'سوچو میں...... ڈھل جاؤں تو؟ میں جیسی ہوں، ویسی نظر نہ آؤں تو—— یہ سب کچھ تم پر ہے نر بھے چودھری...... تم پر—— مجھے خوبصورتی پسند ہے۔ اس کمرے کو جنت سے زیادہ خوبصورت بنا دو...... مجھے خوشبوئیں پسند ہیں...... میرے لئے خوشبوؤں کا خزانہ لے آؤ—— میرے لئے تم بھی اپنے آپ کو بدلو گے نر بھے چودھری...... بدلو گے نا——؟ خوشبو کو، خوشبو اور ایک

حسین جسم کو ایک حسین جسم کی چاہت ہوتی ہے...... میرے لئے تم یہ سب کرو گے نا، نربھے چودھری، ورنہ...... ورنہ......'

○○

لفظ بجتے رہے...... بجتے رہے...... وہ اٹھا تو سورج کی شعائیں سیدھے کھڑکی سے ہوتی ہوئی اس کی آنکھوں پر پڑ رہی تھیں...... فریج والی لڑکی غائب تھی...... رات کی سچائی کے احساس کے لئے وہ سب چیزیں، یہاں تک کہ 'ناریوفو' کی پینٹنگس تک کمرے میں موجود تھی۔ بستر پر وہ ننگ دھڑنگ پڑا تھا۔ ابھی بھی جیسے خوشبوؤں نے چاروں طرف سے، اسے اپنے دائرے میں لے رکھا تھا...... مسرت کا عجیب سا احساس اب بھی ہو رہا تھا۔

'یہ سب کیا ہے؟'

یہ کیا کیسا خواب ہے۔ وہ سمجھ پانے سے قاصر تھا۔ کپڑے پہن کر اس نے ڈرتے ڈرتے فریج کھولا۔ فریج خالی تھا...... مگر وہی رات والی خوشبوئیں فریج کے اندر بھی بسی ہوئی تھیں۔

(4)

اب نربھے چودھری نکلنے کے لئے تیار تھے۔ لیکن کیا یہ وہی پرانے نربھے چودھری تھے۔ 'حلیہ پوری طرح سے بدلا ہوا۔ کالی آئرن کی گئی پینٹ پر، پوری آستین والی سفید شرٹ...... اور دنوں کی طرح جھٹ پٹ جو ملا پہن کر تیار نہیں ہوئے نربھے چودھری...... کپڑے ہی کتنے تھے۔ اس پر بھی ڈھلے ہوئے کپڑوں کی تعداد کتنی ہوتی تھی۔ لے دے کر ایک جوڑا...... کپڑے بھی خود ہی دھونے پڑتے تھے۔ لاجپت نگر مارکیٹ سے دو نمبر کا سستا سا آئرن مل گیا تو اٹھا کر لے آئے نربھے چودھری۔ لیکن کپڑے آئرن کون کرے۔ صبح صبح بس پکڑنے کے چکر میں آئرن بے چارا ویسے ہی 'کوٹ' کے ڈبے میں بند رہا لیکن...... دلی آنے کے اتنے برسوں بعد جیسے سارے قاعدے قانون ان کے لئے بدل گئے تھے؟...... اور تو اور...... دو ایک ٹائی لوہے والے صندوق میں پڑی تھی۔ کبھی گفٹ میں ملی ہوگی۔ لیکن پہننے کی نوبت نہیں آئی۔ وہی موتیہاری کا چھیلا۔ اپنے یہاں عام دنوں میں وہ ایسے سوٹڈ بوٹڈ ہو کر نکل سکتے تھے؟ کیوں نربھے چودھری؟ پیچھے سے ''شاک'' سے کمینٹ پاس ہوتا...... ''نیا ہے'' کا ہے بھائی۔ موتیہاری کا چھیلا''۔

لیکن آج موتیہاری کے اسی چھیلے نے اپنی شکل وصورت بدل ڈالی تھی۔ اس پر پرفیوم۔ یہ پرفیوم کی شیشی اسے مادھری نے دی تھی۔ اپنے کریٹیو ریلس کی پرمانینٹ ایکٹریس۔ جس کے بارے میں یونٹ والوں کا کہنا تھا...... ارے مادھری کا ٹانکا اجے گوسوامی سے، کوئی آج سے 'بھڑا' ہے...... دیکھتے نہیں، ان کے ہر پروڈکشن میں کوئی نہ کوئی رول ضرور ہوتا ہے۔

'مادھری!'

ایک مخمور کایا...... بند اس۔ پتہ نہیں، اس دن کیا خاص بات تھی۔ کوئی خاص بات تھی، تو بس یہ تھی کہ مادھری اسے سیٹ پر تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ پھر اسے دیکھ کر مادھری کی آنکھوں میں جیسے چمک آگئی...... ''نربھے جی! آپ یہاں ہو''

''کیوں؟''

''ارے ہم آپ کو کہاں کہاں تلاش کر رہے تھے۔''

''کیوں؟'' اسے یقین نہیں ہو رہا تھا۔ مادھری جیسی لڑکی اسے تلاش کر سکتی ہے...... بیٹا یہ ہے فلم میں آنے کا مطبل...... کا؟ کہ مادھری جیسی لڑکیاں بھی...... ہے s s ہے s s اس نے کھیسیں پنوریں۔ اور مادھری نے پرفیوم اس کی طرف بڑھا دیا...... ''خاص تمہارے لئے۔ دارجلنگ گئی تھی شوٹنگ میں۔ دیکھو وہاں بھی تمہیں نہیں بھولی۔''

نازک سالس۔ مادھری نے ہلکے سے پرفیوم کا چھڑکاؤ اس کی قمیض پر کیا۔ آنکھوں میں قوس قزح تن گئے۔ لیکن فوراً ہی الیا راجا کی فلم 'اپو راجا' کا وہ بونا اُسے یاد آ گیا...... جسے فلم کی اداکارہ نے انگوٹھی دیتے ہوئے جلدی جلدی کہا تھا...... ''منگنی سمجھتے ہونا۔ کل صبح وقت پر پہنچ جانا۔ دیر مت کرنا......'' اداکارہ نے وہ انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنا دی تھی۔ بونا کمل ہاسن اپنے بونے جوکر دوستوں میں منگنی کی اس انگوٹھی کو لے کر کتنا خوش ہوا تھا۔ گانا بھی گایا۔ دوستوں نے بھگوان کی طرف سے 'اچنبھے کے طور پر لکھی جانے والی تقدیر' کے لئے اُسے مبارکباد بھی دی۔ مگر آگے...... اس وقتی خوشی کا نتیجہ کیا نکلا تھا...... ''ارے اپو! انگوٹھی تو نکالو۔ دیر ہو رہی ہے۔' اور اداکارہ رجسٹرار کے پوچھے جانے پر ہنستی ہے...... ''گواہ یہ ہے اپنا اپو...... چلے گا......''

'چلے گا......؟' رجسٹرار ہنستا ہے......

پرفیوم لے کر دیر تک نربھے چودھری گم صُم کھڑا رہا...... لیکن وہاں اس پر ہنسنے کے لئے کوئی رجسٹرار نہیں تھا۔ اسے لگا، الف لیلیٰ جیسی کسی کہانی کے اوراق اس کے سامنے کھل گئے

ہوں...... مادھری بنداس ہے تو کیا ہوا...... لوگ غلط بولتے ہیں...... مادھری ایسی ہو ہی نہیں سکتی...... وہ بھی اجے گوسوامی......؟ کیا اس کے پاس اجے گوسوامی جیسے لوگوں کی کمی ہے......؟ اور پھر...... یہ تو میڈیا ہے میڈیا۔ یہاں تو ایسی کہانیاں روز بن جاتی ہیں۔

'مادھری!'

ہونٹوں تک آکر یہ نام جیسے 'رس شرنگار' سے بھرپور غیر معمولی شاعری میں بدل گیا ہو...... لیکن شاعری کتنی جلد باسی اور سڑاند دینے لگی تھی......

'مادھری'...... وہ اسے پکارتا ہوا میک اپ روم میں چلا گیا...... دروازہ کے پٹ آن میں کھلے تو، وہ جیسے موتیہاری کا لمبے قد والا بونا بن گیا تھا...... اجے گوسوامی کی بانہوں میں قید مادھری۔ مادھری نے چلا کر آواز دی تھی...... 'ارے...... نربھے...... سنو تو......'

'جانے دو......' یہ اجے گوسوامی کی آواز تھی......

'تمہارے والے میں سے ایک پرفیوم میں نے......'

اجے ہنس رہے تھے...... ''پرفیوم، اور یہ بہاری...... تم بھی پاگل ہو مادھوری......''

دونوں کا ایک ساتھ قہقہہ گونجا تھا۔ لیکن اب، کچھ بھی آگے سننے کو وہاں رُکا نہیں، نربھے چودھری۔ جیسے پیچھے ہزاروں کی تعداد میں کتے پڑے ہوں...... ڈیفوڈل ڈاگس...... ڈیفوڈل۔ جلتے ہوئے...... ان گنت تعداد میں۔ اداکارہ نے منو کو انگوٹھی دی ہے۔ مادھری نے نربھے کو پرفیوم دیا ہے...... 'الو سمجھتا ہے کہ'...... 'نربھے کو لگتا ہے کہ......'

بونا الو 'پست' ہوتے ہوئے اپنے قد سے کتنا کم ہوا ہوگا؟ مگر...... نربھے...... وہ الو سے زیادہ 'بے وجود' ہو گئے تھے...... چھوٹا لمبے قد والا بونا...... پھر وہ پرفیوم کمرے کی کال کوٹھری میں پھینک دیا گیا۔ شاید اسی نئی صبح کے انتظار کے لئے۔ اسی دھانی صبح کے انتظار کے لئے......

پرفیوم کپڑے میں مارتے ہوئے ایک عجیب سی خفیف ہنسی، نربھے کے ہونٹوں پر کھل رہی تھی۔ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے اس نے پیسے گنے تھے اور پہلا کام کیا تھا...... اپنے قدم پاس والے بیوٹی پارلر کی طرف تیز کئے تھے۔

(5)

''تم نربھے ہو...... نہیں، یقین نہیں آتا۔'' اجے گوسوامی کے چہرے پر عجیب سی سنجیدگی تھی...... آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں نے نربھے کو غور سے دیکھا۔ چھوٹے چھوٹے، ڈھنگ سے تراشے گئے بال...... بدن پر قاعدے کی پینٹ اور شرٹ......

''تو تم سچ مچ نربھے ہو؟''

''کیوں؟''

''یقین نہیں ہوتا۔''

''لیکن اس میں یقین نہیں ہونے کی......''

نربھے' کہتا کہتا' ٹھہر گیا...... اجے گوسوامی اسے غور سے گھور رہے تھے۔ وہ جب بھی اس طرح گھورتے تھے۔ اسے ڈر لگتا تھا......

''رہنے دو۔ دیکھتے نہیں......''

''مطلب......؟''

''مطلب، آج یہ خود پروڈیوسر بن گیا ہے۔ ذرا بال تو دیکھو s s s''

''ذرا چال تو دیکھو s s s''

کمرے میں ٹھہاکا الگ رہا تھا......

''بال تو دیکھو s s s گال تو دیکھو s s s چال تو دیکھو s s s شرٹ تو دیکھو s s s پینٹ تو دیکھو s s s پھر پورا ڈسکو شروع ہو گیا......''

''دیکھو جی دیکھو...... نربھے کو دیکھو s ایک بار دیکھو s بار بار دیکھو۔''

نربھے گم صُم تھا۔ وہ جان رہا تھا۔ مذاق اپنی حدوں کو پار کر رہا ہے...... سب سوچ رہے ہوں گے...... سالا s بدلا بدلا سا لگ رہا ہے بہاری۔ بہاری مطلب......، اسے لگا، مادھری اُسے دیکھ رہی ہے......

لیکن فوراً ہی وہ عورت اس کی آنکھو کی اسکرین پر چھا جاتی ہے...... 'سن رہے ہو نا نربھے! خوشبو کو خوشبو اور ایک حسین جسم کو ایک حسین جسم کی چاہت ہوتی ہے...... میرے لئے تم یہ

سب کروگے نا......؟ کروگے نا،نربھے چودھری؟......ورنہ s s s ورنہ......''

لفظ لگاتار چیخ رہے تھے......

اور ادھر ڈسکو جاری تھا......

''ذرا گھوم کے دیکھیو s جے نربھے s s آگے سے دیکھیو s s جے نربے۔''

اجے گوسوامی نے اس کے بدلے چہرے کی آگ کو پڑھ لیا تھا۔ 'ٹھہرو۔ ٹھہرو'۔ وہ چیخے......یعنی حد ہوتی ہے۔ حد ہوتی ہے بے شرمی کی۔ آپ سب نے ایک سیدھے سادھے بہاری کو......معنی......ہنسیے مت......بہاری کوئی گالی تھوڑے ہی ہے۔''

اجے خالص نربھے 'اسٹائل' سے بول رہے تھے......''بہاری بدل نہیں سکتا کا......؟ ضرور بدل سکتا ہے......اور پوچھ کے دیکھو......یقیناً، اس کے پیچھے بھی اُسی عورت کا ہاتھ ہوگا۔ کیوں نربھے؟

''جی s s s s''

کسی نے آواز لگائی......'فریج والی عورت کا'۔

''ہاں بالکل''۔

''لو دیکھو......''

ہنسی کا فوارا چھوٹا تو نربھے نے یکایک سامنے والے آرٹسٹ کا گریبان پکڑ لیا......

''سالے''......ماحول حیرت زدہ 'طبلوں' کی آواز رک گئی......جیسے، سوئی بھی گرے تو آواز سن لو۔ یکایک بہتی ہوئی ہوا تھم گئی......''مذاق اُڑاتے لوگوں پر بجلی گر گئی......نربھے کا سارا غصہ چہرے پر سمٹ آیا تھا۔

اس نے جھٹکے سے بے چارے آرٹسٹ کا گریبان چھوڑا۔ ہتھیلیاں ابھی بھی گرم تھیں۔ وہ یکایک پلٹا......

''سنو اجے گوسوامی! ایک بات جان لو۔ بہاری 'بڑبک' بن سکتا ہے۔ تو گریبان بھی تھام سکتا ہے۔ مجھے نہیں کرنا تمہارے ساتھ کام......کل پھر آؤں گا۔ پی سا نکال کر رکھنا......''

پھر وہ ٹھہرا نہیں، واپس آ گیا۔

ماحول میں سناٹا چھا گیا۔ جو جہاں تھا، وہیں آنکھیں نیچے کیے کھڑا رہا۔ یہ کیوں ہوگیا؟

یہ سارا کچھ ویسا تھا، جیسے دوستوفسکی کے 'ایڈیٹ' نے پرنسز کی پارٹی میں کیا تھا...... سناٹے کو بھنگ کیا اجے گوسوامی نے۔

''چلو چلو اسکر پٹ پر بیٹھتے ہیں......''

مگر وہ ابھی بھی اپنے چہرے کے احساس کو چھپا نہیں پائے تھے......

(6)

''زندگی سرکس نہیں ہے اور سنو نر بھے۔ تم اپو نہیں ہو۔ تم اپو ہو بھی نہیں سکتے۔ تمہارے ساتھ میں ہوں، میں...... سن رہے ہو نا......؟''

کمرے میں خوشبو پھیل چکی تھی...... نقرئی قہقہہ پھر گونجا......

''دیکھو s s s s s آج میں نے نیا سنگھار کیا ہے، تمہارے لئے صرف تمہارے لئے لئے......''

عورت اُٹھتے ہوئے، آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ پور پور سے خوشبو کی لہریں پھوٹ رہی تھیں...... 'آئینہ' یقیناً حیران تھا کہ کبھی اس کے شیشے، جیسے وجود میں اتنا غیر معمولی 'عکس' بھی سما سکتا ہے۔

''پتہ نہیں مجھے...... مجھے کیا ہو گیا تھا s s پتہ نہیں۔ اب وہ......''

''ڈرتے ہو۔''

''ڈرنا پڑتا ہے...... گھر ہے...... پتا جی ہیں...... اور۔''

''میں s s'' ...... آئینہ نشے میں ڈوب گیا تھا......

''میں s s s تمہیں میری پرواہ نہیں۔ پتھر ہو تم۔ میری طرف دیکھو...... اُس کا 'سنگھار' ویسا تھا...... جیسے سارا عالم ہنسی رو کے ہو، کہ بادشاہ تو ننگا ہے......!

''کیا دیکھ رہے ہو......''

جسم سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔

''تم نے کوئی غلط کام نہیں کیا نر بھے۔ سمجھ رہے ہو نا...... دیکھو تم مضبوط ہوئے...... اور یہ کمرہ پہلے سے زیادہ روشن ہو گیا۔ یقین کرو میں صرف تمہارے لئے بنی ہوں...... تمہارے لئے...... میں لہر ہوں...... جھرنا ہوں...... سنگیت ہوں...... خوشبو ہوں...... اور سب سے زیادہ میں

تمہاری ہوں...... تمہاری ہوں نر بھے...... ss"

پھر جیسے روشنی کا جھماکا سا ہوا......

"آواز میں سنگیت پیدا ہوا...... 'آؤ مجھ میں سما جاؤ ss سما جاؤ sss"

اور......

قارئین!

ٹھیک اُسی لمحہ جو کچھ پیش آیا۔نہیں جانے دیجئے۔نہیں ٹھہریئے۔یعنی، جو کچھ ہونے جا رہا تھا۔نہیں ٹھہریئے۔میں اپنا تبصرہ اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔مگر اُسی لمحہ، اس جگمگاتے، روشن کمرے میں یکا یک بھگدڑ مچ گئی۔یکا یک باہر دروازے پر دستک ہوئی۔عورت پہلے متحیر ہوئی۔ پھر سنگیت تھما۔خوشبو اُڑی۔لہریں گم ہوئیں۔

دستک بڑھتی گئی۔

کمرہ یکا یک چیخ و پکار کرنے لگا۔عورت فریج میں چلی گئی۔

دروازے پر اجے کے آدمی کھڑے تھے۔لفافہ میں نربھے کے پیسے پڑے تھے......

"گن لو......"

"گننے کی ضرورنہیں ہے"

"اور...... صاحب نے کہا ہے کل سے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ٹھیک"...... نربھے نے دروازہ بند کرنا چاہا۔

آگے والے 'مسٹنڈے' آدمی نے دروازہ چھیک لیا——

"سنئے، دروازہ مت بند کیجئے۔"

"کیوں؟"

"مزدور ساتھ میں ہیں...... صاحب نے فریج واپس منگوایا ہے!۔"

نربھے حیرت زدہ کھڑے ہیں......

مزدور فریج اُتارنے اور لے جانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

○○○

بارش میں ایک لڑکی سے بات چیت

(۱)

تب ڈرامہ کی ریہرسل شروع نہیں ہوئی تھی۔

ریہرسل سے ایک مہینہ قبل یہ ''حادثہ'' پیش آیا تھا اگر اسے حقیقت میں 'حادثہ' کا نام دیا جائے تو!

لیکن —— اس 'حادثہ' سے پہلے بھی وہ کہیں ٹکرائی تھی۔ کہاں؟ سمینار میں۔ بس، ایک سرسری سی ملاقات تھی۔ وہ بھی ایسے خالص ادبی سمیناروں میں بولنے کے لئے ہوتا ہی کیا ہے؟ نہیں، مجھے سوچ لینے دیجئے۔ سمینار کا خاص موضوع تھا —— ''عورت'' —— ملینیم یعنی ہزاروں برسوں کے اس سفر میں کہاں کھو گئی ہے عورت؟ پہلے بھی کہیں تھی یا نہیں؟ قدیم گرنتھوں میں دروپدی، کنتی، سیتا، ساوتری، پاروتی، دمینتی، شکنتلا، میتری وغیرہ —— عزت سے پکارے جانے والی، ملینیم صدی کے آخر تک لکس کا نیم عریاں اشتہار کیسے بن گئی؟ یا وہ اشتہار نہیں بنی۔ 'لرل' اور 'لکس' کے اشتہاروں سے آگے نکل کر اور بھی مورچے سنبھالے ہیں اس نے۔ کہا جائے تو ایک پڑاؤ W.W.F بھی ہے۔ آنے والی ملینیم صدی میں کہاں ہوگی یہ عورت؟

مجھے یاد نہیں، میں نے اپنی گفتگو میں کیا کیا جوڑا تھا۔ مگر —— شاید! مجھے یاد کرنے دیجئے۔ ہمیشہ کی طرح میں لفظوں کی لہروں میں بہہ گیا تھا۔ میں نے بات عورت کی آئی ڈنیٹی (Identity) یا آئی ڈنیٹی کرائسس (Identity Crisis) سے شروع کی تھی۔ میں بڑی

بڑی فلسفیانہ قسم کی باتوں میں الجھنا نہیں چاہتا تھا، اس لئے میں نے ٹو دی پوائنٹ مختصر میں اپنے نظریات لوگوں کے سامنے رکھے تھے۔ یعنی کیوں ہے عورت میں یہ آئی ڈینٹیٹی کرائسیس ــــــ؟ پہلے باپ کا گھر، باپ کے نظریوں پر سنبھل سنبھل کر پاؤں رکھنے والی، یہاں سے باہر جب وہ پرائے گھر میں بھیج دی جاتی ہے، یعنی شوہر کا گھر۔ شوہر کے نظریات۔ باپ اور شوہر کے الگ الگ نظریات کو ماننے پر مجبور عورت کی اپنی آئی ڈینٹیٹی کہاں باقی رہتی ہے؟ اگر کبھی وہ اپنی یعنی سیلف آئی ڈینٹیٹی کے لئے لڑنا چاہتی ہے تو ــــــ نہیں! اُف، سماج میں انجنا مشرا جیسی ان گنت مثالیں موجود ہیں۔ کیا غلطی پہلی بار وہاں نہیں ہوتی، جب وہ اپنے شوہر کا آدھا نام اوڑھ لیتی ہے، یعنی، اگر وہ سیما ورما ہے اور شادی کسی راجن شری واستو سے ہوتی ہے تو، وہ سیما ورما سے اچانک سیما شری واستو ہو جاتی ہے۔ کیوں؟ وہ صرف اپنی پہچان نہیں بدلتی، شاید انجانے میں بہت کچھ کھو دیتی ہے۔ پھر کھونے اور بدلنے کا ایک لمبا سلسلہ لگاتار چل پڑتا ہے......''۔

○○

مجھے یاد نہیں، میں کب تک بولتا رہا ــــــ

مجھے یہ بھی یاد نہیں۔ میں کیا کیا بولتا رہا، کتنی دیر تک ہال تالیوں سے گونجتا رہا، سیمنار کب ختم ہوا، کب میں باہر نکلا؟ مگر استقبالیہ ہال سے بس تھوڑی دور پر وہ کھڑی تھی۔

وہ ــــــ وہی 'حادثہ' والی لڑکی۔

اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی ــــــ

''آپ ــــــ آپ کافی اچھا بول لیتے ہیں۔''

(اس کی آواز سرد تھی۔ اتنی سرد جیسے کسی گہرے کنویں سے، برف کے ڈھیر کو ہٹاتی ہوئی اوپر اٹھ رہی ہو۔)

''اس سے پہلے بھی آپ کو بہت بار پڑھا تھا ــــــ مگر ــــــ آج ــــــ آپ کو سننے کے بعد ــــــ کیا عورت آپ کے لئے سچ مچ وہ نہیں ہے، جو دوسرے مردوں کے لئے ہے ــــــ''

(اس کی آواز میں، میں نے کسی ناگن کی پھپھکار محسوس کی۔ مگر ــــــ اس کی آواز پُرسکون تھی۔)

"آپ نے اچھی بات اٹھائی ہے۔ آپ سے متفق ہوں میں۔ مگر—— سچ سچ کیا آپ ایسے ہی ہیں۔ مثلاً گھر کے دروازے تک جانے والا آدمی آئیڈیالوجی کی سطح پر ایک ہی رہتا ہے نا……؟

اُف کسی آتما جیسی آواز۔ میں دھک سے رہ گیا۔ ہو ہنس رہی تھی—— وہ قد میں عام لڑکیوں سے زیادہ لمبی تھی۔ میں نے چونک کر پوچھا——

"میں…… میں سمجھا نہیں؟"

وہ پھر ہنسی—— "سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے ابھی، لیکن—— اگر میں آپ سے ملنا چاہوں تو؟ کسی—— کسی بھی دن—— ؟ کیا کسی دن آپ کے گھر آسکتی ہوں؟"

"ہاں، ہاں کیوں نہیں۔"

مجھے یاد ہے، گاڑی میں بیٹھنے تک میرے دانت بج رہے تھے۔ مجھے گھر تک پہنچانے والے میرے میزبان دوست نے پوچھا بھی تھا—— "بات کیا ہے؟ سردی تو بہت زیادہ نہیں۔ نیا سال شروع ہونے میں تو ابھی ایک ماہ باقی ہے……"

میں نے بات بدلتے ہوئے کہا—— "نیا سال نہیں، سن دو ہزار—— ایک نئے ملینیم کی شروعات، میں نے اپنی گفتگو میں 'وٹ' پیدا کرتے ہوئے کہا تھا—— "دراصل یہ دانت ملینیم کے اختتام کے استقبال میں بج رہے ہیں۔"

(۲)

تب تک میں نے ڈرامہ لکھا بھی نہیں تھا۔ (ڈرامہ کی ریہرسل شروع ہونا تو دور کی بات۔ ہاں، مجھے اپنے ڈائریکٹر سمیر مہادیون کی طرف سے بار بار غصے کو جھیلنا پڑ رہا تھا۔

"سن دو ہزار کے دوسرے ہفتہ تک ہمیں یہ ڈرامہ کر لینا ہے۔ اُف اور کتنی دیر لگائیں گے آپ؟"

"بس، جلد ہی ناٹک پورا کرلوں گا۔"

سمیر مہادیون تھیٹر کا آدمی تھا۔ تھیٹر پر دل و جان سے فدا۔ اپنی پائی پائی تھیٹر پر لٹا دینے والا۔ تھیٹر، اس کے لئے صرف تھیٹر نہیں تھا۔ جب وہ کوئی نیا ڈرامہ ہاتھ میں لیتا، یوں ہی 'بورایا' سا گھومتا رہتا۔ اس بار ڈرامہ کے لئے اس کا خاص موضوع تھا—— "عورت" وہ بار بار میرے

کمرے کی میز پر مکا مارتا تھا۔

''لکھو۔ ایسا لکھو کہ ہال تالیوں سے گونج جائے۔ یہ آنے والی نئی صدی میں میرا پہلا ڈرامہ ہوگا۔ یاد، عورت کو کوئی بالکل نیا کردار دو۔ ہزار سال بیت گئے، اب نئے ہزار سال کی شروعات ہوئی ہے۔ مجھے سائنس یا کسی نئی ایجاد سے زیادہ قیمتی کھوج نظر آتی ہے —— عورت میں۔ لگاتار آنے والی تبدیلیوں کی کھوج —— بس یار —— جھٹ پٹ لکھ ڈالو تم —— میں جانتا ہوں، اسے تم ہی لکھ سکتے ہو۔ کوئی دوسرا تم سے اچھا نہیں لکھ سکتا۔''

وہ مجھے مسکہ لگا رہا تھا۔

میں نے یکا یک پوچھا —— ''سمیر مہادیون، تم نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟''

وہ اپنے بال کھجا رہا تھا —— ''کیا کہوں، ہزار برسوں میں کوئی نہیں ملی۔''

○○

اس رات میں ڈرامہ ہی لکھنے کی تیاری کر رہا تھا، کیوں کہ سمیر مہادیون کو اب 'نا' کرنا میرے بس کی بات نہیں رہ گئی تھی۔ اس رات کئی دلچسپ باتیں رونما ہوئی تھیں۔ جیسے میں گیس پر چائے کا پانی چڑھا کر بھول گیا تھا۔ جلنے کی بو آنے پر جب میں بھاگا بھاگا گیا تو چائے دانی بالکل کالی پڑ چکی تھی۔ شاید پانی کا آخر قطرہ تک سوکھ کر کاربن بن چکا تھا اور سارے کمرے میں دھواں پھیل گیا تھا —— تین بار ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تھی اور ہر بار بلینک کال۔ میرے پاؤں سے ٹکرا کر 'عربی' شمع دان کی کرچیاں پورے کمرے میں پھیل گئی تھیں، جسے صاف کرنے میں مجھے پورے آدھے گھنٹے لگ گئے تھے۔ تو کیا یہ سب مجھے ڈرامہ شروع کرنے سے روک رہے تھے؟

نہیں، شاید اس رات ایک اور بھی 'حادثہ' دیر سے مجھے پاگل اور پریشان کئے جا رہا تھا ——

باہر زور زور سے بارش ہو رہی تھی، پیٹ پیٹ کر۔ آپ نہیں جانتے۔ مجھے بارش کا گیت کتنا پسند ہے۔ مجھ جیسے اکیلے، غیر شادی شدہ آدمی کو بارش کا یہ گیت کس قدر پاگل اور بے چین بنا دیتا ہے۔ کبھی چھت پر —— جیسے وائلن کے تاروں کو ہلکی ہتھیلیوں سے لہرا کر چھوڑ دیا گیا ہو۔ کبھی چھجے سے گرتے ہوئے...... کبھی یہ احساس کہ آپ کی آنکھیں بند ہیں۔ بدن کسی مونالیزا کے اندر میں بے جان سا پڑا ہے لیکن اس کی سب سے چمکیلی آنکھیں بند ہیں اور تصور کیجئے ——

دائیں بائیں چاروں طرف سے بارش کی بوچھاریں گر رہی ہیں ——— بغیر آپ کو چھوئے، گنگنائے بھگوئے...... بس! آپ کے ننگے تلووں کو چھوتی پانی کی دھاریں دور تک بہتی جا رہی ہوں ———

تو میں اسی تصور میں شرابور تھا۔ آگے بڑھ کر میں نے کھڑکی اور شیشوں کے دروازوں سے پردے کھینچ دئے تھے......

کمرے میں ایک عجب طرح کی "ادبی تاریکی" تھی ——— "ادبی تاریکی" نہیں، آپ اس کا تجزیہ مت کیجئے۔ مجھے لگتا ہے آپ اس کا تجزیہ کر بھی نہیں سکتے۔ کیسی، بے چین کرنے والی یہ ادبی تاریکی ہوتی ہے، اسے ادب تخلیق کرنے والے ہی بتا سکتے ہیں۔ وہ بھی ایسے عالم میں، جبوہ کچھ تخلیق کرنے کا ذہن بنا چکے ہوتے ہیں اور وہ بھی ایسی صورت میں جب کہ باہر زوروں کی بارش ہو رہی ہو......

تو باہر زوروں کی بارش ہو رہی تھی...... اور ٹین کے چھجے سے لڑھکتی پانی کی بوندوں کا سنگیت ایک عجب طرح کا سماں پیدا کر رہا تھا...... ایک طرف میری لمبی خاموشی سے نکلی ادبی تاریکی تھی اور دوسری طرف......

کوئی تھا، جو دروازے کا شیشہ تھپتھپا رہا تھا......

دوسرے ہی پل مجھے کسی عورت کی کانپتی آواز سنائی دی تھی ———

"کھولئے، دروازہ کھولئے۔ میں بری طرح بھیگ گئی ہوں......"

میں نے گھوم کر دیکھا۔ شیشے پر سفید سی ہتھیلیاں رکھی ہوئی تھیں۔ نہیں، جڑی ہوئی تھیں۔ کوئی پیکر تھا جو ہلکی روشنی اور شیشے کے باوجود، دھند میں کسی کی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا۔

کون ——— ؟

لیکن اس وقت میرا یہ پوچھنا کسی حماقت سے کم نہیں تھا۔ میں تیزی سے آگے بڑھا اور دروازہ کھول دیا۔

سامنے وہی تھی ——— وہی سیمینار روالی لڑکی۔

"پہچانا آپ نے؟" ——— وہی جانی پہچانی ہنسی ——— "یا بھول گئے؟"

"نہیں...... اتنی جلدی...... نہیں......"

"یعنی ——— دیر میں بھولنے کے عادی ہیں آپ۔ اُف! میں بُری طرح سے بھیگ گئی ہوں۔ کیا آپ اندر آنے کو نہیں کہیں گے......"

''ارے، اندر آجایئے......''

مجھے شرمندگی ہوئی اور میں نے پہلی بار اس کا بغور جائزہ لیا۔ وہ بُری طرح بھیگ گئی تھی۔ اس نے ہلکے گلابی رنگ کی ساڑی پہنے ہوئی تھی۔ جواب اس کے بدن سے پوری طرح چپک گئی تھی۔ اس کی گردن لمبی تھی۔ بالوں کے'' گچھوں'' سے ہوکر پانی کے قطرے، اس کی لمبی گردن سے ٹکراتے، اس کے بلاؤز کو تر کر رہے تھے...... لانبی گردن۔ مجھے افسوس ہوا۔ کاش، اس کے پہلے میں نے سندل کے پیڑوں کی طرح ہوتی ہیں—— شفاف اور چکنی۔ وہ تھوڑی دبلی پتلی تھی۔ ساڑی سے میچ کرتا ہوا بلاؤز تھا—— وہ گوری نہیں تھی۔ رنگ ہلکا سانولہ تھا مگر بارش سے بھیگی ہوئی یہ لڑکی ایک دم سے کمرے کی تاریکی میں ایک دوسرا ہی نقش بھر گئی تھی۔

یقیناً، لڑکیوں کے پورے بدن پر آنکھیں ہوتی ہیں اور انہیں فخر کے ساتھ اس بات کا احساس بھی رہتا ہے کہ انہیں کوئی بغور دیکھ رہا ہے۔ بُری طرح پانی سے شرابور ہونے کے باوجود شاید اسے اپنے بھیگے ہونے کا ذرا بھی احساس نہیں تھا......

''دیکھ چکے......''

وہ میری طرف دیکھتے ہوئے ہنسی—— میں ایک دم سے گھبرا گیا۔

وہ ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''کیوں...... تمہیں'' وہ کہتے کہتے ٹھہری...... ''آپ کہنا مجھے بوجھل لگتا ہے، تمہیں کہوں تو......''

''چلے گا۔''

وہ پھر ہنسی...... ''کیوں تمہیں عجیب سا نہیں لگا۔ بارش کی رات ایک جوان لڑکی اس طرح تمہارے کمرے میں آجاتی ہے۔''

''تمہارے کپڑے بھیگ گئے ہیں۔''

''جانتی ہوں۔ آگے یہ تو نہیں کہو گے کہ ہینگر سے کپڑے نکال کر لے آؤں۔''

''اوہ، مجھے سچ مچ افسوس تھا...... ابھی آیا—— سچ مچ سب سے پہلے تمہیں کپڑوں کی ضرورت ہوگی۔''

''رُکو۔ پھر گرما گرم چائے کی...... تھرمس تمہارے پاس ہے نا؟''

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

میں جانے کو مڑا تو اس نے روک دیا۔۔۔۔ ''ٹھہرو۔۔۔۔ مت جاؤ میں یوں ہی کہہ رہی تھی۔''

''میرے کپڑے تمہیں۔۔۔۔''

''آ جائیں گے۔۔۔۔ یہی کہنا چاہتے ہو نا۔'' وہ پھر ہنسی۔۔۔۔ ''نہیں آئیں گے ڈھیلے ہوں گے۔ میں تم سے زیادہ دبلی ہوں۔ جسم اور کپڑوں کے ساتھ کچھ بھی سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں ہوں۔''۔۔۔۔ وہ پھر ہنسی۔

''سنو میں ان لڑکیوں میں نہیں ہوں، جو بھیگ کر پرائے مرد کے کمرے میں گھس کر اس کا وارڈروب تلاش کر لیتی ہیں۔''

''پھر تم چاہتی کیا ہو؟''

''یہاں بیٹھ جاؤں صوفے پر اجازت ہو تو۔۔۔۔ صوفہ تھوڑا سا گیلا ہی تو ہوگا۔۔۔۔'' وہ پھر بے مطلب ہنسی۔ ''یقیناً ایک گیلی شئے، دوسرے کو گیلا۔۔۔۔ کر دیتی ہے۔''

''کیوں آئی ہو؟''

''ارے تم تو ایسے پوچھ رہے جیسے ڈر رہے ہو۔''

''کیوں ڈروں گا؟''

''میں کیا جانوں، خود سے پوچھو۔۔۔۔ وہ اچانک سنجیدہ ہو گئی تھی۔۔۔۔ ''تمہیں یاد ہے، وہ سیمینار''۔۔۔۔ میں نے پوچھا تھا نہ، میں اگر اچانک، بنا بتائے تمہارے گھر آ جاؤں تو۔۔۔۔ بارش کے اس موسم سے زیادہ مناسب وقت مجھے دوسرا نہیں لگا۔ مجھے لگا، یہی صحیح وقت ہے جب تم سے ملاقات کی جا سکتی ہے۔۔۔۔ اس کے چہرے پر ذرا سی تختی تھی۔۔۔۔ ''کبھی کبھی کوئی ایسا آدمی ہونا چاہئے جس سے آپ کچھ شیئر کر سکیں آپ کا پسندیدہ آدمی۔۔۔۔'' اس نے میری طرف گھور کر دیکھا۔۔۔۔ سیمینار والے دن تمہاری باتیں سن کر لگا تھا، تم سے اپنا آپ شیئر کیا جا سکتا ہے اور اپنا آپ شیئر کرنے کے لئے بارش کی رات سے زیادہ خوبصورت وقت کوئی نہیں۔۔۔۔ ''اوب ہو نہ تم''۔۔۔۔ آگے بڑھ کر اس نے کھڑکی کے پردے کھینچ دیے۔ باہر بجلی چمکی تھی۔ وہ خوف سے پیچھے ہٹی۔۔۔۔

''میرے شوہر ہیں لیکن میں نے شوہر کا گھر چھوڑ دیا ہے''۔۔۔۔ وہ دوبارہ صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ کچھ دیر تک دائیں ہاتھ کے ناخنوں کو چباتی رہی۔۔۔۔ اس دن آپ نے تخلیق کر اکسس،

آئیڈنیٹٹی کرائسس کا ذکر نہ چھیڑا ہوتا تو...... خیر...... جانے دیجئے۔ آئڈنیٹٹی کرائسس......''

وہ ہنس رہی تھی...... مرد اسے پرایا ہی سمجھ سکتا ہے۔ آئڈنیٹٹی کیا دے گا؟...... شادی کے کچھ ہی دنوں بعد لگا، اس میں ایک ساتھ بہت سارے جنگلی مرد یا بھیڑئے اکٹھا ہو گئے ہیں۔ ہم شادی کے بعد اس کے، الگ کے فلیٹ میں آ گئے تھے۔ کافی پیسے والا تھا وہ۔ کافی بڑا فلیٹ اور رہنے والے صرف دو آدمی۔ وہ بہت کم باتیں کرتا تھا۔ رومانس کرنا یا رومانٹک باتیں کرنا شاید اسے آتا ہی نہیں تھا اور جلد ہی مجھے اس کے دو شوق کا پتہ لگا، جو بہت ہی مختلف تھا اور......''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا......''وہ کراس ورڈس سے کھیلتا تھا۔ پہیلی، معمہ یا Puzzle''—— سارا دن وہ پنسل لئے خالی خانوں میں کچھ نہ کچھ بھرتا رہتا اور ایسا کرتے ہوئے اسے کسی بات کی فکر نہیں ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ اپنی نئی نویلی دلہن کی بھی، جسے یہاں آئے ہوئے ابھی بہت دن نہیں گذرے تھے۔ مجھے پر جو گزر رہی تھی میں جانتی تھی۔ پھر...... یا تو اس پر پاگل پن کا دورہ پڑنے لگا یا پھر اس نے ایک دوسرا شوق پال لیا''

''وہ کیا......؟''

''وہ بہت سارے پتھروں کو جیب میں جمع کرنے لگا۔ کراس ورڈس حل کرنے کے درمیان جب پریشان ہو جاتا تو گھر کی چیزوں کو پتھروں سے نشانہ بنانے لگتا...... چھوٹے چھوٹے بلب، قمقمے، جھاڑ فانوس...... شیشے کی کھڑکیاں، گلاس...... اس کی آنکھوں میں بے رحمی ہوتی۔ ایک دن اسی طرح گھر کی چیزوں کو نشانہ بناتے بناتے میرے پاس آ نکلا۔''

''پوچھا...... تمہیں میں پاگل تو نہیں لگتا''

''نہیں بالکل نہیں''...... میں نے جواب دیا میں جانتی ہوں کہ یہ سب تم کیوں کر رہے ہو۔''

''کیوں کر رہا ہوں؟''

''اس لئے کہ تمہارے پاس سے فنتاسی سرک گئی ہے۔ تم سب کچھ اپنی چھوٹی سی عمر میں ہی کر گزرے ہو۔''

اس کا چہرہ اچانک سفید پڑ گیا۔

''افسوس اس بات کا ہے کہ گھر کی ساری چیزیں ٹوٹ جائیں گی تو؟''

اس کی آنکھوں میں ایک خوفناک چمک تھی۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ واپس نکالا تو

اس کے ہاتھ دو۔ تین نکیلے پتھروں سے بھرے تھے۔

میں ہنسی تھی...... ''مجھے پتہ تھا اس کے بعد تم یہی کرو گے...... چلاؤ۔ مجھ پر پتھر چلاؤ۔''

اس نے تین بار باری باری سے پتھر چلایا۔ میں تینوں بار جھک جھکا کر اس کا وار بچاتی رہی۔ جب اس کے ہاتھ خالی ہو گئے۔ میں نے وہیں زمین سے ایک بڑا سا پتھر اٹھالیا۔

''تو کیا تم نے اسے مار ڈالا؟''

''نہیں۔'' وہ ہنس رہی تھی...... ''اتنا پاگل سمجھتے ہو مجھے۔ جو ایسے آدمی کو مار کر اپنی زندگی ختم کر لیتی۔ مجھے پتہ تھا، ایک ایسا دن میری زندگی میں آنے والا ہے اور سچائی یہ ہے کہ اتنی جلد وہ دن میری زندگی میں آجائے گا، مجھے یقین نہیں تھا اور حقیقت یہ تھی کہ میں اسے ڈرانے میں کامیاب ہوگئی تھی۔''

''پھر؟''

''اس رات وہ غائب رہا۔ دوسرے دن دروازے پر دستک ہوئی۔'' میں نے دروازہ کھولا تو اس کے ساتھ ایک نئی لڑکی تھی اور ایک دو مزدور تھے۔ جو یقیناً گھر کی ٹوٹی ہوئی چیزیں ٹھیک کرنے یا بدلنے آئے تھے اور یقیناً اس کی جیبیں بھاری ہوں گی اور اس میں پتھر پڑے ہوں گے...... میں چپ چاپ ان کو اندر آنے کا راستہ دے کر باہر نکل گئی۔

''باہر یعنی کہاں......؟''

''پاگل۔ کیسے آدمی ہو...... وہ ہنس رہی تھی...... تمہارے کمرے میں اور کہاں...... سنو کپڑے سچ مچ بہت گیلے ہیں اتار دوں۔''

''کیا؟''

وہ پھر کھلکھلا کر ہنسی...... ''سمجھو۔ تمہارا وارڈ روب استعمال کرنا نہیں چاہتی۔ تو کیا تم مجھے دیکھتے رہو گے؟'' وہ زور سے ہنسی۔ بارش میں بھیگی لڑکی کا بھیگا ہوا جسم۔ اگر مان لو۔ اگر میں کپڑے اتاروں......؟ پوری طرح عریاں ہو جاؤں تو؟ کیا بغیر دیکھے تم اس طرح مجھ سے باتیں کیوں کر سکتے ہو جیسے اپنے کسی دوست سے کر رہے ہو،...... اس نے زور دیا...... اپنے مرد دوست سے۔''

وہ ہونٹ چبا کر چیخی تھی...... ''اپنی آنکھیں ادھر کرو...... میں سچ مچ......''

اور سچ مچ اس نے کپڑے اتار دیئے تھے۔ میں نے اپنی پشت کی آنکھوں سے اس کے

پورے جسم کو کپکپا دینے والے احساس کے ساتھ محسوس کیا۔ میرا سارا جسم جل رہا تھا۔ ہونٹوں تک تیز لپٹیں اچانک سامنے آ کر بھڑک گئیں تھیں۔ مجھے کہنا چاہئے۔ اتنا خوبصورت، سڈول جسم آج اور اس سے قبل میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

باہر بجلی کڑک رہی تھی۔

بارش کی بوندیں تیز رفتار سے برس رہی تھیں۔ میں اس کی طرف مڑا تو وہ بلند آواز سے چیخی...... ''یہ۔ای......ای......''

لیکن اس کی کمزور آواز پر جیسے بجلی کی کڑک حاوی ہو گئی تھی۔

بارش کب بند ہوئی، پتہ نہیں چلا۔ میں اس کے جسم سے ہٹا تو وہ بلاؤز کے بٹن بند کر رہی تھی۔ پھر وہ ٹھہری نہیں، میں نے اسے دروازہ کھول کر جاتے ہوئے دیکھا۔

جاتے وقت بھی اس نے مجھ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔

بس۔ وہ ایک چھلاوے کی طرح آئی اور چھلاوے کی طرح چلی گئی۔

(۳)

یہ سچ ہے کہ تب تک ناٹک لکھا نہیں گیا تھا۔

ایک پورے ملینیم کے اختتام میں اب صرف بیس دن باقی رہ گئے تھے۔ ادھر سمیر مہادیون ایک دم سے میرے سر پر سوار تھا۔

''یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ قلم بانجھ تو نہیں ہو گیا؟''

''نہیں۔''

''تمہارے لئے شادی کرنا ضروری ہے سمجھ گئے۔ میرا۔ پہلے بھی یہی خیال تھا۔ عورت...... عورت، جیسے موضوع پر تم سے نہیں لکھا جائے گا۔''

وہ ہنس رہا تھا۔

حقیقت میں سمیر مہادیون کو مجھ پر ہنسنے کا حق حاصل تھا۔ اس لئے کہ وہ میری دماغی حالت سے واقف نہیں تھا۔ میں لگاتار ڈرامہ کو اس ''حادثے'' سے جوڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اہم بات یہ تھی کہ مجھے اس عورت کی تلاش کرنی تھی جو ویدک عہد میں عزت واحترام کی چیز تھی، ویدک عہد، اُتر ویدک عہد، بھگتی آندولن اور مسلمانوں کی آمد تک جو ہندوستانی کلچر میں کئی روپ

بدل چکی تھی اور اس انٹرنیٹ عہد تک آتے آتے اس کے بارے میں کچھ بھی کہنا آسان نہیں رہ گیا تھا۔ ان سب کچھ کے باوجود وہ عورت تھی...... وجود میں ایک نشہ رکھنے والی۔ سمھوگ، کے وقت ہر بار پُر اسرار ہو جانے والی۔ پُر اسرار...... لیکن عورت بہر حال عورت ہوتی ہے۔ چاہے وہ کتنے ہی ملینیم کیوں نہ اوڑھ لے۔

موضوع میں نے وہیں سے لیا تھا۔ وہی بارش والی عورت۔ اس پُر اسرار عورت کی ایک ایک بات مجھے یاد رہ گئی تھی۔ ضروری یہ تھا کہ مجھے اس سارے واقعے کو نئے انداز سے لکھنا تھا۔ لکھتے وقت 'واقعے' کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں۔ حقیقی کردار کسی دوسرے کردار میں سما جاتا ہے...... ملینیم کے خاتمے کی عورت۔ میں نے اس کے شوہر کا کردار، اس عورت میں ڈال دیا تھا۔ مجھے پتھر اچھے نہیں لگے تو میں نے اس کے ہاتھوں میں پستول تھما دیا۔ وہ چست چوکس لباس یعنی جینس، ٹی شرٹ وغیرہ پہنتی تھی۔ بال چھوٹے تھے۔ قد مناسب۔ کمر کی پیٹی میں ہر وقت ایک پستول ہوتی تھی۔ وہ زمانے سے تھکی نہیں تھی، نہ ہی وہ زمانے کو مٹھیوں میں کرنا چاہتی تھی۔ زمانہ اس کے لئے ایسی ہی ایک لاچار سی شئے تھا، جیسے گھر کی کوئی بیکار سی لگنے والی چیز، جس پر بڑے آرام سے، کمر سے پستول نکال کر، وہ گولی چلا دیتی تھی۔ بس...... ایک ذرا سی ٹھائیں...... خالی وقت میں وہ کراس ورڈس سے کھیلتی تھی۔ کھیلتے کھیلتے پریشان ہو جاتی تو وہی 'دوست پستول' اس کے ہاتھوں میں آجاتا۔

ٹھائیں...... بلب ٹوٹ گیا۔

ٹھائیں...... فانوس کے شیشے زمین پر بکھر گئے۔

ٹھائیں...... کتابوں کی الماری کے آر پار گولیاں نکل گئیں۔

اور...... ٹھائیں...... ٹھائیں...... پرندوں کی طرح...... کبھی آسمان کی طرف...... کبھی شانت لہروں کی طرف...... اور کبھی...... بس پزل (Puzzle)۔ کراس ورڈس...... دنیا میں اس کے لئے کوئی کشش باقی نہیں تھی......

یہ ایک خوبصورت سا کردار تھا۔ ناٹک کے لئے یہ ایک انتہائی نیا کردار تھا۔ مجھے یقین تھا، جب یہ کردار تھیٹر میں زندہ ہو اٹھے گا تو مجھے چاروں طرف سے تالیاں ملیں گی۔ یہ کردار ملینیم کی ہزار سالوں میں بدلتی عورت سے میل کھاتا تھا۔ لیکن مجھے یہیں، ایک کردار کی اور ضرورت تھی۔ ایک ایسا کردار جو اسے سہارا دے سکے۔ یقیناً یہ کردار میرا تھا۔ (اور یہ ناٹک میں بھی مجھے ہی نبھانا یا

ادا کرنا تھا)۔اب میرے لئے اہم تھا، میرے اپنے اس کردار کو سجانا یا سنوارنا۔ مجھے پتہ تھا کہ یہ عورت آسانی سے قابو میں نہیں آئے گی۔ جس طرح اس کا شوہر قابو میں آ گیا تھا (اس نے پتھر پھینکے اور ہر بار بچ گئی اور دوسری صبح، ایک دوسر، پتھر کھانے والی کو راستہ دے کر، موسلا دھار بارش کی ایک رات میرے کمرے تک پہنچ گئی۔)

حقیقت میں مجھے ایک نئی سچائی کو پیش کرنا تھا...... اور میں 'کہانی' سے، نئے سرے سے گزر رہا تھا۔

یہ اور بات ہے کہ میں کمرے میں تیز تیز ٹہل رہا تھا اور لگاتار سگریٹ پیئے جا رہا تھا۔

(۴)

خاموش جگہ، خاموش فضا۔ ایک ٹھہری ہوئی ندی۔ ان سب کو اسٹیج پر دکھانا آسان نہیں...... مگر مجھے یہیں، اپنے ہیرو یعنی اپنے آپ کو لانا تھا۔ فنتاسی سے اکتائی عورت، کراس ورڈس کے بیکار سے کاغذ کو ہوا میں اُچھال کر گولیاں چلاتی ہے...... ایک، دو، تین...... ٹھائیں...... ٹھائیں...... ٹھائیں...... اچانک ایک چیخ گونجتی ہے۔ ایک انسانی آواز۔ یہ کسی جانور کی آواز نہیں تھی۔ عورت اس چیخ کی طرف مڑتی ہے...... چونک جاتی ہے۔ ایک انسانی جسم۔ لہولہان بازو۔ مرد نظر اٹھاتا ہے۔ عورت کو دیکھتا ہے۔ پھر لہولہان بازو سے گولیاں نکالنے میں ایسے محو ہو جاتا ہے، جیسے اس سناٹے میں اس کے سامنے کوئی عورت نہیں، بے کشش سی کوئی شئے کھڑی ہو۔ جیسے پتے، جیسے پیڑ، جیسے گھومتے جانور، جیسے آسمان، جیسے ستارے......

وہ اپنی گولیاں نکال رہا ہے...... اس طرح، جیسے اس پر احسان کر کے، کوئی ایک کام دے دیا گیا ہو۔

عورت اس کے پاس آ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ دیر تک دیکھتی ہے...... پھر پوچھتی ہے۔

''درد ہو رہا ہے؟''

''درد۔ یہ لفظ کچھ سنا سنا سا ہے۔ پتہ نہیں!''...... وہ سر جھکا دیتا ہے۔

''کافی خون بہہ گیا ہے چلو......''

زندگی کے تمام تجربوں سے گذرنے، انہیں ریجکٹ (Reject) کرنے کے بعد...... زندگی کے تئیں مایوس ہو جانے والی عورت کے اندر مجھے پھر سے ہمت اور حوصلہ پیدا کرنا تھا۔ یعنی

ایک نیا ملینیم...... پھر سے ایک نئی شروعات۔ کیوں گم ہوئے رشتوں کی پھر سے پہچان۔ ہزاروں برس گزر جانے کے بعد ہم پھر سے نئے کیوں نہیں ہو جاتے؟ جیسے ابھی ابھی جنم ہوا ہو۔ مجھے احساس تھا۔ نئے ملینیم کی شروعات میں تمام طرح کا آڈمبر اتار کر اسے پھر سے ایک لڑکی بن جائے۔ ویسی لڑکی جیسی نظموں میں ہوتی ہیں۔ چھوئی موئی سی، پتہ نہیں کیوں، میں اس میں سوئے ہوئے جذبات کو جگانا چاہتا تھا...... اور میرا کردار ایسے پیر، فقیر، سنت یا ایک ایسے 'بے ضرر' انسان کا تھا، جو اچانک ہی، بوڈم کا شکار ہوئی اس عورت کے رابطے میں آ گیا تھا۔

ڈرامہ کا ایک فریم یہ بھی تھا...... کہ لڑکی خون صاف کرتے ہوئے اچانک میرے کپڑوں کو اتارنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کے اندر کہیں گہرائی میں چھپی جنسی خواہشات جاگ جاتی ہے۔ وہ کسی شیرنی کی طرح مجھ پر جھپٹتی ہے اور میں...... میرے اندر کہیں گہرائی تک چھپا ڈر جاگ جاتا ہے۔

میں گھبراہٹ میں پیچھے ہٹتا ہوں۔

لڑکی میرا ہاتھ تھام لیتی ہے......

ناٹک کے اگلے منظر میں لڑکی تھکی تھکی سی لیٹی ہے، میں چپ چپ اُسے اکیلا چھوڑ کر بغیر کچھ کہے واپس چلا جاتا ہوں۔

○○

ڈرامہ میں کچھ اور بھی واقعات تھے۔ ڈرامہ میں سمبھوگ، کائنات اور کائنات سے متعلق نئے احساس اور فلسفے پر باتیں کی گئی تھیں...... ڈرامہ تیار تھا۔ اور حقیقت ہے کہ سمیر مہادیون اسے بار بار پڑھتا ہوا جھوم رہا تھا۔

''واہ...... واہ میرے دوست...... واہ...... میں اپنی بات واپس لیتا ہوں۔ میں نے کہا تھا۔''

وہ چونک کر پوچھتا ہے...... ''مگر اس ناٹک میں مرد کا کردار تمہیں کچھ اٹ پٹا نہیں لگا۔ یعنی ایک بے حد معصوم، میمنے جیسی عورت...... وہ زیادہ لاؤڈ ہو گئی ہے۔ میرا مطلب کچھ زیادہ......''

''مرد۔ اوہ۔ تم سمجھے نہیں سمیر مہادیون۔ مجھے مرد ہمیشہ معصوم لگا ہے عورت کے مقابلے۔ ابھارٹ اٹیک کو ہی لو۔ کتنی عورتوں کو ہارٹ اٹیک ہوتا ہے۔ ظاہر ہوا، دل تو صدا سے

مردوں کے پاس رہا ہے۔ درد کا احساس ہمیشہ مردوں نے ہی کیا ہے۔ وہ سچ مچ معصوم ہے۔ میں نے اس ختم ہوتی ملینیم میں عورت کا حقیقی چہرہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے......''

سمیر مہادیون کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر بولا......

''تو چلو دیر کس بات کی۔ ڈرامہ کی ریہرسل شروع کرتے ہیں۔''

(۵)

ڈرامہ کی ریہرسل شروع ہو چکی تھی۔ ملینیم کے ختم ہونے میں ابھی کئی دن باقی تھے۔ اس پُر اسرار عورت کا کردار ایک بنگالن لڑکی ادا کر رہی تھی۔ سومیا چٹرجی۔ سومیا لمبی بھی تھی اور دبلی پتلی۔ حالانکہ چہرے مہرے کے تاثرات قطعی طور سے اس عورت سے میل نہیں کھاتے تھے، اور میل کھا بھی نہیں سکتے تھے۔ سومیا کو لینے کی دو ہی وجہ تھیں۔ ایک اس کا لمبا قد۔ دوسرا وہ تھیٹر کی منجھی ہوئی ایکٹریس مانی جاتی تھی۔

ریہرسل کو چار پانچ دن گذر چکے تھے۔ مگر سمیر مہادیون سومیا کی ایکٹنگ کو لے کر پُر یقین نہیں تھا۔ وہ بار بار غصے میں اپنے بالوں کو نوچنے لگتا۔ ''نو۔ ناٹ ایٹ آئی۔'' سومیا...... یہ ویسی عورت نہیں ہے۔ آئی مین...... ہنٹر والی ٹائپ...... تمہیں اس میں حقیقت کا رنگ بھرنا ہوگا...... حقیقت کا رنگ...... یو...... نو...... مجھے ریلیٹی چاہئے...... ریلیٹی...... ایکٹنگ نہیں چاہئے......''

سومیا حیران سی اس کی طرف دیکھتی...... ''میں سمجھ نہیں پا رہی ہوں سر...... انفیکٹ......''

''یہ کردار......'' سمیر مہادیون غصے سے میز پر مکا مارتا ہے...... ''سومیا! سمجھنے کی کوشش کرو...... ایک پوری صدی، نہیں، ملینیم اس عورت کے پاس سے جا رہا ہے...... شٹ، گزر چکا ہے...... کبھی رسم و رواج کی بیڑیاں، کبھی پاک دامانی کی اگنی پرکشا اور کبھی...... دراصل وہ اداس ہوگئی ہے۔ آئی مین...... نیوٹرل...... چیزوں میں اس کے لئے کوئی کشش نہیں ہے...... رشتوں میں احساس میں...... جذبات میں...... اور سومیا دس از فنٹاسٹک رول فار یو...... یو شُڈ انجائے...... یہ صرف ایک واقعہ یا کردار نہیں ہے، یہ ایک بدلی ہوئی عورت ہے......''

''بس سر......'' جواب میں سومیا کے چہرے پُر شکن آ جاتی ہے...... وہ دوبارہ اسکرپٹ پر جھک جاتی ہے...... فنٹاسٹک...... '' سمیر مہادیون میری طرف مڑتا...... تم دیکھنا یہ ناٹک تھیٹر ورلڈ میں ہلچل مچا دے گا......''

سچائی یہ ہے کہ میرے اندر اس ڈرامہ کے لئے اتنا جوش نہیں تھا جتنا سمیر مہادیون میں بھرا ہوا تھا۔ حالانکہ بارش کی اس رات والی پوری کہانی اب بھی میرے چہرے پر لکھی ہوئی تھی...... اور میں ریہرسل کرتے کرتے کتنی بار چونک کر بڑبڑایا تھا...... اور ہر بار سومیا نے مجھے حیرت زدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا...... ''کیا بات ہے سر! طبیعت کچھ......

''نہیں۔ طبیعت ٹھیک ہے......'' سمیر مہادیون ایک بار پھر ٹھہر کر زور سے چلایا......

''ریڈی...... ریڈی فار ریہرسل...... سین نمبر...... او کے سومیا...... ریڈی؟...... گو فار ریہرسل...... چلیں......''

منظر وہی تھا...... عورت خون دیکھ کر چونک جاتی ہے...... وہ آگے بڑھ کر میرے کپڑوں کو اتارنے کی کوشش کرتی ہے۔ اچانک وہ جنسی جذبات سے لبریز ہو جاتی ہے...... اس کا سارا جسم جذبات کی شدت سے لرز رہا ہوتا ہے۔ وہ پاگلوں کی طرح میری طرف بڑھتی ہے...... ایک اینٹی ویمن کردار...... ''سومیا ریڈی ہے......

سمیر مہادیون چلاتا ہے......

میں گھبرایا سا پیچھے ہٹتا ہوں۔ اور......

ریہرسل روم کا دروزہ اچانک کھلا ہے......

ٹھک...... ٹھاک...... ہیل والے جوتے بجے ہیں...... کوئی آ رہا ہے...... کوئی آ گیا ہے۔ سمیر مہادیون نے چونک کر دیکھا ہے...... میں ٹھہر گیا ہوں......

''معاف کیجئے گا......'' وہی سرد سا لہجہ...... ''میں ریہرسل دیکھ سکتی ہوں......؟''

''کیوں نہیں...... کیوں نہیں، بیٹھئے......''

''شکریہ۔''

وہ کرسی پر بیٹھ گئی ہے...... اس کی آنکھیں پتھرائی ہوئی ہیں...... میرے ماتھے پر پسینہ کی بوندیں جھلملا اٹھتی ہیں...... یہ وہی ہے...... کتنے آرام سے کرسی پر بیٹھی ہوئی ہے...... جیسے...... مجھ سے شناسائی ہی نہیں ہو...... مجھے جانتی ہی نہیں......

سمیر مہادیون میرے قریب آ گیا ہے...... ''کیا بات ہے...... طبیعت...... وہ سومیا بھی کہہ رہی تھی۔'' ''نہیں......'' ایک بار پھر مسکرانے کی ناکام کوشش...... ''نہیں بالکل ٹھیک ہوں......''

''تو پھر آرام سے ریہرسل کرونا......''

سمیر مہادیون کے چہرے پر شکن ہے...... وہ پھر چلاّ تا ہے...... ''گو فارں...... سین نمبر......

سومیا میری طرف بڑھتی ہے...... میں پیچھے ہٹتا ہوں...... پیچھے دیوار ہے...... میں دیوار سے لگ گیا...... میری آنکھیں برابر اس لڑکی میں لگی ہوئی ہیں...... یہ کیا...... وہ کھڑی ہوگئی ہے...... وہ آہستہ آہستہ سمیر مہادیون سے باتیں کررہی ہے۔ سمیر گردن جھکائے دھیرے دھیرے ہاں، میں گردن ہلا رہا ہے۔ میرے ماتھے پر ایک بار پھر پسینہ کی بوندیں پھیل گئی ہیں...... وہ دھیرے دھیرے ایڑی زمین سے رگڑتی ہوئی دنوں ہاتھوں سے کچھ سمجھانے کی کوشش کررہی ہے......

''اوہ...... یس......''

سمیر مہادیون نے زور سے تالیاں بجائی ہیں...... اب وہ مجھے بلا رہا ہے؟

''کیا ہے......؟''

''یہ...... ان سے ملو...... یار...... کمال ہے۔ کمال، ابھی انہوں نے جو سین سمجھایا ہے، بس کمال ہے......

''سین......؟''

''ہاں سین، بھائی مجھے تو اس آئیڈیا نے زیادہ متاثر کیا ہے...... اور ویسے بھی تمہارے چہرے پر وہ تاثرات نہیں آرہے ہیں، نہ ہی سومیا وہ تاثرات دینے کی کوشش کررہی ہے......''

''مطلب......''

میں ایک دم سے چونک گیا۔

''مطلب...... کردار بدل دیئے جائیں گے...... نو...... نو...... یو کانٹ انٹرپٹ...... سمجھو...... یہ تھیٹر ہے بھائی...... تھیٹر...... یہاں سب کو مل جل کر کام کرنا ہے۔ وہی کرنا ہے جو سب کو اچھا لگے...... یہی تو فرق ہے تھیٹر اور سنیما میں......''

''مطلب...... میرا رول بدل جائے گا......''

''ہاں، جیسا انہوں نے بتایا۔ دیکھو، بُرا مت ماننا۔ ان کی بات میں وزن ہے۔ کتنے لوگ ہیں جو تمہارے کردار والی عورت کو پسند کریں گے...... یعنی وہ ہنٹر والی...... یار پھر وہی......

جذباتی ہو رہے ہو تم...... بھاڑ میں گیا ملینیم ...... بھاڑ میں گئی وہ ملینیم والی عورت...... عورت ہر بار وہی ہوگی...... وہی عورت...... کمزور......''

''مگر......''

''مگر وگر۔ کچھ۔ نہیں......''

میرا لہجہ کمزور تھا — ''مگر یہ تو میری اسکرپٹ کے ساتھ ناانصافی ہوگی —''

''پھر وہی اسکرپٹ...... یار......'' وہ مجھے دونوں ہاتھوں سے ہلا رہا تھا...... ''پھر جذباتی ہو رہے ہو تم...... ارے یار...... یہ تھیٹر ہے...... تھیٹر...... اس میں سب کی مرضی چلتی ہے...... سب کے کہنے سے چلتا ہے تھیٹر...... پھر، جس سے سب کو فائدہ ہو......'' سمیر مہادیون عورت کی طرف گھوما تھا...... ''تو آپ لکھ دیں گی — ٹھیک — ایسا کیجئے، یہی سین — سمجھ رہی ہیں نا، آپ...... یہی سین...... کل آپ لکھ کر لے آیئے...... پھر دیکھتے ہیں......''

میں نے اب آخری حملہ کیا تھا —

''مجھے...... معاف کرنا...... شاید میں یہ رول نہ کر پاؤں؟''

سمیر مہادیون نے اس بار کچھ غصّے کچھ جوش سے میرا ہاتھ تھاما تھا — ''خالص جذبات، آدرش...... صرف کردار بدلے ہیں...... تم ہو...... اور تم بدلے ہوئے کردار بھی تم ہی کر رہے ہو — دوسری طرح سے کیوں تو — تمہیں کرنا ہی پڑے گا...... اب بحث کی کوئی گنجائش نہیں ہے...... سمجھ رہے ہو تم......

''اچھا، میں چلتی ہوں......''

اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔

اُف...... برف جیسا سرد ہاتھ —

''میری کوئی بات لگی ہو تو......''

وہ اچانک جانے کے لئے مڑی تھی۔ پھر ایڑیاں بجاتی ہوئی تیزی سے ریہرسل ہال سے باہر نکل گئی۔

یقیناً، چونکنے کی باری اب میری تھی — یہ کیا ہوا۔ ایسا کیونکر ہوا۔ اس نے مجھے پہچانا کیوں نہیں...... اور وہ چاہتی کیا ہے؟۔

سمیر مہادیون مجھے زور زور سے ہلا رہا تھا — ''فلموں میں جاؤ گے تب پتہ چلے

گا...... یار وہاں تو پوری کہانی بدل جاتی ہے یہاں تو صرف کردار بدلے گئے ہیں......

کردار......؟

لیکن کیا حقیقت میں صرف کردار بدلے گئے تھے......

دوسرے دن ریہرسل کامیابی سے گذر گئی۔ معلوم نہیں یہ اتفاق تھا، یہ سومیا چٹرجی اس کردار کے لئے زیادہ فٹ تھی —— اب کردار میں میری جگہ وہی آگیا تھا، اس کا شوہر، ایک بے رحم آدمی...... سومیا نئی نویلی دلہن تھی، جو مرد کی بے رحمی کی سزا کاٹ رہی تھی......

''دیکھا——''

سمیر مہادیون پُر یقین تھا —— میرا پہلے بھی خیال تھا —— عورت کو لاؤڈ نہیں ہونا چاہئے۔ لاؤڈ تو —— تم ——

چلو اچھی بات ہے، تم آج زیادہ گمبھیر نہیں ہو......''

لیکن —— وہ کتنا جانتا تھا مجھے؟ یہ وہی کردار تھا وہی بارش والی رات...... جب میں اچانک پاگل ہو کر اس عورت کی طرف جھپٹا تھا...... وہ چیخی تھی، خوف سے پیچھے ہٹی تھی...... مگر ایک پرائے مرد کے کمرے میں آکر بے لباس ہو جانا...... ادبی اندھیرا، حقیقت کے اندھیرے میں بدل گیا تھا...... ریہرسل کرتے وقت مجھ میں پورا پورا مجرم اتر آیا تھا...... ریہرسل ہوتے ہی اس نے زور زور سے تالیاں بجائی تھیں ——

پھر میری طرف اپنا سرد ہاتھ بڑھایا تھا......

"Congratulations"

سمیر مہادیون آگے آگیا تھا۔ میری طرف دیکھ کر......

وہ بے رخی سے مڑا، پھر عورت کی طرف گھوما ——

''آپ آگئے...... آپ سمجھ رہی ہیں نہ...... باقی سین بھی...... سن دو ہزار کے دوسرے ہفتے میں ہی —— آپ سمجھ رہی ہیں نہ......''

عورت گھومی تھی...... ''انہیں اگر کوئی شکایت نہ ہو تو...... سمیر مہادیون نے میرا ہاتھ تھاما تھا —— ''یقین دلاتا ہوں، انہیں...... انہیں کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

اور یقیناً —— بھلا مجھے کیا شکایت ہو سکتی تھی......؟ یہ کہ میرا کردار بدل گیا تھا۔ یہ کہ اسکرپٹ کا پورا نام جھام اس نے سنبھال لیا تھا —— پورا کردار —— یا پورے فائنگ میں ——

اب میں وہی غیر شائستہ سا مرد تھا۔ جاہل، جنگلی ...... ریہرسل پورا ہوا......

ہم نے ایک نئے ملینیم میں قدم رکھا۔

ڈرامے کا پہلا شو تالیوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ ختم ہوا — نہ معلوم کیوں مجھے بار بار لگ رہا تھا — میرے ادب کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ یا یہ کہ اپنے ادب یا ادیب ہونے کا مذاق میں نے خود اڑایا ہے......

اس رات پہلے شو سے واپسی کے بعد ایک حادثہ، اور ہوا تھا — اس نے فون کیا تھا — وہی، برفیلی آواز۔ اس نے مجھے ایک ویران جگہ کا پتہ دے کر بلایا تھا — ملنے کے لئے......

(۶)

وہ سامنے کھڑی تھی...... اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ بے نشان، روح جیسا......

''تم...... جانتے ہو، میں نے تمہیں یہاں کیوں بلایا ہے......''

اف، وہی برف کے پگھلنے جیسا لہجہ۔

''نہیں —''

وہ مسکرا رہی تھی — ''مجھے کبھی برا نہیں لگا، کہ میں — میں جو سوچتی ہوں، وہ حقیقت میں کیوں نہیں ہوتا۔ یعنی آدمی ہونے کے باوجود آدرش واد کی چٹان، جوالا مکھی کی طرح اندر ہی اندر کیوں دھنستی جاتی ہے...... کسی بڑے دھماکے کے لئے — آئیڈیالوجی......''

وہ ہنس رہی تھی —

''بُرا مت ماننا۔ یاد ہے، سیمینار کے روز میں نے پوچھا تھا...... سیمینار سے گھر...... اور گھر کے دروازے پر قدم رکھنے والا آدمی آئیڈیالوجی کی سطح پر تو ایک سا ہی رہتا ہے نہ......''

وہ پھر ہنسی — ''تم ویسے نہیں نکلے...... نکل بھی نہیں سکتے تھے...... اور اسی لئے میں نے تمہیں اس کردار سے نکلوایا۔ جانتے ہو کیوں —''

''نہیں —''

''تم اس کردار میں فٹ نہیں تھے...... یعنی پہلے والے کردار میں — اس لئے میں نے پوری کہانی بدل دی...... تم کہیں سے فٹ نہیں تھے......''

اس نے بڑے آرام سے پستول نکال لی تھی۔

میں نے خوف سے اس کی طرف دیکھا۔

اُس کی آنکھوں میں ایک زہریلی مسکراہٹ تیر رہی تھی ——— 'کیوں، ڈر گئے؟ ڈرو مت......؟ تمہیں کیا لگا، میں تم پر ایک گولی برباد کردوں گی۔'

وہ مسکرا رہی تھی ——— اب میں اتنی بھی بے وقوف نہیں ہوں ——— وہ تو بس...... ایسے ہی...... شوقیہ...... اچھا لگتا ہے نا، تمہارے ناٹک کے پہلے والے کردار سے میل کھاتا ہوا......'

اچانک اُس کے چہرے سے ہنسی غائب تھی ——— جاؤ تم!

وہ زور سے چیخی ——— سنا نہیں تم نے ———

پھر اُس نے آنکھیں جھکا لیں ——— میری فکر کئے بغیر وہ وہیں ایک چٹان نما پتھر پر بیٹھ گئی ——— اُس کے ہاتھ میں پتہ نہیں، کہاں سے ایک میلا سا صفحہ آ گیا تھا، یقیناً یہ کراس ورڈس تھا۔ وہ فاؤنٹین پین لے کر پورے وجود کے ساتھ اُس پر جھک گئی تھی۔

واپس لوٹتے ہوئے میرے قدم شل تھے اور دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔

کاتیائن بہنیں

ایک ضروری نوٹ

قارئین! کچھ کہانیاں ایسی ہوتی ہیں جن کا مستقبل مصنف طے کرتا ہے لیکن کچھ کہانیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کا مستقبل کہانی کے کردار طے کرتے ہیں۔ یعنی جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی جاتی ہے، اپنے مستقبل کے تانے بانے بنتی جاتی ہے اور حقیقت میں مصنف اپنے کرداروں کو راستہ دکھا کر خود پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

ایسا اس کہانی کے ساتھ بھی ہوا ہے...... اور ایسا اس لئے ہوا ہے کہ اس کہانی کا موضوع ہے...... 'عورت'...... کائنات میں بکھرے تمام اسرار سے زیادہ پُر اسرار، خدا کی سب سے حسین تخلیق۔ یعنی اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ وہ عورت کو جان گیا ہے تو شاید اس سے زیادہ 'گھامڑ' اور شیخی بگھارنے والا، یا اس صدی میں اتنا بڑا جھوٹا کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا۔ عورتیں جو کبھی گھریلو یا 'پالتو' ہوا کرتی تھیں۔ چھوٹی اور کمزور تھیں۔ اپنی پُر اسرار فطرت یا مکڑی کے جالے میں سمٹی، کوکھ میں مرد کے نطفے کی پرورش کرتیں...... صدیاں گزر جانے کے بعد بھی وہ محض 'بچہ دینے والی ایک گائے' بن کر رہ گئی تھیں مگر شاید صدیوں میں مرد کے اندر دہکنے والا یہ نطفہ شانت ہوا تھا۔ یا عورت کے لئے یہ مرد دھیرے دھیرے بانجھ یا سرد یا محض بچہ پیدا کرنے والی مشین کا ایک پرزہ بن کر رہ گیا تھا......

تو یہ اس کہانی کی تمہید نہیں ہے کہ عورت اپنے اس احساس سے آزاد ہونا چاہتی ہے...... شاید اسی لئے اس کہانی کا جنم ہوا...... یا اس لئے کہ عورت جیسی پُر اسرار مخلوق کو ابھی اور 'کریدنے' یا اس پر تحقیق کرنے کی ضرورت ہے...... ہم نے ابھی بھی اس مہذب دنیا میں، اسے صرف مقدس ناموں

یا رشتوں میں جکڑ رکھا ہے۔

تو قارئین! یہ کوئی پریوں کی کہانی نہی ہے۔ یہاں دو بہنیں ہیں...... کاتیائن بہنیں۔ ممکن ہے ان بہنوں کے نام پر آپ کو 'لولیتا'، 'انا کارنینا' اور 'مادام بواری' کی یاد آ جائے مگر نہیں! یہ دوسری طرح کی بہنیں ہیں۔ مردوں کی 'حاکمی' کو للکارنے والی...... تو اس کہانی کا جنم کچھ ''خاص'' حالات میں ہوا ہے۔

ایک واقعہ

گرچہ یہ کوئی فلمی منظر نہیں تھا ___ لیکن یہ فلمی منظر جیسا ہی تھا۔ مس کاتیائن کے ہاتھوں سے سبزی کا تھیلا پھسلا اور دو بڑے بڑے آلو لڑھکتے ہوئے بھوپیندر پر یہار کے پاؤں سے ٹکرائے۔ بھوپیندر پر یہار، عمر ایک کم باسٹھ سال، تھوڑا لہرائے ___ تھوڑا رکے ___ آلوؤں کو اٹھایا اور سبزی منڈی کی ایک دکان پر کھڑی مس کاتیائن پر جی جان سے نچھاور ہو گئے۔

''آپ مس کاتیائن ہیں نا......؟ وہ ''اینا کی ڈالی'' والی دکان کے سامنے والے گھر میں......؟''

''ہاں۔'' مس کاتیائن اتنا بول کر خاموش ہو گئیں۔ شاید انہیں گفتگو کا یہ انداز پسند نہیں آیا۔ وہ بھی ایسی جگہ؟ سبزی منڈی میں...... کوئی 'مرد' اس طرح کسی عورت سے اس طرح بات کرے، اُنہیں اچھا نہیں لگا ___

''میں وہیں رہتا ہوں...... آپ کے گھر کے پاس...... تھیلا بھاری ہے؟''

پتہ نہیں کہاں سے بھوپیندر پر یہار کے لہجے میں اتنا اپنا پن سمٹ آیا تھا۔

''نہیں کوئی بات نہیں......''

''دیجئے نا۔ میں اٹھا لیتا ہوں......''

بھوپیندر پر یہار نے آرام سے تھیلا اٹھایا اور سبزی منڈی کی دھول بھری سڑکوں پر دونوں چپ چاپ چلنے لگے۔ ہاں بھوپیندر پر یہار کچھ لمحے کے لئے یہ بالکل ہی بھول بیٹھے تھے کہ وہ کوئی نوجوان نہیں، بلکہ ایک کم باسٹھ سال کے گھوڑے پر سوار ہیں......

لیکن گھوڑے میں اچانک جوش آ گیا تھا۔

○○

ایک عالی شان مگر پرانے زمانے کا چندن کی لکڑی کا بنا ہوا محراب نما دروازہ تھا۔ یہ دروازہ چرچرانے کی بھیانک آواز کے ساتھ کسی ہارر فلم کی طرح کھلتا تھا...... اس کے بعد کافی کھلا ہوا صحن تھا۔ غرض یہ ایک ٹوٹا پھوٹا سا بے رونق گھر تھا۔ یہاں آپ ہمیشہ ہر موسم میں بڑی مس کاتیائن کو دیکھ سکتے ہیں—— جھکی ہوئی نظریں، ہاتھوں میں پکڑی ہوئی تیلیاں—— ایک طرف پڑا ہوا اون کا 'گچھا'۔ تیلیوں میں الجھے ہوئے ہاتھ...... یعنی دنیا سے بے خبر مس کاتیائن سوئٹر بن رہی ہیں۔ جاڑا ہو گرمی یا برسات، مس کاتیائن کی بس اتنی سی دنیا ہے...... گہری فکر، اون کا گولا اور تیلیاں۔ لیکن یہ باتیں زیادہ توجہ طلب نہیں ہیں کہ بڑی مس کاتیائن یہ سوئٹر کس کے لئے بنتی ہیں۔ انہیں پہننے والا کون ہے؟ یا بس سوئٹر بننا مس کاتیائن کا ایک شغل ہے—— ایک ہی سوئٹر کو بار بار ادھیڑتے رہنا اور بنتے رہنا......

''اندر آجائیے......''

چھوٹی مس کاتیائن نے اشارہ کیا۔ بھوپیندر پریہار تھیلا لئے صحن میں آگئے...... ہمیشہ کی طرح بڑی مس کاتیائن نے گردن گھما کر چھوٹی مس کاتیائن کے ساتھ اندر آتے ہوئے اجنبی، کو دیکھا...... لیکن آنکھوں میں حیرانی کا شائبہ تک نہ تھا۔ چہرہ پتھر جیسا بے حس۔

''یہ پڑوسی ہیں......'' چھوٹی مس کاتیائن نے بڑی کے سامنے تھیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا...... ''بھاری تھا...... اس لئے مدد کرنے چلے آئے۔''

بھوپیندر پریہار کو یقین ہے کہ چھوٹی کاتیائن کی وضاحت پر بڑی کی آنکھوں میں ایک ہلکی سی چمک ضرور لہرائی ہوگی حالانکہ اس چمک کو وہ صرف محسوس کر سکتے تھے۔ اس لئے کہ دوسرے ہی لمحے سوئٹر بنتے پتھر کے مجسمے سے آواز آئی تھی...... ''بیٹھئے نا......''

یہ کاتیائن بہنوں کے ہاں بھوپیندر پریہار کی پہلی انٹری (Entry) تھی۔

کچھ بھوپیندر پریہار کے بارے میں

بھوپیندر پریہار مرد آدمی تھے۔ مردوں کے بارے میں ان کی اپنی رائے تھی...... ایک خاص طرح کا فیسی نیشن (Fascination) تھا اس لفظ کے بارے میں...... مثلاً وہ سوچتے تھے کہ مرد ایک شاندار جسم رکھتا ہے۔ خوشبو میں ڈوبا ہوا جسم...... ایک سدابہار، مست مست، کسی تناور درخت کی طرح شان سے ایستادہ...... بے پروا، بے نیاز کسی کو خاطر میں نہ لانے والا، عورت

یا بیوی جیسی چیز اسی جسم کو قید میں رکھنا چاہتی ہے۔ یہ جسم بے لگام گھوڑے کی طرح ہے۔۔۔۔ شاہراہوں کو روندتا۔۔۔۔ منزلوں کو پیچھے چھوڑتا۔۔۔۔ سمندر کی طرح بے خوف۔۔۔۔ لہروں کی طرح چنگھاڑتا۔۔۔۔ طوفان کی طرح گرجتا۔ یا شیر ببر کی طرح بے قابو۔۔۔۔ سرکش اور دھرتی کو اپنے طاقتور پنجوں سے روندنے والا۔ یہ جسم کسی ایک درّے میں نہیں چھپ سکتا۔۔۔۔ کسی ایک بیرک میں قید نہیں رہ سکتا۔۔۔۔ کسی ایک قید خانے میں، کسی ایک گھر میں یا کسی ایک عورت میں......

لیکن ہوتا کیا ہے، وقت آنے پر یہ جسم ایک عورت کے حوالے کر دیا جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے بس......اسے تمہارے حوالے کیا۔ بس یہی ہے......اپنے جسم کی پتوار جیسے چاہو اس پر استعمال کرو۔

مسز پریہار عام عورتوں جیسی ہی ایک عورت تھی......جس کے لئے زندگی کا مطلب ایک کنبے یا شوہر اور بچوں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ یا شاید بچے کے آنے کے بعد شوہر کی بھی کچھ زیادہ حیثیت نہیں رہتی۔ سمن کے آنے کے بعد مسز پریہار کی زندگی کا یہی ایک مقصد رہ گیا تھا۔ سمن۔ صرف سمن۔ اس لئے شاید کبھی کبھی شوہر کے پتوار جیسے تنے جسم کی مانگ کو بھی وہ نظر انداز کر جاتی......

''نہیں......اسے اتنا پیار مت دو۔ بھگوان کے واسطے'' بھوپیندر پریہار کے ہونٹوں پر تلخی تھی۔

''کیوں؟''

''کیونکہ بچے ہوتے ہی ایسے ہیں۔ لاپرواہ اور بے وفا......''

''پاگل ہو گئے ہو!''

''بچے تمہاری محبت کی قدر نہیں کریں گے۔ وہ ایک دن تاڑ جتنے ہو جائیں گے اور ہمیں بھول جائیں گے۔''

اور شاید یہی ہوا تھا۔ سمن بڑا ہوا......لو میرج کی اور بیوی کو لے کر کناڈا چلا گیا۔ مسز پریہار اس فرض سے سبکدوش ہو کر ابدی نیند سو گئی۔ اکیلے رہ گئے بھوپیندر پریہار۔ لیکن وہ اس زندگی کو یادوں کا قبرستان نہیں بنانا چاہتے تھے۔ وہ بقول رسول حمزہ توف...... پیار کو زندہ رکھنا چاہتے تھے جس کے بارے میں ان کا عقیدہ تھا کہ زندگی سے پیار چلا گیا تو ہم بھی نہیں بچ سکتے۔ وہ کھونا نہیں چاہتے تھے اور سچ کہا جائے تو اپنے مرد ہونے کے بھرم کو قائم رکھنا چاہتے تھے۔۔۔۔ اور

شاید خالی پن کے یہی وہ لمحے تھے جب کاتیائن بہنوں سے ان کی دوستی کے در وا ہوئے تھے یا بقول رسول حمزہ توف...... اس بہانے وہ اپنے آپ کو زندہ رکھ سکتے تھے۔

بڑی بہن یعنی رما کاتیائن کا نظریہ

کاتیائن بہنوں کی زندگی میں ویرانی کی شاید ایک لمبی تاریخ رہی تھی...... آس پاس کے لوگوں کے لئے اس گھر یا بہنوں کے بارے میں سب کچھ پُر اسرار تھا...... یعنی جب یہ بہنیں گھر میں ہوتیں یا وہ وقت جب بے ہنگم آواز کے ساتھ کھلنے والے دروازوں سے یہ باہر نکلتیں تو گویا سر گوشیوں کا بازار گرم ہو جاتا۔ ان کی زندگی پر، اسرار کا دبیز پردہ پڑا تھا...... شاید اس مکمل کائنات سے بھی زیادہ پُر اسرار تھیں وہ۔ بڑی بہن کے ہاتھ میں ایک گل بوٹوں والی چھتری ہوتی جس کا ساتھ ان کے لئے ہر موسم میں لازمی تھا۔ جاڑا ہو، گرمی ہو یا برسات ـــــ گویا اندر کوئی خوف ہو اور پھول دار چھتری کسی باڈی گارڈ کی طرح ان کی نگرانی کرتی ہو۔ چہرہ اس چٹان کی طرح سخت، سمندر کی لہریں جس کا کچھ نہیں بگاڑ پاتیں۔ آج تک کسی نے بھی رما کاتیائن کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ آپ اپنے گھر کی بالائی منزل سے شام ڈھلنے تک جب بھی جی چاہے انہیں دیکھ لیجئے...... ایک کرسی پر سوئٹر بنتی ہوئی رما کاتیائن آپ کو ضرور مل جائیں گی ـــــ عمر ساٹھ کے آس پاس۔ چھوٹی ریتا کاتیائن بڑی سے دو تین سال چھوٹی رہی ہوں گی۔ اس سے زیادہ نہیں۔ مگر ریتا، رما کی طرح سخت نہیں تھیں۔ کسی زمانے میں خوش مزاج بھی رہی ہوں گی مگر وقت کے ساتھ ساتھ مزاج میں ایک قسم کی سنجیدگی آ گئی تھی۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ اس سے پہلے کاتیائن بہنوں کی پُر اسرار دنیا میں کوئی آیا تھا یا نہیں۔ مگر بھوپیندر پریہار کی اچانک آمد گھر میں شکوک وشبہات کی فصل لے کر آئی تھی اور یہ شک بھوپیندر پریہار کے جاتے ہی شتر مرغ کی طرح ریت سے اپنا سر نکالنے لگا تھا۔

بڑی کاتیائن کی آنکھوں میں حیرانی کے دوڑے تھے اور چھوٹی کاتیائن کے ہونٹوں پر ایک شرارت بھری خاموشی۔

''کب سے جانتی ہو اسے؟''

''کسے ـــــ؟''

''وہی، جسے لے کر تم گھر آئی تھی''

''اچھا وہ۔ بھوپیندر پر پیار......''

''نام بھی جانتی ہو۔اس کا مطلب پرانی ملاقات ہے......کب سے جانتی ہو اسے؟''

''آج سے پہلے......نہیں۔''

''ایک ہی دن میں اس نے سبزی کا تھیلا بھی تھام لیا اور گھر میں آ ٹپکا......''

''نہیں۔آپ نے سمجھا نہیں۔''

''کیا ایک اجنبی شخص کو تم اس گھر میں لے آئیں اتنا کافی نہیں......''

چھوٹی مس کاتیائن کی آنکھوں میں مایوسی تھی۔''نہیں، دراصل آپ ابھی بھی نہیں سمجھیں......تھیلا بھاری تھا......''

''صفائی مت پیش کرو۔اس سے پہلے ایسا حادثہ اس گھر میں کبھی نہیں ہوا۔''

بڑی مس کاتیائن کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔''ابھی تم سبزی کاٹو۔رات کا کھانا بنانے کی تیاریاں کرتے ہیں، مگر یاد رکھو......رات میں۔رات میں اس واقعہ کے بارے میں دوبارہ غور کریں گے۔''

دہشت بھری رہگوار سے

ہم کہہ سکتے ہیں وہ رات کاتیائن بہنوں کی نظر میں بہت عام سی رات نہیں تھی۔بڑی کاتیائن کمرے میں ٹہل رہی تھیں......جیسے اندر ہی اندر کسی خاص نتیجے پر پہنچنے کی تیاری کر رہی ہوں یا جیسے رات کے وقت شوہر اپنے کمرے میں کچن سے لوٹنے والی اپنی نو بیاہتا دلہن کا انتظار کرتا ہے......کہ وہ اب آئے گی یا بتی بجھائے گی یا اس کے قدموں کی آہٹ سنائی دے گی۔

لیکن آپ اس طرح بڑی کاتیائن کو ٹہلتے دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ بڑھاپے کے گلیاروں میں اتنی دور تک نکل آئی ہیں۔نہیں، حیرت انگیز طور پر اس وقت وہ کسی نوجوان سے کم نہیں لگ رہی تھیں___یقیناً ایک ایسے نوجوان سے جو اپنی بیوی کی کسی بات سے ناراض ہوا تھا ہو اور اس سے گفتگو شروع کرنے کی ذہنی کشمکش سے گزر رہا ہو۔چھوٹی کاتیائن کے اندر داخل ہوتے ہی بڑی نے کسی لومڑی کی طرح اپنی نگاہیں اس پر مرکوز کر دیں......

___ آؤ ٹرسٹ ایکسرسائز (Trust Excercise) کرتے ہیں۔

___ ٹرسٹ ایکسرسائز؟ لیکن کیوں؟

—— جرح مت کرو۔ مردوں کی طرح مت بنو...... کیونکہ تم نے اپنا Trust کھویا ہے......

—— یا تم نے؟

—— ممکن ہے۔ اس لئے آؤ آنکھیں بند کریں اور شروع ہو جائیں......

اور اسی کے ساتھ دونوں آمنے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ بڑی کاتیائن کی پتلیاں دھیرے دھیرے بند ہونے لگیں...... چھوٹی کاتیائن کچھ سوچ کر مسکرائیں اور پتھریلی زمین پر وہ بھی بڑی کاتیائن کے آمنے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ ٹرسٹ ایکسر سائز میں ایک دوسرے پر آنکھیں موند کر گرنا ہوتا ہے۔ سامنے والے کو اپنے ساتھی کو تھامنا ہوتا ہے۔ ایسا کئی بار کرنا ہوتا ہے۔ سامنے والے نے اگر تھام لیا تو مطلب صاف ہے۔ ابھی یقین میں کمی نہیں آئی یا ابھی یقین بحال ہے۔ یہ عمل پتھریلی زمین پر اس لئے کرتے ہیں تا کہ گرنے یا چوٹ لگنے سے پیدا ہونے والا احساس اس یقین کو پھر سے بحال کر سکے—— دراصل مغربی ممالک سے ہم لگاتار کچھ نہ کچھ بطور تحفہ لیتے رہے ہیں اور ''ٹرسٹ'' کرنے کا یہ نایاب طریقہ ابھی کچھ دنوں پہلے ہی وہاں سے امپورٹ ہو کر آیا ہے......

تو کاتیائن بہنوں نے آنکھیں بند کرلیں۔ ممکن ہے آپ کے لئے یہ سارا منظر بے لطف، اکتا دینے والا اور واہیات ہو...... مگر شاید کاتیائن بہنوں کو یقین کی دوڑ سے باندھنے کے لئے یہ کھیل کافی معنی رکھتا تھا اور جیسا کہ ہمیں بھی یقین تھا آنکھیں بند کرنے، ایک دوسرے پر گرنے کے عمل میں چھوٹی سر کے بل گری تھی۔ شاید یہ ایک عمر پار کرنے کی حد کے سبب تھا۔ یا جو بھی ہو، مگر طے تھا کہ بڑی اسے تھام نہیں پائی اور چھوٹی کاتیائن کے ہونٹوں سے، لڑکھڑاتے، گرتے ہوئے ایک زور کی چیخ نکل گئی تھی......

''آہ جیسا کہ مجھے یقین تھا۔'' بڑی کاتیائن کا لہجہ برف سا سرد تھا۔ ''وہ آدمی...... تم نے سچ مچ اپنا ٹرسٹ کھو دیا ہے۔ چلو...... بہت دنوں کے بعد ہی سہی ذرا ماضی کی راکھ کریدتے ہیں۔'' بریکا تیائن نے چھوٹی کے کندھے پر ہاتھ رکھا......

''تمہیں کچھ یاد آ رہا ہے؟''

''ہاں۔''

—— ''تمہیں یاد رکھنا بھی چاہئے۔'' بڑی کی آواز میں لرزش تھی—— ''اس آدمی کے

باوجود، جو مرد تھا یا باپ تھا...... یا جنگلی سانڈ۔ یہی کمرہ تھا نا...... اور وہاں دروازے پر......"

چھوٹی کاتیائن کو یاد تھا۔ باپ دروازے پر شراب پی کر شام کے وقت آ کر، ماں کا نام لے کر زور زور سے چلاتا تھا......

"—— سب یاد ہے۔"

"—— باپ کیوں یاد ہے اس لئے کہ اس میں بے رحمی تھی۔ وہ ایک خوفناک انسان تھا۔ بلکہ حیوان...... تمہیں یاد ہے، ماں رویا کرتی تھی۔ کبھی کبھی خوب زوروں سے...... اور ساری رات چلایا کرتی تھی...... اور باپ نشے میں دھت سویا رہتا تھا......"

"—— ہاں، مگر وہ سب بھیانک یادیں ہیں اور رونگٹے کھڑی کرنے والی...... میری ماں ایک سہمی ہوئی گائے تھی۔ نہیں، وہ ایک معصوم میمنا تھی...... اور بچپن سے باپ تھوڑا تھوڑا کر کے اس میمنے کو ذبح کرتا رہا تھا۔"

"—— تمہیں یاد ہے؟ اس وقت یا ان دنوں تم گرتی تھی تو......، روتی تھی تو...... یا کسی پریشان کر دینے والے ڈر سے سہم جاتی تھی تو......، یہ میں ہوتی تھی، میں...... میں بڑی تھی اور میں انہیں دنوں تمہیں چاہنے بھی لگی تھی...... نہیں، تمہیں یاد ہونا چاہئے، جب یکا یک ڈر کر سہم کر تم مجھ سے چپک جایا کرتی تھی تو...... یا میری گود میں اپنا سر رکھ دیتی تھی تو...... یہاں ٹانگوں کے درمیان سے...... کسی ایک مرکز سے دریا پھوٹ پڑے تو...... کیسا لگتا ہوگا؟ اندر سنسناہٹ کا ایک طوفان سا آ جاتا تھا۔ شاید ایسا اس لئے بھی تھا کہ دنیا میں اور بھی لوگ ہو سکتے ہیں، ہمیں پتہ نہیں تھا—— ہم صرف ایک دوسرے کو جانتے تھے یا پھر ماں کو—— جسے اس زمانے میں معصوم میمنا کہہ کر ہم اداس ہو جایا کرتے تھے یا پھر اپنے باپ کو، جس کی پرچھائیں تک سے ہمیں ڈر لگتا تھا—— ہم کسی مرد کو صحیح طور سے پہچان نہیں پاتے تھے، جیسے عورت ہونے کے نام پر ہمارے سامنے صرف مظلوم ماں کا تصور رہ گیا تھا۔

"ہاں یہ سچ ہے۔" چھوٹی کاتیائن کی آواز بوجھل تھی۔

—— "تو تمہیں یاد ہونا چاہئے۔" بڑی کاتیائن نے اپنی بات جاری رکھی......"وہ دن...... شاید وہ دن ہماری زندگی کے چند خوبصورت دنوں میں ایک تھا...... گلی میں ایک سانڈ پاگل ہو گیا تھا...... یاد ہے، وہ اپنی بڑی بڑی سینگیں اٹھائے، کبھی ادھر کبھی اُدھر دوڑ رہا تھا۔ کچھ دیر تک ہم بھی اس تماشے کا حصہ بنے رہے۔ مگر اب باپ کے آنے کا وقت ہو چلا تھا۔ باہر

دکاندار، راگیر سب تالیاں بجا رہے تھے۔ ہم کمرے میں آ گئے...... ہم ایک دوسرے کو برابر دیکھے جا رہے تھے...... جیسے، اب میمنے کے لرزنے کی آواز آئے گی۔ اچانک آنکھوں کے سامنے باپ کی شبیہ ابھری۔ اس کا چہرہ سانڈ جیسا تھا...... اس کی سینگیں نکلی ہوئی تھیں...... اور وہ ان سینگوں سے دیوانہ وار میمنے کو زخمی کر رہا تھا...... تم میری طرف دیکھ رہی تھیں اور میں ان لہروں کی ہلچل گن رہی تھی جو تمہارے اس طرح دیکھنے سے میرے بدن میں اٹھنے لگی تھیں...... یاد ہے...... میں نے کہا تھا...... مجھے چھوؤ...... مجھے بخار لگ رہا ہے...... تم دھیرے سے میری طرف بڑھی تھیں اور تبھی باہر زوردار گرج کے ساتھ دروازے پر کچھ گرنے کی آواز آئی تھی ـــــ زبردست شور ہوا تھا۔ تم کانپتی ہوئی میرے بدن میں سما گئی تھی اور میں ـــــ ''جیسے کسی ایک مرکز سے دریا پھوٹ پڑے تو''...... میں تمہیں لے کر کانپ رہی تھیں...... اندر سنسناہٹ ہو رہی تھی...... تبھی میمنے کی بے خوف، پُرسکون اور ٹھہری ہوئی آواز سنائی دی......''

''دروازہ کھولو سانڈ نے تمہارے باپ کو پٹخ دیا ہے...... شاید وہ مر گیا ہے......''

دروازہ کھول کر میں نے پہلی بار ماں کو دیکھا۔ وہ حسین لگ رہی تھی...... ماں کے چہرے پر خوف کا شائبہ تک نہیں تھا۔ باہر دروازے پر ایک ہجوم اکٹھا تھا...... اور وہیں...... گلی میں کھلنے والے دروازے کے پاس باپ کا بے جان جسم اوندھا پڑا تھا...... شرٹ خون سے تر تھی۔ اس نے شراب پی رکھی تھی ہمیشہ کی طرح...... راگیروں کے شہہ دینے پر وہ سانڈ سے بھڑ گیا۔ لوگ ماں کو صبر کی تلقین کر رہے تھے...... ''کسے معلوم تھا کہ ایسا ہو جائے گا''...... یاد ہے۔ ماں خاموشی سے سب کچھ سنتی رہی...... پر یکا یک سب کے سامنے زور زور سے ہنس دی تھی...... لوگوں کی آنکھیں حیرانی سے پھٹی پڑی تھیں۔ ممکن ہے یہ سمجھا گیا ہو کہ شوہر کے صدمے کو نہ سہہ پانے کی وجہ سے...... لیکن ماں کی کیفیت تو صرف ہمیں معلوم تھی......''

''ہاں...... اس کے بعد ماں جب تک زندہ رہی...... وہ بیٹھی بیٹھی ہنس پڑتی تھی......''

اور مرتے وقت بھی اس کے ہونٹوں پر یہ ہنسی موجود تھی۔ گویا ماں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا، کہ باپ جیسا آدمی ایک دن مر سکتا ہے۔ بڑی کا تیائن کے لہجے میں سنجیدگی تھی...... مگر آخر یہ سب میں تمہیں کیوں یاد دلا رہی ہوں؟ کیوں؟ تو سنو ریتا کا تیائن!'' بڑی کا تیائن کے الفاظ برف ہو رہے تھے......'' سنو اور غور سے سنو۔ اس لئے کہ عورت اپنے آپ میں مکمل ہوتی ہے۔ ایک مکمل سماج۔ مرد کبھی مکمل نہیں ہوتا۔ جو مرد ایسا سمجھتے ہیں وہ غلط فہمی کا شکار ہیں...... مرد کو عورت

کی ضرورت پڑ سکتی ہے لیکن عورت کو مرد کی نہیں...... اس لئے، ابھی سے کچھ روز پہلے جو آدمی تمہاری زندگی میں آیا ہے......

چھوٹی کاتیائن نے بات بیچ میں ہی کاٹ دی...... ''آپ کی غلط فہمی ہے'' اس نے دوسرے ہی پل نظر جھکالی۔ ''میری زندگی میں کوئی مرد نہیں آیا ہے۔ میں نے کہا نا...... وہ محض ایک حادثہ......''

''ٹھیک ہے...... لیکن تم نے حادثوں کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ یاد رکھنا۔ وہ آدمی...... کیا نام بتایا تم نے...... ہاں بھوپیندر پریہار۔ وہ دوبارہ بھی آسکتا ہے...... اور اس کے لئے تمہارا جواب کیا ہوگا۔ کیا بتانا پڑے گا مجھے۔''

''نہیں'' چھوٹی کاتیائن مسکرائی۔ ''عورت اپنے آپ میں مکمل ہے۔ ایک مکمل سماج۔''

''اور اب میں یہ دکھانا چاہتی ہوں کہ اس مکمل سماج کے پاس کیسی کیسی فینٹاسی موجود ہے...... ٹھہرو، ہاں۔ ہوسکے تو وارڈ روپ سے اپنی کھلی کھلی نائٹی نکال لو۔ سلیولیس (Sleevless)۔ تم اس عمر میں بھی آہ۔ اس عمر میں بھی'' ...... بڑی کاتیائن کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ ''سنا تم نے۔ میں بس ابھی آئی۔''

کاتیائن بہنوں کی فینٹاسی

رات دھیرے دھیرے خاموشی کے ساتھ اپنا سفر طے کررہی تھی۔ مگر یہاں...... اینا کی ڈالی والی دکان کے سامنے والے گھر میں رات ایک نئے 'ایڈونچر' سے آنکھیں چار کررہی تھی...... شاید! بہت ممکن ہے ہمارے ہندستانی معاشرے میں سوچا جائے، اس عمر میں تو آگ بہت پہلے کی کسی منزل میں بجھ چکی ہوتی ہے...... اور کیسی آگ؟ کیسی راکھ____؟ مستی کے ساتویں آسمان پر پہنچانے والے نئے نشے براؤن شوگر اور ہیروئن بھی وہ ہیجان نہ پیدا کر پائیں جو اس خستہ اور سیلن زدہ کمرے میں پیدا ہورہا تھا......

''اس وقت میں تمام کائنات کی سوامی ہوں...... سمجھا تم نے۔'' بڑی کاتیائن کے ہاتھوں سے گرم گرم بھاپ اٹھ رہی تھی، جیسے جاڑے کے دنوں میں صبح صبح منہ کھولنے سے اٹھتی ہے...... اس کے ہاتھ میں ایک اسٹیل کی کٹوری تھی...... کٹوری میں پگھلا ہوا اصلی گھی پڑا تھا۔ چھوٹی کا چہرہ قد آدم آئینے کی جانب تھا...... اس نے سلیولیس سیاہ نائٹی پہن رکھی تھی...... شاید نہیں۔ نائٹی

نے اچانک اس کی عمر پہن لی تھی...... اس چھوٹے سے کپڑے میں وہ ایک دم سے چھوئی موئی لگ رہی تھی۔ بڑھاپے اور جھریوں سے میلوں پیچھے۔ جہاں صرف ہنستا گاتا ڈھول بجاتا حسن ہوتا ہے۔ حسن کا ساز چھیڑنے والے جذبات ہوتے ہیں...... اور جذبات کے پیچھے چھپی مجروح 'ہوسنا کی' ہوتی ہے......" ہاں اب ٹھیک ہے۔ لیٹ جاؤ اور کپڑے اتار دو......" بڑی کاتیائن کی آواز سے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے ڈھیر ساری "ماریجوانا" پی لی ہو......اور وہ پوری طرح نشے میں آ گئی ہو......

چھوٹی کاتیائن لیٹ گئی......اندھیرے میں جلتی ٹیوب لائٹ میں اس کا جسم چمکا...... بڑی نے اسٹیل کی کٹوری تھام لی۔ اس کا سخت جھریوں بھرا ہاتھ 'گھی' کے اندر گیا...... جیسے کبھی میدے کی چھوٹی چھوٹی 'لوئیاں' بنتی ہیں اور انہیں ڈھیر سارے گھی میں ڈبویا جاتا ہے...... گورے چٹے بدن پر بڑی کاتیائن گھی اس طرح ملنے لگیں گویا چھوٹی کا بدن اچانک میدے کی 'لوئیوں' میں تبدیل ہو گیا ہو...... جھپ...... جھپ......

"آہ، تم اب بھی ویسی ہو......" بڑی کے ہاتھ میں حرکت ہوئی۔ "بالکل ویسی...... سنوریتا کاتیائن...... دیکھو......خود کو دیکھو____ غور سے۔آہ......اپنی عمر کو دیکھو____ نہیں، عمر کو مت دیکھو____ مگر سنو____ غور سے سنو____ مرد اس تندور کو کب کا ٹھنڈا کر چکا ہوتا ہے____ ایک لاش گھر کی طرح____ مگر یہاں تم اپنے آپ کو دیکھو____ تم لاش گھر نہیں ہو____ برف گھر بھی نہیں ہو____ تم تندور ہو۔"

بڑی کاتیائن اپنے غیر مفتوح ہونے کے خیال سے زور سے ہنسی......

"اسے بتا دینا......کیا نام بتایا تم نے۔ بھوپیندر پریہار......اسے بتا دینا، عورت اپنے آپ میں مکمل ہوتی ہے......اسے مرد کی ضرورت نہیں......"

پھر وہ اس پر جھک گئی۔ رات خاموشی سے اپنا سفر طے کر رہی تھی۔

بھوپیندر پریہار اور عشق کی ڈگر

اتنی عمر گزر جانے کے بعد بھی بھوپیندر پریہار زندگی کے اسی فلسفے پر قائم تھے کہ ایک عمر گزر جانے کے بعد بھی ایک عمر بچی رہ جاتی ہے......اور جو عمر باقی بچ جاتی ہے اسے اسی طرح گزارنے یا جینے کا حق حاصل ہونا چاہئے۔ مسز پریہار کے گزر جانے اور سمن کے کناڈا بھاگ

جانے کے بعد اچانک ان پر بڑھاپا طاری ہونے لگا تھا..... حالانکہ انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ جسم بوڑھا بھی ہوسکتا ہے..... وہ تو بقول رسول حمزہ توف۔ ''جسم تو بس عشق کے لئے ہے اور عشق کو زندہ رکھنا ہی انسان کا اولین فرض ہے.....'' شاید بڑھاپے کی یہ شروعات انہیں کافی آگے لے گئی ہوتی، وہ تو اچھا ہوا جو اچانک چھوٹی کاتیائن ان سے آٹکرائیں..... مدتوں بعد اندر کہیں کوئی چنگاری سی لپکی تھی..... بڑھاپے کی تنہائی میں چہرے اور بالوں کو سنوارتے ہوئے وہ جیسے برسوں پرانے چہرے والے بھوپیندر پریہار کو واپس لانے کی کوشش کررہے تھے..... کتنی ہی بار قدم ''اپنا کی ڈالی'' والی دکان کے سامنے والے گھر کی طرف اٹھے۔ ہر بار دروازہ کھلتا تھا اور بند ہوجاتا تھا۔

''کاتیائن بہنوں کی دنیا''..... بھوپیندر پریہار کو لگتا، باہر کی دنیا میں ان کے بارے میں جتنی کہانیاں ہیں..... شاید وہ سب کی سب سچ ہیں..... یہاں تو کسی پریوں کی کہانی سے بھی زیادہ الجھا ہوا معاملہ تھا، لیکن انہوں نے ہار نہ ماننے کا فیصلہ کیا تھا اور شاید اسی لئے اس دن انہیں کامیابی مل گئی تھی۔

وہ ایک دستک کے بعد دروازہ کھلا تو سامنے چھوٹی کاتیائن کھڑی تھیں۔

''کیا بات ہے؟ بڑی کاتیائن سو رہی ہیں۔ جو بولنا ہے جلدی بولو۔''

''اندر آجاؤں؟''

چھوٹی کاتیائن نے کچھ سوچنے کے بعد کہا ــــــ ''آسکتے ہو۔ ویسے بھی بڑی کو اٹھنے میں دو ایک گھنٹے تو لگیں گے ہی۔''

وہ اندر آگئے۔ چندن کی لکڑی کے بنے محراب نما دروازے سے گزرتے ہوئے ــــــ یہ وہی جگہ تھی جہاں آپ ہر موسم میں بڑی کاتیائن کو دیکھ سکتے ہیں..... ہاتھ میں تیلیاں تھامے، سر جھکائے سوئٹر بنتی ہوئی..... وہ ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ سب کچھ ایسا تھا جیسا کالج کے دنوں میں لڑکے لڑکیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ یا پیار کی پہلی بارش کی پہلی بوند پڑتے ہی یہ سب ان کی اداؤں میں شامل ہوجاتے ہیں.....

چھوٹی کاتیائن کچھ دیر تک اسے گھورتی رہی۔

بھوپیندر پریہار۔ نے نظریں جھکالیں۔

ذرا دیر بعد چھوٹی کاتیائن کے لب ہلے..... ''تمہاری..... تمہاری بیوی ــــــ؟''

''نہیں ہے۔ گزر گئی۔''

''اوہ......''

''نہیں، اس میں افسوس کرنے جیسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ جی چکی تھی......''

''عمر سے زیادہ......؟'' چھوٹی کاتیائن نے حیرانی ظاہر کی۔

''ہاں، مرنے سے دس برس پہلے تک مجھے احساس ہی نہیں تھا کہ وہ ہے...... یعنی گھر میں ہے۔''

''ایسا کیوں تھا؟'' چھوٹی کاتیائن کی ہرنی جیسی آنکھوں میں چمک جا گی۔

''پتہ نہیں ــــــ پر مجھ میں جیسے ایک نئے اور جوان بھوپیندر پریہار کی واپسی ہو رہی تھی......تم...... یعنی آپ سمجھ سکتی ہیں......اس عمر میں...... یعنی مجھے دیکھ کر......'' ــــــ وہ کہتے کہتے لڑکھڑائے تھے۔

چھوٹی کاتیائن کھلکھلا کر ہنس پڑیں ــــــ ''وہی...... غلط فہمی کی روایت...... مرد سمجھتا ہے وہ ساٹھ کے بعد پھر سے بچہ بن گیا ہے......اور عورت تو اپنی عمر سے زیادہ بوڑھی ہو گئی ہے...... ہے نا، ایسا ہی کچھ ــــــ'' وہ پھر زور سے ہنسی۔

''پتہ نہیں۔'' بھوپیندر پریہار کے کھوکھلے لفظوں یں ہلچل ہوئی۔ ''مگر میرا خیال ہے کہ مرد...... یعنی......''

''مرد۔ مرد کے نام پر اتنی رعونت کیوں بھر جاتی ہے مرد میں ــــــ بار بار اس لفظ کو دہراتے ہوئے، اپنی کسی کمزوری پر پردہ تو نہیں ڈالتے......'' چھوٹی کاتیائن نے الفاظ جیسے زہر میں ڈبو رکھے تھے۔ ''خیر! جو بھی کہنا ہے جلدی کہو۔ بڑی کاتیائن تمہارے اس طرح آنے کو پسند نہیں کرتیں۔''

''کیوں؟'' بھوپیندر پریہار اچانک ٹھہر سے گئے۔ ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں......

''تمہاری اپنی زندگی ہے، ان کی اپنی......''

''نہیں، ہماری زندگیاں ایک ہیں۔''

بھوپیندر پریہار زور سے لڑکھڑائے...... ''کیا ــــــ؟''

''ہاں، ہم لسبین (Lesbian) ہیں...... لسبین۔'' وہ بڑے اطمینان سے ناخن چباتے ہوئے بولی۔

''لسبین۔''...... بھوپیندر پر یہار اچھل پڑے...... جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

''ہاں، میں لسبین ہوں...... لیکن تم تو ایسے ڈر رہے ہو جیسے میں کوئی کوڑھی ہوں، یا مجھے ایڈس ہو گیا ہے۔''

''لیکن تم......'' ان کی آنکھیں اب بھی پھٹی پھٹی تھیں۔

''کیوں آتے ہو میرے پاس، اچھی طرح جانتی ہوں۔'' چھوٹی کاتیائن کے لہجے میں شدید نفرت تھی...... ''اپنے باپ کو بھی جانتی تھی۔ تمہیں بھی...... تمہارے اس پورے مردانہ سماج کو ــــ حیران مت ہو۔ بس وہی غلط فہمی پر مبنی روایتیں ــــ مرد ہونے کی خوش خیالی ــــ یہ احساس ہی اچانک تمہیں ایک بے وقوف راکشش میں تبدیل کر دیتا ہے۔ تم سمجھتے ہو سب تمہاری طاقت کے ماتحت ہیں۔ تو یہ تمہاری نا سمجھی ہے...... سنو بھوپیندر پر یہار...... تمہاری بیوی نہیں ہے، یہ بات ذہن کی گانٹھ کھول کر نکال کیوں نہیں دیتے کہ تمہاری بیوی، دس برس پہلے ہی کھوئی نہیں تھی ــــ بلکہ مر چکی تھی ــــ اور تم نے مارا تھا اسے......''

''میں نے؟'' بھوپیندر پر یہار ایک دم سے چونکے۔

''ہاں تم نے۔ ہاں، اس لئے کہ دس برس پہلے ہی اس کے اندر کے لاوے کو بجھا چکے تھے تم...... اور اسی لئے وہ تمہارے لئے نہیں تھی...... یا مر گئی تھی...... اور اس بڑھاپے میں بھی تمہارے اندر ایک گرم، دہکتا ہوا جسم ہے...... سنو پر یہار...... تم نے اپنی تہذیب اور روایت کے وہ موتی چنے ہیں جہاں صرف ''ایک بیوی بس، یا لوگ کیا کہیں گے'' کی بندشیں ہوتی ہیں ــــ تم لاکھ ماڈرن بننے کی کوشش کرو مگر تم ہو وہی...... ایک بزدل مرد...... اگر اتنی ہی آگ تمہارے اندر ہے تو تم اپنا جسم کسی مرد سے کیوں نہیں بانٹتے ــــ؟ جہاں تمہیں بند کمرے میں داخل ہونے کے لئے تم کو بہت سے سوالوں کا جواب نہیں دینا ہوگا......''

''لیکن خود کو......'' بھوپیندر پر یہار کا جسم تھرتھرایا۔

''بھول کر رہے ہو تم۔ خود کو ابھی دیکھا کہاں ہے۔ اسے تو تم نے Gay یا Homosexuality اور کئی دوسرے غلط ناموں میں باندھ رکھا ہے...... میں کہتی ہوں میں لسبین ہوں، تب بھی تمہارا سماج اچانک ہم پر بے رحم ہو جاتا ہے ــــ لسبین یعنی کسی ناجائز نظریے کی اولاد ــــ لیکن ایسا نہیں ہے۔ ہم نے آپس میں سکھ، امن، شان و شوکت اور سرشاری کی انتہا ڈھونڈ لی ہے۔ اب تم چاہو تو جا سکتے ہو......''

آخری جملہ اس قدر ٹھہر ٹھہر کر بولا گیا تھا کہ بھوپیندر پر یہار کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اندھیرا دھیرے دھیرے چھٹ رہا تھا...... چھوٹی کا تیائن کے لفظ چیخ رہے تھے اور اس چھٹتے ہوئے اندھیرے میں وہ کئی پر چھائیوں کو سمٹتے ہوئے دیکھ رہے تھے...... ماں، بابوجی، بیوی، سمن...... پر چھائیاں ایک دم سے ہٹ گئی تھیں...... گے (Gay)، لسبین اور کتنے ہی غیر فطری رشتے...... اب ایک سہما سا اُجالا تھا...... اور اس اُجالے میں وہ صاف دیکھ رہے تھے کہ وہ اپنی عمر سے زیادہ جی چکے ہیں۔ زندگی، موت، سکھ...... کہنا چاہئے ایک پل کو چھوٹی کا تیائن کے الفاظ کے تیر سے گھبرا کر وہ کافی دور نکل آئے تھے...... اور اب...... بھوپیندر پر یہار کے ہونٹوں پر ایک تیکھی سی مسکراہٹ تھی......

''سنو رما کا تیائن...... وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولے...... ٹٹول ٹٹول کر اپنے لفظوں کو یکجا کرتے ہوئے بولے۔ ''سنو۔ ہم میں سے کوئی بھی کبھی بھی مر سکتا ہے...... سمجھ رہی ہونا___ کبھی بھی مر سکتا ہے___ کیوں کہ ہم اپنی عمر سے زیادہ جی چکے ہیں...... اس لئے......'' پتہ نہیں وہ اور کیا کیا کہہ رہے تھے لیکن چھوٹی کا تیائن...... انہیں کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ صرف ایک ٹک بھوپیندر پر یہار کا چہرہ تکے جا رہی تھیں۔ ہاں، اس عمل کے دوران، ان کے اندر تیز سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ جو اس سنسناہٹ سے مختلف تھی جیسی سانڈ والے حادثے کے دن بڑی کا تیائن کی بانہوں میں سمٹ کر اس نے محسوس کی تھی...... پتہ نہیں یہ کیا تھا، اسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا...... یا۔ وہ سمجھنا نہیں چاہ رہی تھیں۔

آخری مکالمہ چھوٹی کا تیائن کا

وہ اسی نائٹی میں تھیں۔ سلیولیس سیاہ نائٹی میں۔ آئینے کے سامنے...... لیکن آئینہ شانت تھا۔ آئینے میں کہیں کوئی آگ، کوئی بھڑکیلا پن، کوئی لگاؤ، کوئی کشش نہیں رہ گئی تھی۔ دھیرے دھیرے ریتا کا تیائن نے نائٹی کے تمام ہک کھول ڈالے۔ ذرا فاصلے پر بڑی کا تیائن کھڑی تھیں، اور انہیں گھورے جا رہی تھیں۔ لیکن ان کے اس طرح دیکھنے میں کوئی بزرگی، کوئی حکم یا کوئی خفگی شامل نہیں تھی۔

اچانک چھوٹی کا تیائن کے منہ سے ایک تیز چیخ نکلی۔ نائٹی کے تمام ہک انہوں نے کھول ڈالے تھے۔ آئینے میں ایک سہما، بے ڈھنگا جسم مردہ پڑا تھا۔ وہ بوکھلاہٹ میں چیختی ہوئی

بڑی کاتیائن کی طرف جھپٹیں......

''آگ کہاں ہے؟ میرے جسم کی آگ کیا ہوئی؟''

بڑی کاتیائن ایسے چپ تھی، جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں ہو۔

''سنو، میرے اندر......تم نے تو کہا تھا......'' چھوٹی کاتیائن کی نظریں جیسے مدتوں بعد بڑی کاتیائن کی آنکھوں میں سمائی جا رہی تھیں...... یاد ہے......؟ سنو، تم نے ہی کہا تھا، آہ تم اب بھی ویسی ہو...... بالکل ویسی ریتا کاتیائن...... سنو، مرد اس تندور کو کب کا ٹھنڈا کر چکا ہوتا ہے'' ......وہ پھر چیخی......''آگ کہاں ہے، میرے اندر کی آگ کہاں ہے......؟''

بڑی کاتیائن کا چہرہ ہر پل تیزی سے بدل رہا تھا۔

''تم......تم سن رہی ہو۔ میں......میں کیا پوچھ رہی ہوں......؟''

کافی دیر بعد بڑی کاتیائن کے بدن میں حرکت ہوئی...... اس نے چھوٹی کی جلتی آنکھوں کی تاب نہ لا کر نظریں جھکا لیں۔

''آگ تو میرے پاس بھی نہیں ہے۔''

بڑی کاتیائن کے الفاظ سرد ہو چکے تھے۔ پھر وہ ٹھہری نہیں، تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئیں۔

آئینے میں ابھی بھی چھوٹی کاتیائن کا سہما، بے ڈھنگا جسم پڑا تھا......اور شاید مردہ بھی۔

○○○

مرد

(الف)

مسز گرووراور تانیہ ایک منظر دیکھتی ہیں

''وہ ہنس رہے ہیں، باتیں کر رہے ہیں......''

ناگواری سے کہا گیا ــــ ''ہوتا ہے!''

''اب انہوں نے چھریاں سنبھال لی ہیں۔''

اِدھر ایک کپکپی طاری کر دینے والی کیفیت ــــ جواب میں کہا گیا ــــ ''اور دیکھو''۔

اُدھر سے پھر ایک حیرت بھری آواز ــــ 'انہوں نے ڈونگرے سنبھال لئے ہیں۔''

''اُف! وہ کتنے اوجڈ، باتونی اور جلد باز ہیں۔''

''انہوں نے چھریاں سنبھال لی ہیں اور اب وہ اپنے بے ڈول ہاتھوں سے سبزیاں کاٹ رہے ہیں۔''

''کاٹنے دو'' جواب میں کہا گیا۔ ''اور ہاں اب نیچے اتر آؤ۔''

OO

سامنے ایک کھڑکی کھلتی تھی۔

بلند و بالا عمارتوں کے بیچ شہر پھر سے اندھیرے میں گم ہوگیا تھا ــــ ایک بڑی عمارت، اس سے بالکل قریب ایک دوسری بڑی عمارت اور اس سے بالکل قریب ــــ

ہوا کئی کئی روز تک ان گلی کوچوں کے چکر لگانا بھول جاتی۔ لوگوں کو اس بات کا احساس تک نہیں تھا۔ کوئی بھی نہیں پوچھتا، نہ ہی پوچھنے کا ان کے پاس وقت تھا۔

''سنو بھئی، تم نے ہوا کو دیکھا ہے؟ کیا آج ہوا نے ادھر کا رخ کیا تھا؟''

●●

ہنسئے مت، سچ تو یہ ہے کہ ادھر صرف بلند و بالا عمارتوں کا جنگل رہ گیا تھا۔ رہنے والے نظر نہیں آتے تھے۔ رنگ برنگی، گھومتی لہراتی، ڈولتی گاڑیاں نظر آتی تھیں جو کبھی ان عمارتوں میں داخل ہوتیں، کبھی باہر نکلتیں بس ـــــ اور اسے محض اتفاق ہی کہا جائے گا کہ ''مارٹن کرا'' میں بنی ان دو عظیم عمارتوں پانچویں منزل کی کھڑکیاں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھلتی تھیں۔ ایک میں اکثر مسز گرودور، اِس بوڑھی کھوسٹ تک چڑھی لیڈی اور اس کی سولہ سالہ پوتی تانیہ کو دیکھا جا سکتا تھا۔ چاروں طرف سے بند اس پانچویں منزل کے فلیٹ کو بس یہ سامنے کی جانب کھلنے والی کھڑکی ہی زندگی سے جوڑتی تھی۔ یعنی ایک ذرا سی ہوا۔ ایک ذرا سی سانس۔

سامنے والے فلیٹ کی کھڑکی ہمیشہ بند رہتی تھی۔

مسز گرودور تانیہ سے اکثر پوچھتیں۔ ''دیکھ کر بتاؤ کوئی آیا؟''

سوال میں ہر بار ایک گہرا اضطراب آمیز تجسس ہوتا، گویا بجھے بجھے مکالموں کو جینے کے لئے کچھ اور جگہ مل جائے۔

تانیہ کے جواب میں ہر بار ایک مایوسی ہوتی۔

''کوئی امکان نہیں۔''

''کیوں؟''

''یہ فلیٹ کرائے پر نہیں لگے گا''۔

''کیوں نہیں لگے گا اُلو کی پٹھی۔''

عین ممکن تھا مسز گرودور تانیہ کے ہلکے پھلکے مذاق سے مشتعل ہو کر گالی گلوچ پر اتر آتیں مگر تانیہ کی شفاف ہنسی ان کے تیکھے مکالموں کی ہوا نکال دیتی۔ بس وہ دھیرے دھیرے بڑبڑاتیں...... ''کتیا، حرامزادی، دیکھو تو کیسے پورے وجود کے ساتھ ہنستی ہے...... بن ماں باپ کی بچی۔'' دوسرے ہی لمحے ایک سرد سی لہر مسز گرودور کو بھگوتی، گدگداتی چلی جاتی۔

●●

لیکن اس دن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ بڑھیا مسز گروور نے کوئی گالی نہیں بکی۔ ماحول کے بوجھل پن کے درمیان تانیہ کی ہنسی کہیں کھوگئی تھی۔

''اماں! کھڑکی کھلی ہے......''

''اچھا......!''

مسز گروور بستر سے اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔ ''کوئی ہے کیا، بتانا؟''

''ابھی تک تو کوئی نہیں......ہاں......ٹھہر......کوئی آ رہا ہے...... وہ آ گئے ہیں۔ اماں......وہ تین ہیں......''

''تین......لیکن کون ہیں؟''

''وہ مرد ہیں اماں۔''

''ان کے ساتھ کوئی عورت نہیں ہے......''

''شاید نہیں......کیونکہ ایک نے......''

''کیا ایک نے......؟''

''ویکیوم کلینر آن کرلیا ہے......شاید وہ کچن کی صفائی کرنے والے ہیں......''

''تم نے اچھی طرح دیکھا کہ وہ مرد ہیں؟''

''ہاں۔''

''اور یہ بھی کہ وہ اب کچن کی صفائی کرنے والے ہیں......''

''ہاں اماں۔''

''ٹھیک ہے۔ اب اتر آؤ۔''

''اماں ذرا ہاتھ تو تھامو......''

''ٹھیک ہے کمبخت...... لے پکڑ......لیکن مجھے گرامت دینا۔''

لکڑی کا ایک چھوٹا سا اسٹول تھا، جس پر پاؤں رکھ کر تانیہ بہ آسانی کھڑکی سے اس پار دیکھ سکتی تھی۔

''تو مرد آئے ہیں۔''...... مسز گروور ابھی بھی بڑبڑا رہی تھیں۔

''ہاں اماں، اس میں نیا کیا ہے؟ آج کل بہت سے مرد......''
تانیہ ''اکیلے رہتے ہیں'' کہتے کہتے رک سی گئی تھی۔۔۔
''تونے دیکھا ہے نا۔ ان کے ساتھ کوئی عورت......''
''عورت ہوتی تو ویکیوم کلینر سے......لوتم خود ہی آواز سن لو۔ صفائی ہو رہی ہے۔''
''ہاں۔۔۔'' مسز گرووَر کے ہونٹوں پر ایک پُر اسرار مسکراہٹ تھی۔ ''مردوں کو صفائی کا کہاں دھیان رہتا ہے؟'' اب ان کی آواز میں ''چوری پکڑی جانے والی'' جھلاہٹ سوار تھی......
''مرد تیری طرح نہیں ہوتے۔ کام چور کہیں کی......''
''پھر کیسے ہوتے ہیں؟''
''مرد تو مرد ہوتے ہیں......بس کہہ دیا نا۔ زیادہ بک بک مت کیا کر۔ ان لڑکیوں کو ذرا سا موقع دے کر دیکھو بس شروع ہو جاتی ہیں، سر چڑھنے لگتی ہیں۔ بیل کی طرح۔ اب جا، کھڑی کھڑی میرا منہ کیا دیکھ رہی ہے؟''
''جاتی ہوں، تم بھی عجیب ہو اماں۔'' تانیہ مسکراتی، اٹھلاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔
مسز گرووَر دھیرے سے بڑبڑائیں......''تو صفائی ہو رہی ہے......ہونہہ......مرد صفائی کیا جانیں......صفائی تو......''
وہ آدمی آچکا تھا جسے اپنا خاوند کہتے ہوئے اسے ہر بار شرمندگی کا احساس ہوا تھا۔ کہنا چاہیے دل نے گوارہ تو کبھی نہیں کیا تھا مگر وہ شوہر تھا۔ رسم و رواج کے مطابق......شوہر۔۔۔اس لئے ان دکھ بھرے دنوں کا گواہ تو اسے بننا ہی تھا۔
تو وہ آدمی آچکا تھا اور وہ دیر سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔ یہ اداس پت جھڑوں کے دن تھے۔ باہر پتے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہے تھے۔ اس نے، اس شخص کو غور سے دیکھا۔ وہ اپنی بنیان اتار رہا تھا۔ پسینے کی گھناؤنی بدبو میں ڈوبی ہوئی بنیان۔ اس نے بنیان ویسے ہی اتار کر بستر پر پھینک دی تھی جہاں وہ سوتی تھی۔ اس کا جی متلا رہا تھا......وہ آدمی اچانک مڑ کر سامنے آگیا تھا۔ کالا بھیانک چہرہ، بڑی بڑی گول گھومتی آنکھیں، سینے اور کندھوں کے آس پاس اُگے بال۔
اس کی آنکھوں میں ناگواری تھی......''ایسے کیا دیکھ رہی ہو جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ چلو کھانا نکالو بڑی زور سے بھوک لگی ہے۔''

''نہاؤ گے نہیں......''

''نہیں...... کیوں......'' وہ زور سے بے ہنگم طریقے سے ہنسا۔

''نہایا تو پسینے مر جائیں گے۔ پسینے مر گئے تو بھوک بھی مر جائے گی۔'' اس نے آہستہ سے اسے دھکا دیا۔ ''جاؤ دماغ مت چاٹو، کھانا نکالو۔''

ایک لمحے کو وہ لڑکھڑائی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل چکی تھی۔ یہ آدمی...... وہ صوفے پر دونوں ٹانگیں پھیلائے لیٹ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ نیچے کے حصے میں اس نے صرف ٹاول باندھ رکھی تھی۔ جبکہ اوپر کا حصہ ننگا تھا...... یہ آدمی، اسی آدمی کے ساتھ اسے ساری عمر گزاری ہے۔ جب وہ کھانا لے کر آئی تو وہ خرّاٹے لے رہا تھا۔ منہ بھدے انداز سے کھلتا اور پھر بند ہو جاتا۔ خراٹوں کی عجیب سی آواز فضا میں گونج رہی تھی۔ اس نے روکھے لہجے میں تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

''اٹھو...... کھانا آ گیا ہے......''

''رکھ دو......'' اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اب وہ بُرا سا منہ بنا کر پلیٹ میں رکھے کھانے کو دیکھ رہا تھا...... وہی روٹی، سا، بھاجی، دال...... گفتگو کا دوسرا حصہ نرمی سے بھرا اور چونکانے والا تھا۔

''سنو......تم نہیں کھاؤ گی؟''

اس نے اپنائیت سے بھری نظروں سے بچنے کی کوشش کی ــــــ

''نہیں، مجھے بھوک نہیں ہے۔''

(شیڈ-1 ختم)

وہ بھی پت جھڑ کے دنوں کی ایک اداس صبح تھی۔ تانیہ واپس آئی تو بوڑھی مسز گروور کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں۔ ہونٹ ہل ہل کر خراٹوں جیسی آوازیں نکال رہے تھے۔ بدن پسینے سے بھیگ چکا تھا۔

تانیہ ہلکے سے چیخی...... ''اٹھو اماں۔ نہالو......''

جواب میں مسز گرودور کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ ''کوئی ضرورت نہیں۔''

''پھر تم کھانا کیسے کھاؤ گی؟ جسم تو دیکھو، پسینے سے شرابور ہو رہا ہے۔''

''باتونی لڑکی......صرف بک بک کئے جاتی ہے۔ جا، کھانا لے کر آ۔اور ہاں......تو نہیں کھائے گی کیا؟ اچھا سن۔ اپنی بھی تھالی لے آنا۔ یہیں بیٹھیں گے۔ کھائیں گے اور باتیں کریں گے۔''

تانیہ نے عجیب معنی خیز نظروں سے مسز گروور کو دیکھا۔ پھر وہ تھالیاں لانے چلی گئی، مسز گروور جیسے ابھی بھی سوچ میں ڈوبی تھیں۔ تھالی اٹھا کر بھی ان کی پھیلی ہوئی آنکھیں کسی سوچ میں گم تھیں......

''مرد میں ایک عجیب سی خوشبو ہوتی ہے......نہیں......تُو کھا......تو کیا سمجھے گی......ہاں تو......توبہ۔ بڑے بڑے بال، کالا چہرہ، بالوں سے بھری چھاتی...... کندھوں تک اُگے بال......اور پسینے کی بدبو...... پاگل......کتیا......تو کھاتی کیوں نہیں......لیکن مرد کے پورے وجود میں ایک عجیب سی خوشبو ہوتی ہے......''

تانیہ نے چونک کر اماں کو دیکھا......اماں تھالی میں رکھے کھانے کو بھول چکی تھیں۔ ان کے چہرے پر بڑی عجیب سی مسکان سجی تھی اور اماں کی آنکھیں گہرے رنگوں میں ڈوب گئی تھیں۔

(ب)

پوجا......اور مرد

''اماں، کھڑکی کھل گئی ہے۔''

مسز گروور پھر چیخیں...... ''کمبخت، اسٹول پر ٹھیک سے کھڑی رہ، گر جائے گی......ہاں، تو با وہاں کیا ہو رہا ہے؟''

تانیہ مڑی، ہونٹوں پر انگلی رکھی...... ''شی! کوئی آ رہا ہے......ارے وہی ہے اماں۔ کل والا آدمی۔''

''اکیلا ہے؟''

''ہاں۔''

''آج بھی کوئی عورت نہیں؟''

''نہیں۔''

''نوج! یہ مرد ہمیشہ سے اکیلے ہوتے ہیں۔ بیوی بچے، پورا پریوار ہو تب بھی اکیلے ہوتے ہیں...... اب ٹکر ٹکر میرا منہ کیا دیکھ رہی ہے...... کیا کر رہا ہے وہ......؟''

تانیہ مسکرائی ''ہاتھ میں اگربتی ہے...... شیوجی والی اگربتی...... پوجا کر رہا ہے......''

''پو......جا......'' مسز گروور زور سے ہنسیں۔ ''اچھا چل۔ ناس پیٹی۔ اسٹول سے اتر آ......'' وہ اب بھی ہنس رہی تھی۔

''یہ مرد پوجا وجا کیا جانیں...... ضرور اپنے پاپ دھو رہا ہوگا۔''

(شیڈ-2)

اس کے لئے پوجا کیا ہے یہ تو وہ اسی رات جان گئی تھی...... شادی والی رات شاید اس کے لئے زندگی کی سب سے بھیانک رات تھی...... وہ آدمی...... اس آدمی کو شوہر کے طور پر قبول کرنا بس اس کی مجبوری ہے ورنہ اسے تو پل دو پل ڈھنگ سے دیکھنا بھی خود پر ظلم کرنا تھا۔ مجبوری یہ تھی کہ وہ اس گھر سے آئی تھی جہاں ہاتھ تنگ ہوتے ہیں اور لڑکیاں بھاری۔ کسی بدنصیب لمحے میں اگر قسمت نے اسے اس آدمی کو سونپ دیا تھا تو اس میں کسی کی بھی غلطی نہیں تھی۔ ہاں! بدقسمتی سے یا شاید یہ عمر کا تقاضہ تھا کہ کچھ حسین سے سپنے پلّو میں بندھے رہ گئے تھے۔ ان سپنوں کی موت پر اسے ضرور رونا آیا تھا۔

شادی والی رات، وہ پو پھٹنے سے پہلے ہی بستر چھوڑ کر اٹھ بیٹھا...... وہ جائزہ لیتی رہی...... اس نے کوئی نوٹ بک نکالی تھی۔ لیمپ کی روشنی میں وہ کسی قسم کے حساب کتاب میں لگا ہوا تھا۔ ایک انتہائی حسین رات —— وہ اس رات بھی اس قدر اکتا دینے والا کام ——

''کیا کر رہے ہو؟''

''کچھ نہیں۔'' اس کے جواب میں روکھا پن تھا۔ بزنس کا کچھ حساب کتاب رہ گیا تھا۔ تم سو جاؤ۔''

یہ آدمی۔ اسے اس آدمی کی جمالیاتی حس پر غصہ آرہا تھا۔ کم سے کم اس رات تو اسے اس عورت کو جی بھر کر دیکھنا چاہئے تھا، جس کو اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مگر جیسے، وہ ان سب باتوں سے بے نیاز تھا...... سپنے کرچیوں کی صورت اندر ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہے تھے...... ایسے آدمی کے ساتھ، ایسے آدمی کے ساتھ، جہاں خواہشیں نہیں ہوں، خواب نہیں ہوں۔ بس ایک

روٹین لائف والا جانور رہو ہو......ایک چھوٹی سی زندگی کیسے کیسے سمجھوتوں کی نذر ہو جاتی ہے۔
شاید عورت بہت چھوٹی چھوٹی چیزوں میں بھی خوشیوں کا جواز ڈھونڈ لیتی ہے۔ جیسے اسے بتایا جائے کہ اس نے جو پہن رکھا ہے وہ کیسا ہے۔ یا وہ کیسی لگ رہی ہے۔ یا اس میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لی جائے۔ اسے کریدا جائے۔ مگر یہاں تو......اس کا واسطہ ایک پتھر سے تھا...... اور وہ بس کام سوتر کا کوئی مبہم سوتر بن کر رہ گئی تھی جسے کسی کسی رات، نئے طرح سے بوجھنے کی واتسیاین کی خواہش بڑھ جاتی تھی۔ بس......کام، بزنس اور پیسہ...... اسے پوجا وغیرہ کے کاموں میں ذرا دلچسپی نہیں تھی۔ ہاں، تب اس دن...... جب سبودھ پیدا ہوا تھا۔ وہ ہون کا سامان اور پنڈت کو لے کر آیا تھا اور حد سے زیادہ خوش تھا۔

اسے تعجب ہوا......''تم......تم یہ بھی کر سکتے ہو!''

''کیوں؟''

''نہیں، مجھے لگتا تھا......''

''ہر کام وقت پر اچھا لگتا ہے......''

''اگر ہوتی تو......؟''

''تو دیکھا جاتا......'' وہ ٹھہرا، پھر بولا......''تو کیا......تب بھی پوجا کرواتا۔ اب میں اتنا بھی گیا گزرا نہیں ہوں''......دوسرے ہی لمحے وہ اپنے رنگ میں واپس آ چکا تھا......''اب زیادہ بک بک مت کرو۔ پنڈت جی آئے ہیں، ان کی سیوا میں لگ جاؤ۔''

اس رات وہ کافی دیر سے آیا۔ آدھی رات گئے دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھلا تو سامنے وہ نشے میں دھت کھڑا تھا۔

''پی کر آئے ہو؟''

''ہاں۔''

''کہاں گئے تھے؟''

وہ غصے میں بے ہودہ انداز میں چیخا......''بتانا ضروری ہے کیا؟''

''ہاں، اس لئے کہ اب تم اکیلے نہیں ہو گھر میں......'' کہتے کہتے وہ رک گئی تھی۔

اس نے لڑکھڑاتے ہوئے ہاتھ اٹھایا تھا مارنے کے لئے ــــ ''کمینی کہیں کی۔ جرح کرتی ہے۔ جیسے وہ صرف تیرا ہی بیٹا ہے۔ ارے میرا بھی ہے، تبھی تو جشن منا کر آیا ہوں......''

''جشن؟'' وہ سہم کر پیچھے ہٹی تھی۔

''ہاں جشن۔'' وہ لڑکھڑانے کے باوجود نارمل لگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''دوست اس خوشی میں کھینچ کر لے گئے تھے...... ناچنے والی کے پاس...... لیکن دیکھو میں چلا آیا......''

وہ بستر پر اوندھا گر گیا۔ جوتے تک نہیں اتارے...... اس کے کپڑوں سے تیز بدبو اٹھ رہی تھی اور اس کا سر بری طرح جھنجھنا رہا تھا۔ ناچنے والی کے پاس؟ نہیں کم سے کم آج کی رات...... وہ اس آدمی کے ساتھ بیڈ شیئر نہیں کر سکتی...... وہ اس بستر پر اس کے پاس پاس نہیں لیٹ سکتی۔

تبھی بچے کے چیخ کر رونے کی آواز آئی۔ اس نے بچے کو گود میں اٹھایا اور تیزی سے دوسرے کمرے میں آ گئی۔

(شیڈ-2 ختم)

مسز گرودوراچانک زور زور سے ہنسنے لگیں۔ تانیہ نے گھبرا کر ان کی طرف دیکھا۔ ''کیا بات ہے اماں......؟''

''نہیں، کچھ نہیں۔ یہ مرد......'' وہ اب بھی زور زور سے ہنسے جا رہی تھی...... ''تجھے کیا معلوم، مرد کو کسی بات کا ہوش نہیں رہتا۔ مرد...... مرد ہوتا ہے۔ اس کی ہر ادا میں سنگیت ہے۔ ہر سُر میں سادھنا۔''

تانیہ کو جھٹکا لگا تھا۔ ''اب یہ نئی بات کہہ رہی ہو تم اماں۔''

''پگلی۔'' اماں کو غصہ آیا۔ ''مرد کو سمجھنے کے لئے تجربہ چاہئے اور تجربے کو عمر۔ تو کیا جانے کمبخت۔''

مسز گرودور چپ تھیں، جیسے پرانی کہانیوں کی بارش نے انہیں پوری طرح بھگو دیا ہو۔ ''سچی بات ہے...... مرد کے ہر انداز میں نشہ ہے لیکن یہ بات کتنی دیر بعد سمجھ میں آتی ہے......''

''وہ مارتا بھی تھا؟''

تانیہ کی بات پر مسز گرودور غصے میں جھپٹیں...... ''حکومت کرنے والا بادشاہ ہوتا ہے۔ باقی لوگ رعایا۔ جو حکومت کرتے ہیں انہیں مارنے کا بھی حق ہوتا ہے۔ مرد فطرتاً حاکم ہوتے ہیں۔''

''اور چیخنا چلانا؟''

''یہ سب بادشاہوں کی طبیعت میں شامل ہے......''

''اور روکھا پن؟''

''یہ مرد کی فطری ادا ہے۔ ارے یہی خوشبوئیں تو......''

مسز گرو ور کہتے کہتے ٹھہریں، پھر چیخیں...... ''تو یہ سب کیوں پوچھ رہی ہے...... باؤلی ہوئی ہے؟ کمبخت کام کی نہ کاج کی...... چل بھاگ یہاں سے......''

وہ ابھی تک اس بے رحم جلاد کی خوشبوؤں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

(ج)

مرد کی خوشبوؤں کے کچھ اور رنگ

''اب کیا ہے؟ بتاتی کیوں نہیں؟''

''ٹھہرو...... دیکھنے تو دو...... وہ تین ہیں۔''

''تین ہیں...... یہ کیا؟ کبھی گھٹ جاتے ہیں، کبھی بڑھ جاتے ہیں؟''

''شی......'' تانیہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھی...... وہ غصے میں ہیں، اور آپس میں جھگڑ رہے ہیں۔ وہ تیز تیز باتیں کر رہے ہیں......''

''جھگڑ رہے ہیں......؟''

''ہاں، اور شاید ان میں سے ایک، جو کل پوجا کر رہا تھا اس کی...... آنکھوں میں آنسو ہیں......''

''اے لڑکی۔''...... مسز گرو ور گمبھیر لہجے میں مخاطب تھیں۔ ''دوسروں کے پھٹے میں پاؤں نہیں ڈالتے۔ چلو اتر آؤ۔ اور لڑکی...... کیا دیکھا تم نے...... وہ مرد...... کیا کہا...... رو رہا تھا؟ کمبخت ان مردوں کو تو، کبھی ڈھنگ سے رونا بھی نہیں آیا...... چلو اسٹول ٹھیک سے تھامو۔ اور نیچے اتر آؤ۔''

(شیڈ-3)

وہ سمجھ نہیں پارہی تھی، آخر اس آدمی میں کہیں تو محبت کی کوئی کونپل چھپی ہوگی، کہیں کسی گوشے میں۔ کبھی تو وہ محبت کی اس کونپل کو باہر لانے کی کوشش کرے گا۔ عورت کیلئے ماں بننا ایک عجیب سا تجربہ ہے ـــــ اپنے جسم سے اپنے ہی جیسے گوشت کے لوتھڑے کا باہر نکل آنا۔ پھر اس کی اٹھکھیلیوں کو دیکھنا...... ایک خوشگوار حیرانی...... کبھی کبھی وہ چھٹپٹا کر رہ جاتی۔ بہت ہوتا تو اس کے جنگلی پن سے واقف ہونے کے باوجود سوال کر بیٹھتی۔

''کیسے آدمی ہو تم؟''

''کیوں؟'' اس کے لبوں پر غصے کی پپڑیاں جمی ہوتیں۔

''بچہ بڑا ہو رہا ہے۔''

''سارے بچے بڑے ہوتے ہیں۔''

''لیکن یہ سارے بچوں میں سے نہیں ہے۔ یہ تمہارا...... تمہارا اپنا خون ہے۔'' وہ غصے میں چیختا...... ''تو کیا یہ کسی اور کا بھی خون ہو سکتا تھا......؟''

''نہیں...... میرا مطلب ہے...... شاید اپنے بچے کو اس طرح بڑے ہوتے دیکھنا...... اپنے آپ میں...... تم سمجھ رہے ہو نا، میں کیا کہنا چاہتی ہوں؟''

''ہاں! اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ تمہارے پاس کام نہیں ہے۔ خالی دماغ پڑا ہے، دن بھر اوٹ پٹانگ باتیں سوچنے کے لئے......''

''زندگی کس لئے ہوتی ہے؟'' وہ اپنے آپ سے کہتے ہوئے ٹھہر جاتی۔ مگر زندگی اور زندگی سے جڑی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کی اسے پرواہی کہاں تھی...... ایک بے حد اوجڈ اور وحشی انسان۔

سپنوں کے پت جھڑ کے دن جیسے اب دور ہو چکے تھے۔ اب ایک بچہ تھا اس کے پاس۔ اور بچہ بڑا ہو رہا تھا۔ بچے کے پاس اڑانیں تھیں۔ بچے کے پاس سپنے تھے...... اور اس بچے میں ایسا بہت کچھ تھا، جو صرف اسی کا تھا، جو اس کے شوہر کا نہیں تھا۔

پھر بچہ اسکول جانے لگا۔ بچے کے اسکول جانے کا مطلب اس کے نزدیک بس اتنا تھا...... کاپیاں، کتابیں لے آنا...... فیس جمع کر دینا۔ کبھی کبھی کتاب یا کاپی کھو جانے پر اسے ڈانٹ دینا یا تھپڑ مار دینا۔

ایک بار سمجھانے کے خیال سے وہ اس کے بہت پاس کھسک آئی۔

''سنو......؟''

''کیا ہے؟''

''بچہ کچھ اور بھی چاہتا ہے۔''

''کیا؟''

''ہاں، کچھ اور...... مثلاً یہ کہ ہر اچھی بری بات اس سے شیئر کی جائے۔ اس کے بھولے بھالے معصوم سوالوں کا جواب دیا جائے...... اسے نظر انداز نہیں کیا جائے۔ اسے وقت دیا جائے۔ کبھی کبھی اسے پکنک پر بھی لے جایا جائے...... اور کبھی کبھی......'' ''میرے پاس اتنا فالتو وقت نہیں۔''

وہ دیر تک غور سے اس جنگلی آدمی کا چہرہ پڑھتی رہی...... تو باپ کے پاس وقت نہیں تھا اور بیٹا اس سے ڈرتا تھا۔ بیٹے کو بہت زیادہ اس کی موجودگی پسند نہیں آتی تھی۔ بیٹا اپنے ایسے ہی باغی خیالات کو لے کر بڑا ہو رہا تھا اور ایک دن بڑے ہونے پر بیٹے کی حرکتوں سے لگا۔ اس میں چاہت کی کونپلیں پھوٹنے لگی ہیں...... بیٹے کی حرکتیں ہی کچھ ایسی تھیں، اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔ کبھی کبھی بیٹھے بیٹھے وہ خیالوں میں گم ہو جاتا تھا۔ اسے بھوک نہیں لگتی تھی۔ وہ صبح سویرے ہی گھر سے نکل جاتا تھا اور ایک دن اس کی کتابوں سے ایک لڑکی کی تصویر بھی نکل آئی تھی۔

''کون ہے یہ؟'' اس کے لہجے میں اپنے پن کی مٹھاس تھی۔

''تمہیں کہاں سے ملی؟'' بیٹے کو چوری پکڑے جانے کا احساس تھا۔

''کہیں سے بھی۔ لیکن یہ ہے کون؟''

''کوئی ہے۔''

''لیکن کون ہے؟''

بیٹے کی آنکھوں کی چمک بجھ گئی تھی...... ''کوئی ہے، جو اس گھر میں نہیں آسکتی۔ سنا ماں! اس گھر میں نہیں آسکتی!''

''لیکن کیوں؟'' وہ ایک دم سے چونک گئی تھی۔

''کیونکہ...... تم اچھی طرح جانتی ہو ماں!''

''میں کچھ نہیں جانتی۔'' اس کے رگ و پے میں ابھی بھی ہلکی ہلکی سرسراہٹ ہو رہی تھی۔

''یہ گھر...... یہ گھر نہیں ہے۔ یہ گھر کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ اس گھر کا ماحول بوجھل ہے۔

یہاں......محبت نہیں ہے......''

بیٹا اس جملے کے بعد ٹھہرا نہیں۔

○○

شوہر کے آنے کے بعد وہ خود کو روک نہیں پائی۔

''سنا وہ کیا کہہ رہا تھا؟''

''کیا؟''

''وہ......اسے احساس ہے کہ اس گھر میں......''

شوہر کی آنکھیں غصے سے پھیلی ہوئی تھیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ چیخا تھا......کیا، یہ عشق کی عمر ہے اس کی......اسے وہی سب کچھ کرنا ہے جو میں......''

''وہ ایسا کچھ نہیں کرے گا جو تم کر رہے ہو۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ اسے تمہاری طرح نہیں بننا ہے۔'' وہ پہلی بار اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چیخی تھی......''وہ آدمی بننا چاہتا ہے اور آدمی آدمی ہوتا ہے، آدمی کے پاس وقت ہوتا ہے۔ آدمی کے پاس احساس اور جذبات ہوتے ہیں۔ آدمی عشق بھی کرتا ہے۔ آدمی عشق کو سمجھتا بھی ہے......اور مجھے کہہ لینے دو، تم یہ سب نہیں جانتے، بالکل نہیں جانتے۔''

وہ جانے کو مڑی تو دروازے کے پاس بیٹے سے ٹکرا گئی۔ بیٹے کا چہرہ پُرسکون تھا پتھر کی طرح۔

''آؤ ماں۔'' بیٹے نے اس کے کانپتے ہوئے وجود کو سنبھالا تھا۔ شوہر نے پلٹ کر دیکھا لیکن اس بار......وہ کچھ نہیں بولا۔ بس سوچتا رہا اور سوچتے سوچتے وہیں صوفے پر بیٹھ گیا۔

دوسرے ہی روز رات میں اس نے اپنے شوہر کو دیکھا——وہ فکرمند لگ رہا تھا۔ وہ بار بار ٹہلنے لگتا تھا۔ اسے احساس تھا وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ مگر وہ اپنی عادت سے مجبور تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ ٹھہرا۔ وہ اس کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ وہ اس کی جانب سے مڑا۔ اس کے لہجے میں نرمی تھی۔

''سنو۔اس سے کہہ دو۔وہ جو کچھ کرنا چاہتا ہے کرے۔مگر ابھی نہیں۔''

''کیا؟''

''وہ لڑکی......تم نے بتایا تھا نا......کہہ دینا مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے مگر ہر کام وقت پر ہونا چاہئے۔''

وہ واپس بستر پر آگیا تھا۔اس نے آنکھیں بھی نہیں ملائیں۔اوندھے لیٹ گیا اور کچھ ہی دیر بعد اس کے خراٹے گونجنے لگے۔

''کیسا آدمی ہے یہ؟'' وہ غور سے اس کے بدنما بالوں کے گچھوں کو دیکھتی رہی، شاید صرف اتنا کہنے کے لئے ہی اس نے اتنی محنت کی تھی۔مگر یہ آدمی۔آخر بیٹے کے لئے اتنا نرم کیسے ہوگیا؟

وہ آج تک نہیں سمجھی......

پھر جیسے دھوپ سرکتی ہے......جیسے موسم بدلتے ہیں، جیسے برس پر برس گزرتے ہیں......بیٹا بہولے آیا۔پھر تانیہ ہوئی۔اس میں ابھی بھی کوئی فرق نہیں تھا......وہ ویسا ہی جنگلی تھا۔وحشی......سرپھرا، روٹین لائف والا جانور......پھر ایک دن......تانیہ کو چھوڑ کر بہو بیٹا گاڑی سے جا رہے تھے......کہ وہ حادثہ پیش آگیا۔

OO

وہ بیتے دنوں کو یاد نہیں کرنا چاہتی تھی۔جیسے دنیا ہی ایک دم سے پلٹ گئی ہو۔کسی بھیانک سپنے کی طرح وہ اس منظر کو بھول جانا چاہتی تھی......اسے بس اتنا یاد ہے......اس کے چہرے کی سیاہی اور بڑھ گئی تھی۔وہ معصوم سی، ننھی سی تانیہ کو قصوروار مان کر چل رہا تھا......لیکن لفظ لفظ باہر نہیں آرہے تھے۔گھر میں مزاج پرسی کے لئے آنے والوں کی بھیڑ بڑھنے لگی تھی۔

پھر رات ہوئی، باہر ضرور کتے رو رہے ہوں گے۔ہلکی بارش بھی ہوئی ہوگی۔اسے احساس تھا۔سڑک سنسان اور ڈھلی ہوگی۔وہ بچوں سے اپنا دھیان ہٹانا چاہتی تھی۔اس نے دیکھا، اس کا شوہر اٹھا......دھیرے سے......اس رات......وہ اس رات کو کبھی نہیں بھول سکی۔وہ رات اسے اپنے بچوں کی موت کے لئے نہیں، بلکہ اس منظر کے لئے یاد رہ گئی تھی۔

کمرے میں تاریکی تھی۔یقیناً اسے احساس تھا کہ اسے کوئی نہیں دیکھ رہا ہے۔دھیرے دھیرے وہ ننھی تانیہ کی طرف بڑھا۔اس نے دیکھا......سوئی ہوئی تانیہ کو اس نے بڑے پیار سے

اٹھا کر سینے سے لگالیا ہے۔ وہ سسکیاں لے رہا ہے مگر چوروں کی طرح سسکیوں کی آواز دھیرے دھیرے تیز ہو رہی ہے۔ حالانکہ وہ ان آوازوں کو اندر ہی روکے رکھنا چاہتا ہے۔ لیکن کیوں؟

کچھ دیر تک تانیہ کو سینے سے لپٹائے رہنے کے بعد اس نے اپنے آنسو پونچھے...... تانیہ کو پھر وہیں سلایا اور دوبارہ اپنے بستر پر آ گیا۔

اس کے بعد وہ زیادہ تر اداس رہا۔ لیکن اس کی فطرت نہیں بدلی تھی۔ اس کے بعد وہ زیادہ دن زندہ بھی نہیں رہا۔

(شیڈ-3 ختم)

تانیہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''تم نے یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی اماں؟''

مسز گرو ور اپنی نم آنکھوں کو پونچھتی ہوئی ہنس رہی تھی۔ ''کمبخت! اتنا ساتھ رہنے پر بھی ایک مرد...... مرد کو نہیں سمجھ سکی......''

ان کے چہرے پر اب بھی مسکان پھیلی ہوئی تھی۔

''لوگ عورت کو پہیلیاں کہتے ہیں۔ لیکن...... پہیلیاں تو مرد ہوتا ہے...... اس کے وجود کا کھردرا پن اپنے آپ میں ایک پہیلی ہے اور اس کھردرے پن میں جو نرمی ہے، وہ...... وہ عورت کہاں سے لائے......؟''

تانیہ حیرت زدہ ان کے چہرے کو تکے جا رہی تھی۔

مسز گرو ور چلائیں ـــــ ''پاگل لڑکی، میرا منہ کیا دیکھ رہی ہے۔ جا جا کر کچھ کام کر؟''

تانیہ غصے سے بولی۔ ''اماں، تم نے ہی تو بلایا تھا......''

''ہاں ـــــ'' مسز گرو ور کے لفظوں میں ٹھہراؤ تھا ـــــ ''بلایا تھا تو جانے کو بھی تو میں ہی کہہ رہی ہوں۔ زبان دراز لڑکی......''

پھر وہ دیر تک گالیوں سے اسے نوازتی رہیں۔

(د)

آخری منظر

''ہاں، کیا ہے، بولتی کیوں نہیں؟''

''اماں...... وہ سامنے......''

''ہاں، بتانا کیا ہے...... یہ گردن اُچکا اُچکا کر کیا دیکھ رہی ہے، ٹھیک سے کھڑی رہ۔ اسٹول گر جائے گا۔''

''شی......'' تانیہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔

''وہی ہے کل والا آدمی...... جو رو رہا تھا......''

''اکیلا ہے؟''

''نہیں......''

''تو بول نا۔ وہی پہلے والے دو لوگ نہیں؟''

''نہیں اماں۔ تم ٹھیک سے دیکھنے بھی نہیں دیتیں......''

''تو دیکھ۔'' مسز گروور کو غصہ آ گیا تھا۔

''اس کے ساتھ ایک......؟ ایک عورت ہے۔''

''عورت؟''

''ہاں اماں، آج اس کے ساتھ ایک عورت بھی ہے۔''

مسز گروور کی آواز کہیں پھنسنے لگی تھی...... ''اور کیا ہو رہا ہے؟''

'وہ دونوں شاید جھگڑ رہے ہیں۔ مرد عورت کو ڈانٹ رہا ہے۔ غصّے میں تیز تیز بول رہا ہے۔'

''نگوڑی۔ خیر، تو اسٹول سے اتر آ۔ تیرا اور کوئی کام نہیں ہے کیا؟ جب تب تاک جھانک کرتی رہتی ہے۔ جا میرے لئے کھانا لے کر آ جا۔ بڑی زور سے بھوک لگ رہی ہے......''

تانیہ نے گھور کر مسز گروور دیکھا اور ایک جھٹکے سے اسٹول سے کود گئی۔

''ٹھیک سے، سنبھل کر...... کمبخت ماری......''

تانیہ نے جیسے آگے کچھ سنا ہی نہیں۔ وہ اماں کے لئے کھانے کی تھالی لانے چل دی۔

ہاں، تھالی لے کر واپس آتے ہوئے ایک عجیب سا منظر سامنے تھا۔ اماں کسی طرح اسٹول پر چڑھنے میں کامیاب ہو گئی تھیں اور گردن اُچکا اُچکا کر سامنے والے فلیٹ میں کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

○○○

صدی کو الوداع کہتے ہوئے......

(1)

''لیکن اس کا حل کیا ہے؟''

پاپا کی آنکھوں میں الجھن کے آثار تھے، لہجے سے جذبات غائب ــــــ چہرہ ذرا سا سکڑ گیا تھا۔

ماں کے رویے میں کھو کھلے قسم کی سختی تھی ــــــ ''آنے والے مہمان کو آنے ہی نہیں دیا جائے...... یعنی......''

یہ ایک دوٹوک فیصلہ تھا ــــــ

''لیکن کیا ریا تیار ہو جائے گی ــــــ ؟''

پاپا کے ماڈرن ہونے کی آزمائش ابھی بھی برقرار تھی ــــــ

اچانک پیدا ہونے والی اس کشیدہ صورت حال میں الگ الگ سطح پر تینوں ہی جکڑ گئے تھے۔ ماں، پاپا اور ریا!

(2)

ریا ان بچیوں میں سے نہیں ہے جو کچھ دنوں پہلے تک عصمت چغتائی تک کی کہانیوں میں موجود ہوا کرتی تھیں ــــــ الہڑ، شرارتی، گڈے گڑیوں کا کھیل کھیلتی ــــــ دھاگے سوئی سے انگلیاں چھید لینے والی ــــــ ہوا کے دوش پر لہراتی اڑتی ہوئی ــــــ شادی بیاہ میں مراثنوں کے بیچ ڈھولک پر تال دیتی ہوئی ــــــ کسی ننھے منے بچے کو گود میں لپکتی ہوئی، جس پر بڑی بوڑھیاں آواز بھی کستیں ــــــ ''ارے، ابھی تو تم خود ہی بچی ہو، بچہ ہاتھ سے چھوٹ گیا تو ــــــ '

مگر، اسی بات کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ اسے ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ریا ان بچیوں میں سے ایک ہے جو کچھ دنوں پہلے تک ہماری کہانیوں میں موجود ہوا کرتی تھیں۔ عصمت چغتائی تک کی کہانیوں میں ـــــ شرم سے آنچل کا کونا دانتوں میں دابے ہوئے ـــــ یا ہرنی کی طرح قلانچیں بھرنے والی ـــــ خرگوش جیسی نرم اور پھدکنے والی ـــــ ٹپ سے کسی بات پر آنکھوں میں آنسو لے آنے والی ـــــ چھت پر پتنگوں کے موسم میں پیچ لڑانے والی اور کسی پسند آجانے والے لڑکے پر سو سو جان سے فدا ہونے والی ـــــ اسے چپکے چپکے تنہائی میں خط لکھنے والی...... کسی کے آنے کی آہٹ سے ڈر جانے والی ـــــ

کیا ریا کے بارے میں ایسا کہا جانا صحیح ہے ـــــ؟ شاید نہیں (یہاں ایک قلم کار کی حیثیت سے میں اپنا اعتراض درج کرانا چاہوں گا) ـــــ ریا، دادی نانی سے چپکی، طلسماتی کہانیاں سننے والی ریا، نہیں ہے۔ یہ ریا آج میں جنمی ہے۔ اس بدلے ہوئے وقت میں (اور بطور قلم کار پھر میں مداخلت کے لئے معافی چاہوں گا) کوئی وقت آج کی طرح نہیں ہے ـــــ اچھا برا کہنے والا میں کون ہوتا ہوں ـــــ لیکن ان تین کروڑ برسوں میں یا شاید جیسا اب ہے، کوئی ریا خرگوش جیسی نرم اور ہرنی کی طرح قلانچیں بھرنے والی نہیں ہو سکتی ـــــ

(3)

تب ریا چھوٹی تھی۔ ایک سپنا دیکھا تھا اس نے۔ بہت سے گھوڑے ہیں اور ایک اندھیری سرنگ، گھوڑوں کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہیں۔ گھوڑے بے تحاشہ بھاگ رہے ہیں۔

''میں نے ایسا کیوں دیکھا کہ گھوڑوں کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہیں؟'' ریا کی آنکھوں میں سوال تھے۔

''کیا وہ گھوڑے اڑ رہے تھے؟''

''ہاں ہوا میں اڑ رہے تھے۔''

''خوب مضبوط تھے اور جوان تھے؟''

پاپا مسکراتے ہوئے اس کی طرف مڑے ـــــ کیوں کہ یہ تم تھیں ریا۔ اتنا تیز مت بھاگو۔ گھوڑوں کی آنکھوں پر پٹیاں اس لئے بندھی تھیں کہ وہ سرنگ کی دیواروں سے ٹکرا نہ جائیں۔''

(4)

وہ کالونیوں میں جمے تھے اور اپنی تہذیب اپنے ساتھ لائے تھے۔ وہ 'برانڈوں' کی دنیا سے تھے یا پیدا ہوتے ہی وہ برانڈ بن جاتے تھے۔ وہ اپنی اپنی چہار دیواری میں قید تھے یا کہنا چاہئے اپنے اپنے بیڈروم میں، اپنے اپنے ڈرائنگ روم میں، وہ .M.T.V کلچر کے ساتھ اپنا سفر شروع کر رہے تھے۔

مان لو کوئی کہتا ہے کہ.. (جرمن ادیب ہرمن ہیسے کے لفظوں میں) ایک چڑیا انڈے سے جنم لینے والی ہے۔ انڈا کائنات ہے جو جنم لینا چاہتا ہے، اسے ایک دنیا کو تباہ و برباد کرنا پڑے گا۔

قارئین! معافی چاہوں گا۔ اس کہانی کا انداز دوسری کہانیوں جیسا نہیں ہے۔ ہو بھی نہیں سکتا۔ جیسے ہم صرف اس بات سے مطمئن نہیں ہو سکتے کہ یہ دنیا بدل رہی ہے۔ صرف بدل رہی ہے، کہنے سے چڑیا اور انڈے کا وہ تصور سامنے نہیں آتا۔ اس لئے کہ چڑیا انڈے سے باہر نکلنے کے لئے جدوجہد کر رہی ہے اور انڈا دنیا ہے۔ جنم لینے والے کو، اس دنیا کو توڑنا ہوگا۔

اور جیسا کہ ہیسے نے ڈیمیان' میں 'سنکلیر' کو بتایا...... پرانی دنیا کا زوال نزدیک آرہا ہے۔ یہ دنیا نئی شکل لے گی۔ اس میں سے موت کی مہک آرہی ہے۔ موت کے بغیر کچھ بھی نیا نہیں ہوگا۔ جنگ ہوگی۔ تم دیکھو گے کہ چاروں طرف کیسا ہیجان بپا ہے۔ لوگوں کو مزہ آئے گا۔ یکسانیت سے اوب کر لوگ مارکاٹ شروع ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔ دراصل نئی دنیا کی شروعات ہو چکی ہے اور یہ بات ان کے لئے بھیانک ہوگی جو پرانی دنیا سے چپکے ہوئے ہیں۔

تو قارئین! یہ کوئی بہت مسرت انگیز خبر نہیں ہے۔ 31 دسمبر کی رات، جب ایک گھنا کہرا آسمان پر چھایا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اپنے اپنے کمروں، ہوٹلوں، بار اور ڈسکوتھیک میں بند لوگ نئے سال کے استقبال کے لئے جشن کی تیاری کر رہے تھے ــــــ بیسوی صدی کے اختتام کے اس گھنے کہرے نے مسٹر ارجن دتیہ کار اور ان کی ماڈرن بیوی رما دتیہ کار کو یہ خبر سنائی تھی ــــــ کہ ان کی چودہ سالہ لڑکی ریا ایک بچے کی ماں بننے جا رہی ہے۔

(5)

پہلے یہ 'دنیا' ویسی نہیں تھی۔ ظاہر ہے، ہماری کہانی کی ہیروئن ریا کے پاپا ارجن دتیہ کار

کو اس دنیا کے لئے جدو جہد کرنی پڑی تھی۔ پہلے سب کچھ تھوڑا تھوڑا سا تھا ان کے پاس۔ تھوڑی سی آرزو، تھوڑی سی خواہش، تھوڑی سی زمین، تھوڑا سا آسمان، تھوڑا سا مذہب اور تھوڑا سا سوشلزم۔ پہلے تھوڑے سے سپنے تھے۔ پھر یہ یکا یک بڑے ہونے لگے۔ ٹھیک ان کے نام کی طرح دیتیہ کار۔ کمپیوٹر کے چھوٹے چھوٹے پارٹ پرزوں سے اپنا کام شروع کیا تھا۔ ہاں، شاید اس سے پہلے تک ماضی کی 'فلاپی' میں جو کچھ بھی تھا وہ 'ڈیلیٹ' کیا جا چکا تھا۔ ہاں اس کے بعد نئے حالات اور نئے موسم نے جو 'فلاپیاں' بنائی تھیں، مسٹر دیتیہ کار نے انہیں ذہن میں محفوظ کر لیا تھا۔ ایسی ہی ایک 'فلاپی' میں مسٹر نیلا مبر بھی قید ہیں ـــــ مسٹر نیلا مبر جو پی سی ایل کمپنی کے 486 ماڈل کمپیوٹر ماہانہ قسطوں پر بیچنے والی کمپنی میں کسی اہم عہدے پر فائز تھے اور ریا کو ایک جگہ پارٹی میں دیکھ کر (ایسا دیتیہ کار کا خیال تھا) دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا یا کہنا چاہئے گھر میں بھی آنا جانا شروع کر دیا تھا ـــــ جو ابتدائی دنوں میں مسٹر دیتیہ کار کو پسند نہیں آیا تھا اور ان باتوں کو دیتیہ کار نے صرف اس لئے گوارا کیا تھا کہ نیلا مبر کی دوستی سے انہیں اپنے بزنس میں فائدہ ملنے کی امید بندھ گئی تھی۔

نیلا مبر کی دوستی نے چاہے کچھ اور نہ کیا ہو، لیکن ان کے اندر دبے ہوئے خوابوں کی پھلجھڑی میں ماچس کی ایک چھوٹی سی جلتی تیلی سلگا دی تھی۔

نیلا مبر کی نو دولتیہ لوگوں سے دوستی تھی۔ وہ ان سے مل کر آتا تو کافی نئی نئی معلومات فراہم کرتا۔ جیسے...... مصر کی سیر کرنا چاہئے، دریائے نیل میں کشتی بانی، جبل سینا پر چڑھائی۔ اسی سے معلوم ہوا کہ 'ہوانا' سگار پینے کا ایک الگ ہی مزا ہے۔ 'کوہبا' رومیو جولیٹ، بولیوا اینڈ پنچ جیسے برانڈ پیتے ہوئے کوئی بھی رئیس آپ کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے ـــــ جیسے نیویارک میں 'بالتھ زار' میں لنچ یا ڈنر کرنا ـــــ یا پھر مین ہٹن کے مراقشی ریستوراں 'چہ زادہ' میں اپنی من پسند چیزیں کھانا ـــــ مثلاً آپ کے پاس پرانی شراب 'اسپرنگ بیک' ہو جو کسی بھی شوقین رئیس کو پسند ہو سکتی ہے اور پہناوے کے لئے ڈیزائنر ٹوم فورڈ کے ڈیزائن کئے گئے بیگ، جوتے، پوشاک یا بیلٹ آپ کے پاس ہوں۔ یعنی نیلا مبر کے پاس آئیڈیل کے روپ میں ایک ایسی زندگی تھی جسے دولت کی گھن گرج سے ہی خوبصورت بنایا جا سکتا تھا۔ مثلاً برادری میں رعب جمانا ہو تو بچوں کو لیزلس کے ذریعے سوئزرلینڈ کے 'بروبئے' میں چلائے جانے والے شیوروں میں چھٹیاں منانے بھیج دیجئے ـــــ ہو سکے تو اپنی بیوی کو بھی ـــــ اور یہاں اپنی من پسند چاہنے والی کے ساتھ کسی بی ایم ڈبلیو یا Luxes بہت تیز رفتار تارگا کیریر پورش یا ایکس ایس فور ایکس اسٹن میں زندگی کے مزے

لیجیے۔

دیتیہ کار کو ان دنوں شک ہوا تھا۔ 'کہیں تم نے بھی اپنی بیوی کو اپنے بچوں کے ساتھ......'

نیلامبر 'ہاہاہا' کر کے ہنسا ضرور لیکن دیتیہ کار کو نیلامبر کی آواز اتنی دبی دبی اور مرجھائی لگی جیسے اسی کے الفاظ میں، کسی نو دولتیہ کے 'بنکاک یا سوئیس' میں رکھے کھاتوں کے بارے میں سی بی آئی کو جانکاری مل گئی ہو ــــــ دوسرے الفاظ میں کرسٹل کا رابکارا (جواریوں کے ذریعے کھیلے جانے والے تاش کے پتوں کا کھیل) میں بازی ہاتھ سے نکل گئی ہو۔

شروع شروع میں دیتیہ کار کو احساس جرم سا ہوا تھا ــــــ یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا ہے۔ وہ بار بار یہاں کیوں آتا ہے؟

''تمہیں کیا الجھن ہے......؟ رما کسی ماہر نفسیات کی طرح مسکرائی تھی۔ اس کا ہر لفظ نپا تلا تھا۔''

''تمہیں بس مجھ پر شک نہیں کرنا چاہیئے۔ وہ اگر بے وقوف ہے، تو اسے روکنے کی بے وقوفی تمہیں نہیں کرنی چاہئے۔ اب جو زندگی تمہارے حصے میں آرہی ہے، وہ پہلے تمہارے پاس نہیں تھی ــــــ میری بات سمجھ رہے ہو نا ــــــ اور اس تبدیلی میں تھوڑا سا ہاتھ اس سن آف بچ نیلامبر کا بھی رہا ہے۔ وہ ہر بار کچھ نہ کچھ دے ہی جاتا ہے ــــــ ہیرے، زیورات......اور بدلے میں اگر تمہاری بیوی کی تعریف کرتا ہے تو سنو دیتیہ کار! مکمل طور سے بزنس مین بنو۔ اِف یو وانٹ تو اچیو سم تھنگ ان لائف......کچھ باتوں کو رد کرنا سیکھو......''

اچھی یا بری، صحیح یا غلط، جو بھی ہو۔ اس حادثے کے بارے میں جو اندازے لگائے جا رہے تھے اس کی شروعات اسی 'منطق' سے ہوئی تھی یا نیلامبر کے لفظوں میں نیویارک کی کسی بھیڑ بھاڑ والی سڑک پر رش ڈرائیونگ کرتی اس کی گاڑی اچانک ایک ساتھ بہت سی گاڑیوں سے ٹکرا گئی تھی۔

(6)

بچپن میں وہ رِیا سے کسی بات پر ناراض ہو جاتا تو رما اسے خاموش کر دیتی......

''بچوں کو ایک آزاد دنیا چاہئے۔ اس چھت کے نیچے۔''

دیتیہ کار خاموش ہو گیا۔ لیکن رِیا کو دی جانے والی آزاد دنیا کے پیچھے اسے بار بار یہ

احساس ہوتا رہا کہ اس کی اپنی دنیا چھن رہی ہے ـــــ یا یہ کہ سب کی الگ الگ دنیا بن رہی ہے ـــــ اس کی ریا کی اور رما کی ـــــ کبھی دیکھتا، ننھی منی ریا تیز میوزک سسٹم پر ایروبکس کرنے میں مصروف ہے۔ یا کسی کمرے میں نیلامبر، رما کو گپ چپ کچھ سمجھانے میں لگا ہے اور ایک بہت سمجھدار بیوی کی طرح رما، اسے روک کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

ہم آگے بڑھتے ہیں تو اس سے بھی آگے نکل جاتی ہیں ہماری خواہشات۔

یہاں یک لامحدود کائنات تھی جو رما کی آنکھوں میں سمائی ہوئی تھی۔ گلیمر سے بھرپور، وہ ریا کے سامنے ہوتی تو دیتیہ کار کو ڈر سا لگتا کہ وہ ریا کو کچھ سپنے دکھا رہی ہوگی یا خود سپنے دیکھ رہی ہوگی ـــــ آنکھوں میں اتری ہوئی ایک اندھیری سرنگ اور ہنہناتے، آنکھوں پر پٹی باندھے، دوڑتے گھوڑے......

دیتیہ کار کو ریا کا وہ سپنا ہمیشہ یاد رہا...... ہاں، گھوڑوں کے صرف تصور سے ہی وہ بار بار، جوناتھن سوفٹ، کے گھوڑوں سے موازنہ کرنے لگتا...... تم ہو کیا انسان! یہ تمہارے دبلے پتلے ہاتھ پاؤں...... مجھے دیکھو...... دیوتاؤں کی سواری...... گھوڑا کسی حکمراں کی طرح۔ غلام ومحکوم انسان کے سامنے فخر سے تن گیا تھا...... دیتیہ کار کو احساس ہے کہ گھوڑوں کے مقابلے میں انسان کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک لاچار بدقسمت، سپنوں پر منحصر رہنے والا۔

نیلامبر ہنستا ہوا کہتا ہے ـــــ ''ہم ریموٹ کلچر کے لوگ ہیں۔ گھر میں بہت سے لوگ ہیں تو سب اپنے اپنے پروگرام الگ الگ چینلوں پر دیکھنا چاہتے ہیں ـــــ سونی پر پروگرام پسند نہیں آیا تو ریموٹ کا بٹن دبا کر ZEE لگا دیا۔ زی پسند نہیں آیا تو M.T.V. 'اسپورٹ' V.T.V. اور ـــــ ریموٹ تو ہے نا...... شوہر پسند نہیں آیا تو شوہر بدل دو...... بیوی پسند نہیں آئی تو......''

''بچوں کا کیا کریں...... ریموٹ سے بچے نہیں بدلے جا سکتے؟''

دیتیہ کار پوچھتا ہے۔ نیلامبر اچانک چپ ہو جاتا ہے......

(8)

مگر نہیں، ارجن دیتیہ کار کی یہی مجبوری ہے ـــــ وہ سسٹم کے ساتھ بھی رہتا ہے اور قدم قدم پر اسے ریجیکٹ بھی کرتا رہتا ہے۔ سسٹم کا ساتھ نہ دے تو اندھیرا ہے اور سپنوں میں

ہنہنانے والے گھوڑے کسی اندھی سرنگ میں کھو جاتے ہیں — ساتھ دینے پر مجبور ہے تو...... کچھ کچھ اندر سے ٹوٹتا ہے — یعنی ایک سطح پر یا جس سطح پر وہ سسٹم کو منظوری دیتا ہے وہیں اس کی مخالفت میں اپنے ضمیر کا قتل بھی کرتا ہے یا قتل کی کوشش۔ دراصل وہ ایک زندگی (ہم اسے اذیت سے بھرپور نہیں کہیں گے) گزارنے کے لئے مجبور ہے...... جدوجہد کی قوت اس میں نہیں ہے۔

جیسا کہ دیتیہ کار نے سوچا تھا، اپنی جدوجہد کے دنوں میں ایک رومانی دنیا — ایک خوبصورت زندگی...... اور اس لئے سوچا تھا، کہ تب تک بند بند سے قصباتی ماحول میں بھی، تنگی اور بندشوں کے باوجود، پوری طرح محبت کے لئے وقف ایک حسین کائنات ہوا کرتی تھی — دکھ سکھ کا سنگم اس کے والدین، پھر ان کے والدین پھر ان کے اڑوس پڑوس، چاچا چاچی، تاؤ۔ زندگی کے دامن میں رومانی نظمیں یوں پسری ہوتیں جیسے آسمان میں تارے......

تب سورج، سورج تھا۔ زمین، زمین تھی۔ آسمان، آسمان تھا۔ تب چاند کی چاندنی چھٹکی ہوتی تھی — تاروں ستاروں کی فسوں خیز کہانیاں ہوا کرتی تھیں — پیڑوں کے نیچے فطرت یا فضا کی نرم آغوش ہوا کرتی تھی...... چھت پر پلنگیں بچھی ہوتی تھیں...... ان پلنگوں یا کھاٹوں سے قصوں داستانوں کا میل ہوتا تھا......

تب پھول تھے، خوشبو تھی...... تب جذبات بھی تھے...... تب دکھ اور سکھ کا فطری احساس تھا...... اور اب۔ اس کالونی کلچر میں، ایک دروازے سے ٹکراتے دوسرے دروازے — دوسرے سے تیسرے...... ان ہزاروں دروازوں میں سے کوئی چاند نہیں جھانکتا۔ کوئی چاندنی رات، تاروں بھرا قافلہ...... کھاٹوں پلنگوں سے جنم لینے والی بے باک داستانیں۔

دیتیہ کار کو لگتا ہے...... بچوں سے فطرت یا فضا نہیں، زندگی چھن گئی ہے۔ وہ بچے تھے تو بچوں جیسا سوچتے تھے۔ بچے جیسے نظر آتے تھے مگر کیا...... ریا کو آپ بچہ کہیں گے؟

''ریا ابھی بھی بچی جیسی نظر آتی ہے؟'' رما کی آنکھوں کے کنول مرجھا گئے تھے۔

''بچی ہے تو بچی جیسی ہی......'' لیکن دیتیہ کار 12 سالہ ریا کو دیکھتے ہوئے ڈر گئے تھے...... نہیں، ریا تو جوان ہوگئی ہے۔

''نہیں......'' رما کے لہجے میں کرختگی تھی...... ''میں یہی کہہ رہی ہوں کہ...... اسے بچی جیسی نہیں دکھنی چاہئے۔''

''لیکن کیوں؟'' دیتیہ کار کے لہجے میں ڈر کوند گیا تھا۔
''کیوں کہ بچی لگنے میں اس کا نقصان ہے۔اس کا کیریر، اس کا مستقبل؟''
دیتیہ کار کے اندر بیٹھے باپ نے مورچہ سنبھالا......
''بارہ سال کی عمر کے بچے پڑھتے ہیں۔ بارہ سال میں مستقبل کہاں سے آگیا؟''
''اس لئے کہ......'' رَما کے ہونٹ جکڑ گئے تھے___ ''جو غلطی ہم سے ہوئی ہمارے بچوں سے نہیں ہونی چاہئے......اس لئے کہ یہی عمر ہے جب......''
دیتیہ کار ڈر گیا تھا۔
''ڈرومت۔ میں جو کروں گی، ریا کی بھلائی کے لئے کروں گی۔''
''لیکن تم کروگی کیا؟ کیا ریا کو جوان کر دوگی......اس کے مستقبل کے نام پر......؟''
دیتیہ کار کو لگا تھا کہ رما کو اس طنز پر ہنسنا چاہئے، مگر رَما سنجیدہ تھی۔
''ہاں، میں اسے جوان کردوں گی......''
''پاگل ہوگئی ہو......؟''
''نہیں......میں نے فیصلہ کرلیا ہے___ میں ریا کو ہارمونس کے انجکشن دلاؤں گی۔''
دیتیہ کار تبھی چونکا تھا۔ جب پہلی بار رما نے گلیمر ورلڈ کا نام لیا تھا۔ ماڈلنگ، کم عمر اداکاراؤں کی بے باک زندگیاں......ایک بار نیلامبر نے ہنستے ہنستے پوچھا تھا۔ فلمی دنیا کی اکثر ہیروئنیں اپنے باپ اور باپ کا گھر کیوں چھوڑ دیتی ہیں؟ ہنستے ہنستے نیلامبر نے تازہ تازہ ممتا کلکرنی کی مثال پیش کی تھی۔ دیتیہ کار کو لگتا ہے باپ اپنی اپنی قوت برداشت کا امتحان دیتے دیتے ہار جاتے ہوں گے۔ پھر یہاں تو باڈی فٹ نیس، ذہانت اور کھلے پن کا ہر راستہ گلیمر ورلڈ تک جاتا تھا۔ بیوٹی کوئنز، مس انڈیا، مس ورلڈ، مس یونیورس......دنیا کے سامنے بیٹی کا کھلا ہوا جسم اور ننگی پنڈلیوں پر نظر ڈالتے ہوئے ماں باپ کو یقیناً فخر ہوتا ہوگا۔

(9)

یہ انہی دنوں کا حادثہ ہے، جب نیلامبر کو اونچا اڑتے اڑتے اچانک ٹھوکر لگی تھی......
نیلامبر کی کمپنی اپنے پروڈکٹس کی مانگ گھٹنے سے پریشان ہو رہی تھی۔ فیصلہ یہ لیا گیا کہ خسارے میں چلنے والی کمپنی ہی کیوں نہ بند کر دی جائے۔ اس سے موٹی تنخواہ پانے والے نیلامبر جیسے

ایگزیکیوٹیو اچانک ہی ریٹائر کر دئے گئے۔

جیسے اچانک بلندی سے گر کر زمین پر آنے کا احساس ہوتا ہے۔ اس دن نیلامبر کے ہونٹوں پر ایک طرح کی کپکپی تھی......

''اسے روکو...... وہ بہت تیز اڑ رہی ہے......''

''لیکن اب...... شاید دیر ہو چکی ہے......'' یہ دیتیہ کار نہیں ایک لاچار باپ کا لہجہ تھا......''

''کچھ کرو...... نیلامبر کا لہجہ خوف زدہ تھا...... انجانے میں اس لڑکی نے اپنے لئے ایک گیس چیمبر چن لیا ہے—— تم سمجھ رہے ہونا—— اس کا دم گھٹ جائے گا۔ پہلے ڈسکو تھیک، پھر بار، ہارمونز کے انجکشن...... ریا کا اگلا پڑاؤ، کنڈوم بھی ہو سکتا ہے...... اسے روکو......''

دیتیہ کار کے اندر ایک ایسی بے کیف اداسی چھائی ہوئی تھی جسے توڑنے کے لئے یہ سخت لفظ 'کنڈوم' بھی کارگر نہیں تھا...... وہ دیکھ رہا تھا کہ اس لبرل ازم یا صارفیت نے تو ریا کو ہارمونز کا انجکشن لینے سے پہلے ہی جوان بنا دیا تھا۔

وہ سب کچھ آنکھ موند کر دیکھنے کو مجبور تھا۔ یہ بھی کہ پرانی دنیا کا زوال ہو رہا ہے۔ چڑیا انڈے سے باہر نکلنے کے لئے جدوجہد کر رہی ہے...... اسے موت کی بو آ رہی تھی...... موت کے بغیر کچھ بھی نیا نہیں ہوگا...... لوگوں کو جنگ سے تحفے میں ملا ہیجان چاہئے۔ ہیجان...... سنسنی...... شاید نئی دنیا کی شروعات ہو چکی ہے...... اور یہ شروعات ان جیسوں کے لئے بھیانک ہے۔ جو اب تک پرانی دنیا سے چپکے ہوئے ہیں......

(9)

اس اثنا میں کئی معمولی قسم کے چھوٹے چھوٹے حادثات ہوتے رہے...... جیسے 'ماڈلنگ' کے لئے رما نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا...... جیسے نیلامبر نے دھیرے دھیرے گھر آنا بند کر دیا...... جیسے ریا چپ چاپ رہنے لگی۔ لمبی گہری اداسی، جو کسی صدمے سے جنمی ہو یا جو ڈپریشن کے مریضوں کے لئے عام بات ہے...... اس لمبی گہری اداسی کے پیچھے وہ مسلسل رما کی شکست دیکھ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ دنیا گول ہے لیکن یہ یقین نہیں تھا کہ رما عورت کی جون میں کبھی واپس بھی آ سکتی ہے—— یا تو یہ مکمل شکست تھی یا پھر اس حادثے کا وہ آخری ورق—— جہاں نیند کی کئی

گولیاں نگل کر رِیا نے خودکشی کی کوشش کی تھی......

تو کیا چڑیا انڈا توڑ کر باہر نکل آئی تھی......؟

یہ ارجن دیتیہ کار کے لئے عرفان ذات کا وقت تھا۔ لیکن ابھی ایک لرزہ دینے والا منظر باقی تھا۔ رِیا کو ہوش آ چکا تھا تاہم اس کی میڈیکل رپورٹ ابھی آنا باقی تھی......لیکن اس میں کیا نکل سکتا ہے، یہ رما کی آنکھوں میں پڑھا جا سکتا تھا___ سارے گھر میں جیسے یکا یک ٹھنڈی لہر دوڑ گئی تھی۔ ایک دھند تھی جس نے چہروں کے درمیان انجانے پن کی دیوار اٹھا دی تھی...... ایک چیخ گونجی...... کچھ ٹوٹنے کی آواز آئی۔ دیتیہ کار اور رما بھاگتے ہوئے آئے تو......سامنے...... اپنے دروازے پر رِیا کھڑی تھی___ کپڑے تار تار___ آنکھیں انگاروں کی بارش کرتی ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں آدھی ٹوٹی ہوئی سوڈا واٹر کی بوتل تھی...... چہرے پر ایک عجیب طرح کا تناؤ جو غصہ سے جما تھا۔ رِیا بہت زور سے چلائی۔

''کیا جاننا چاہتے ہیں آپ لوگ......زیادہ تنگ کریں گے تو......''

دیتیہ کار جانتے تھے۔ فلمیں اور فلموں کا تشدد قدرتی انداز میں بچوں کے ذہن پر اپنا اثر ڈالتے رہے ہیں۔ سرد کہرے میں جیسے ان کے جذبات بھی سرد ہو رہے تھے۔ تب ایک دن بعد نئے دن کی شروعات ہونے والی تھی___ یا پرانے سال کے آخری دن انہیں ایک چونکانے والی خبر ملنے والی تھی۔

یا......ایک نئی شروعات کی چڑیا کو انڈا توڑ کر باہر نکلنا تھا۔

(10)

کیسے ہوا یہ سب؟

دیتیہ کار سوالوں کے اندر جاتے جاتے ٹھہر جاتے۔ کیا یہ سب اس وقت کے اندھیرے کا سچ ہے، آزادی کے وقت کی آئیڈیلزم، لوہیا کا سوشلزم...... پھر یہ 'ازم' کتنے طبقاتی گروہوں میں بٹا تھا۔ مادہ پرستی، کنزیومرازم، گھوٹالہ واد۔ کہیں ایک لبرازم کی اینٹ بھی رکھ دی گئی...... کیا کہیں گے ہم اس نسل کو...... M.T.V. کنڈوم نسل......عدم تحفظ کے جذبات میں اسیر، باہر باہر آزادی کے لطف کا ناٹک کرتے ہوئے۔ اندر اندر گہری اداسی میں ڈوبے، تناؤ میں___ ستم رسیدہ___ جیسے کسی بھیانک دھوکہ دھڑی کے شکار ہوئے ہوں...... یا جیسے خود کو غیر محفوظ کر رہے

ہوں۔ مگر کس سے...... ایک مفرور یا مہاجر کلچر میں رچے بسے بچے— اس تناؤ سے نجات پاتے ہیں تو اگلے قدم پر جرم راستہ روکے ہوئے ملتا ہے— ریا کی وہ خونی آنکھیں...... وہ مضبوط نہیں، وہ تو بہت کمزور ہیں— لمحے میں خودکشی جیسے فیصلوں میں زندگی کا مفہوم ڈھونڈنے والے۔ شخصی تشدد کے شکار...... آنکھوں میں جنون لئے، کسی بھی طرح کے ہیجان کے نام قربان ہو جانے والی نسل...... لیکن اس نسل کو، اس سمت میں لانے والا کون ہے؟ ہر نسل اپنے پہلے والی نسل سے کچھ نہ کچھ اثر لینے پر مجبور ہے، تو کیا دیتیہ کار کے باطن کا وہ سیکولر اور لبرل کردار والا شخص صرف ایک علامت اور متھ تھا، جس کا اثر لے کر ریا مجبوراً ان اوراق کو لکھنے پر مجبور ہوئی ہے...... گھوڑے ہنہنا رہے ہیں— گھوڑوں کی آنکھوں پر بندھی پٹیاں کھل رہی ہیں...... گھوڑے دور تک پھیلی اندھیری سرنگ کی دیواروں سے ٹکرا سکتے ہیں......

○○

۳۱ ردسمبر— گھر سے باہر دور تک کہرے کی چادر پھیلی ہوئی تھی...... بہت کم وقت بچا تھا، نئے سال کے آنے میں...... لیکن کبھی کبھی باہر سے پٹاخوں کی آواز آ جاتی۔ یہ ختم ہوتی ہوئی بیسویں صدی کو الوداع کرنے کی آوازیں تھیں...... یا نئے سال کے استقبال کی تیاری۔ ایک صدی گھنے کہرے میں چھپ رہی تھی۔ ایک نئی صدی گھنے کہرے سے جنم لے رہی تھی...... میڈیکل رپورٹ ایک نئے جنم کی کہانی لے کر آ گئی تھی۔

— ''وہ...... ابھی بچی ہے۔''

— ''تم نے اسے ہارمونز کے انجکشن لگائے تھے......''

— ''لیکن...... وہ...... ابھی بچی ہے......''

سردی سے دانت کٹکٹائے...... باہر کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ نئے سال کے آنے کے باوجود ایک لرزہ دینے والا سناٹا......

— ''اب کیا ہو سکتا ہے؟'' رما کے ہونٹ تھرتھرائے تھے......

— ''اس سے پہلے بھی اس کے بارے میں ہر فیصلہ تم نے کیا ہے...... اس لئے......''

—— ''تمہارے اندر فیصلہ لینے کی قوت نہیں تھی......''

—— ''یا...... میں اپنی بچی کو ہارمونز کے انجکشن نہیں لگوا سکتا تھا۔''

—— ''میری آنکھوں میں سپنے پل رہے تھے۔ میرا بھی شوق تھا کہ دوسروں کی طرح اپنی بچی کو ٹیلی ویژن یا پردے پر دیکھوں۔''

—— ''پھر یہ خیال کیوں چھوڑ دیا؟''

—— ''کیونکہ......'' رما کا لہجہ برف ہو رہا تھا۔ ''وہ مجھے آدمی نہیں لگا......''

—— ''نہیں۔ وہ بھی آدمی تھا ہماری تمہاری طرح......'' دیتیہ کار کچھ سوچ کر اداس ہو گیا ہے...... اس کمپیوٹر کی طرح بے کار اور بے قیمت جس سے اچھا پروڈکٹ مارکیٹ میں آچکا تھا۔

(12)

باہر پٹاخے چھوٹنے شروع ہو گئے ہیں...... شاید سال نو کی آمد قریب ہے...... وہ جانتا ہے باہر کڑاکے کی سردی کے باوجود ہمیشہ کی طرح بچے، جوان مسرت اور گرمجوشی کے ساتھ سڑکوں پر نکل آئے ہوں گے —— یا اپنے اپنے گھروں میں گھڑی کی سوئیوں کے جڑنے کا انتظار کر رہے ہوں گے —— رما چپ ہے...... وہ ایک عجیب سی سرگوشی سن رہے ہیں۔ ابھی اور بھی انقلاب باقی ہیں۔ آنے والے کچھ برسوں میں بایو ٹکنالوجی اور جینٹک انجینئرنگ کی سمت میں ہونے والے انقلاب...... شاید اگلے پڑاؤ کے طور پر، ہم نینو ٹکنالوجی کے عہد میں داخل ہو جائیں۔ جراسک پارک کے ڈائنا سور سے بھی زیادہ بھیانک ایک نئے عہد کی شروعات...... ہر قدرتی اور فطری چیز کی آپ ایک نقل بنا کر رکھ سکتے ہیں —— جیسے پیڑوں کی بایونک نقل...... ایک مائیکرو درخت یا ماحولیاتی اثرات آپ اپنے کمرے میں لا سکتے ہیں۔

وہ ایک ٹھنڈی سانس بھرتا ہے...... لگاتار ہونے والے انقلاب نے ہمیں 'بونسائی' بنا دیا ہے......

''لیکن اس کا حل کیا ہے؟''

رما اس کے چہرے پر نگاہیں جمائے ہوئے ہے —— ''ریا کے بارے میں تم نے کیا فیصلہ کیا......؟''

مگر شاید اب وہ کچھ بھی سوچ پانے کی حالت میں نہیں ہے۔ گھڑی کی سوئی ایک دوسرے سے جڑ گئی ہے۔ باہر پٹاخے چھوٹنے کی رفتار تیز ہوگئی ہے۔ وہ کسی روبوٹ کی طرح اپنی جگہ سے اٹھ کر گیٹ کی طرف بڑھتا ہے۔ دروازہ کھولتا ہے۔ شاید نئے سال کے خیر مقدم میں یا بیسویں صدی کو ہمیشہ کے لئے الوداع کہنے کے لئے ـــــ باہر کی کڑکڑاتی ہوئی ٹھنڈک ـــــ آنکھوں کے آگے دور تک بچھی ہوئی کہاسے کی چادر ـــــ دور تک دھواں...... دھواں، کچھ بچوں کے ہنسنے، قہقہہ لگانے کی آوازیں بھی آرہی ہیں ـــــ شاید وہ آپس میں ناچ گا رہے ہوں۔ آتش بازیاں چھوڑ رہے ہوں۔

مگر دیتیہ کار...... سردی نے جیسے اپنی جگہ پر انہیں جکڑ دیا ہے...... چڑیا انڈا توڑ کر باہر نکل آئی ہے۔ یا پھر......

بغیر پٹی کے، سرنگ میں دوڑنے والا گھوڑا دیواروں سے ٹکرا کر لہولہان پڑا ہے۔

○○○

مادام ایلیا کو جاننا ضروری نہیں

فیروز اور مادام ایلیا کے درمیان ایک بے ربط مکالمہ

''دونالی بندوق اور ڈریسنگ گاؤن'' ـــــ اس نے حامی بھری۔ سر کو ایک ذرا سی جنبش دی۔ گو ایسا کرتے ہوئے اس کے چہرے کی جھریاں کچھ زیادہ ہی تن گئی تھیں اور گول گول چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی سرخیاں کچھ ایسے پھیل گئی تھیں، جیسے گرمی کے دنوں میں انڈے کی زردیاں پھیل جاتی ہیں۔

'ہاں، اتنا کافی ہے۔ زندہ رہنے کو اس سے زیادہ اور کیا چاہئے' ـــــ 'اس نے ہونٹ ہلائے اور سوکھے ہونٹوں پر جمی پپڑیوں کے درمیان شگاف بنتے چلے گئے۔

''مگر میرے پیارے بوڑھے فوجی تمہیں کچھ اور بھی چاہئے' ـــــ بوڑھی مادام ایلیا کے لہجے میں دردمندی تھی ـــــ بہت زیادہ کچھ۔ میرے پیارے بوڑھے فوجی، اس عمر میں تو چاہنے کی طلب بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ سمجھ رہے ہو نا تم......؟''

فیروز راہب، وہ معمر مرد جو اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ دھیرے دھیرے بندوق گھماتا رہا۔ جیسے، ایسا کرتے ہوئے مادام ایلیا کے چبھتے الفاظ کی ناپ تول کر رہا ہو۔

''آہ تم نے محبت بھی نہیں کی۔ جب کہ موقع تھا تمہارے پاس ـــــ مادام ایلیا کے لہجے میں ناراضگی تھی ـــــ اچھے بچوں کی طرح چپ چاپ بیٹھے رہو میرے پیارے بوڑھے فوجی۔ چپ چاپ۔ سمجھ رہے ہو نا تم۔ جبکہ محبت کے مواقع تھے تمہارے پاس ـــــ مگر تم نے وقت گنوا دیا۔ تمہیں محبت کرنی چاہئے تھی ـــــ اس عمر میں پرانی محبت کا خیال ـــــ ؟ تم نہیں جانتے۔

اس سے عمدہ تو وہ مشروب بھی نہیں ہوتی، جسے تم اب اپنی زندگی سے زیادہ پیار کرتے ہو۔نہیں پیارے فوجی، ایسے مت دیکھو......ایک سینڈوچ اور مل سکتا ہے؟''

''نہیں اب سینڈوچ نہیں ہے۔''

معمر عورت ٹھہاکا لگا کر ہنسی۔''میرے پیارے بوڑھے فوجی۔ مجھے پتہ ہے۔ سینڈوچ اور نہیں مل سکتا۔ ذرا ٹھہرو۔ ایک بار چیک تو کرلوں......''

وہ بمشکل اپنی جگہ سے اٹھی۔ اٹھ کر، کیکروں، کی بنی المیرا تک گئی۔ المیرا کی خالی ریک میں کچھ دیر تک اپنی آنکھیں گھما گھما کر کچھ دیکھتی رہی۔ پھر بلاوجہ ہنسی۔

''افسوس۔ نہیں ہے۔ مگر کیا ہوا۔ سینڈوچ تو دوبارہ آسکتے ہیں۔ مگر میرے پیارے فیروز......'' اس بار اس نے بوڑھے کو اس کے نام سے پکارا تھا......'مگر......تم تو نہیں آسکتے اور سنو۔ مات کھانا تو مرنے سے بدتر ہے۔ کیا تم مر گئے ہو___؟ سینڈوچ کی طرح زندگی دوبارہ تو نہیں مل سکتی___!''

بوڑھے فیروز نے دونالی کا رخ اپنی طرف کیا۔ پھر نال اپنی پیشانی سے سٹالی۔ ''بزدلی۔ آہ! حال سے بیزاری اور مستقبل کا نشہ ختم ہو جائے تو......آہ تم سمجھ رہے ہو نا، زندہ رہنے کے لئے......''

وہ اپنا مکالمہ ادھورا چھوڑ کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

بچپن کے واقعات اور تذکرہ پہلی گولی کا

ان دنوں فیروز بہت چھوٹا تھا اور سچ پوچھئے تو بچپن میں ایسے خیالات پیدا نہیں ہوتے ہیں، جیسا کہ اس کے دل میں پیدا ہوتے تھے___ ان دنوں زیادہ تر وہ ایک چرمی واسکٹ پہنتا تھا، جو اس کے باپ نے اسے امتحان پاس ہونے کی خوشی میں تحفے میں دیا تھا___ اور وہ اسے پہن کر خوش ہوتا تھا کہ اس سے زیادہ خوبصورت شئے دنیا میں اور کوئی نہیں۔ جاڑا ہو، گرمی یا برسات، وہ اسے اتارنے کا نام نہیں لیتا۔ ہاں پہلی بار چرمی واسکٹ اس نے اپنے بدن سے تب الگ کیا جب اس نے سنا کہ......

وہ جاڑے کے دنوں کی ایک رات تھی۔ روشنی کئی دنوں سے نہیں تھی۔ کمرے میں بھبھکتا ہوا ایک لالٹین جل رہا تھا۔ باہر کتے بھونک رہے تھے اور اس نے دیکھا، لالٹین کی دھیمی روشنی میں

اس کے باپ کا چہرہ سیاہ پڑا ہوا تھا۔ باپ سہما سا ماں کے چہرے پر جھکا ہوا تھا۔
''تم سن رہی ہونا...... جنگ ہونے والی ہے۔ آہ! جنگ، جو ہمارے لئے تباہی لائیگی۔''
''شی......'' اس نے ماں کی آواز سنی۔ دھیرے بولو۔ ماں کی آواز لڑکھڑا رہی تھی......
''یہ جنگیں ختم نہیں ہوسکتیں؟''
''اس نے باپ کے خوفزدہ چہرے کا عکس دیکھا، جو گہرے سناٹے کی طرح شانت تھا ___ نہیں۔ جنگیں ایک بار شروع ہوگئیں تو...... پھر نہیں رکتیں۔ ہاں بیچ بیچ میں سیز فائر...... مگر......''

''سیز فائر''...... ماں چونک گئی تھی۔
''جنگیں ایک خاص مدت کے لئے بند کردی جاتی ہیں۔'' باپ ٹھہر ٹھہر کر کہہ رہا تھا...... تم سمجھ رہی ہونا...... یہ ایک طرح کا معاہدہ ہوتا ہے...... مگر جنگیں جاری رہتی ہیں...... سیز فائر اس لئے ہوتے ہیں کہ...... جنگ میں لذت پیدا کی جاسکے۔''

ایلیا اس سے دو برس بڑی تھی۔ صبح کھانے کی میز پر اس نے دیکھا، اس کا باپ کچھ زیادہ ہی رنجیدہ تھا۔ اس نے ایلیا کو قریب بیٹھنے کے لئے کہا۔ پھر باری باری سے سب کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کا انداز ایسا تھا، جیسے وہ ''لام'' پر جا رہا ہو۔ سب کو چھوڑ کر ___
پھر باپ نے نظر نیچی کر لی...... مگر...... وہ دھیرے دھیرے کہہ رہا تھا...... ''آہ! ایلیا...... تم جانتی ہونا، بلیاں کتے اپنی دیکھ بھال کرنا اچھی طرح جانتے ہیں مگر...... ہم انسان...... وہ اٹک رہا تھا...... مان لو...... کل سے اس میز پر ایک آدمی کم ہو جائے تو......؟ وہ ٹھہرا اور اتنی دیر میں باپ نے اپنے حواس بحال کر لئے...... یعنی میں......'' وہ مسکرا رہا تھا...... ''گھر کی چھت سے سیاہ بادل لٹک رہے ہیں میرے جان۔ یہ بادل کسی بھی وقت کمرے میں آسکتے ہیں۔''
فیروز نے ماں کو دیکھا ___ ماں کی آنکھوں میں نہ تعجب کا اظہار تھا نہ ہمدردی کا۔ اس کے برخلاف ماں نے چندھی آنکھوں سے باپ کو دیکھا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ___ بولی۔
''شی...... دیواروں نے سن لیا تو......''
''بلیاں اپنی حفاظت کرنا جانتی ہیں۔ کتے اور دوسرے جانور بھی......''

فیروز نے اپنے چمڑے کی واسکٹ پر اپنا ہاتھ پھیرا ـــــ اس نے ایلیا کو دیکھا جو اچانک باپ سے لپٹ گئی......

''تو کیا یہ سیز فائر ہے؟''

''ہوسکتا ہے۔ جنگ ابھی رکی ہوئی ہے میری جان۔ اس کے بعد...... کبھی بھی شروع ہوسکتی ہے......''

پھر سب خاموش ہو گئے۔

دوسرے دن جب باپ جانے کو ہوا تو سب نے مخالفت کی۔ مگر باپ اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا...... ''جب بلیاں اپنی دیکھ بھال کرنا جانتی ہیں تو......''

اس پورے دن باپ نہیں آیا۔ ماں خاموشی کے ساتھ حجرے میں رہی۔ ایلیا بار بار دروازہ کمرہ ایک کرتی رہی۔ رات کے پچھلے پہر دروازے پر دستک گونجی۔ اس نے دیکھا۔ دو چار لوگ اس کے باپ کے مردہ جسم کو لئے کھڑے ہیں۔

''یہ باہر ملا ہمیں۔ باہر راستے میں۔ کسی نے اسے گولیوں سے......''

اس نے دیکھا، ماں سوگوار لباس پہن کر باپ کی لاش کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ ایلیا نے روتے چیختے سارا گھر سر پر اٹھالیا ـــــ اس کے کانوں میں باپ کی آواز آتی رہی...... یہ سیز فائر ہے...... آہ، بلیاں، کتے اپنی دیکھ بھال کرنا......''

وہ باپ پر جھک گیا۔ باپ کے سینے کو گولیوں سے چھید ڈالا گیا تھا۔ جہاں جہاں گولیاں لگی تھیں، وہاں خون کے فوارے جم گئے تھے...... سارا جسم خون سے سنا تھا اور جسم سے عجیب سی بدبو اٹھ رہی تھی۔ اس نے اچانک اپنی انگلیوں میں حرکت محسوس کی اور اس کی متحرک انگلیاں باپ کے جسم میں ان جگہوں پر پیوست ہونے لگیں جہاں گولیاں داغی گئی تھیں۔

ایلیا روتے ہوئے چیخی ـــــ ''فیروز! یہ کیا کر رہے ہو؟''

وہ سرد لہجے میں بولا ـــــ دیکھتی نہیں۔ گولیاں نکال رہا ہوں۔

''خدارا بس کرو۔ بس کرو فیروز۔''

ماں دھیرے سے بولی ـــــ ''باپ پر بیٹے کا حق ہوتا ہے۔''

ایلیا پھر چیخی ــــ مگر...... ''تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟''

''میں اس واقعہ کو زندہ رکھنا چاہتا ہوں۔ تبھی تم ایلیا۔ زندہ رکھنا چاہتا ہوں ــــ وہ حلق پھاڑ کر چیخا ــــ صرف باپ کی موت مجھے یاد نہیں رہ سکتی ــــ صرف یہ، کہ ایک رات یہ گولیوں سے چھلنی ہوا تھا۔ میں اس کے جسم سے ساری گولیاں نکالتے ہوئے اس واقعہ سے جڑنا چاہتا ہوں ــــ ڈراونے خواب کی طرح۔''

''نہیں ایسا مت کرو۔ ایسا مت کرو فیروز......''

ایلیا زور زور سے چلانے لگی۔ ماں اسی طرح باپ کی لاش کے پاس بیٹھی تھی۔ جیسے کچھ بھی اس کے لئے عجوبہ نہ ہو۔

سیز فائر

(کسی کہانی کے لئے یہ تعین کرنا ضروری نہیں ہے کہ وہ واقعہ کب ظہور میں آیا...... یا وہ حادثہ کب سرزد ہوا۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ دن تاریخ، مہینے حقیقت سے پوری طرح واقف کرانے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ معزز قارئین! یہ سب کچھ ان دنوں ہوا۔ یا یہ مان لیا جائے کہ ان ہی دنوں ہوا ہوگا یا انہی دنوں ہوسکتا ہے...... ماننے اور فرض کر لینے سے سچ زیادہ شفاف ہوکر ہمارے سامنے آتا ہے ــــ

(ہاں تو مان لیتے ہیں، یہ سب کچھ ان ہی دنوں ہوا ہوگا جب ایک انسانی نسل پرانی ہو رہی تھی اور دوسری نسل جوان ہو رہی تھی۔ ایک صدی وقت کے سرد و گرم کی کہانیاں سمیٹے رخصت ہو رہی تھی اور...... ایک صدی آ رہی تھی)

اور سچ یہ ہے کہ ہمارے ہیرو، یعنی فیروز راہب نے اس واقعہ کے بعد چرمی واسکٹ اتار پھینکا۔ اسے بہت ساری باتوں کا جواب نہیں ملا ــــ مثلاً اس کے باپ کو کیوں مارا گیا۔ مثلاً اس قتل سے کسی کا کیا فائدہ ہوسکتا تھا۔ مثلاً...... اس کی ماں روئی کیوں نہیں۔ جس دن اس نے چرمی واسکٹ اتارا، اس دن ایک واقعہ اور ہوا۔ اس دن ایلیا اسے بدلی بدلی سی نظر آئی...... اس نے ایلیا کو غور سے دیکھا...... ایلیا کی آنکھوں میں ایک نئی دنیا آباد ہو رہی تھی ــــ

پھر کافی عرصہ گزر گیا۔

باپ، حادثہ اور گولی...... گو، بہت زیادہ وقت گزر جانے کے بعد بھی یہ حادثہ اسے کل کا

لگتا تھا۔ جبکہ اس درمیان یعنی باپ کی موت کے ٹھیک دو سال بعد ماں بھی باپ کے پاس چلی گئی۔ مگر سچ تو یہ تھا کہ وہ ماں کو بھول بھی گیا۔ مگر باپ کا حادثہ اس کے ذہن میں ابھی بھی جیوں کا تیوں محفوظ تھا۔ یعنی وہ خوفناک رات...... نصف شب ہونے والی دستک اور باپ کے مردہ جسم سے گولیاں نکالنے کا عمل...... اسے یقین تھا، باپ اس کے اندر زندہ ہے اور باپ اس کے اندر زندہ رہا تھا......

اس بیچ، جیسا کہ باپ نے کہا تھا...... جنگیں لگاتار ہوتی رہیں۔ یا جیسا کہ آگے باپ نے سیز فائر کے بارے میں بتایا تھا...... جنگیں رک رک کر پھر شروع ہو جاتیں۔

اس بیچ صرف ایک بات ہوئی ــــ نہ چاہنے کے باوجود وہ فوج میں چلا گیا۔

ایک دن۔ کافی دنوں بعد اس نے ایلیا کو چہچہاتے ہوئے دیکھا تو چونک پڑا۔ ایلیا کی آنکھوں میں چمکتے رنگوں والی چڑیا کی شوخی اتر آئی تھی۔

''کیا بات ہے ایلیا......''

''سیز فائر...... ایلیا ہنسی...... میرے پیارے فوجی...... میں محبت کر رہی ہوں ــــ وہ ذرا سا ہنسی...... 'کیوں محبت میں ہنسنا جرم تو نہیں ہے اور میرے پیارے فوجی۔ یہ بات تمہارے لئے بھی ہے۔ تم بھی محبت کرنا شروع کر دو۔''

وہ اس کے قریب آ گئی۔ ''جنگ میں ہم ایک دوسرے سے دور چلے جاتے ہیں...... نہیں؟''

''تمہیں باپ کے جسم سے نکلنے والی گولیاں یاد ہیں؟''

''آہ...... تم بالکل نہیں بدلے۔ سنو، باپ نہیں ہے۔ میرے پیارے فوجی۔ باپ بہت دور چلا گیا ہے۔ وہ کھلکھلائی...... محبت جنگ کو بھلا دیتی ہے...... تم سمجھ رہے ہو نا میرے پیارے......''

ان دنوں آسمان پر گدھوں کی طرح جنگی طیاروں نے منڈرانا شروع کر دیا تھا۔ اس کے پاس بھی جنگ میں شامل ہونے کا پروانہ آ گیا...... اس رات دونوں نے جشن منایا...... ایلیا نے اپنا وائلن نکالا جو اس کے باپ نے اس کی بارہویں سالگرہ پر دیا تھا۔ فیروز نے اپنا ڈریسنگ

گاؤن نکالا، جو چرمی واسکٹ کی طرح اسے پسند تھا۔

کمرے میں مدھم اندھیرا تھا۔ ایلیا دیر تک وائلن بجاتی رہی۔ وہ تادیر اپنی خوشی کا اظہار کرتا رہا۔ شاید لام پر جانے سے قبل وہ ہر طرح کے احساس سے بے خبر ہو جانا چاہتا تھا۔

''محبت''...... ایلیا نے وائلن سے ہاتھ روک کر کہا...... ''جنگ میں کوئی عورت مل جائے تو اس سے محبت ضرور کر لینا۔''

ایلیا اور محبت

جنگ بند ہو چکی تھی۔ وہ جنگ سے واپس لوٹ آیا۔ پھر وہ جنگ میں شامل نہیں ہوا___ پھر بہت کچھ نہیں ہوا۔ پھر جیسے وقت کا پرندہ ایک لمبی چھلانگ لگا گیا۔ صدی...... ایک صدی، دوسری صدی میں گم ہونے والی تھی اور نئی صدی گم ہونے والی صدی کے بطن سے جنم لینے والی تھی...... اچانک اس نے پلٹ کر دیکھا___ ایلیا ایک معمر عورت میں تبدیل ہو کر اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں وہی وائلن تھا۔

''آہ'' سب ختم ہو گیا۔ وہ دھیرے سے بڑبڑایا___ ڈریسنگ گاؤن کافی پرانا پڑ چکا تھا۔ بٹن ٹوٹ گئے تھے۔ کپڑا بوسیدہ ہو چکا تھا اور وہ دونالی بندوق___ زندہ رہنے کے لئے......''

''آہ'' اس نے لمبا سانس کھینچا۔

''بالآخر وہ آدمی بھی...... کیوں ایلیا۔ وہ آدمی بھی فریبی نکلا نا...... کیا ملا، اس پر ایک عمر لٹا کر......؟''

ایلیا کے لہجے میں ہنسی تھی___ ''تم نہیں سمجھو گے میرے پیارے بوڑھے فوجی۔ اس کی آواز میں کہیں بھی تھکن نہیں تھی...... وہ وائلن تب بھی بجتا تھا...... وہ اس لمحے کا سچ تھا۔ وہ سچ آج بھی ہے۔ یہ میرا سچ ہے...... محبت، محبت ہوتی ہے میرے پیارے فوجی۔''

آنکھیں موند کر وہ وائلن بجانے میں مصروف تھی___

''کیا تمہیں اس کی یاد آتی ہے ایلیا؟''

ایلیا بے ساختہ مسکرائی...... ''تمہیں باپ یاد ہے___؟ بلیوں کو اپنے راستوں کا پتہ ہوتا ہے......''

وہ دیر تک کمرے میں چپ چاپ ٹہلتا رہا اور اس درمیان ایلیا برابر وائلن بجاتی رہی۔

محبت اور مادام ایلیا کا نظریہ

جنگ کے درمیان، بہت سی باتیں ہوئیں...... جیسے...... ایک رات، اس کے شراب کے گلاس میں ایک کاکروچ گر گیا تھا___ جیسے کاکروچ کی موت کا جشن منایا گیا تھا___ مگر وہ آدمی......نہیں، اسے کاکروچ کو یاد رکھنا ہے اور اس آدمی کو بھول جانا ہے۔''

''وہ آدمی......اس کی انگلیوں کے پور پور میں جیسے ایک مدت تک باپ کے جسم میں لگی گولیوں کا درد موجود تھا___ ویسے ہی وہ آدمی......''

فیروز دھیرے سے کھانسا___ وہ آدمی اس کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ بس ایک گولی چلی تھی۔ دشمن کے دفاع میں چلنے والی محض ایک گولی___ اپنی حفاظت کے لئے...... باپ کے الفاظ جیسے مدھم پڑ گئے تھے......

اس نے گولی چلا دی۔ سرحد کے اس پار، اس نے کسی کو گرتے، چھٹپٹاتے اور دم توڑتے ہوئے دیکھا___ بہت ساری چیخوں کے بیچ وہ چیخ واحد تھی، جو اس کی جنم دی ہوئی تھی___ اس نے دیکھا، اس کی بندوق کی نال سے ابھی بھی دھواں اٹھ رہا تھا اور وہاں......سرحد کے اس طرف۔

وہ دھیرے دھیرے پیچھے ہٹ رہا تھا___ خوفزدہ ہو کر۔ یہ......یہ آدمی......فوج میں شامل ہونے سے قبل بھی اسے معلوم تھا کہ......وہ کسی پیس مشن میں نہیں جا رہا ہے......وہاں گولے برسیں گے......بارود پھٹیں گے......آگ کے آسمان چھوتے شعلے ہوں گے......اور......آدمیوں کی چیخ ہوگی......اسے سب کچھ پہلے سے پتہ تھا۔ پھر بھی اسے یقین نہیں تھا کہ اس کی بندوق سے___ وہ آدمی......ایک آدمی۔ بس ایک آدمی۔ بس ایک آدمی......اس براعظم سے کم ہونے والا وہ ایک آدمی اس کی گولی کا نشانہ بنے گا___ اس کی گولی کا۔ ایک اذیت ناک حقیقت۔

''آہ......تم نے وقت گنوا دیا......، ایلیا اس کے پاس آ کر ٹھہر گئی۔ زندہ رہنے کے لئے......''

اس نے بندوق کو جنبش دی جیسے گہرے سناٹے سے باہر نکلنے کا راستہ ڈھونڈ رہا ہو۔

اس کے بعد جو ہوا وہ بہت عجیب تھا___ اپنے لہجے میں سختی پیدا کرتے ہوئے ایلیا نے اس کے ہاتھوں سے بندوق چھین لی۔

''یہ وہی بندوق ہے نا جس کی گولی سے......''

''ہاں......اس نے گہرا سانس کھینچا۔ تاہم یہ اعتراف کرنے میں اسے ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی۔

ایلیا نے اس کی آنکھوں میں جھانکا......' مجھے پتہ ہے۔ تم کیا چاہتے ہو۔ ٹھیک اپنے باپ کی طرح......اس بندوق کو بھی اپنی زندگی سے لگا کر رکھنا چاہتے ہو......''

اس کا لہجہ تیکھا تھا۔۔۔۔''یادوں کو اپنے دل سے نکال کیوں نہیں دیتے۔''

وہ ایک دم ایسے چونک پڑا، جیسے شراب کے گلاس میں کاکروچ کو دیکھ لیا ہو......''تم۔ ایلیا تم......بھی تو......یہ والکن......''

ایلیا نے اس کے ڈریسنگ گاؤن پر ایک نظر ڈالی اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''میرے پیارے''۔۔۔۔ برسوں بعد وہی چمکتے رنگوں والی چڑیا کی شوخی اس کی آنکھوں سے جھانک رہی تھی......

''زندہ رہنے کے لئے......ایک......ایک محبت بھی کافی ہوتی ہے میرے پیارے فوجی۔''

OO

وارن ہسٹینگس کی ٹوپی

ٹوپی کی قسمت ایسے بھی کھل سکتی ہے، محمد علی بھائی نے کبھی سوچا نہیں تھا۔ چھوٹی بڑی ،ترچھی، دو پلی، فیروز آبادی، حیدر آبادی، لکھنوی، ملتانی، مولانا ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر اسٹائل ٹوپیوں کی اتنی بڑی کوئی 'ڈیل' بھی ہو سکتی ہے، محمد علی بھائی کے لئے ایسا سوچنا عرش پر اڑنے کے برابر تھا۔ وہ تو صبح سے شام تک رنگین، ریشمی، مخملی، ملائم، چکور، گول اور ولایت علی خاں والی ٹوپیوں کا مول تول کرتے گذار دیتے تھے ___ دور کہاں، یہیں اپنے دلّی کے نظام الدین میں ___ بستی حضرت نظام الدین۔ سنا ہے پڑوس میں کوئی بہت بڑے شاعر بھی تھے۔ غالب نام تھا۔ ارے وہی غالب اکیڈمی والے غالب۔ جہاں ٹھیلا لگاتے ہیں، وہی تو ان کا گھر ہے ___ گھر نہیں دکان ___ یا جو بھی ہو، محمد علی بھائی صبح سے شام اس لئے بھی پریشان رہتے ہیں کہ ہر آنے والا نیا مسافر بس اُسی کے ٹھیلے کے پاس آ کر پوچھتا ہے ___

'غالب اکیڈمی جانتے ہو؟'

اب کیا ___ وہ چیخیں یا چلائیں کہ بھیا، جہاں کھڑے ہو وہی تو ہے اُن کی دکان۔ پتہ نہیں اس دکان مکان میں یا جو بھی کہہ لیں، صبح سے کیا کیا ہوتا ہے کہ لوگ بس جوق در جوق چلے ہی آتے ہیں۔ جیسے اور کوئی کام ہی نہیں۔ کتنے ہی لوگ اس کی دکان پر آ کر دریافت کرنے کے بعد، جیسے اُسے پریشان کرنے پر آمادہ ہو جاتے ___

___ نہیں جانتے؟

نہیں۔

___ غالب کو نہیں جانتے؟

نہیں۔

___ ہوگا کوئی ایسا جو کہ غالب کو نہ جانے؟

میں نہیں جانتا، بس۔

___ پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہیں؟

تم ہی بتلاؤ کے ہم بتلائیں کیا

___ یعنی کوئی مسلمان غالب کو نہیں جانے

'اے بھائی اِس کو مسلمان مت کہئے' ___ بتانے والوں نے محمد علی بھائی کو بتایا تھا ___ نہیں جانتے کیا۔ شاعر تھا ___ کوٹھے پر جاتا تھا ___ شراب پیتا تھا۔

'توبہ توبہ'......

محمد علی بھائی کی آنکھوں میں غالب، ان کے خاندان، بلکہ خاندان در خاندان کے لئے ڈھیر ساری نفرت جمع ہو جاتی۔

___ روزے نہیں رکھتا تھا

اچھا

___ نماز بھی نہیں پڑھتا تھا

اچھا

___ پھر تو ٹوپی بھی نہیں پہنتا ہوگا؟

نہیں ___ یہی تو ___ غزلوں کی طرح اُس کی ٹوپی بھی مشہور ہے۔ غالب کی بڑی سی ٹوپی ___ بابل کے ٹیڑھے مینار کی طرح دور تک جانے کے بعد ذرا سی جھک گئی ___ ٹوپی کے اوپر کے حصہ میں پیوند لگی ہوئی ___ کپڑے کا بالشت بھر حصہ۔ مخملی ٹوپی ___ کچھ لوگ اس کے ٹھیلے کے پاس آکر پوچھتے بھی تھے ___

غالب ٹوپی ہے؟

نہیں

'کمال ہے، غالب اکیڈمی کے پاس ٹوپی بیچتے ہو اور غالب ٹوپی نہیں رکھتے۔ بھائی کمال ہے۔'

کمال تو بس پوچھنے والے کی نظر میں ہوتا___ یعنی، ہوگا کوئی ایسا جو کہ غالب کو نہ جانے۔ محمد علی بھائی بدلی ہوئی سیاست کی فارسی نہیں جانتے تھے۔ مگر غالب کو مسلمان کہنے کے نام پر ان کے تن بدن میں آگ لگ جاتی___ شرابی اور مسلمان۔ ہونہہ۔ سنا ہے ڈومنی کے کوٹھے پر جاتا تھا۔ فرنگیوں کے لئے شاعری کرتا تھا۔ ان ہی گلیوں میں گھومتا ہوگا کل۔ نہیں۔ کسی نے بتایا___ وہ تو گلی قاسم جان میں رہتے تھے___ یہاں سے کیا واسطہ___ پھر یہاں کاہے کو آگئے___؟ دکان کھلوادی اور وہ مزار تو دیکھئے___ یہاں مزار بھی بنوالیا___ لیکن کیا ہوا بھائی اتنا بڑا مزار اتنی جگہ گھیر لی۔ مگر باہر سے تالہ بند۔ دروازے پر کتے لوٹتے ہیں یا صاحب جان فقیر دو چار کتوں کو کسی محبوب کی طرح اپنے سینے سے چمٹائے 24 گھنٹہ سوتا رہتا ہے۔

''یہی ہوتا ہے مذہب سے پھرنے کا انجام۔ ارے انہی مسلمانوں نے تو ......اور شراب پئیں''۔

محمد علی بھائی کو غالب کا ذکر گوارا نہ تھا۔ کچھ پیارا تھا، تو اپنے محبوب کا تذکرہ___ محبوبِ اولیا یعنی درگاہ حضرت نظام الدین۔ ایک قطار سے پھول والے___ چھوٹی چھوٹی اِن تنگ گلیوں میں محبوب اولیاء کی برکت ہے۔ چھوٹے چھوٹے ہوٹل تو دیکھ لیجئے۔ ہزاروں کی تعداد میں بھوکے، لاچار، غریب، فقیر۔ پانچ پانچ روپے میں کھانا کھلایئے۔ باہر سے آنے والا آدمی محمد علی بھائی کی دکان پر بھی رکتا ہے۔ ٹوپی کی قیمت پوچھتا ہے۔

'کتنے کی ہے؟'

'توبہ توبہ......' سرمے، والی آنکھیں اور زیادہ ندی جتنی گہری ہو جاتیں___ 'کیا بولتے آپ۔ ٹوپی کی قیمت نہیں ہوتی...... ہدیہ ہوتا ہے۔ ہدیہ......

'جو مرضی ہدیہ دے دیں۔'

محمد علی بھائی جانتے تھے، ہدیہ کے نام پر دینے والا دو چار پیسے زیادہ ہی دے جائے گا۔ کبھی کم نہیں دے گا___ اب بھلا قرآن پاک، تسبیح اور ٹوپی جیسی پاک چیزوں کی خرید پر مول تول کرنے کی ہمت کون کرے گا___ اللہ کا کلام۔ اللہ کے گھر میں باادب جانے کے لئے ایک ٹوپی ہی تو احترام کا واحد ذریعہ ہے۔ بچپن میں ابا بھی کہتے تھے___ مسجد میں سر ڈھک کر جانا چاہئے۔

'کیوں؟'

'فرشتے ہوتے ہیں۔ مقدس گھر ہے اس لئے۔'

'نہیں پہنی تو؟'

'شیطان سر پر تھپڑ مارتے ہیں۔'

ہوss ہوss محمد علی بھائی کو ہنسی آتی ہے۔ ایک وہ دن اور ایک یہ ___ ٹوپی کی عزت اور دبدبہ جو دل میں قائم ہوا، سو آج تک ہے ___

ٹوپی کو آنکھوں سے چومتے ہیں۔ ریشمی، دوپلّی، ترچھی، بچوں کی، روئی جیسی ملائم ٹوپیاں ہاں ___ تو۔ ذکر چلا تھا، ڈومنی کے کوٹھے پر جانے والے غالب کا۔ شراب پینے والے غالب کا اور تقدیر تو دیکھئے۔ جگہ ملی تو کہاں۔ یہاں محبوب اولیاء کے آستانہ کے قریب ___ عرس کے دنوں میں یہاں ٹھیلا لگانا بھی مشکل ہو جاتا۔ جوق در جوق آدمی ہی آدمی ___ محبوب اولیاء کے آستانہ پر قوال اپنے اپنے راگ الاپ رہے ہیں۔

'بھر دے جھولی مری یا محمد

لوٹ کر پھر میں جاؤں نہ خالی......'

وہ ٹھیلے کو غالب کے مزار والی گلی کے کنارے لگا کر، کپڑے سے برابر کر، محبوب اولیاء کے در پر دستک دینے پہنچ جاتا۔ کسی نے بتایا تھا۔ یہیں علامہ اقبال کی دعا بھی قبول ہوئی تھی۔ کہتے ہیں اقبال نے سات برسوں تک کچھ بھی نہیں لکھا۔ آستانے میں حاضری دی اور یہ شعر پڑھا ___

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو، وہ نام ہے تیرا
مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا

'اب دیکھئے اقبال کہاں ہیں ___ شاعر مشرق کہا جاتا ہے ___ کسی نے بتایا تھا، علامہ کا مزار تو لاہور میں ہے ___ یہی تو غلط ہے۔ علامہ کو یہاں ہونا چاہئے تھا۔ یہاں تو بیکار غالب کو بھیج دیا۔ شرابی کہیں کا۔'

محمد علی بھائی کو اقبال پسند تھے...... پسند ہی نہیں تھے، بہت پسند تھے۔ وہ کہتے بھی تھے ___ ارے غالب کی کا بات کرتے ہو۔ شاعر تھے تو اقبال۔ ایک کیا۔ دس سنا دوں اشعار۔ ابھی اسی وقت۔ مسلمانوں کے تھے۔ اپنے تھے اور یہ غالب۔ لیکن وقت یہی تھی۔ کبھی کبھی لوگ غالب ٹوپی تو پوچھنے چلے آیا کرتے، اقبال ٹوپی پوچھنے کوئی نہیں آتا تھا۔

یہ پوری بستی ہی محمد علی بھائی کو اللہ کی سوغات لگتی تھی۔ نور سے بھمل ___ چاروں طرف جیسے نور ہی نور پھیلا ہو۔ ایک قطار سے پھول والوں کی سیر ___ اور ٹھیک اُن سے چار قدم، آنکھوں کے فاصلے پر تبلیغی جماعت والوں کا دفتر ___ دفتر کیا تھا، مسجد کہیے۔ مسجد کیا، سب کے لئے ایک آشیانہ ___ دنیا بھر سے لوگ آتے ہیں۔ سوڈانی، چینی، افریقی، امریکی اور پتا نہیں کہاں کہاں سے ___ چہرے الگ، رنگ الگ، زبان الگ۔ لیکن کام ایک۔ مشن ایک۔ اسلام کی تبلیغ۔

تب اُس نے شروع شروع یہاں ٹھیلا لگانا شروع کیا تھا۔ ٹوپی خریدنے آئے بہت سے لوگوں کو تو وہ پہچان بھی نہیں پاتا تھا ___ کہ کیا، یہ بھی مسلمان ___ کمال ہے۔ یہ بھی ___ یہ کالا بھجنگ ___ یہ بھی۔ یہ افریقی بھی۔ یہ چینی بھیّا بھی ___ سب کو ٹوپیاں دیتے دیتے ایک دن وہ مسجد میں چلا گیا۔ اُف۔ چاروں طرف نور کی بارش۔ اُس سے کہا گیا ___

'وہ چلاّ میں چلے۔ چالیس دنوں تک۔ نہیں تو چوبیس دن۔ نہیں تو اپنے شہر میں ہی تین دن کا وقت نکالے۔ آزاد اپارٹمنٹ سے تاج اپارٹمنٹ۔ گھر گھر گھومنا ہے۔ نماز پڑھنے کی تبلیغ کرنی ہے۔''

'سبحان اللہ...... سبحان اللہ'

محمد علی بھائی ہر بات پر سبحان اللہ کہتے ہیں۔ تبھی سے یہ عادت پڑی ہے۔ چلاّ میں جانے لگے تو جیسے گھر والوں کو بھولنے لگے۔ ابا تو جا ہی چکے تھے۔ مرشد آباد میں انتقال ہوا ___ اور وہ اپنے بھائی مشتاق کے ساتھ یہاں خوریجی، دہلی میں آکر بس گئے ___ زیادہ دنوں تک غائب رہنے لگے تو بیوی نے طوفان اُٹھا دیا ___

'گھر کی سوچو۔ دو دو بچے ہیں۔'

'تو......'

'بچہ مدرسہ جانے لگا ہے۔'

'اچھی بات ہے۔' سرمہ لگی آنکھوں میں 'خاندانی جنون' پیدا ہوا ___ 'عیاشی میں جاتا ہوں کیا۔ مذہب کے کام سے جاتا ہوں۔'

'اور گھر؟'

'بتایا تھا نا۔ پہلے خلیفہ نے کیا کیا تھا۔ پیارے نبیؐ کے لئے گھر میں کچھ بھی نہیں چھوڑا۔
'محمد علی بھائی کو، جاہل بیوی کو پیٹنے کی خواہش ہوئی۔ مذہب کے کام پر بندش لگاتی ہے۔ مگر کیا کرتے۔ جب آس پاس والوں کے 'مشورے' بڑھے کہ بھائی اولاد والے ہو، اور پھر بزنس بھی ٹھپ...... پڑ رہا ہے...... تو ذرا سی آنکھ کھلی اور 'چلتے' میں جانا کم کر دیا۔ بند نہیں کیا۔ بڑا بھائی مشتاق اُن دنوں 'ڈرائیوری' کرنے لگا تھا۔ دو ایک بار شیخ اور ایک 'عرب' کی صحبت میں دوسرے ملک جا چکا تھا۔ اس لئے محمد علی بھائی بھی ڈرائیونگ کرنا سیکھ چکے تھے۔' اس درمیان سعودی عرب سے تبلیغ میں آئے شیخ یاسر سے اُن کا سامنا ہوا تھا۔ تبلیغ کے لئے حیدر آباد گئے۔ وہاں سترہ سال کی ایک دلہن پسند آ گئی۔ غریب باپ کو بیٹی کی قیمت چکائی ___ واپسی میں بستی نظام الدین آئے۔ محمد علی بھائی سے ملے تو دل کی بات ہونٹوں پر آ گئی۔

'ہمارے ساتھ چلو گے؟'

'کیوں نہیں؟'

'ویزا بنا ہوا ہے'

'بالکل ہے۔'

ڈرتے ڈرتے محمد علی بھائی نے پوچھا۔ 'عمرہ (آدھا حج) تو کر سکوں گا نا؟

'عمرہ کیوں۔ حج کیوں نہیں ___؟'

محمد علی بھائی لاجواب ہو گئے۔ مکہ مدینہ کے پُر نور نظارے آنکھوں میں گشت کرنے لگے ___ بیوی بچوں کو، پیسے کے لئے تسلی دی ___ اور خود نکل گئے، اللہ میاں کی نگریا ___ خانہ کعبہ۔ اللہ میاں کا گھر ہی تو ہے ___ عمرہ کیا۔ حج بھی کر آئے اور دو سال میں ہی شیخ کی نوکری بھی چھوڑ کر آ گئے۔

محمد علی بھائی لوٹ تو آئے لیکن تجارت اور بزنس کے ''دو اور دو، دو سو'' کے پہاڑے سیکھ چکے تھے ___ آنکھیں کھل گئی تھیں ___ لے دے کر وہی ایک ٹھیلا ___ وہ اپنی اس 'تجارت' کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کے فراق میں تھے ___ شاید اس لئے بھی کہ مشتاق نے سلیم پور میں گھر لے لیا تھا اور وہ اب تک خوریجی کے دو کمروں والے کرائے کے فلیٹ میں دہلی کی گرمی برداشت کر رہے تھے۔ لیکن امید تھی۔ اللہ کی لاٹھی میں دیر ہے اندھیر نہیں ___ ایک دن معجزہ ہوگا۔ جھولی

پھیلائیں گے، اور محبوب اولیاء اتنا دے دیں گے کہ قارون کا خزانہ بھی کم پڑ جائے گا۔

●●

قارئین،

برسوں پہلے ایک جادوگرنی نے پوچھا تھا۔ آپ جادو پر یقین رکھتے ہیں ___ اور یقیناً، اس سوال کو پوچھتے ہوئے جادوگرنی طنز سے مسکرائی تھی ___ یعنی اس عہد میں، اس ترقی یافتہ عہد میں بھی ___ ؟ ممکن ہے، آپ کسی جادو یا معجزے پر یقین نہ رکھتے ہوں مگر ہمارے محمد علی بھائی کے ساتھ، آگے جو واقعہ پیش آیا، وہاں یقین کرنا ہی پڑے گا۔ کیونکہ یکا یک، جیسے طلسم ہوشربا کی داستانوں سے اٹھ کر کوئی کردار، زندہ ہو کر اُن کے سامنے متعلق کھڑا ہو گیا ہو۔ یہ آنکھوں کا دھوکہ نہیں تھا۔ پھر بھی ہمارے محمد علی بھائی نے آنکھیں ملیں۔ بستی حضرت نظام الدین کے فٹ پاتھ کنارے رکھے، اپنے ٹھیلے کا جائزہ لیا ___ نظر اٹھا کر دیکھا ___ سامنے ایک فرنگی تھا اور ایک تھے اپنے صادق بھائی ___ جو کتنی ہی بار تبلیغی جماعت کی مسجد میں دکھائی دیئے تھے۔

دونوں یکا یک اُس کے ٹھیلے کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ اس طرح، جیسے لیوتالستائے کی ایک کہانی میں، کسی بھوکے پیاسے کے گھر خود بھگوان چل کر آ گئے ہوں۔

'جی۔ صادق بھائی۔ السلام علیکم......'

محمد علی بھائی غور سے صادق بھائی کا چہرہ پڑھ رہے تھے ___

'سلام مجھے نہیں، انہیں کیجئے ___ '

'اخواہ۔ مسلمان ہیں؟ سبحان اللہ۔' محمد علی بھائی نے تپاک سے ہاتھ آگے بڑھایا ___

'نہیں۔ مسلمان نہیں۔'

محمد علی بھائی نے فوراً ہاتھ پیچھے کھینچ لیا ___ 'کیا کہتے ہیں صادق بھائی۔ کافر کو سلام کرنا منع ہے۔'

'ہوگا ___ '

'آپ تو نماز روزہ سب کرتے ہیں۔ پھر ایسی بات......' محمد علی بھائی کہتے کہتے رک گئے ___ فرنگی، انگریزی میں دھیرے دھیرے صادق بھائی سے کچھ کہہ رہا تھا اور صادق بھائی انگریزی میں اُس کا جواب دے رہے تھے...... ٹیل ہم۔ ٹیل ہم پلیز ___ ٹیل ہم ویٹ آئی ایم

ویری مچ پلیز ٹو لُک وہاٹ ہی سیڈ۔ تم سے مل کر بہت خوش ہیں۔'

'کیا کہتے ہیں صادق بھائی......'

صادق بھائی نے اُس کا ہاتھ پکڑا۔ دھیرے سے کان میں کہا___ 'محمد علی بھائی، تیری تو چل پڑی......'

'مطلب'

'اِن سے ملو___ یہ ہیں___ ایرک ہیسٹنگز......'

'ای......رے......ک......' محمد علی بھائی نام لیتے لیتے ٹھہر گئے ___

کیا......ایریک......؟

'ہیسٹنگز۔ وارن ہیسٹنگز کے خاندان کا......'

'تو میں کیا کروں۔'

'کرنا تمہیں ہی ہے محمد علی بھائی___ 'صادق بھائی ہنس رہے تھے۔' کیونکہ بزنس کا معاملہ ہے۔'

'بزنس اور مجھ سے؟'

محمد علی بھائی کی پیشانی پر شکن پڑ گئی تھی___ اب سامنے والا آدمی اُنہیں اچھا لگنے لگا تھا___

ایریک ہیسٹنگز نے، صادق بھائی سے کہا___ Come to the point

'convey to him, what I mean.

صادق بھائی نے ترجمہ کیا___ محمد علی بھائی، ان کی باتیں غور سے سنو۔'

'اوہ۔یس......یس۔' محمد علی بھائی جوش سے بولے۔ اتنی انگریزی تو وہ جانتے ہی تھے۔

اٹیس اے لانگ لانگ اسٹوری، اِمپاورنگ مومنٹس آف آلموسٹ تھری سنچوریز۔ لمبی کہانی ہے۔ ڈھائی سو سال کے عرصے میں پھیلی ہوئی......'

صادق نے ترجمہ کیا کیا، جیسے تھوک نگلا ہو___

پوچھتے پوچھتے وہ ٹھہرے___ آر یو اے ڈسنڈنٹ آف سراج الدولاز فیملی؟

'آپ نواب سراج الدولہ کے خاندان کے ہیں نا؟ یعنی یہ بات بالکل سولہ آنے سچ

ہے، نا'؟

محمد علی بھائی ایک لمحہ کو جیسے ننگے ہو گئے۔ گہرا سناٹا چھا گیا۔

●●

'غربت' کے اِس باب کو بھولے ہوئے ایک زمانہ ہو گیا۔ کہاں سراج الدولہ، کہاں وہ___ لیکن سنتے تھے......، اُن کے بھائیوں میں سے ایک لیاقت الدولہ کے خاندان سے اُن کا 'شجرۂ نصب جا کر مل جاتا ہے۔

تب اٹھارہویں صدی کا مرشد آباد اور تھا۔ کہتے ہیں لندن، پیرس اور روم کی چمک بھی اُس کے سامنے ماند تھی اور اس بات کا اعتراف تو رابرٹ کلائیو تک نے کیا تھا___ ریشمی کپڑے اور ہاتھی کے دانت سے بنی خوبصورت چیزوں کی وجہ سے بھی مرشد آباد کی شہرت دور دور تک تھی۔

'اُن دنوں......' اریک ہیسٹنگز ایک لمحہ کو ٹھہرا___ صادق بھائی کا ترجمہ جاری تھا___ مرشد آباد بھاگیرتھی اور اب کے ہگلی ندی کے دونوں طرف بسا ہوا تھا۔ کہتے ہیں یہیں، یہیں بھاگیرتھی کے کنارے، پہلی بار تمہارے آباء و اجداد میں سے ایک، اور ہمارے وارن ہیسٹنگز کی ملاقات ہوئی تھی___ ایک بڑی ڈیل کے لئے......

'ڈیل؟'

محمد علی بھائی بچوں کی طرح کانپ گئے___ جیسے تیز ہوا چلی ہو اور تیز طوفانی ہوا میں اُن کا جسم مثل بید تھرّانے لگا ہو___

'ڈیل...... بزنس ڈیل.....'

محمد علی بھائی کے لئے وہ فرنگی ایک 'گورا' آدمی تھا اور یہ گورا آدمی اِس وقت مسکرا رہا تھا___

یکایک سر میں جیسے تیز تیز بجلی کڑکنے لگی___

'لیکن اتنے برسوں بعد___ یعنی دو سال نہیں دس سال نہیں، سو سال نہیں___ بلکہ ڈھائی سو سال......؟'

محمد علی بھائی کو حیرانی تھی___ اتنے برس میں تو قبرستان کی تاریخ بھی بدل جاتی ہے___ دنیا کی کون کہے؟ ڈھائی سو سال پرانے مردے تو پتہ نہیں کہاں سے کہاں نکل جاتے

ہوں گے ssہوہوss۔

'منحوست___' صادق بھائی کی آواز میں ناراضگی تھی___ یہی تو کمی ہے۔ ہم ہندوستانیوں میں۔ تاریخ بھول جاتے ہیں۔ نہیں بھولتے تو یہاں رہتے کیا؟ ان کی طرح چاند پر چلے گئے ہوتے___ یہی تو فرق ہے۔ ان کے لئے سب کچھ تاریخ ہے___ بلکہ سچ یہ ہے کہ اریک بھائی بھی تاریخ ہیں___ ان کا حال اور ماضی بھی تاریخ ہے......'

'لیس......' اریک ہسٹنگو نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا۔

صادق بھائی اُس کی طرف گھومے___ 'پتہ ہے۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں___ تمہیں تلاش کرنے میں ساری زندگی لگ گئی___ وارن ہسٹنگو کے مرنے کے بعد ڈیل کی یہ تاریخ کچھ پشتوں تک تو چلتی رہی مگر کسی کو بھی ہندوستان آنے میں کامیابی نہیں ملی___ دراصل وارن ہسٹنگو کے گھر والے، اُن پر زندگی کے آخری لمحوں میں لگنے والے الزام اور الزامات اور مقدموں سے بالکل خوش نہیں تھے___ پھر لگاتار کورٹ کچہری، گواہیاں، اس سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی طاقت کم ہو رہی تھی۔ کمپنی کے افسرِ اعلیٰ بھی کمزور پڑنے لگے تھے۔ لیکن تاریخ ان ڈھائی سو برسوں میں آنے والی نسل کو اس ڈیل کی کہانی سناتی رہی اور ہسٹنگو خاندان کا ہر آدمی سوچتا تھا___ وہ ہندوستان جائے گا___ لیاقت الدولہ کے خاندان والوں کو پکڑے گا___ اور اس تاریخی ڈیل کے بارے میں بتائے گا___'

معاذ اللہ! محمد علی بھائی صدیوں پرانی تاریخ کی اس محبت سے بے حد متاثر تھے___ مگر میرا گھر۔ میرے بارے میں......'

صادق بھائی نے اُس کا ہاتھ تھاما___ جو تاریخ کی حفاظت کرتے ہیں، وہ تاریخ میں شامل لوگوں تک پہنچ جاتے ہیں۔

'مگر___'

صادق بھائی، محمد علی بھائی کے ہاتھوں کو تھامے رہے___ 'DNA جانتے ہو یا نہیں؟'

'ہاں۔' محمد علی بھائی کو اپنے تاج پر فخر کا احساس ہوا___

'اسپیل برگ نے کھدائی میں ملے ڈائناسور کے انڈے سے پورا جوراسک پارک تیار کرلیا۔' کب، کیسے، کیا' جیسی چیزیں تاریخ میں نہیں آتیں___ صرف جانو، دیکھو اور سنتے رہو___'

'یس...... یو آر رائٹ.....'

محمد علی بھائی کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔ سب سمجھ گیا ___ سمجھ گیا صادق بھائی۔

لیکن کیا اور کتنا سمجھا تھا، محمد علی بھائی نے ___ لیاقت الدولہ اور سراج الدولہ کے خاندان کی 'رام کہانی' تو کب کے نوابوں کے قبرستان میں دفن ہو چکی تھی۔

مرشد آباد چھوڑے بھی ایک زمانہ ہو گیا ___ پھر کبھی وہ لوٹ کر تاریخ کی سنہری 'گپھا' میں نہیں گئے۔ وہاں تھا ہی کیا۔ سوائے ناامیدی اور ایک دُکھ بھری کہانی کے۔ وہ تو، اللہ اللہ خیر صلی جمنا پار، خوریجی میں دو چھوٹے کمروں والا ایک اصطبل مل گیا اور مل گئی بستی حضرت نظام ___ مل گیا ٹوپیوں والا ایک ٹھیلہ ___ اور مل گئے، انہی بستیوں میں اپنے صادق بھائی ___ جن سے کسی اُجاڑ دُکھ بھرے لمحے محمد علی بھائی نے ذکر کیا تھا، کہ وہ کس کے خاندان سے ہیں اور اب کیا ہو گئے۔

'نہیں اس بات کو آپ ایسے نہیں سمجھیں گے ___' ارک ہیسنگز کا چہرہ چمک رہا تھا ___ 'دراصل اُس وقت ہمارے سائنسداں زمین اور کرۂ باد کو لے کر ایک تجزیاتی رپورٹ لائے تھے۔ زمین کا کرۂ باد پانچ پرتوں کا بنا ہوا ہے۔

'ٹراپوس فیئر، اسٹریٹوس فیئر، میسوس فیئر، تھرموس فیئر اور ایکسوس فیئر.....'

'تو.....' محمد علی بھائی کے چہرے پر گھبراہٹ تھی..... اتنے سارے فیئر..... اس گھبراہٹ میں وہ ایریک ہسینگز کا چہرہ دیکھنا بھول گئے ___ جس کی دائیں آنکھ کے پاس کے کالے تل سے، روشنی کی چنگاریاں نکل رہی تھیں ___ ٹھیک ایسے، جیسے پرندے اُڑتے اُڑتے 'بجوکا' کو دیکھتے ہوں ___ ٹھہرتے ہوں ___ لوٹ جاتے ہوں۔ نہیں، یہ تمثیل ٹھیک نہیں ___ ہاں، یاد آیا، مولوی صاحب، مدرسے میں اپنی جگہ باہر جاتے ہوئے 'گوتکیہ' کو رکھ دیتے تھے، پھر اشارے سے کہتے تھے ___ 'یہ میں ہوں، جانا مت۔' اُن کے جانے کے بعد بھی گوتکیہ عجب عجب طرح سے مولوی صاحب کی شکلیں لیتا رہتا تھا۔ اس وقت کچھ ایسا ہی تھا۔ وہ ڈر بھی رہا تھا۔ سمجھنا بھی مشکل تھا۔ اُس پر اس گورے بھائی کا چہرہ ___ بڑا ڈیل ___ لیکن یہ ڈیل کے درمیان میں کرۂ باد کہاں سے آگیا۔

'ڈیل کے درمیان میں کرۂ باد؟' محمد علی بھائی خود کو روک نہیں سکے۔

ترجمہ کرنے والے صادق بھائی دل کھول کر ہنسے ___ گورے آدمی کی چھوٹی آنکھیں سکڑ گئیں ___ لیکن دوسرے ہی لمحے اُن میں چمک پیدا ہو گئی ___ صادق بھائی نے اُس کے لفظوں کا ترجمہ کیا ___ دس فول از سے انگ......

اوہ نوssنوss ارتھ ڈسنگو ہنس رہا تھا ___ پھر اُس نے کچھ کہا۔ اب اُس کی انگریزی اور ترجمہ ساتھ ساتھ چل رہا تھا ___

'جیسے جیسے ہم اوپر بڑھتے جاتے ہیں، ہوا ہلکی ہوتی جاتی ہے......'

'تو......'

'یہ سب کچھنا اتنا آسان نہیں۔ ہندستان میں ولایتی مال کی کھپت کے سلسلے میں ڈیل ہوئی تھی۔ ہری دوار، ایودھیا، بنارس اور ایسے ہی کچھ مذہبی مقاموں پر گیروا ریشمی کپڑے تھوک میں بھجوانے کی بات ہوئی تھی ___ لارڈ ویلزلی نے خود ہی بہترین مال کے لئے ہندوستان کے ان بڑے ہندو بازاروں کی اسٹیڈی کی تھی۔ مگر صادق دھیرے سے پھسپھسایا ___ محمد علی بھائی جتنا کہا جائے، اتنا ہی سمجھو۔ زیادہ آگے پیچھے مت دیکھو ___ آگے پیچھے دیکھو گے تو یہ ڈیل ہاتھ سے نکل جائے گی۔ فائدہ تمہیں ہوگا تو کمیشن مجھے بھی تو ملے گا۔ سمجھے کہ نہیں۔ اب کیا ہے کہ یہ لاٹری تمہارے نام کھل گئی بس......اب ایسے سمجھو......کہاں یہ......کہاں ہم......اتنا پڑھے لکھے ہیں اور ہم ___ کیا مقابلہ ہے ___ کوئی مقابلہ ہوتا تو دوسو سال سے زیادہ کیا یہ ہم پر حکومت کرتے......؟ ایک دن سب کی قسمت بدلتی ہے۔ سمجھو تمہارے دن بھی......

درمیان میں ارتھ ڈسنگو نے ناگواری سے اُس کی پھسپھساہٹ کے بارے پوچھا۔

صادق بھائی نے ترجمہ کیا......دس فول از سے انگ......

'اوہ......یس......' ارتھ ڈسنگو کے چہرے کی سلوٹیں ختم ہوئی تھیں......لیکن اب یہی سلوٹیں محمد علی بھائی کے چہرے پر 'اُچھل' کر چھا گئی تھیں ___

'معاملہ اُلجھا ہوا ہے ___'

'نہیں اُلجھا ہوا نہیں ___ ' صادق بھائی سمجھا رہے تھے ___ بس تمہارے سمجھنے کا پھیر ہے۔ آخر نواب سراج الدولہ کے خاندان سے ہو ___ ایک بڑے آدمی کی دوسرے بڑے آدمی سے ڈیل ہوئی تھی۔ ڈیل ناکام ہوئی ___ ڈھائی سو برس سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا ___ اور اس کے بعد......'

'ڈھائی سو...... کیا یہ کچھ زیادہ ___ زیادہ آپ کو نہیں لگتا؟'

'لگتا ہے تو کیا کریں؟' صادق بھائی کے چہرے پر ناراضگی تھی ___ یقین بھی ایک چیز ہوتا ہے ___ اور محمد علی بھائی۔ یہ تو ایک موقع ہے۔ سنہرا موقع ___ تمہارے لئے۔ ادھر اُدھر مت دیکھو۔ ذرا سوچو۔ ڈھائی سو سال پہلے جو ڈیل ہوئی تھی ___ وہ اجودھیا، ہری دوار اور ہندوؤں کو لے کر ___ اور اب کی ڈیل مسلمانوں کے ساتھ ___ تمہارے ساتھ۔ امریکہ، انگلینڈ سب تمہارے ساتھ ہیں ___'

'کہاں ساتھ ہیں؟'

'کیوں؟'

اُسامہ کیا پہلے ہمارے آدمی تھے۔ اُن کے تھے۔ ایک ڈیل تو اُن کی بھی ہوئی تھی۔ کیا ہوا اور بغداد میں عراق میں، ہم کیا اردو اخبار بھی نہیں پڑھتے ہیں۔

محمد علی بھائی کی سرمہ لگی آنکھوں میں 'ذہانت' کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔

سب کرۂ باد کی وجہ سے۔ اُس وقت زمین کا کرۂ باد بدل گیا تھا۔ ریشمی کپڑے پہننے والوں کو پھپھولے نکل جاتے تھے۔ بڑے بڑے دانے چیچک جیسے۔ انگلینڈ میں اس کو لے کر میٹنگ ہوئی۔ وارن ہیسٹنگز بھی شامل ہوئے اور کہا گیا اس وقت ہندوستان سے درآمد کئے ہوئے ریشم سے انگلینڈ میں تیار کیا گیروایا بھگوا کپڑا ہندوستان بھیجنا مشکل ہے۔ یہ ہندو ذات کو نا صرف پریشانی میں ڈالنے جیسا ___ بلکہ اس سے انگلینڈ کے راجاؤں کے لئے اُن میں یقین میں بھی کمی آئے گی اور یہ ڈیل ہوئی تھی ___ تمہارے پُرکھوں میں سے ایک لیاقت الدولہ سے، جن کی لکھنؤ سے مٹیا محل اور کلکتہ کے مٹیا برج تک طوطی بولتی تھی۔

●●

قارئین

یہ قصہ بھی ڈھائی سو سال پہلے کا ہے اور اس کہانی میں تاریخ اتنا ہی ہے، جتنا دال میں نمک اور سچی بات یہ ہے کہ ہماری اس کہانی میں 'سانڈ' کا کوئی تذکرہ نہیں ہے اور جو تذکرہ ہے، وہ ٹوپی کا ہے۔ اس میں ڈھائی سو سال پہلے کی تاریخ آتو گئی ہے۔ مگر اتفاق سے۔

اور اتفاق ہی کہنا چاہئے کہ حال فی الحال شروع ہوئے اس قصے کی بنیاد تب پڑی،

جب ہندوستان میں غیر ملکی سرمایہ کاری کے سہارے ہندوستان کو اٹھاتے ۔ سرکار کا چراغ بجھ گیا اور بام پنتھیوں کے سہارے بنی نئی سرکار نے غیر ملکی سرمایہ کاری پر اپنی ہری جھنڈی تو سنا دی ۔ لیکن بحث میں بھی گھر گئے ۔ معاشی پالیسیوں اور بجٹ پیش کرنے کے شور شرابے کے دوران ہی وارن ہیسٹنگز کے خاندان کے لوگ نے، سراج الدولہ کے خاندان سے مل کر اپنی نئی ڈیل کی منشا ظاہر کر دی تھی اور جیسا میں نے بتایا، اس میں نمک برابر اتہاس کا دخل تو رہے گا۔ پلاسی کی جنگ، ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت اور ہندوستان کا غیر ملکی حکومت کا غلام بن جانا___ یہ واقعہ، (اتفاق ہی ہے) اس کہانی سے جڑی ہے ۔ اورنگ زیب کی موت کے بعد اُس کی اولادوں کی خانہ جنگی شروع ہو گئی ۔ سارے صوبوں میں بدامنی پھیلنے لگی ۔ مغلیہ حکومت کے دو اہم صوبے دکن اور بنگال، خود مختار بن گئے ۔ بنگال میں علی وردی خاں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے دائرے کو بڑھنے سے روک رکھا تھا۔

1756 میں علی وردی خاں کی وفات ہوئی اور اُن کی وصیت کے مطابق سراج الدولہ کو بنگال کا نواب تسلیم کر لیا گیا ۔ دہلی حکومت اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ اُس سے فرمان حاصل کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا۔ سراج الدولہ کو بنگال کا نواب تسلیم کر لیا گیا۔ دہلی حکومت اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ اُس سے فرمان حاصل کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا۔ دہلی حکومت اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ اُس سے فرمان حاصل کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا۔ سراج الدولہ کے مقابلہ ایسٹ انڈیا کمپنی، سرمایہ داری کی تیزی سے اُبھرنے والی سب سے بڑی طاقت تھی ۔ اس کا مرکزی دفتر لندن میں تھا۔ لیکن شاخیں بمبئی، مدراس اور کلکتہ میں تھے اور جو ایک دوسرے میں سے آزاد تجارت کرتی تھی ۔ لیکن وہ آپس میں تعلقات بنائے رکھتی تھیں ۔ اٹھارہویں صدی میں مرکزی حکومت کی کمزوری کی وجہ سے ایسٹ انڈیا کی شاخوں نے مقامی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ مدراس کلکتہ میں کمپنی کے چالاک افیسر بھیجے گئے تاکہ ہندوستان کی بڑی منڈی پر دھاوا بولا جا سکے ۔ ایسے افسران میں وارن ہیسٹنگز بھی تھا جو 1772 میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا گورنر بنا۔

اُس وقت ہندوستان کی آبادی کا ایک بڑا حصہ انیسویں صدی کے پہلے دہائی تک متفرق صنعتوں میں لگے تھے ۔ بُنکاری، عوام کا قومی روزگار تھا۔ لاکھوں عورتیں کتائی سے اپنے پریوار کے لئے کمائی کرتی تھیں ۔ انگریزی چمڑے کا کام سے لاکھوں کو روزگار ملتا تھا۔ وارن ہیسٹنگز نے طے کیا، کچے ریشم کی پیداوار کو بڑھاوا دیا جائے ۔ ہدایت نامہ جاری ہوا۔ ریشم کے کاریگر، کمپنی

کے کارخانوں میں کام کریں اور جو نہیں کریں گے، سزا کے حقدار ہوں گے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان میں ریشم اور سوتی کپڑوں کا بننا کم ہوگیا۔ جن لوگوں نے پچھلی صدیوں میں یوروپ اور ایشیا کے بازاروں میں یہ مال غیر ممالک سے بھیجے تھے، وہ ہی ان مالوں کو بڑھتے ہوئے مقدار میں باہر سے منگانے لگے۔

کمپنی کا اختیار نامہ 1813 میں رینول ہوا۔ تلاش کی گئی۔ گواہیاں ہوئیں۔ وارن ہیسٹنگز، ٹامس منٹو، سر جان میلکم وغیرہ گواہوں کی گواہیاں لی گئیں۔

وارن ہیسٹنگز کا بیان نپا تلا تھا۔ ہندوستانی پیداوار کے بارے میں وہ اتنا بھر جاننے کے بارے میں دلچسپی رکھتے ہیں کہ برٹش مال کس طرح یہاں اپنی جگہ بنا سکتا ہے اور ہندوستانی صنعت کی قیمت پر کس طرح برٹش صنعت پنپ سکتے ہیں۔

وارن ہیسٹنگز سے پوچھا گیا۔ کیا ہندوستانی عوام، اپنے استعمال کے لئے یوروپ کے مال کی مانگ کر سکتی ہے۔

وارن ہیسٹنگز نے جواب دیا تھا___ ہندوستان کے غریبوں کو کسی کمی کا احساس نہیں ہے۔ انہیں چاہئے تھوڑا تھوڑا، روٹی کپڑا اور مکان۔ یہ ساری چیزیں وہ اپنی دھرتی سے پا سکتے ہیں۔

سر جان میلکم کا ماننا تھا، ہندو باہمت، اُداس اور بھلے مانس ہیں وہ سچے اور کھرے ہیں۔ وہ ولایتی مال نہیں کھپا سکتے۔ کیونکہ اُن میں خریدنے کی شکتی نہیں ہے۔ وہ آسان اور سادہ زندگی ہی گزارا کرتے ہیں۔

'لیکن اُنہیں یہی آسان اور سادہ زندگی غیر ممالک سے مہیا کرائی جائیں تو؟'

وارن ہیسٹنگز کا جواب تھا: شاید اسی دن کے لئے وہ یہاں بھیجے گئے ہیں۔

●●

یہی وقت تھا، جب کمپنی کے کارخانوں کی وکالت کرنے والے سراج الدولہ کے بھائی لوگوں میں سے ایک لیاقت الدولہ وارن ہیسٹنگز کے رجوع میں آئے تھے اور اُن سے ہیسٹنگز کے مکالمے کچھ اس قسم کے رہے۔

'ساتھ دو گے؟'

'ہاں۔'

'بڑی ڈیل بڑا پیسہ۔'

'آپ حاکم۔'

'ریشم کے کپڑے بنگال تک محدود ہیں۔ تم مرشد آباد کے۔'

'جو حکم حاکم۔'

ہمارے پاس بارہ ریزیڈینسیاں اور کئی کارخانے ہیں۔ کچھ جگہ پٹنی ریشم، مہین ریشم کے مال بنتے ہیں۔ ہمیں اچھے مہین ریشم چاہئے۔ ہندوؤں کو وہی کپڑے دو، جو وہ پہنیں، وہی کھانے کو دیں، جو وہ کھائیں اور وہی رہنے کو دو جو...... ان سے سستے میں ریشم لو۔ مال ولایت بھی بھیجا جائے گا۔ انہیں بھگوا ریشم کی دھوتی، ریشم کے کُرتے اور ریشم کی جنیئو دو۔ لیاقت الدولہ لاکھوں میں کھیلو گے تم۔

لیکن لیاقت الدولہ کے لاکھوں میں کھیلنے کا سپنا پورا نہیں ہوا۔ ہندوستانی آزاد پیدا کار کے لئے، کمپنی کا قدم سیدھے اُنہیں اور غلام کرنا تھا۔ اختیار نامہ کے رینول کی بات ہوئی۔ شور شرابا ہوا اور لیاقت الدولہ سے ہونے والی بڑی ڈیل انگریزوں کی دھوکہ بازی کی بھینٹ چڑھ گئی۔

اِس المیہ کو وارن ہیسٹنگز نے اپنی ڈائری میں یوں لکھا:

'جو کچھ ہوا، اُس سے ہمارے برٹش کے کام کرنے والوں کو تعجب نہیں ہونا چاہئے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہئے ہندوستان کے کام کرنے والے، انگلینڈ کے کام کرنے والوں سے، پہلے اِس صنعت میں ہیں۔ ان کے اپنے حدود ہیں۔ پانی اور کھانا کم ملتا ہے پھر بھی اُن میں محنت کی لگن غضب کی ہے ہم یعنی برٹش کام کرنے والوں سے، پہلے سے اِس صنعت میں ہیں۔ ان کے اپنے حدود ہیں۔ پانی اور کھانا کم ملتا ہے پھر بھی اُن میں محنت کی لگن غضب کی ہے ہم یعنی برٹش کام کرنے والوں سے زیادہ ہم ہندوؤں کو نہیں لبھا پائے، لیکن ایک دن___ آنے والے دنوں میں سے کسی ایک دن ہندوستانیوں کے ساتھ مل کر ہمیں اس آنے والے دنوں میں سے کسی ایک دن ہندستانیوں کے ساتھ مل کر ہمیں اِس طرح غیر ملکی سرمایہ کاری کو بڑھاوا دینا پڑے گا۔ ہندوستان انوکھی صلاحیت والا، انوکھا ملک ہے اور یہ یاد رکھنے کی بات ہے وہاں مذہب ہی 'اعلیٰ' ہے۔ مستقبل میں ہندوستان ہی سب سے بڑا بازار سے بننے کی گنجائش بھی رکھتا ہے۔

قارئین

قصہ کوتاہ، یہ وہی پُرزہ تھا، جسے چاندی کے ورق میں جیسی صدوقچی میں رکھ کر، انتہائی حفاظت سے اریک ہیسنگو نے نکال کر اُس کے سامنے رکھا تھا___ لو، دیکھو......

محمد علی بھائی کے ہاتھ بڑھانے بھر سے وہ تھر تھرانے لگا تھا۔

صادق بھائی نے ترجمہ کیا___ 'چھونا مت، صرف دیکھنے کی چیز......'

'لیکن......'

'لیکن کیا؟'

'دیکھوں تو سہی کیا لکھا ہے۔'

'تاریخ، اتہاس، اتہاس کو چھو سکتے ہو تم......'

'نہیں......'

'دیکھ تو سکتے ہو۔'

'کیا؟'

'وہی جو حال کا اتہاس ہے۔'

'حال کا اتہاس......؟'

'لیس۔ جو تم نے بنایا......تم نے۔'

اُجلے آدمی کا چہرہ خوشی سے جگمگا رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر کچھ کہہ رہا تھا اور اُس کا ترجمہ ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

پہلی ڈیل اجودھیا، ہری دوار، لیکن اب تمہاری پہلی ہندوؤں کی اور جب تمہاری یعنی مسلمانوں کی۔ اجودھیا کی ڈیل وہیں ہوگی۔ وہ کمزور تھے۔ بچے اور بھولے بھالے۔ اور تم سے تو ڈر لگتا ہے۔ تم تو ورلڈ ٹریڈ ٹاور بھی گرا دیتے ہو۔ ایک دم ورلڈ ٹریڈ سے زیرو آور تمہارے اُسامہ تمہارے صدام___ سمجھ رہے ہو نا تم نے، تم نے ایک ہو کر سرکار گرا دی۔ 'ہندتو' کی سرکار کس نے گرائی۔ تم نے کیونکہ پہلی دفعہ ایک تھے تم اور بابری مسجد، ورلڈ ٹریڈ ٹاور منہدم کئے جانے سے گجرات تک تم زیادہ سے زیادہ مسجدوں میں پہنچ رہے ہو۔ لگ___ زیادہ سے زیادہ، تمہیں زیادہ سے زیادہ ٹوپیاں چاہئیں۔ ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں۔ پہلے والی جو ڈیل نہیں ہوئی تھی، ہم اُس کی قیمت چکا دینے گے۔

'کیا چکائیں گے؟'

محمد علی بھائی کا جسم، اچانک چلنے والی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سے لرز رہا تھا___

'جو مانگو کے ملے گا۔'

'مانگ۔ مانگ نا......' صادق بھائی کی بری بڑی آنکھیں ایسی ہوگئی تھیں، جیسے اُنہوں نے تندور میں 'سینکے' جانے والے تندوری چکن کو تاڑ لیا ہو۔

'چلو ہم ہی دیتے ہیں۔' اریک ہیسنگر لٹانے پر آگئے تھے۔

'دہلی تم کو دیا۔'

'دہلی......'

'ہاں___ معنی دہلی مارکیٹ۔' صادق بھی ہنسے۔

محمد علی بھائی کی آنکھیں جیسے پتھر تھیں۔ ایسے دہلی کیسے دے دیا۔ دہلی تو کبھی مغلوں کی، کبھی انگریز کبھی باجپائیوں کی اور کبھی سونیا کی ہے۔

'چلو لکھنؤ لے جاؤ، اودھ دے دیا۔'

'اودھ؟'

'معنی پورے اودھ کا مارکیٹ۔' صادق بھائی کھلکھلا کر ہنس رہے تھے___ 'دیکھتے کیا ہو۔ مصافحہ کرو۔ مصافحہ اتنی بڑی ڈیل۔'

'ارے ہاتھ بڑھاؤ۔'

اُس نے ہاتھ بڑھایا۔ یعنی محمد علی بھائی نے ہاتھ بڑھایا مصافحہ یعنی ہاتھ ملانے کے لئے اور ٹھیک اسی لمحہ وہ اپنی دنیا، بستی حضرت نظام الدین اور ٹھیلے کی دنیا میں واپس آگئے۔ اریک ہیسنگر تھوڑا سا محمد علی بھائی کے کالے مٹ میلے، کُھردرے ہاتھوں کو بڑھا دیکھ کر تھوڑا ٹھٹھکا تھا۔ ٹھیک ایسے ہی اُسے کرنٹ لگا تھا، ایک بار جب دو سال کی ڈیوٹی پر 'شیخ' کی جنت، کار چلانے وہ سعودی گیا تھا۔ فائدہ اتنا ہوا کہ دو سال میں 'عمرہ' بھی کر آیا اور حج بھی ہو گئے۔ وہاں رہتے، سہتے، کار چلاتے ہوئے محمد علی بھائی کی آنکھوں میں اتنی روشنی بڑھی تھی، جتنا اِس ڈیل کا سن کر بھی نہیں بڑھی۔

بس، وہ تو ایک دن، شیخ کے حساب کتاب کو لے کر دُکھی محمد علی بھائی نے سلام ٹھونک دیا___

'سلام شیخ۔ اپنا ٹھیلا پیارا۔ اپنی بستی حضرت نظام الدین پیاری۔ تبلیغی جماعت کا دفتر پیارا اور اپنی پلی دو پلی ٹوپیاں پیاری۔ میں تو چلا___ '

'کیا سوچنے لگے؟' صادق بھائی نے جھٹکا دیا تو اُسے خیال آیا۔ اریک ہسینگز نے مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ پینٹ کی جیب سے باہر نہیں نکالا ہے۔

'مجھے سوچنے کا ٹائم چاہئے۔'

'ٹائم؟'

'آخر ڈیل ہے۔ مذاق ہے۔'

اریک ہیسنگز کے پوچھنے پر صادق نے ترجمہ کیا___ ہی ٹولڈ......

'اوہ لیس۔ لیس......'

صادق بھائی نے بتایا___ 'ہم پھر آئیں گے۔ سوچنے کے لئے دو دن کی مہلت ہے۔ اُس کے پاس اور ہاں۔ کل یہ تمہارے ساتھ لنچ بھی کریں گے۔ یہیں کریم میں اور___ تمہارے کارخانے سے ملیں گے، جہاں تمہاری ٹوپیاں بنتی ہیں۔ ہےss ای۔ مسٹر محمد علی ٹھیک؟'

صادق بھائی، محمد علی بھائی کی سرمہ لگی آنکھوں میں جھانک رہے تھے۔ جاتے جاتے تپاک سے ہاتھ ملایا۔ اریک بھائی کی مرسڈیز باہر تھانے کے پاس لگی تھی۔ بستی حضرت نظام الدین سے باہر نکلتے ہی تھانہ ہے۔ وہاں عام طور پر بستی یا فاتحہ پڑھنے آنے والے لوگ گاڑیاں لگا دیا کرتے ہیں اور ان گاڑیوں کے لئے یہیں کے رہنے والے پانچ دس روپے لے کر گاڑی کی حفاظت کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے، تھانے بھی کچھ پیسے پہنچ جاتے ہوں۔ مگر یہ بات یقین سے اس لئے بھی نہیں کی جا سکتی، یہاں سارا علاقہ'...... مطلب نیکی کا۔ جو بھی کام کرو گے، محبوب الٰہی خوش ہوں گے۔

●●

'کریم میں کھانا کھائیں گے؟'

اتنی بہت ساری باتوں میں جو بات محمد علی بھائی کو یاد رہی، وہ یہ تھی کہ کریم میں کھانا کھائیں گے۔ کریم مطلب اسٹیٹس سمبل۔ یہاں، ٹھیلا لگانے سے پہلے سے ہی وہ کریم کے بارے میں کتنی کہانیاں سنتا رہا۔ جب کے کریم ہے ہی کتنی دور۔ ٹھیلے سے دس قدم ناپ لو۔ دروازہ پر باوردی چوکیدار آتے ہی سلام داغتا ہے۔

کریم میں کھانے کی 'ہمت' اپنی جگہ تھی۔ مگر___ یہ بات بھی بار بار پریشان کرتی تھی

کہ وہ اریک بھائی کو جواب کیا دیں۔ اچھا ہے، کریم کی دھیمی دھیمی روشنی میں برسوں کا خواب پورا کریں اور اریک بھائی کو جواب دیں۔ ایسا ممکن ہی نہیں۔

ایک بات اور تھی ___ اریک بھائی نے کہا تھا ___ جہاں ٹوپیاں بنتی ہیں، وہ اُس کا خانے کو بھی دیکھنا چاہئیں گے۔ آخر کو لمبی ڈیل کا سوال ہے۔ جتنا مال یا آرڈر چاہئے، اُس حساب سے اریک بھائی اس ٹوپی مارکیٹ کی 'ٹوہ' لینا چاہتے تھے......

بے حد اشتعال میں ڈوبی رات کیسی ہوتی ہے، یہ پہلی بار محمد علی بھائی نے جانا۔ رات بھر رہ رہ کر کروٹیں بدلتے رہے۔ کبھی بچوں کو چھوتے۔ کبھی اُٹھ کر بیوی کے ہونے کا احساس کرتے۔ کیا سچ مچ اُن کی ڈیل ہوگی۔ کیا اِس ڈیل سے اُن کی دنیا بدل جائے گی۔

●●

صبح چھ بجے ہی صادق بھائی گاڑی لے کر گھر آ گیا۔ اریک بھائی بستی حضرت نظام الدین، درگاہ پر پہنچ چکے تھے اور اندر آستانے میں گورے چٹے مجاوروں کو دنا دن سو دو سو کی رسید اور صندوقہ لئے بیٹھے 'تاجروں' نے اریک بھائی کو محاصرہ میں لے لیا تھا۔ یہ کوئی بہت اچھا منظر نہیں تھا، محمد علی بھائی کے لئے۔ ایک لمحہ کو رات والا سپنا 'فر......ر' ہو گیا۔ اریک بھائی نے اُسے دیکھ کر خوشی ظاہر کی مگر محمد علی بھائی کے چہرے پر 'سرد مہری' پسری رہی۔

'تو چلیں۔' صادق بھائی نے پوچھا ___

'صفیہ کی ڈیری' ___ یہی وہ جگہ تھی، جہاں محمد علی بھائی کی ٹوپیاں بنا کرتی تھیں۔ تین بڑے بڑے ہال تھے، زیادہ تر عورتیں تھیں، جو یہ کام کیا کرتی تھیں۔ بستی حضرت نظام الدین کے اندر گلیوں میں یہ 'ڈیری' تھی۔ ایک 'ہال' صرف مشینوں کے نام تھا۔ جہاں پاؤں سے چلنے والی مشینوں پر عورتیں ٹوپی کو آخری شکل دیا کرتی تھیں۔ سوت، ریشم، جھالے سے لے کر مشین ایک ایک چیز کو اریک بھائی دیکھتے رہے۔ تب ایک سورج کافی سر چڑھ آیا تھا۔ اب منزل تھی کریم کی۔ صادق بھائی کا خوف یہ تھا کہ بات بن جائے اور اُن کا کمیشن نہ جائے۔

جبکہ محمد علی بھائی کی پیشانی پر اُگنے والی تیسری آنکھ اب تھوڑی تھوڑی کھلی تھی۔ وہ نا زیادہ جوش میں تھے، نا حوصلہ افزا، وہ ٹھیک ایسے ہی ہندوستانی تھے، جیسے 'ہندوستانی ہندوؤں کے لئے وارن ہیسٹنگز نے اُس ڈیل کے بارے میں غور کیا تھا ___ 'یعنی سب کچھ تھوڑے تھوڑے میں

مطمئن رہنے کا نظریہ اور یہ نظریہ کسی بھی مارکیٹ اسٹریٹجی کو منہدم کر سکتا تھا۔

●●

دلستین ___ 'صادق بھائی اُس کی طرف مڑے ___ تب ہندوستان میں تین قسم کے شہتوت تھے۔ یوروپ میں اُگایا ہوا سفید شہتوت، چین میں اُگایا ہوا کالا بیگنی اور ہندوستانی شہتوت۔ تین قسم کے کیڑے تھے۔ دیسی، اٹلی اور چین کے کیڑے۔

ارِیک بھائی نے ایک چھوٹی سی ڈائری کھولی ___ کمپنی کے پاس 13-12 ریشم گھر تھے۔ کمپنی پیشگی دیتی تھی۔ لیکن کمپنی پر پہلا الزام تو یہی لگا کہ ہندوستانی سیاست آزادی کے ساتھ ساتھ معاشی اور صنعتی آزادی بھی کھوتی جا رہی ہیں۔

'وہ گواہوں' مقدمہ، مزاحمت سے تھوڑے اُداس سے تھے۔ وہ تو سطح تجارت بڑھانا چاہتے تھے۔ شاید اِسی لئے 'بھاگی رتھی' کے پاس وہ ایک بار پھر لیاقت الدولہ سے ملے۔ ملنا طے ہوا۔ رات 7 اور 8 کے درمیان۔ وارن ہیسٹنگز اپنی گھوڑا گاڑی میں تھے۔ لیاقت الدولہ کو گھر نہ بلانے کے پیچھے بھی کئی وجہیں تھیں، جیسے مقدمہ سے پہلے کچھ تیار کردہ ریشمی گیروا کپڑوں کے کچھ تھان ہری دوار، بنارس اور برندابن جیسے بازاروں میں پہنچائے گئے تھے..... 'پہلی بار۔ لو شروع کرو ___'

ارِیک ہیسٹنگز اُس کی طرف مڑے۔ کریم کی میز پر خوشبو دیتا کھانا رکھ دیا گیا تھا۔ لذیذ پکوان باوردی ویٹر۔ سر جوڑے کھڑا تھا۔ اُس نے دیکھا، صادق بھائی قورمے کا گوشت اپنی پلیٹ میں ڈال رہے ہیں۔

اور یہ کہانی کا ڈراپ سین ہے۔ مقدمہ یا ناش اِسی بات پر تھا۔ پتہ نہیں کس نے منڈی میں افواہ اُڑا دی کہ ریشم کے مال میں گائے اور سور کی چربی ملی ہوئی ہے۔ اِٹس ٹوٹل نانسینس اینڈ انڈا جسٹیبل الگ الگ علاقوں سے دنگے پھیلنے کی خبر آ چکی تھی۔ اور......

ارِیک ہیسٹنگز نے گوشت کا نوالہ توڑا ___ ٹھیک اُسی وقت وارن ہیسٹنگز کی گھوڑا گاڑی 'بھاگی رتھی' کی طرف بڑھ رہی تھی کہ راستے میں ہی اُنہیں دیوانی کا ایک آدمی گھوڑا بھگاتا اُن کے پاس آیا اور بولا ___ آگے نہ جائیں۔ لیاقت الدولہ مار ڈالا جا چکا ہے۔ کمپنی کی فوج الرٹ ہے۔ کچھ پاگل ہندوستانی ہیں، جنہیں سمجھنا ضروری ہے۔ بہتر ہے کہ......؟'

وارن ہیسٹنگز پر لگنے والے اِس ایمپیمنٹ کے مقدمے میں خلاصہ کیا گیا___

''ہندوستانیوں کو ہندوستانیوں کے انداز میں ہی سمجھا جائے۔ اُن کے مذہب کو چھیڑے بغیر۔ وہ مذہب کے معاملے میں شہد کی مکھی کے چھتوں کی طرح ہیں۔ جس سے اُن پر حکومت کرنا آسان نہیں رہ جائے گا۔''

●●

قارئین!

قصہ کوتاہ۔ شام ڈھل گئی تھی۔ بستی حضرت نظام الدین اندھیرے میں ڈوب گئی تھی۔ کریم میں کھانے کے بعد تھوڑا سیر سپاٹا ہوا۔ پھر وہ ہمایوں کے مقبرے کی طرف نکل گئے۔ واپس لوٹنے تک چراغ روشن ہو چکے تھے۔ گاڑیوں کا شور تھم گیا تھا۔ آسمان پر تارے ٹمٹما آئے تھے۔ اریک آہستہ سے بولا___ ڈھائی سو برس اتہاس، اتہاس بدلنے کے لئے کافی ہوتے ہیں، نہیں؟

'یس......' صادق بھائی بتا رہا تھا___ 'سر! جنون تو وہی ہے۔ اجودھیا سے گودھرا اور گجرات تک۔'

'اب ہندو دھوتی کم پہنتے ہیں۔' اریک بھائی آہستہ سے ہنسا___ لیکن مسلمان ٹوپی ضرور پہنتے ہیں۔ اور پوری دنیا میں بستی حضرت نظام الدین سے نِکارگوا، اور چین سے جاپان تک۔ پچھلی ڈیل ناکام ہوگئی تھی لیکن......

مرسیڈیز دور کھڑی تھی۔ چاند کی روشنی میں، اندھیری سڑک پر تین بھوتوں کے سائے زمین پر نشان بناتے چل رہے تھے......

اریک بھائی انگریزی میں بولے___

صادق بھائی نے ترجمہ کیا___ ''تم ساتھ دو۔ اِس بار ٹوپی ہم پہنائیں گے۔ مسلمانوں کو۔''

آخری دو لفاظ وہ اتنے آہستے سے بولے کہ سامنے سے آتی گاڑی کے ہارن کے درمیان یہ الفاظ دب کر رہ گئے تھے۔

ڈراکیولا

مصنف کا بیان

''میں ہر بار تمہارے گھر کی الگنی پر گیلے کپڑے کی طرح 'ٹنگی' رہی۔ تم میرے لئے مٹھی مٹھی بھر دھوپ لاتے تھے۔ اور میں تھی، برف جیسی یخ ___ دھوپ تمہاری مٹھیوں سے جھر جھر جاتی تھی...... سوکھتی کیسے میں......؟ تمہارے ہی گھر کی الگنی پر ٹنگی رہی۔ دُکھ دینے کے لئے تمہیں۔''

وہ کچھ ایسا ہی سوچتی تھی۔ اپنے بارے میں ___ وہ یعنی، صوفیہ مشتاق احمد۔ اُسے اپنے بارے میں کچھ بھی سوچنے کا حق حاصل تھا۔ جیسے یہ کہ راتیں کیوں ہوتی ہیں؟ جیسے یہ، کہ آسمان پر ٹمٹماتے تاروں میں، اُس کی بھولی بسری عمر کیسے سما جاتی ہے۔ جیسے یہ کہ صبح کیوں ہوتی ہے۔ سورج کیوں نکلتا ہے۔ دھوپ سے زندگی کا کیسا رشتہ ہوتا ہے ___؟

قارئین، مجھے احساس ہے کہ میں نے کہانی غلط جگہ سے شروع کردی۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ایسا میرے ساتھ اکثر ہوا ہے۔ مگر پیارے قارئین، مجھے اس بات کا اعتراف کرلینے دیجئے کہ مجھے اس کہانی کو لکھنے کا کوئی حق نہیں تھا اور یقین جانیے، اس کہانی کے کرداروں سے، ملنے سے قبل تک مجھے اس بات کا احساس تک نہیں تھا کہ زندگی سے جڑی بے حد معمولی سچائیاں اتنی تلخ، اتنی سنگین بھی ہوسکتی ہیں ___ مجھے یہ بھی احساس ہے کہ آج کے عہد میں، جس کے بارے میں یہاں تک کہا جاتا ہے کہ اس سے زیادہ مہذب ترین دنیا کا کوئی تصور جارج بش کے پاس بھی نہیں ہے ___ اور نیوکلیائی ہتھیاروں کی، انسانوں کے قتل عام کی اس سے بدصورت مثال شاید تاریخ کے بے رحم صفحوں پر بھی مشکل سے ہی ملے گی ___ مجھے احساس ہے کہ انسانی بم،

جینوم، کلوننگ اور نیوٹکنالوجی کے اس عہد میں میں آپ کو ایک ایسی کہانی سنانے جا رہا ہوں، جس پر چوتھی دنیا کے مہذب ترین لوگ شاید ہی بھروسہ کرسکیں ___ انسانوں کو غلام بنانے والی کہانیاں اور غلاموں سے کیڑے مکوڑوں سے بھی زیادہ بدترین سلوک کی فنتاسیاں، معاف کیجئے گا، لوگ بھولے نہیں ہیں ___ تاریخ کے صفحات اذیت اور جبر کی مثالوں سے بھرے پڑے ہیں ___ لیکن یقین جانئے، میں ایسی کوئی رس بھری، لذیذ داستان آپ کے سامنے رکھنے نہیں آیا ___ اور آپ ہنسیں گے، یقیناً آپ کو ہنسنا چاہئے ___ کہ خود کو مہذب ثابت کرنے کی ریس میں اگر آپ کو کوئی ایسا قصہ سنایا جائے کہ عظیم طاقتوں میں سے ایک بننے جا رہے ملک ہندستان میں، سن 2005 میں، ایک مسلمان لڑکی اپنی شادی کے لئے 'شاہزادوں' کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی اور اچانک ایک دن اُس نے ایک تنہا، اُداس کمرے میں ___ آسیبی داستانوں کے مشہور زمانہ کردار **ڈراکیولا** کو دیکھ لیا ___ تو چونکئے گا مت ___

اور یقین جانیے، ہماری اس کہانی کی کردار صوفیہ مشتاق احمد کے ساتھ یہی ہوا ___

●●

آدھی رات کا گجر بج چکا تھا۔ کمرے میں زیرو پاور کا بلب جل رہا تھا۔ باہر خوفناک آندھیاں چل رہی تھیں۔ پتے سرسرا رہے تھے۔ باہر کوئی جنگل نہیں تھا۔ پھر بھی چمگادڑوں، بھیڑیوں، الو اور طرح طرح کی خوفناک آوازیں رات کے پُراسرار سناٹے کو اور بھی زیادہ خوفناک بنا رہی تھیں اور یقیناً یہ دستک کی آواز تھی ___ نہیں۔ کوئی تھا، جو دیواروں پر رینگ رہا تھا ___ کیا ویمپائر ___؟ اُف، خوفناک آوازوں کا ریلا جسم میں دہشت کا طوفان برپا کرنے کے لئے کافی تھا۔ سہمی ہوئی سی وہ اٹھی۔ بدن میں کاٹو تو خون نہیں ___ وہ اٹھی، اور تھرتھراتی، کانپتی کھڑکی کی طرف بڑھی۔ لڑکھڑاتے کانپتے ہاتھوں سے کھلی کھڑکی کے پٹ بند کرنے چاہے تو ایک دم سے چونک پڑی ___ کوئی تھا جو دیواروں پر چھپکلی کی طرح رینگ رہا تھا۔ اُف۔ اُس نے خوفزدہ ہو کر دیکھا۔ یقیناً یہ ڈراکیولا تھا، ہونٹ انسانی خون سے تر ___ دانت، لمبے، بڑے اور سرخ ___ وہ اپنے 'کوفن' سے باہر آیا تھا۔ صبح کی سپیدی تک اپنے ہونے کا جشن منانے یا پھر انسانی خون کا ذائقہ تلاش کرنے...... وہ یکبارگی پھر خوف سے نہا گئی۔ کسی اسپائیڈر مین کی طرح ڈراکیولا اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دیوار پر آرام سے چھپکلی کی طرح ___ پنجوں پر اُس کی گرفت مضبوط

تھی۔ وہ اُسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ چیخنا چاہتی تھی مگر...... رینگتا ہوا، ڈراکیولا، ایکدم، دوسرے ہی لمحے اُس کے کمرے میں تھا ___ اُس کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک تھی...... اور اُس کے نوکیلے دانت اُس کی نازک ملائم گردن کی طرف بڑھ رہے تھے...... اُس کی آنکھوں میں نیم بے ہوشی کی دھند چھارہی تھی ___

مصنف سے صوفیہ مشتاق احمد کی بات چیت

'اُف، ڈراؤنا خواب، لیکن اس صدی میں ڈراکیولا ___ آپ کتابیں بہت پڑھتی ہیں، ڈراؤنی کتابیں؟'

'نہیں پڑھتی۔'

'پھر یہ خواب'

'نہیں، یہ خواب نہیں ہے۔ دیکھئے......'

مصنف کے لئے یہ صبر آزما لمحہ تھا۔ یقیناً اُس کی گردن کی ملائم جلد کے پاس کئی داغ تھے ___ لیکن کیا یہ ڈراکیولا کے نوکیلے دانتوں کے نشان تھے، یا...... مصنف اِن 'اذیت گزار' لمحوں کے سفر سے، پھیکی ہنسی ہنستا ہوا اپنے آپ کو باہر نکالنے کا خواہشمند تھا ___

'یقیناً یہ داغ...... آپ سمجھ رہے ہیں نا، ایک صبح ہم اٹھتے ہیں۔ اور کیڑے نے...... کیڑا...... آپ سمجھ رہے ہیں نا......؟'

صوفیہ مشتاق احمد کا چہرہ اس وقت، لیونارڈو دی ونچی کی پینٹنگ مونالزا کی طرح ہورہا تھا، جس کے تاثر کو آپ لفظوں کا لباس پہنا ہی نہیں سکتے۔ یقیناً...... وہ کیڑا ہی تھا۔ نوکیلے دانتوں والا ایک خوفناک کیڑا...... اور آپ سے زیادہ بہتر کون جانے گا کہ اس صدی میں انسان سے زیادہ خوفناک کیڑا...... دوسرا کون ہوسکتا ہے......'

ہے...... ہے...... ہے......، مصنف پھیکی ہنسی ہنسنے پر مجبور تھا...... 'یہ سب تو دانشوری، دانشمندی کی باتیں ہیں۔ ہے...... ہے......'

مصنف کے الفاظ کھو گئے تھے...... لیکن وہم وگمان کی ایک بے نام سی کہانی یہ بھی تھی کہ مصنف نے وہ داغ دیکھے...... اور یقیناً وہ داغ اُس کی گردن پر موجود تھے......

لیکن اس کہانی کے ساتھ اس بے معنی گفتگو، ڈراکیولا، صوفیہ مشتاق احمد کی گردن میں

پڑے ڈراکیولا کے نوکیلے دانتوں کے نشان کا کوئی رشتہ نہیں ہے ___ لیکن یقیناً اس گفتگو کے بعد ہی اس کہانی کی بنیاد پڑی تھی، اور یقیناً ___ اب جو کچھ میں سنانے جارہا ہوں، وہ بیان کی شکل میں ہے اور اس بیان میں، میں شامل ضرور ہوں، لیکن یہ یقین کرنا ضروری ہے کہ اس کہانی میں، اپنی طرف سے میں نے کوئی اضافہ یا الٹ پھیر نہیں کیا ہے...... اس سے پہلے کہ الگ الگ بیانات کا سلسلہ شروع ہو، مختصراً اس کہانی کے کرداروں سے آپ کا تعارف کرادوں۔ دتی جمنا پار رہائشی علاقے میں ایک چھوٹی سی مڈل کلاس فیملی ___ بڑی بہن ثریا مشتاق احمد۔ عمر پینتیس سال۔ ثریا کے شوہر اشرف علی ___ عمر چالیس سال۔ نادر مشتاق احمد، ثریا کا بھائی۔ عمر 30 سال۔ اور ہماری اس کہانی کی ہیروئن (نہیں معاف کیجئے گا، بڑھتی عمر کے احساس کے ساتھ ایک ڈری سہمی سی لڑکی ہماری کہانی کی ہیروئن کیسے ہوسکتی ہے) صوفیہ مشتاق احمد، عمر 25 سال۔

تو اس کہانی کا آغاز جنوری مہینہ کی 8 تاریخ سے ہوتا ہے۔ سردی اپنے شباب پر تھی۔ سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ دانت سردلہری سے کٹکٹارہے تھے۔ لیکن جمنا پار، پریہ درشنی وہار، فلیٹ نمبر بی 302 میں ایک ناخوشگوار حادثہ وقوع پذیر ہو چکا تھا۔

کوئی تھا، جو تیزی سے نکلا ___ پہلے لڑکھڑایا، پھر باہر والے دروازہ کی چٹخنی کھولی اور تیز تیز، سرد رات اور کہاسوں کے درمیان، سیڑھیوں سے اُترتا ہوا، بھوت کی طرح غائب ہوگیا ___

'وہ چلا گیا......' یہ جیجو تھا۔ صوفیہ مشتاق احمد کا جیجو، آنکھوں میں خوف اور الجھن کے آثار ___ وہ چلا گیا اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے۔'

نادر مشتاق احمد نے نظریں اٹھائیں۔ منظر کچھ ایسا تھا جیسے ویتنام اور ناگاساکی، ایٹم بم دھماکے کے بعد ندیوں سے اٹھتے ہوئے آگ کے شعلے آسمان چھو گئے ہوں ___ 'کیا ہوا، اُسی سے پوچھتے ہیں۔'

'لیکن، کیا پوچھیں گے آپ ___ ثریا جیجو کی طرف مڑی۔ پھر ایک لمحے کو نظر اٹھا کر اُس نے نادر کی طرف دیکھا ___ جذبات پر قابو رکھو، اُف، دیکھو...... وہ کیا کررہی ہے......'

'شاید وہ آرہی ہے......' جیجو نے ہونٹوں پر انگلی رکھی ___

'کوئی اُس سے کچھ بھی نہیں پوچھے گا۔' یہ ثریا تھی ___

'تم بھی کیسی باتیں کرتی ہو باجی۔ کوئی اُس سے بھلا کیا پوچھ سکتا ہے۔ وہ بھی اس

ماحول...... اور ایسے عالم میں۔ لیکن...... کچھ......'

'کچھ نہیں ہوگا۔'

'ہم نے فیصلہ کرنے میں......'

ثریا مشتاق احمد، ایک لمبا سانس لیا۔ آواز ڈوبتی چلی گئی ___ 'کہہ نہیں سکتی...... مگر ___ اُس نے اپنے شوہر اور نادر مشتاق احمد کی طرف ایک گہری نظر ڈالی ___ ''ہم نے آپس میں بات کی تھی۔ اس کے سوا ہمارے پاس دوسرا راستہ ہی کیا تھا۔''

'وہ آرہی ہے اور اب ہمیں خاموش ہو جانا چاہئے ___ اور یقیناً ہمارے تاثرات ایسے نہیں ہونے چاہئیں کہ اُسے کسی بات کا شک ہو کہ ہم اُس کے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں ___ اور یقیناً ہمیں اُس کی نفسیات کو بھی سمجھنا ہوگا۔'

یہ جیجو تھا ___

باہر کہاسا زمین پر گر رہا تھا۔ رات برف سے زیادہ ٹھنڈ ہوگئی تھی ___ دروازہ چرچڑانے کی آواز ہوئی۔ برف پگھلی۔ دھند چھٹی۔ سامنے صوفیہ کھڑی تھی۔ صوفیہ مشتاق احمد۔ ایک لمحے کو وہ ان کے پاس آکر ٹھہری۔ لیکن رُکی نہیں ___ دوسرے ہی لمحے، وہ اپنے کمرے میں واپس لوٹ گئی ___

پہلا بیان: ثریا مشتاق احمد

میں ثریا مشتاق احمد۔ پیدا ہوئی اتر پردیش کے بلند شہر میں۔ محلّہ شیخاواں۔ مسلمانوں کا محلّہ۔ زیادہ تر شیخ برادری کے مسلمان ___ پاس میں مسجد تھی۔ پاپا مشتاق احمد کی چھوٹی سی دکان تھی۔ اسٹیشن روڈ پر۔ پنج گانہ نمازی ___ پیشانی پر سجدے کے داغ۔ چہرہ ایسا نورانی اور معصوم کہ میں نے زندگی میں آج تک نہیں دیکھا اور ممی تو جیسے گائے تھیں۔ نادر چھوٹا بھائی تھا۔ اُس سے پانچ سال چھوٹا اور صوفیہ مجھ سے دس سال چھوٹی تھی ___ بچپن میں چھوٹی چھوٹی آنکھیں مٹکاتی تو شرارت سے سارا گھر خوشی سے جھوم جایا کرتا۔

کالج میں داخلے سے قبل ہی اشرف زندگی میں آگئے تھے ___ کیسے ___ ؟ یہ لمبی کہانی ہے۔ چھوٹے سے شہر میں ایسی کہانیوں کے پر لگ جاتے ہیں۔ پھر کبوتر کی طرح پرواز کرتی یہ کہانیاں شیخاواں کے ایک گھر سے دوسرے گھر میں گونجنے لگی تھیں ___

مما کو ہائپر ٹینشن تھا ___

پپا جلد گھر آجاتے تھے، طبیعت کی خراب کا بہانہ بنا کر ___ پڑوس والی مسجد سے نماز کی صدا بلند ہوتے ہی، وہ تیز تیز لپکتے مسجد پہنچ جایا کرتے۔ وہاں سے آتے، تو لفظوں کے تیر سے اُداس اور گھائل ہوتے ___ ممی اور وہ گھنٹوں اشرف کے بارے میں باتیں کرتے رہتے ___ مثلاً کیوں آتا ہے۔ کیا کام ہے ___ خاندان تو اچھا ہے نا ___ یہ لڑکی ناک تو نہیں کٹائے گی۔ صوفیہ تو کافی چھوٹی ہے ___

نادر نے صرف ایک بار جلتی آنکھوں سے میری کی آنکھوں میں دیکھا تھا ___ بجیا، یہ کیا تماشہ ہے۔ چاروں طرف تم دونوں کے ہی ریڈیو بج رہے ہیں۔

'تو بجنے دو نا......'

تب گول گول آنکھیں نکال کر صوفیہ نے میری طرف دیکھا تھا۔

'ایک ریڈیو میرے لئے بھی لا دو نا......'

'پاگل، ایک ریڈیو نے ہی طوفان مچا دیا ہے......' نادر ناگواری سے بولا

لیکن میں یہ کہانی کیوں سنا رہی ہوں۔ میری اور اشرف کی کہانی میں اگر کچھ دلچسپ ہے تو صرف یہ، کہ ہم نے لومیرج کی تھی۔ پھر اشرف دلّی آگئے۔ اور میں بھی دلّی آگئی ___ اور جیسا کہ مہانگروں میں ہوتا ہے ایک دن خبر آئی۔ پپا نہیں رہے۔ دوسرے سال خبر آئی۔ ممی نہیں رہیں۔ شیخاواں اُجڑ گیا۔ گھر ویران ہوگیا۔ بلند شہر سے رشتہ ٹوٹ گیا ___ نادر اور صوفیہ دونوں دلّی آگئے۔ کبھی کبھی احساس ہوتا، اشرف ان دونوں کی موجودگی سے پریشان تو نہیں ہیں۔ لومیرج کا یہ بھی ایک فائدہ تھا کہ اشرف کسی بھی بات پر بولتے یا ٹوکتے نہیں تھے۔ مگر من میں کچھ گانٹھیں تو پڑ ہی جاتی ہیں ___ کبھی جب اشرف کو، اُن کی اپنی دنیا میں قید اور اُداس دیکھتی تو دل کی بات ہونٹوں پر آجاتی......

'وہ......ایک دن پرواز کر جائیں گے......'

'ہاں......'

'کون جانتا تھا، ممی پاپا اس طرح ہمیں ذمہ داریوں سے باندھ کر......'

اشرف کہیں اور دیکھ رہے ہوتے ___

'تم ان دونوں کی موجودگی کو لے کر...... نہیں میرا مطلب ہے......'

اشرف گہرا سانس کھینچ کر کہتے ہیں ___ 'بچے ہیں...... لیکن...... پرائیویسی کے یہی دن ہیں۔ یہ دن واپس نہیں آتے...... یہ دن چلے گئے تو......'

نہیں، مجھے احساس تھا، اشرف کی رومانی دنیا میں نئی نئی فنتاسی اور خوبصورت کہانیوں کی ایک بڑی دنیا آباد ہے...... وہ اکثر اس کا ذکر بھی کیا کرتے...... مثلاً ہنسی ہنسی میں...... 'ثریا، یہ لباس کیوں بنایا گیا...... شادی کے بعد گھر میں میاں بیوی کو لباس نہیں پہننا چاہئے...... نیچرل ڈریس...... آخر ہم قدرتی لباس میں کیوں نہیں رہ سکتے......؟ بس یہی تو چار دن ہوتے ہیں۔ ایک ساتھ سوئمنگ...... ایک ساتھ......'

اشرف جب دن میں مجھے لے کر کمرہ بند کرنے کی کوشش کرتے تو وحشت سی ہوتی ___ صوفیہ کیا سوچے گی۔ بڑی ہو رہی ہے۔ پھر جیسے کمرے کے بند سناٹے میں کوئی کیڑا چپکے سے منہ نکالتا ___ اشرف ایکدم سے بوکھلا کر اُس سے الگ ہو جاتے۔ خود ہی آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیتے......

'جاؤ۔ تمہیں آزاد کرتا ہوں۔'

مصنف سے ثریا مشتاق احمد کی مختصر سی گفتگو کے کچھ حصے

''تو گویا تم سمجھ رہی تھی...... کہ کیڑے......'

'ہاں......'

'یقیناً یہ کیڑے صوفیہ نے بھی دیکھے تھے......؟'

'اور نادر نے بھی......'

'پھر؟'

'نادر کو اپنی خودداری کا احساس تھا ___ وہ ایک بوجھ کی طرح اس گھر میں رہنے کے خلاف تھا اور اسی لئے اپنے لئے ایک چھوٹی سی نوکری کا بندوبست کرتے ہی......'

'اُس نے یہیں تمہارے قریب ایک فلیٹ لے لیا۔'

'ہاں۔ اور پھر صوفیہ کو بھی لے گیا......'

'نہیں۔ شروع میں نہیں لیا گیا۔ اُسے اپنی مجبوریوں کا احساس تھا۔ مگر...... صوفیہ چپ چاپ رہنے لگی ___ سارا سارا دن گم صم ___ اپنے آپ میں کھوئی۔ کسی سے بولنا چالنا تک نہیں۔

بس جی چاہا تو کبھی کبھی ٹی وی کے آگے بیٹھ گئی۔ اُس کا بس چلتا تو سارا سارا دن بستر پر سوئی رہتی ___ مگر جیجو اور پرائے کے گھر میں رہنے کا احساس...... اور اچانک اُس دن...... وہی کیڑا......

'کیڑا......؟'

ثریا مشتاق احمد اپنے بیان میں گم ہوگئی تھیں۔

ثریا مشتاق احمد کے بیان کا دوسرا حصہ

مُیامارفوسس۔ آپ نے یقیناً یہ کہانی پڑھی ہوگی۔ نہیں، میں کیڑے میں، یا کیڑا مجھ میں تبدیل ہوگیا، ایسی کوئی بات نہیں۔ مگر وہ تھا، یہیں ___ کمرے میں ___ صبح، سورج نکلنے سے پہلے ہی، بستر چھوڑتے ہوئے، میں نے اُسے اشرف کی آنکھوں کے پاس رینگتے ہوئے صاف دیکھا تھا۔ نہیں، مجھے کہیں سے کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ یقیناً وہ تھا۔ اور میرے بھگانے سے پہلے ہی......

اُس دن ارم کا برتھ ڈے تھا۔ اِرم کون۔ میری بیٹی۔ اشرف کی آنکھوں کا تارا۔ پانچ برس کی ارم کو لے کر اشرف کی آنکھوں میں خوابوں کے اتنے جھومر اور فانوس دیکھے کہ ڈر ڈر جاتی...... وہ ایک خوبصورت شیشے کا ایکوریم تھا، جو اشرف اُس کے لئے خصوصی طور پر لے کر آئے تھے ___ شیشے کی رنگین دنیا میں تیرتی سنہلی مچھلیاں...... 'یہ سون مچھریاں ہیں......' اشرف نے کہا تھا ___ ایک دن میری بٹیا اس سے بھی خوبصورت ایک سون مچھلی بن جائے گی ___ انسانی سون مچھلی۔ پھر اپنی ہی بات پر وہ زور سے ٹھہا کہ لگا کر ہنسے تھے۔ گھر سے باہر نکلتے ہوئے شام کی پارٹی کے بارے میں وہ کچھ تفصیلات بتا کر گئے تھے۔ بچوں کی فہرست بن گئی تھی۔ ڈرائنگ روم خوبصورت ڈھنگ سے سجانے کے لئے کہہ گئے تھے...... 'کیڑا'...... ایک بار پھر اشرف کے دروازہ کے باہر نکلتے ہی میں نے کیڑے کی جھلک دیکھی تھی۔ کیڑا...... میں چیختے چیختے رہ گئی ___ تب تک اشرف باہر نکل چکے تھے...... چار بجے شام میں وہ واپس آئے تو ڈرائنگ روم کو ویسے کا ویسا پا کر وہ چیخ اٹھے۔

'صوفیہ کہاں ہے......'

'وہ...... سو رہی ہے......'

'کیا۔ سات بجے تک محلے ٹولے کے بچے آجائیں گے اور ابھی تک وہ سو رہی ہے۔ اتنے سارے لوگوں کو پالنے کا ٹھیکا لے لیا ہے تم نے۔ یہ سونے کا وقت ہے...... اور تم...... تم کیا کرتی رہی......'

اشرف غصے سے بول رہے تھے...... کیڑا اُن کی آنکھوں کی پتلیوں پر چپ چاپ بیٹھا تھا۔ کمرے سے باہر نکل کر دیوار سے سٹی ہوئی، تھر تھر کانپ رہی صوفیہ کو میں نے پہلی بار دیکھا۔ شاید اشرف نے بھی صوفیہ کا یہ رنگ دیکھ لیا تھا۔ ایک لمحے کو وہ ٹھہرے۔ پھر اپنے کمرے میں داخل ہو گئے۔ دروازہ زور سے بند کر لیا___

نادر مشتاق احمد کا بیان

نہیں۔ میں اشرف بھائی کو قصوروار نہیں مانتا۔ یقیناً ہم نے اُن کی زندگی میں سیندھ لگائی تھی۔ تقدیر کی مجبوری اپنی جگہ، لیکن اپنے اپنے فیوچر کے لئے کسی کی زندگی میں جبر کے طور پر داخل ہونے کا ہمیں کیا حق تھا___ صوفیہ اُس دن کافی روئی تھی۔ مجھے احساس تھا۔ شاید جان لیوا تنہائی کے اُداس مکالمے اُسے بار بار پریشان کر رہے تھے۔ مجھے اُسے ایک بھائی کی سطح پر، اس سناٹے سے باہر نکالنا تھا۔ اور میں نے اُسے نکالا۔ دوسرے دن، یعنی اس ناخوشگوار حادثے کے دوسرے دن میں اُسے اپنے گھر لے گیا اور ایک دو ماہ بعد اُس کا داخلہ کمپیوٹر میں کرا دیا۔ شاید اُسے اپنی تنہائیوں کو بانٹنے کا موقع مل جائے۔ میں جانتا تھا۔ وہ کوئی دوست نہیں بنا سکتی۔ بوائے فرینڈ تو بالکل نہیں۔ لیکن بڑی ہوتی صوفیہ کی ذمہ داری سے آزاد ہونے کا خیال مجھے زیادہ ستائے جا رہا تھا۔ کیونکہ مجھے امریکہ جانا تھا۔ میرے خواب امریکہ میں بستے تھے اور پھر شروع ہوا آنکھ مچولی کا کھیل___ نہیں صاحب۔ پہلی بار احساس ہوا، کہ بجیا نے خود لڑکا پسند کر کے کتنی قابلیت دکھائی تھی___ رشتہ دار، عزیز، جان پہچان والے، رشتہ گھر، شادی ڈاٹ کام، مہندی ڈاٹ کام۔ لڑکا دیکھنے کا سفر شروع ہوا تو جیسے ایک نئے بازار کو دیکھنے کا موقع ملا۔ نہیں صاحب۔ مجھے معاف کیجئے۔ یقیناً اس لفظ سے بہتر کوئی لفظ میرے پاس نہیں ہے۔ بازار___ ہر کسی نے اپنے اپنے جانور کو پال پوس کر تیار کیا تھا۔ بقرعید کے موقع پر فروخت کرنے کے لئے___ قیمتیں آسمان چھو رہی تھیں۔ اُس پر گھر گھرانہ، شجرہ نسب کی تفصیل___ یہ بازار میرے لئے اور بجیا کے لئے نیا تھا۔ صوفیہ ہمیں گاڑی میں آتے جاتے ہوئے دیکھتی۔ بجیا کو فون پر باتیں کرتے ہوئے سنتی۔ پھر واپس

آ کر ہمارے خاموش چہرے پر اپنی ادھ کھلی آنکھیں رکھ کر، واپس اپنے کمرے میں لوٹ جاتی ___ بجیا کو کبھی کبھی غصہ آ جاتا......

'سب کے رشتے ہو جاتے ہیں۔ مگر یہاں......'

جیجو ایک لمبا سانس بھر کر کہے...... 'فکر کیوں کرتی ہو، آسمان سے ایک دن......'

وہ صوفیہ کے کمرے میں جاتے۔ اُسے بانہوں کے سہارے واپس لے کر آتے ___

''کیا کمی ہے اس میں...... اور ابھی عمر کون سی عمر نکلی جا رہی ہے...... 'ہوئی ہے......' وہ ایک بار پھر ٹھنڈا سانس بھرتے۔ ہر چیز کا وقت مقرر ہے۔ کیوں صوفیہ۔ ایک دن چپکے سے ایک شاہزادہ آئے گا اور ہوا کے رتھ پر بیٹھا کر......''

'نہیں۔ کوئی نہیں آئے گا۔' صوفیہ مسکرانے کی کوشش کرتی۔

'آئے گا......' جیجو میری طرف مڑتے۔ 'نادر، اس قدر پریشان ہونے ضرورت نہیں ہے۔ صوفیہ سے زیادہ خوبصورت لڑکی میں نے کم کم دیکھی ہے، اس کا اعتراف کرتا ہوں۔ مگر کمی کیا ہے صوفیہ میں ___ ' جیجو ہنستے۔ بس ایک کمی ہے۔ خوبصورت کے ساتھ خوب سیرت بھی ہے۔ اور خوب سیرت 'لڑکیوں کے بازار ذرا ٹھنڈے ہیں......'

'میں کیا خوب سیرت نہیں تھی......' ثریا آنکھیں تریرنے کی کوشش کرتی تو جیجو فلک شگاف قہقہہ بلند کرتے ___ 'خود پر کیوں لیتی ہو۔ صوفیہ مختلف ہے۔ اور ایک دن......

میں سوچتا تھا۔ ایک دن ...... ایک دن کیا ہوگا ___ کوئی معجزہ ہو جائے گا ___ چمتکار۔ امریکہ بار بار خوابوں میں منڈراتا ہے۔ نہیں ہنسیے مت ___ پریتی زنٹا، منموہن سنگھ اور ہمارے نیتاؤں سے زیادہ کلنٹن، بش اور کیری مجھے اپنے لگتے تھے۔ جینفر لوپیز کے خیالوں میں، میں زیادہ ڈوبا رہتا تھا ___ ہاں، یاد آیا۔ ایک لڑکا اور آیا تھا۔ فریاد عارف۔ لدھیانہ کا۔ قد پانچ فٹ دس انچ۔ عمر چالیس سال۔ باہر رہنے کا، دس برس کا تجربہ تھا۔ عمر زیادہ تھی تو کیا ہوا۔ یہ رشتہ ہمیں نیٹ سے ملا تھا۔ صوفیہ کی تصویر اور بایوڈاٹا لڑکے کو پسند آیا تھا۔ اُس کی تصویر بھی نیٹ سے ہم نے نکال لی تھی۔ شکل اچھی نہیں تھی۔ لیکن کیا شکل ہی سب کچھ ہوتی ہے...... ہاں، اُس کے ہونٹوں کے پاس ایک داغ تھا...... پتہ نہیں، کس چیز کا داغ تھا۔ جلے کا یا...... مگر داغ تھا ___ ڈرتے ڈرتے ہم نے تصویر صوفیہ کے حوالے کی۔ مگر تصویر دیتے ہوئے یقیناً ہمارے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ نظر جھکی ہوئی تھی۔

صوفیہ مشتاق احمد کا بیان

تصویر میں ہاتھ میں لیتے ہی ہنس پڑی تھی۔ یہ پاپا کے کوئی دوست ہیں کیا...... نہیں، کم از کم جیجو مجھ سے اتنا بڑا مذاق نہیں کر سکتے۔ جیجو کے گھر سے باہر آنے کے بعد بھی میں جیجو کے لئے ذرا بھی خفا نہیں تھی۔ یقیناً وہ سب سے زیادہ مجھے پہچانتے تھے۔ اور یقیناً میرے لئے سب سے زیادہ جنگ بھی، وہی لڑتے تھے اور خاص کر ایسے موقع پر، جب کمرے میں یکا یک کالی کالی بدلیاں چھا جاتیں...... پھر جیسے تیز تیز آندھیوں کا چلنا شروع ہو جاتا۔ نہیں، میں نے تصویر دوبارہ دیکھی...... اور اچانک چہرے کا طواف کرتی آنکھیں داغ کے نشان کے پاس آ کر ٹھہر گئیں۔ ہونٹ کے نیچے کا حصہ...... تصور اور خیالوں کی وادیوں میں، بوسے کے لئے سب سے خوبصورت جگہ۔ میں تو اس جگہ کا بوسہ بھی نہیں لے سکتی۔ میں ہنس رہی تھی۔ پاگلوں کی طرح ہنس رہی تھی۔ کمرے میں دھند بڑھ رہی تھی۔ شاید باہر جیجو، بجیا اور نادر بھائی نے میرے ہنسنے کی آوازیں سن لی تھیں......

'صوفیہ'

دروازے پر تھاپ پڑ رہی تھی۔

نادر غصے میں تھے...... 'دروازہ کیوں بند کر لیتی ہو'

بجیا کی آنکھوں میں ایک لمحے کو ناگواری کے بادل لہرائے...... 'ہم نے ابھی رشتہ منظور کہاں کیا ہے۔ صرف تم سے رائے پوچھی ہے......'

'نہیں۔ وہ...... کیڑا'

دروازہ کھولتے ہوئے میری آنکھیں وحشت میں ڈوبی تھیں ___ جیجو نے سہارا دیا ___ صوفے تک لائے ___ کچھ ہی دیر میں مکالمے بدل گئے۔

'مگر کیڑا......'

نادر نے بجیا کی طرف دیکھا ___ 'کیڑے بڑھ گئے ہیں۔ کیوں۔ رات بھر کاٹتے رہتے ہیں۔ دوا کا چھڑکاؤ کرو۔ یا گڈ نائٹ لگاؤ۔ مگر کیڑے نہیں بھاگتے......'

بجیا یعنی ثریا مشتاق احمد نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ ہونٹوں پر ایک طنز بھری مسکان تھی۔

'آپ یقین جانیے، کوئی تھا۔ جو دیواروں پر رینگ رہا تھا۔ ایک دم سے کمرے کی دھوپ اُتر گئی۔ تاریکی چھا گئی ہے...... کمرے میں کہاسے بھر گئے اور...... میں بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر...... میں نے دیکھا...... جیجو آہستہ آہستہ میری طرف دیکھ رہے تھے___ پھر اُن کے ہونٹوں پر ایک مصنوعی مسکراہٹ داخل ہوئی___

'ایک ستارا آئے گا......'

''ستارے آسمان سے آتے آتے لوٹ گئے......'' یہ بجیا تھی۔

''ہاں، لیکن گھبراؤ مت، ایک ستارہ آئے گا اور یوں اچھل کر تمہاری جھولی میں جا گرے گا......' یہ جیجو تھا___ ہونٹوں پر ہنسی۔ پھر وہ تمہاری آنکھوں میں، کبھی ہونٹوں پر آکر چیخے گا...... یہ میں ہوں۔ پاگل۔ پہچانا نہیں مجھے۔ تمہاری قسمت کا ستارہ......

'اُس کے چہرے پر دھوپ بہت تھی۔ تم نے دیکھا نا' بھائی نظر نیچی کیے، بہن کو ٹٹول رہا تھا۔

''میں جگنو تلاش کرنے گئی تھی۔ راستہ بھٹک گئی___ 'یہ وہ تھی۔ اُس کی آواز اندر کے روشن دان سے بلند ہوئی اور اندر ہی اندر گھٹ گئی۔

جیجو کا بیان

دراصل اُس 40 سال کے ادھیڑ مرد کی تصویر دیکھ کر مجھے خود بہت غصہ آیا تھا___ نادر اور ثریا، رشتہ کے لئے مجھے کم ہی لے جاتے تھے۔ دراصل وہ اس 'مہرے' کو آخری وقت کے لئے بچا کر رکھنا چاہتے تھے اور کسی خاص موقع پر ہی خرچ کرنا چاہتے تھے۔ یہ سب میرے لئے بھی نیا تھا۔ کیونکہ ہر برس بدلتے کلینڈر کے ساتھ ہی، میں صوفیہ کو دیکھ کر اُداس اور پریشان ہوا جا رہا تھا اور آپ سمجھ سکتے ہیں، خود صوفیہ کی کیا حالت ہوگی___ میرے لئے یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ مسلمانوں کے یہاں، ایک خوبصورت جوان لڑکی کی شادی کو لے کر اتنی ساری الجھنیں سامنے آسکتی ہیں___ گھر گھرانہ اچھا۔ خاندان سیّد۔ مگر کسی کو لڑکی کا قد کچھ کم لگتا۔ کسی کو عمر کچھ زیادہ۔ کبھی کبھی جی چاہتا کہ پوچھنے والوں کا گریبان پکڑ کر کہوں، کہ اٹھارہ سال سے رشتہ تلاش کرتے ہوئے تم لوگوں نے اسے 23 سال کا کر دیا ہے اور اب___ شاید میرے اسی غصّے کی وجہ سے نادر اور ثریا مجھے کبھی اپنے ساتھ نہیں لے گئے۔ مگر...... کبھی کبھی اپنی بڑی ہوتی ارم کو دیکھ کر گہری سوچ

میں گرفتار ہو جاتا۔ کیا میرے ساتھ بھی ___ اور ہوا یوں، کہ اچانک اُس دن ارم کو دیکھا تو ایکدم سے چونک گیا ___ ارم غائب تھی۔ ارم میں صوفیہ آ گئی تھی ___

مصنف کا بیان

قارئین، ایک بار پھر مداخلت کے لئے معافی چاہوں گا۔ کہانی شروع ہوئی تو سوچ کے دائرے پھیلتے چلے گئے۔ یہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ کیا یہ بھی کوئی کہانی ہو سکتی ہے۔ ایک مسلمان لڑکی کو لڑکے کی تلاش ہے۔ عمر 23 سال، خوبصورت، تعلیم یافتہ ___ تہذیب کی اتنی صدیاں پار کرنے کے بعد بھی، چوتھی دنیا کے، ہتھیاروں کی ریس میں آگے نکلنے والے ایک بڑے ملک میں، یہ مسئلہ ایک کہانی کا جزو بن سکتا ہے، میں نے کبھی سوچا نہیں تھا ___

اُس دن، میں دوبارہ نادر مشتاق احمد کے گھر گیا۔ دروازہ کے پاس پہنچ کر بیل پر اُنگلی رکھی۔ دروازہ کھولنے والی وہی تھی۔

'آیئے۔'

'نادر؟'

'وہ باہر گئے ہیں۔'

صوفیہ، صوفے پر دھنس گئی۔ کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی ___

'چائے بناؤں!'

'نہیں۔ ابھی رہنے دو۔'

میں آہستہ آہستہ آنکھیں گھماتا کمرے کی ویرانی کا جائزہ لے رہا تھا۔ دیوار پر قطار میں اُڑتی چار چڑیائیں کچھ اور ہی کہانی بیان کر رہی تھیں۔ تیسری والی چڑیا کی قطار ٹوٹ گئی تھی۔ تیسری چڑیا کیل سے جھول رہی تھی۔ پتہ نہیں کب سے۔ دیوار پر کنارے مشتاق احمد کی تصویر لگی تھی۔ تصویر پر ذرا بھی گرد نہیں تھی۔ جیسے ابھی ابھی گرد صاف کی گئی ہو۔ لیکن کمرے کی باقی چیزیں......

'اندھیرا ہے' میں آہستہ سے بولا۔ جبکہ دو پہر کے تین بج رہے تھے۔ کھڑکی کے پاس پردہ پڑا تھا۔

'اس گھر میں ہمیشہ اندھیرا رہتا ہے......' صوفیہ آہستہ سے بولی۔

'اور وہ ڈراکیولا......'

میں آہستہ آہستہ کھڑکی کے پاس بڑھا ___

'نہیں، یہاں نہیں ۔......' یہاں میرے ساتھ آیئے ۔ میرے کمرے میں......'

وہ تیزی سے اٹھی ___ مجھے لے کر اپنے کمرے میں آ گئی ___ سنگل بیڈ کا دیوان پڑا تھا ___ چادر کئی دنوں سے بدلی نہیں گئی تھی ___ کمرہ بے رونق تھا اور یقیناً اس کمرے میں کھڑکی کے راستے گھنے کہرے، داخل ہو جاتے ہوں گے ___

'یہاں...... یہاں سے ۔ یہ دیوار جو ہے...... آپ دیکھ رہے ہیں نا......'

'مگر یہاں تو کوئی قبرستان نہیں ہے۔'

'آہ ۔ نہیں ہے......' صوفیہ اپنے بستر پر بیٹھ گئی ___ 'میں نے کب کہا، کہ یہاں قبرستان ہے ۔ مگر بن جاتا ہے ۔ رات کے وقت ۔ اپنے آپ بن جاتا ہے ___ دھند میں ڈوبا ہوا ایک قبرستان ۔ ڈھیر ساری قبریں ہوتی ہیں ۔ ایک کھلا ہوا 'کوفن' ہوتا ہے ۔ وہ یہاں...... یہاں دیواروں پر رینگتا ہوا، کھڑکی سے اچانک میرے کمرے میں کود جاتا ہے......'

'یقیناً، وہم...... اور وہم کا تعلق تو......'

'مجھے پتہ ہے ۔ وہم ہے میرا ۔ مگر کیا کروں ۔ وہ رات میں، آپ یقین کریں میرے کمرے میں ہوتا ہے......'

'کیوں؟'

'اب یہ بھی بتانا پڑے گا بھلا ۔ خون پیتا ہے...... یقین نہیں ہو، تو یہ داغ دیکھئے ۔' اُس نے اپنی گردن دکھائی ۔ گردن پر یقیناً نیلے داغ موجود تھے ۔

'کوئی یقین نہیں کرتا ۔ میں بھی مانتی ہوں، وہم ہے مگر ۔ وہ ہے ۔ وہ آتا ہے...... اور ......'

میں نے کہانی بدل دی ۔ 'اوہ...... تم نے بتایا تھا ۔ تم بار بار مرتی تھی ___

'کون نہیں مرے گا ایسے ___ جب آپ بار بار اُسے سجا کر باہر لے جاتے ہوں ۔ یا کبھی کبھی سج دھج کر گھر میں ہی نمائش یا میلہ لگا دیتے ہوں ۔ ایک حد ہوتی ہے ۔ کوئی بھی کتنی بار مرتا ہے ۔ کتنی بار مر سکتا ہے کوئی ۔ میں تو ہر بار، ہر پل......'

صوفیہ کہتے کہتے رُک گئی تھی ___

'مگر اُس دن نہیں مری ۔ اُس دن ۔ میں نے سوچ لیا تھا اور مطمئن تھی ۔'

'اُس دن......'

'ارے وہی۔ اِن ڈسنٹ پروپوزل۔' وہ کہتے کہتے رُکی___ ایک ہنسی چہرے پر شعلے کی طرح کوندی۔ پروپوزل، کبھی بھی ان ڈسنٹ نہیں ہوتا۔ مگر بجیا اور بھیا کسی ساتویں عجوبے کی طرح اُس پروپوزل کو لے رہے تھے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ میں پہلی بار کمرے میں کھکھلا کر ہنسی تھی۔ 'اب مزہ آئے گا۔' وہ ٹھہری___ پھر بولی۔ اب کسی کو کیا پتہ۔ میرے جسم میں کتنے انگارے اکٹھے ہو گئے ہیں۔ اب تو شاید سرد بھی ہونے لگے ہوں یہ انگارے___ نہیں، سرد نہیں۔ بڑھتے بڑھتے پورے جسم میں پھیل گئے ہیں۔ پھیلتے پھیلتے...... آپ نہیں سمجھیں گے۔' اُس نے گہرا سانس لیا۔

'لیکن پروپوزل۔؟'

''وہ بھی نیٹ سے برآمد ہوا تھا۔ صوفیہ کے ہونٹوں پر ہنسی تھی___ 'عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔ تھکے ہارے لوگوں کے لئے یہ بھی ہاتھ آیا ایک موقع تھا مگر___ جس وقت بجیا اور بھائی اُس سے ملنے ہوٹل گئے، وہ ہوٹل کی لابی میں بیٹھا سگریٹ کے گہرے گہرے کش لے رہا تھا۔ یہ بجیا نے ہی بتایا۔

اِن ڈسنٹ پروپوزل

ہوٹل کی لابی میں اس وقت زیادہ لوگ نہیں تھے۔ نادر اور صوفیہ اُس کے سامنے بیٹھے تھے۔ وہ سگریٹ کے گہرے گہرے کش لے رہا تھا۔ ظاہر ہے، وہ لڑکی کی تصویر دیکھ چکا تھا۔ لیکن اُس نے ملنے کا تجسس نہیں دکھایا تھا۔ سگریٹ کے گول گول مرغولے کے درمیان اُس کے چہرے کے تاثر کو پرکھا نہیں جا سکتا تھا___

نادر نے گلہ کھکھارتے ہوئے اُسے متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اُس کی اُنگلیوں میں، مہنگی سونے کی انگوٹھیاں تھیں۔ عام طور پر مسلمانوں مردوں میں سونا پہننے کا رواج نہیں ہے۔ گلے میں بھی سونے کا ایک چین پڑا تھا۔ یقیناً اُس کی منشا یہ تھی کہ سامنے والا اُسے کسی رئیس سے کم نہ سمجھے۔

ثریا نے پہلو بدلا اور نا گوار آنکھوں سے نادر کو دیکھا___ اُس نے سگریٹ آرام سے ختم کیا۔ ایش ٹرے میں سگریٹ کے باقی ٹکڑے کو مسلا۔ پھر مسکرایا___

'معاف کیجئے گا۔ سگریٹ میری مجبوری ہے۔'

'کیوں نہ ہم معاملے کی بات کریں۔' نادر نے دوٹوک انداز میں کہا۔

وہ ایک بار پھر مسکرایا ___ 'مجھے بھی جانے کی جلدی ہے۔ دراصل میں سوچ رہا تھا ___ نہیں، جانے دیجئے۔ کسی بھی چیز کو تار کی طرح کھینچنے میں میری دلچسپی نہیں ہے۔ بھاگتی دوڑتی دنیا میں الجبرے کے فارمولے کی طرح میں نے زندگی گزاری ہے۔ دو پلس دو برابر چار ___ سمجھ گئے نا۔ میرا پروپوزل ہوسکتا ہے، آپ کو پسند نہیں آئے۔ مگر سوچئے گا۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ نہیں پسند آئے تو آپ جاسکتے ہیں۔ کوئی جبیز لیتا ہے۔ کسی کی کوئی ڈیمانڈ ہوتی ہے۔ کسی کی کوئی ___ میرے پاس سب کچھ ہے۔ خود سے حاصل کیا ہوا ___ اس لئے مجھے کچھ نہیں چاہئے۔' وہ ایک لمحے کو ٹھہرا اور دوسرے ہی لمحے جیسے نشانہ سادھ کر اُس نے گولی داغ دی......

''ایک دوسرے کو اچھی طرح پر سمجھنے کے لئے بہتر ہے کہ ہم ایک رات ساتھ ساتھ گزاریں۔''

اُس نے ہمارے تاثرات کی پرواہ نہیں کی۔ جملہ ختم کرتے ہی اٹھا اور دوسری طرف منہ کر کے دوسرا سگریٹ سلگا لیا۔ لائٹر کی خوبصورت ٹیون کے ساتھ ایک شعلہ لپکا تھا، جس کی طرف پلٹ کر دیکھنے کی ہم نے ضرورت محسوس نہیں کی ___

صوفیہ کا جواب

واپس گھر لوٹنے تک جیسے یہ دنیا ایک چھوٹے سے سیپ میں بند ہوچکی تھی۔ صوفے پر برسوں کی بیمار کی طرح ثریا دھنس گئی۔ دوسرے صوفے پر نادر نے اپنے آپ کو ڈال دیا۔ آنکھیں بند کرلیں۔ دل ودماغ پر پتھراؤ چل رہے تھے ___ کب کس وقت صوفیہ آکر قریب میں بیٹھ گئی، پتہ بھی نہیں چلا۔ مگر جیسے ساری دنیا الٹ پلٹ ہوچکی تھی ___ سیپ کے منہ کھل گئے تھے۔ یا سیپ، لہروں کی مسلسل اُچھال کے بعد ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئی تھی۔

'کیوں، کیا ہوا......؟'

یہ صوفیہ تھی۔ معمول کے خلاف اُس کے ہونٹوں پر ایک ہنسی بکھری ہوئی تھی ___ جیسے وہ یقیناً اس موسم کی عادی ہوچکی ہو......!

جیجو پاس میں آکر بیٹھ گئے۔ صوفیہ نے جیجو کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔

'یہ آتش بازی بھی پھس ہوگئی۔ کیوں جیجو......؟'

لیکن یہ سچ نہیں تھا۔ نادر مشتاق احمد اور ثریا مشتاق احمد کی آنکھوں میں حساب کتاب کا سلسلہ جاری تھا___

'بتادوں؟' یہ نادر مشتاق احمد تھا۔

'نہیں، جیجو نے درد کی تاب نہ لاکر آنکھیں بند کرلیں___

'بتانے میں حرج ہی کیا ہے......' ثریا کی آواز دبی دبی تھی......

'نہیں۔ مجھے بتایئے' صوفیہ اور قریب آگئی۔ میں جانتی ہوں مجھے کوئی پسند نہیں کرسکتا۔ میں کتنی بار آپ لوگوں سے کہہ بھی چکی ہوں۔ مگر___ اللہ کے واسطے بتایے ہوا کیا ہے......'

اور پھر، جیسے ایک کے بعد ایک آتش بازی چھوٹتی چلی گئی۔ آتش بازیوں کا کھیل رُکا تو دوسرا بم کا گولہ صوفیہ نے داغ دیا۔

'میں تیار ہوں۔ اُسے آنے دیجئے۔ کب بلایا ہے___ ' ثریا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے، اُس نے اپنا فیصلہ سنا دیا___ میں تھک گئی ہوں۔ اب حوصلہ نہیں ہے، اب یہ کھیل ختم ہوجانے دیجئے۔ اب ایک آخری کھیل___ ہم سب کے فائدے کے لئے۔ وہ پھر رُکی نہیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ نگاہوں سے اوجھل ہوگئی___

ایک خوفناک کہانی کا انت

قارئین۔ کوئی دنیا اس سے زیادہ خوبصورت اور کوئی دنیا اس سے زیادہ بدصورت نہیں ہوسکتی۔ یہ میرا ماننا ہے۔ اور شاید یہ اسی لئے بطور مصنف میں اس کہانی کا گواہ رہا___ بطور مصنف میں نے اپنے آپ کو بھی اس کہانی میں شامل کیا___ مجھے نہیں معلوم، ثریا اور نادر نے صوفیہ کی رضامندی کو اپنی منظوری کی ہری جھنڈی کیسے دے دی۔ یا پھر صوفیہ اس پروپوزل کے لئے مان کیسے گئی۔ اس ترقی یافتہ ملک میں شادی کے اس بھیانک بازار کا تصور میرے لئے ممکن نہیں ہے۔ شاید اسی لئے اس خوفناک کہانی کا انت سنانے کا حوصلہ مجھ میں نہیں ہے اور اسی لئے

اب میں آپ کے درمیان سے رخصت ہوتا ہوں ___ جنوری ماہ کی بھیانک ٹھنڈک اپنے عروج پر تھی۔ اُس دن کی صبح عام صبح جیسی نہیں تھی۔ مگر صوفیہ مطمئن تھی۔ وہ شان سے گانا گنگناتی ہوئی اٹھی ___ دوپہر تک سردلہری میں اضافہ ہو چکا تھا ___

گھڑی کی تیزی سے بڑھتی سوئیاں ایک نئی تاریخ لکھنے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔

●●

ڈرائنگ روم میں ایک دوسرے کو گھیر کر سب بیٹھ گئے تھے۔ جسے کسی میت میں بیٹھے ہوں۔ جنازہ اٹھنے میں دیر ہو ___ ایک ایک لمحہ برسوں کے برابر ہو۔ پھر جیسے ہونٹوں پر جمی برف، بھاپ بن کر پگھلی ___

'آہ، یہ نہیں ہونا چاہئے تھے......، یہ جیجو تھا۔

'کیا ہوگا؟' ثریا کی آنکھوں میں اُڑ کر وہی کیڑا آ گیا تھا ___

نادر نے بات جھٹکی ___ رات میں یہ کیڑے پریشان کر دیتے ہیں۔'

'شی......وہ آ رہی ہے......' جیجو نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی......'اور جان لو، وہ کوئی کیڑا نہیں ہے۔'

اور جیسے وقت تھم گیا ___ صوفیہ ایک لمحے کو اُن کے سامنے آ کر رُکی ___

'آپ لوگ......آپ لوگ اتنے پریشان کیوں ہیں۔'

نہیں۔ یہ وہ لڑکی تھی ہی نہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر ڈر جانے والی ___ پتوں کی طرح بکھر جانے والی ___ اُس کی ساری تیاریاں مکمل تھیں ___

وقت آہستہ آہستہ قریب آ رہا تھا۔

اُس نے پلٹ کر جیجو کی طرف دیکھا ___ نہیں یہ جیجو نہیں تھے۔ جیجو کی جگہ کوئی لاش تھی۔ چہرے پر، کاٹو تو خون کا نشان نہیں۔ آنکھیں بے حرکت......

اُس نے پلٹ کر بھائی کی طرف دیکھا۔ بھائی ہمیشہ کی طرح نظریں نیچی کئے، اپنے آپ سے لڑنے کی کوشش کر رہا تھا ___

بہن نے چہرہ گھما لیا تھا۔ اس لئے وہ بہن کے جذبات کو نہیں دیکھ سکی ___

پھر جیسے کمرے میں ایٹم بم کا دھماکہ ہوا ___

'پانچ منٹ باقی رہ گئے ہیں بس، وہ آتا ہوگا___ میں کمرے میں ہوں۔ آپ اُسے کمرے میں ہی بھیج دیجئے گا۔'

اُس کی آواز نپی تلی تھی۔

پھر وہ وہاں ٹھہری نہیں۔ سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی___

اور انت میں کہانی

کوئی امتحان ایسا بھی ہوسکتا ہے، اُس نے کبھی سوچا نہیں تھا۔ بچپن سے لے کر آج تک اپنی خاموشی کے ریگستان میں چپ چپ سلگتی رہی۔ کسی نے بھی اُس کے اندر کی آواز کو کب سنا تھا۔ کسی نے بھی اُس کے اندر کی لڑکی کو کب دیکھا تھا۔ خود اُس نے بھی نہیں۔ نہیں۔ یہ سچ ہے۔ ایک عرصہ سے وہ اپنے آپ سے نہیں ملی۔ کمپیوٹر کوچنگ سے گھر اور گھر سے اپنے اُداس کمرے کا حصہ بنتے ہوئے بس وہ خلاء میں ڈوبتے ابھرتے بھنور کو دیکھنے میں ہی صبح سے شام کر دیتی___ کمرے کے آسیب چپ چپ اُسے گھیر کر بیٹھ جاتے___ اُسے سمجھنے والا کون تھا۔ اُسے پڑھنے والا کون تھا___ وہ عشق نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اپنے لئے کوئی لڑکا پسند نہیں کر سکتی تھی۔ انٹرنیٹ پر چیٹنگ کرتے ہوئے اُس کے ہاتھ کانپتے تھے۔ کسی لڑکے سے دو منٹ چیٹنگ کے بعد ہی اُس کی سانس دھونکنی کی طرح چلنی شروع ہو جاتی۔ بدن کانپنے لگتا۔ سائبر کیفے کی ایک ایک شئے گھومتی ہوئی نظر آتی۔ وہ بدحواس پریشان سی گھر آتی تو......'

لیکن گھر کہاں تھا۔ ماں باپ ہوتے تو گھر ہوتا۔ بہن اور جیجو کا گھر، گھر کہاں ہوتا ہے۔ بھائی کا گھر، گھر کہاں ہوتا ہے۔ گھر میں تو سپنے رہتے ہیں۔ سپنوں کے ڈھیر سارے ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل اسٹار___ یہ چھوٹے چھوٹے تارے تو ہتھیلیوں سے چھوٹ چھوٹ کر گرتے رہے۔ اندھیرے کمرے میں آسیبی مکالمے رہ گئے تھے___

'کھانا بنایا___؟'

نہیں۔

'کیوں؟'

خواہش نہیں ہوئی___

'خواہش یا......؟'

ہونٹوں پر ایک ناگوار سا تاثر اُبھرا۔ کیا بس اسی کام کے لئے رہ گئی ہوں ___

''ہوسکتا ہے۔ بھائی نے یہی سوچا ہو۔''

'نہیں۔ بھائی اُس محبت کرتا ہے۔

'سارے بھائی محبت کرتے ہیں مگر......'

'میرا بھائی'......وہ کہتے کہتے رُک جاتی......

تمہارا بھائی ہر لمحہ، تمہارے اندر رہتا ہے۔ جانتی ہو کیوں؟۔

'نہیں۔'

'اُس کے پاس سپنے ہیں......'

'تو......؟'

'وہ اُڑنا چاہتا ہے۔ اُڑ کر اپنے لئے بھی سپنے دیکھنا چاہتا ہے۔ مگر تم۔ افسوس۔ تم نے اُس کے سپنوں کو راکھشس کے ان دیکھے قلعے میں نظر بند کر رکھا ہے۔ وہ تم سے چھٹکارا چاہتا ہے ___'

'نہیں'، ایک جھٹکے سے اُٹھ کر وہ آئینہ کے سامنے کھڑی ہوگئی ___ 'جھوٹ بولتے ہو تم۔ کوئی چھٹکارا نہیں چاہتا۔ سب پیار کرتے ہیں مجھ سے۔ ہاں، بس، عمر کے پنکھ پرانے پڑ رہے ہیں۔ پنکھ پرانے ہو جائیں تو کمزور ہو جاتے ہیں۔ میں ایک بے ارادہ سڑک بن گئی ہوں۔ کوئی گزرنا ہی نہیں چاہتا۔'

'نہیں ڈرومت۔'

کمرے کے آسیب اُسے گھیر رہے ہیں۔ خود سے باتیں کرتے ہوئے سارا دن گزار لیتی ہو۔ پتہ ہے، بہن کیا کہتی ہے؟

'نہیں۔'

'بھائی پر ناراض ہوتی ہے۔ اسی لئے تو تمہیں وہاں سے نکالا گیا۔ تم کوئی کام ہی نہیں کرتی تھی۔ بس سوتی رہتی تھی۔'

'سوتی کہاں تھی۔ میں تو خود میں رہتی تھی۔ خود سے لڑتی تھی۔'

'کیا ملا۔ بہن نے بھائی کے یہاں بھیج دیا۔'

'بھیجا نہیں۔ میں خود آئی......' کہتے کہتے ایک لمحے کو وہ پھر رُک گئی......

'دراصل تم ٹیبل ٹینس کی بال ہو...... سمجھ رہی ہونا، چھوٹی سی ٹن ٹن...... بجنے والی بال......لیکن اس بال کو راستہ نہیں مل رہا ہے......

'کیا کروں میں......'

'افسوس، تم ابھی کچھ نہیں کرسکتی ___ تم صرف آگ جمع کرتی رہو۔ سن رہی ہو نا۔ آگ......اپنے آپ کو برف کی طرح سرد مت پڑنے دو۔ سرد پڑ گئی تو......لاش کو اپنے گھر کون رکھتا ہے۔ وہ بھی بدبو دیتی لاش......'

●●

ٹیبل ٹینس بال کی طرح ادھر اُدھر لڑھکنے کا سلسلہ جاری رہا ___ پتہ نہیں، وہ کتنی بار مری۔ پتہ نہیں وہ کتنی بار زندہ ہوئی۔ بہن اور بھائی کے ہزاروں سوالوں سے لاتعلق، اپنے ہی آسیب سے لڑتی لڑتی تھک گئی تو اُس 'اِن ڈسنٹ پروپوزل' کے ئے اُس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

اور یہ حیرت کرنے والی بات تھی ___ پہلی بار اُسے لگا۔ کمرے میں آسیب اکٹھا نہیں ہوئے ہوں۔ پہلی بار لگا، اُس کے اُن کہے مکالموں کی بھاپ سے کمرے میں 'کہاسے' نہیں جمع ہوئے ہوں ___ کمرے میں خوف کی چادر ہی نہیں تنی ہو ___ کمرے میں ڈھیر سارے چمگادڑ نہیں اکٹھا ہوئے ہوں۔ جیسے بہن، دھیرے سے ہنستی ہوئی ایک دن بھائی سے بولی تھی ___ آسیب، وہاں آسیب رہتے ہیں سمجھاؤ اُسے۔ کمرے کو اپنی خاموشی سے اُس نے آسیب زدہ بنا دیا ہے اور یقیناً اُسے بھائی کا چہرہ یاد نہیں۔ بھائی نے ہمیشہ کی طرح نظریں جھکا کر کچھ دھیرے دھیرے کہنے کی کوشش کی ہوگی۔

مگر آج ___

آوازوں کے تیر غائب تھے۔ شب خونی ہوا کا پتھراؤ گم تھا ___ آئینہ میں وہ پاگل لڑکی موجود نہیں تھی۔ جسے بار بار بہن کی پھٹکار سننی پڑتی تھی۔ نہیں لڑکی۔ ایسے نہیں۔ مانگ ایسے نکالو۔ لباس، کپڑے کیا ایسے پہنے جاتے ہیں۔ زلفیں کیا ایسے سنواری جاتی ہیں۔

وہ دھیرے سے ہنسی ___

آئینہ والی لڑکی جو بھی ہنسی۔

پھر وہ تیز تیز ہنستی چلی گئی ___

••

کمرے کی دیوار گھڑی پر ایک اُچٹتی نظر ڈال کر وہ کمرے سے ملحق باتھ روم میں چلی گئی۔ کمرے کا دروازہ اُس نے 'اڈگا' کر رکھا تھا، تا کہ 'اُس کی' آہٹ کی اطلاع اُسے باتھ روم میں مل سکے۔ باتھ روم کا ٹائلس ذرا سا گندہ ہو رہا تھا۔ اُس نے شاور کے نیچے کے دونوں نل کھول لیے۔ گیزر چلا دیا۔ گرم گرم پانی جب تلووں سے ہو کر بہنے لگا تو وہ ٹائلس کو اپنے بے حد ملائم گورے ہاتھوں سے تیز تیز رگڑنے لگی۔ ٹائلس کے چاروں طرف صابن کے جھاگ پھیل گئے تھے۔ اُس نے اپنے لئے ایک بے حد خوبصورت اور سینسیشنل نائیٹی کا انتخاب کی تھا۔ یہ نائیٹی سیاہ رنگ کی تھی۔ جو اُس کے گورے 'جھنجھناتے' بدن سے بے پناہ میچ کھاتی تھی۔ نائیٹی اُس نے باتھ روم کے ہینگر میں ٹانگ دیا۔ صابن کے گرم گرم جھاگ اور فواروں سے، وہ کچھ دیر تک اپنے ننگے پاؤں سے کھیلتی رہی ___ پھر مدہوشی کے عالم میں ٹوٹتے بنتے جھاگوں کے درمیان بیٹھ گئی ___ ایک لمحے کو آنکھیں بند کیں۔ دوسرے ہی لمحے کپڑے اُس کے بدن سے آزاد ہو کر اُڑتے چلے گئے۔ اُس نے نل بند کیا۔ جسم میں مچلتے طوفان کا جائزہ لیا ___ صابن کے جھاگوں کو ہاتھوں سے اُڑایا ___ یا پھر اپنے ننگے بدن کے ساتھ وہیں لیٹ گئی ___

کمرے کا دروازہ چڑ مڑایا تو اچانک وہ، جیسے خواب کی وادیوں سے لوٹی ___ منہ سے بے ساختہ آواز بلند ہوئی ___

''آپ انتظار کیجئے ___ آ رہی ہوں۔''

ایک لمحے کو وہ حیران رہ گئی ___ کیا یہ اُس کی آواز تھی ___ ؟ صوفیہ کی آواز ___ جس کے بارے میں مشہور تھا کہ صوفیہ کے تو منہ میں زبان ہی نہیں۔ کیا یہ وہ تھی...... آج سارے موسم جیسے بدل گئے تھے ___ وہ بدل گئی تھی ___

ایک لمحے کو باتھ روم کی کنڈی پر ہاتھ رکھ کر وہ ٹھٹھکی ___ ، دروازہ بند کروں یا ___ نہیں ___ بند نہیں کروں گی ___ بند کرنے سے کیا ہوگا ___ آئینہ کے سامنے برقع پہننے سے کیا حاصل۔ شرط رکھنے والے کو تو سب کچھ دیکھنا ہے۔ اُسے پورا پورا۔ ایک وقت آتا ہے، جب مانگیں جسم سے آگے نکل جاتی ہیں۔ جسم کی ساری حدود توڑ کر۔ آگے۔ بہت آگے...... اُس نے ہلکی سی انگڑائی لی۔ بیسن کے آئینہ میں اپنے عکس کو ٹٹولا...... نہیں وہ ہے۔ ایک مدہوش کر دینے والی 'صفت'

کے ساتھ...... نہیں، یقیناً، وہ کسی بیوٹی کنسٹسٹ میں شامل نہیں ہے۔ مگر وہ...... ایک لمحے کو اُس نے پلکیں جھپکائیں ___ آئینہ میں گیزر چل رہا تھا۔ نہیں یہ گیزر نہیں تھا۔ یہ تو وہ تھی۔ مجسم، سرتا پا آگ......

اُس نے گیزر بند کردیا۔ ٹھنڈے پانی کا شاور کھول دیا...... شاور کی بوندیں آگ میں گرتی ہوئی دھواں دھواں منظر پیش کررہی تھیں۔ چاروں طرف سے آگ کی جھاس اُٹھ رہی تھی۔ ٹائلس سے ___ برہنہ دیواروں سے ___ آئینہ سے ___ اور ___ وہ ایک دم سے چونکی۔ کمرے میں کوئی انتظار کررہا ہے ___ آگے بڑھ کر اُس نے ٹوول کھینچا ___ ہینگر سے نائیٹی کھینچی۔ آئینہ کے سامنے کھڑی ہوئی۔ آئینہ میں بھاپ جم گئی تھی۔ تولیہ سے بھاپ صاف کرنے لگی۔ پھر ایک بار اپنے آپ کو ٹٹولا...... اور دوسرے ہی لمحے دھڑاک سے اُس نے باتھ روم کا دروازہ کھول دیا ___

کمرے میں، یعنی وہ جو بھی تھا، دیوار کے اُس طرف منہ کئے کسی سوچ میں گم تھا۔ دروازہ بھڑاک سے کھلتے ہی وہ یکایک چونکا۔ اُس کی طرف مڑا اور یکایک ٹھہر گیا ___

سلیولیس نائیٹی میں صوفیہ کا جسم کسی کمان کی طرح تن گیا ___ 'آئی ایم صوفیہ مشتاق احمد۔ ڈاٹر آف حاجی مشتاق احمد۔ عمر پچیس سال۔ پچیس سے زیادہ لوگ تم سے پہلے مجھے دیکھ کر جاچکے ہیں ___ تمہارا کا نمبر۔

'مجھے اس سے زیادہ مطلب نہیں......' یہ لڑکا تھا۔ مگر آواز میں کپکپی برقرار ___ جیسے پہلی بار جرم کرنے والوں کے ہاتھ کانپ رہے ہوتے ہیں......

'بیٹھئے۔' وہ آہستہ سے بولی۔

لڑکا بیٹھ گیا۔ اُس نے لڑکے کے چہرے پر اپنی نظریں گڑا دیں۔ چہرہ کوئی خاص نہیں۔ گیہواں رنگ۔ ناک تھوڑی موٹی تھی۔ بدن دبلا تھا۔ قد بھی پانچ فٹ سات انچ سے زیادہ نہیں ہوگا۔ وہ آسمانی جینس اور میرون کلر کی ٹی شرٹ پہنے تھا۔ مینگل سفاری شوز اُس کے پاؤں میں بالکل نہیں جچ رہے تھے ___ لڑکا اُس سے آنکھیں ملانے کی کوشش میں پہلی ہی پائیدان پر چاروں خانے چت گرا تھا۔

'دیکھو مجھے......' وہ آہستہ سے بولی۔

'دیکھ رہا ہوں......' لڑکے نے اپنی آواز کو مضبوط بنانے کی ناکام سی کوشش کی۔

'نہیں تم دیکھ نہیں رہے ہو، دیکھو مجھے ___ نائٹی کیسی لگ رہی ہے......'

اس بار لڑکے نے ایک بار پھر اپنی مضبوطی کا جوا کھیلا تھا ___ 'اچھی ہے......'

'اچھی نہیں۔ بہت اچھی ہے......' وہ مسکرائی ___ کیسی لگ رہی ہوں میں......'

لڑکا ایک لمحے کو سکپکایا ___ وہ دھیرے سے ہنسی...... نظر جھکانے کی ضرورت نہیں ہے...... دیکھنے پر ٹیکس نہیں ہے۔ اور تم تو...... کسی بازار میں نہیں، اچھے گھر میں آئے ہو...... یقین مانو۔ ایک دن تو یہ ہونا ہی تھا۔ اسی لئے تمہاری شرط کے بارے میں سن کر مجھے تعجب نہیں ہوا ___ تمہارے لئے یہی بہت ہے کہ تم مرد ہو۔ مرد ہو، اس لئے تمہارے اندر کا غرور بڑھا جا رہا تھا۔ پہلے تم نے جہیز کا سہارا لیا۔ رقم بڑھائی، رقم دگنی تگنی کی اور پھر...... یقین مانو، میرے گھر والوں نے سوچا تھا کہ یہ موم کی مورت تو بُرا مان جائے گی۔ مگر میں نے ہی آگے بڑھ کر کہا...... بہت ہو گیا...... آخری تماشہ بھی کر ڈالو......'

باہر رات گر رہی تھی۔ نہیں، رات جم گئی تھی۔ جنوری ماہ کی ٹھنڈی لہریں جسم میں تیزاب برپا کر رہی تھیں۔ لیکن وہ جیسے ہر طرح کے سرد و گرم سے بے نیاز ہو کر ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھ رہی تھی۔

'بستر پر چلو یا......'

اتنی جلد...... اتنی جلدی کیا ہے......' لڑکے کی آواز گڑبڑائی تو وہ پوری قوت لگا کر چیخ پڑی ___

'جلدی ہے۔ تمہیں نہیں۔ لیکن مجھے ہے۔ تم سے زیادہ بھوکی ہوں میں۔ کتنے بھوکے ہو تم ___ پتہ ہے یہاں آ کر، اس کمرے میں آ کر مجھ سے نظریں ملاتے ہوئے بھی شرم آ رہی ہے تمہیں ___ بس اتنے بھوکے ہو۔ نہیں۔ باہر...... باہر والوں کی پرواہ مت کرو۔ وہاں ایک بھائی ہے، جب تک میں باہر نہیں نکلوں گی۔ تیر کی طرح زمین میں گڑا، اپنے ناکارہ ہونے کے احساس سے مرتا رہے گا، سہمی سہمی سی ایک بہن ہو گی اور سہمے سہمے سے سوال ہوں گے ___ نہیں اُن سوالوں کی پرواہ مت کرو ___ میں کرتی تو اس وقت نائٹی پہن کر تمہارے سامنے نہیں ہوتی ___ اُنہیں بس یہی پڑی تھی کہ میری شادی ہو جائے ___ پھر تم ملے۔ تم مجھے بستر پر آزما کر، میرے بدن کو منظوری دینے والے تھے۔ سچ، ایک بات بولنا۔ تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے یا میرے بدن سے......'

'وقت ___ 'لڑکے نے پھر مضبوط لفظوں کا سہارا لیا ___ 'وقت بدل رہا ہے۔'

'وقت' ___ وہ زور سے ہنسی ___ 'بدل رہا ہے نہیں۔ بدل گیا ہے۔ لیکن تم کیوں کانپ رہے ہو۔ دیدار کرو میرا، دیکھو مجھے۔'

کمرے میں نور کا جھما کا ہوا ___

ایک لمحے کو اُس کے ہاتھ پیچھے کی طرف گئے ___ نائیٹی کے ہک کھلے اور نائیٹی ہوا میں اُڑتی ہوئی بستر پر پڑی تھی ___

لڑکا بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ کانپ رہا تھا۔ اُس کی پلکوں پر جیسے انگارے رکھ دیئے گئے تھے ___ نہیں، انگارے نہیں ___ برف کی پوری سلی ___ وہ جیسے پلک جھپکانا بھول گیا تھا ___ ہوش اُڑ چکے تھے۔ آنکھیں ساکت و جامد تھیں...... ایک دھند تھی جو روشندان چیرتی ہوئی کمرے میں پھیل گئی تھی۔

'دیکھو مجھے......'

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آئینہ کے قریب آ گئی ___ ''دیکھو مجھے۔ میں نے کہا تھا، نا۔ تم سے زیادہ بھوکی ہوں ___ پچیس لوگ تم سے پہلے بھی مجھے دیکھے بغیر واپس لوٹ چکے ہیں ___ سمجھ سکتے ہو۔ پچیس بار تو یونہی مری ہوں گی ___ شادی کے ہر احساس کے ساتھ بدن میں انگارے پلتے تھے ___ جانتے ہونا، فرائیڈ نے کہا تھا، عورت مرد سے زیادہ اپنے بدن میں انگارے رکھتی ہے ___ اور میں تو بڑی ہوئی تب سے انگارے جمع کرتی رہی تھی...... فلم سے سیریل، ٹی وی، دوست سہیلیوں کی شادی ___ مجھ سے بے حد کم عمر لڑکیوں کے ہاتھ پیلے ہونے کے قصے...... ہر بار انگاروں کی تعداد بڑھ جاتی۔ میں ہر بار انگارے چھپا لیتی...... وہ زور سے چیخی ___ رنڈی نہیں ہوں میں۔ بازار میں نہیں بیٹھی ہوں۔ تم نے سودا نہیں کیا ہے میرا۔ میری میں نے بھی تسلی کی تھی کہ اگر تم میرے شوہر ہوئے تو تمہیں تو پورا پورا مجھے دیکھنا ہی ہے ___ اور پھر...... میرے گھر والے یوں بھی تھک گئے ہیں۔''

اُس نے بے حد مغرورانداز میں آئینہ میں اپنی ایک جھلک دیکھی۔ جیسے قلوپطرہ نے اپنی ایک جھلک دیکھی ہو اور فاتحانہ انداز میں سر اٹھا کر اپنے ملازموں سے کہا ہو ___ یہ آئینہ لے جاؤ، اس کا عکس بھی مجھ سے کم تر ہے۔ کوئی ایسا آئینہ خانہ لاؤ جو میری طرح دکھ سکے۔

وہ مغرور اداؤں کے ساتھ مڑی۔ بستر سے نائیٹی کو اٹھایا اور دوسرے ہی لمحے نائیٹی کے

'بدن' میں داخل ہوگئی ___

لڑکا ابھی بھی تھر تھر کانپ رہا تھا......

'یہ کوٹھا نہیں تھا اور اتنا طے ہے کہ تم آج تک کسی کوٹھے پر نہیں گئے ___ دیکھو...... تم کانپ رہے ہو۔ نہیں، ادھر آؤ۔ اُس نے بے جھجک اُس کا ہاتھ پکڑا۔ مرر کے سامنے لے آئی۔ یوں تو، تم کیسے لگ رہے ہو۔ جو ناتھن سوئفٹ کے گھوڑے ___ لیکن نہیں۔ تم گھوڑے بھی نہیں ہو...... تم ایک ڈرپوک مرد ہو جو ایک خوبصورت بدن کو آنکھ اُٹھا کر غور سے دیکھ بھی نہیں سکتا ___'

لڑکا بے حس و حرکت تھا۔ ساکت و جامد۔ لاش کی طرح سرد ___

صوفیہ مشتاق احمد کی آنکھوں میں برسوں کی ذلت چنگاری بن کر دوڑ گئی ___ بھوک، نفرت پر غالب آگئی ___ 'دیکھتے کیا ہو ___ میں پوچھتی ہوں۔ اب بھی تم اس کمرے میں کھڑے کیسے ہو۔ تم تو شرط کا بوجھ اٹھانے کے قابل بھی نہیں ہو۔ نامرد کیڑے۔ نہیں۔ وہیں کھڑے رہو اور جانے سے پہلے میری ایک بات اور سن لو۔ میں نے کہا تھا نا تم سے زیادہ بھوکی ہوں میں مگر رنڈی نہیں تھی۔ ارے، تمہاری جگہ میں ہوتی، میں نے شرط رکھی ہوتی تو کم از کم یہاں آنے کی جرأت کے بعد، میں نے نہیں کم از کم تمہیں چھوا ضرور ہوتا۔ دھیرے سے، تمہارے ہاتھوں کو...... کہ بدن کیسے بولتا ہے ___ کیسے آگ اُگلتا ہے۔ لیکن تم...... تم تو بند کمرے میں، اپنی ہی شرط کے باوجود، چھونا تو دور اسے دیکھنے کی بھی ہمت نہیں کر سکے......' ایک لمحے کو جیسے اُس کے اندر برقی لہر دوڑ گئی۔ بے حد نفرت کی آگ میں سلگتے ہوئے صوفیہ احمد نے اُسے زور کا دھکا دیا...... 'گیٹ لاسٹ'

لڑکا پہلے ہڑبڑایا۔ پھر سرعت کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔ ایک لمحہ کو صوفیہ مشتاق احمد مسکرائی۔ اپنا عکس آئینہ میں دیکھا ___ نہیں۔ اب اُسے مضبوط ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اُس نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ باہر کہاسے گر رہے تھے۔ سرد ہوا تیز ہوگئی تھیں۔ کھڑکی کھلی رہ گئی تھی۔ اُف، اس درمیان، وہ جیسے وہ دنیا و مافیا سے بالکل بے خبر ہوگئی تھی۔ تیز، جسم میں طوفان برپا کرنے والی سردی کو بھی ___ اُس نے اپنے ہی دانتوں کے کٹکٹانے کی آواز سنی اور اچانک ایک لمحے کو وہ ٹھہر گئی۔ وہی جانی پہچانی دستک ___ خوفناک آوزاوں کا شور۔ جیسے دیواروں پر کوئی رینگ رہا ہو۔ کیا ویمپائر......؟ ڈراکیولا......؟ باہر یقیناً اس پُر اسرار تماشے کا حال جاننے کے لئے اُس کے گھر والے موجود ہوں گے ___ اور اُس کا بے چینی سے انتظار بھی کر رہے ہوں

گے___

مگر...... یہ دستک......خوفناک آوازیں...... دیواروں پر رینگنے کی آواز___ جیسے ہزاروں کی تعداد میں چمگادڑیں اُڑ رہی ہوں۔ پیڑوں پر اُلو بول رہے ہوں۔ شہرخموشاں سے بھیڑیوں کی چیخ سنائی دے رہی ہو___ وہی رینگنے کی آواز___ برفیلی، تیز ہوا سے کھڑکی کے پٹ ڈول رہے تھے......وہ تیزی سے آگے، کھڑکی کی طرف بڑھی___

گھری دھند کے باوجود شہرخموشاں کا منظر سامنے تھا اور وہاں دیوار پر چھپکلی کی طرح رینگتا ڈرا کیولا، اس بار اُسے بے حد کمزور سا لگا___ شاید وہ شہرخموشاں میں واپس اپنے 'کوفن' میں لیٹنے جارہا تھا۔

جبکہ صبح کی سپیدی چھانے میں ابھی کافی دیر تھی___

OOO

لیبارٹری

گندہ تالاب، کیکڑے اور وہ

یہ قیاس لگانا بہت آسان ہے کہ وہ کہاں پیدا ہوئے ہوں گے ـــــــ وہ سابرمتی آشرم سے دلی کے آشرم چوک تک کہیں بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ کہیں، کسی بھی طرح، کسی بھی حال میں ـــــــ لیکن معاف کیجئے گا۔ اُنکی پیدائش کے عمل کو کسی بھی طرح میں 'کلوننگ پروسیس' سے جوڑنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ اس لئے کہ کلوننگ کے ذریعہ چاہے وہ بھیڑ، ہو یا انسان ـــــــ اور یقیناً آپ تسلیم کریں گے کہ سائنس کی تجربہ گاہیں، انسانی تجربہ گاہوں کے مقابلے، کم خطرناک ہیں ـــــــ نہیں، اس بحث کے لئے ڈولی بھیڑ' یا پہلے انسان 'مکاوٗف' کے تصور سے الجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اتنا کہنا کافی ہے کہ سائنس کا پیدا کردہ انسان بھی گوشت پوست کا ہی انسان ہوگا مگر اُس انسان سے کم خطرناک ہوگا ـــــــ جو انسان کے ذریعہ، انسانی فضا میں، انسانی گھر، انسانی کمرے میں اور انسانی عمل کے دوران ان عالم وجود میں آ گیا ہے ـــــــ (اس لئے تسلیم کر لیتے ہیں کہ کلوننگ کا انسان دوم درجے کا انسان ہوگا، کہ اُس کے اندر جنگ اور تہذیب کے جراثیم وہ شدّت اختیار نہیں کر پائیں گے جو............)

اس لیے فرض کرتے ہیں کہ وہ وہی تھے جو انسانی فضا میں، انسانی گھر میں، انسانی عمل کے دوران ـــــــ

اور فرض کرتے ہیں کہ وہ سابرمتی آشرم سے دلّی کے آشرم چوک تک کہیں بھی پیدا، ہو سکتے ہیں ـــــــ

OO

وہ کئی تھے۔ چار، پانچ چھ، سات، آٹھ...... یعنی کل ملا کر اتنے کہ اُنکی گنتی آسانی سے ہو سکتی ہے۔ وہ بیحد نرم ملائم، سادہ لوح یا ایسے تھے، جن کو لے کر پانیوں کی مثال دی جا سکتی ہے۔ یعنی کسی بھی برتن میں ڈال دو ـــــ وہ ایسے تھے کہ آپ اُن کا کچھ بھی استعمال کر سکتے تھے ـــــ

اور جس دن کا واقعہ ہے، اُس دن دوپہر کا سورج آگ برساتا ہوا اپریل مہینے کو جلانے اور جھلسانے کی تیاری کر رہا تھا۔ دو بجے کا وقت ہوگا۔ 'وہ' بہر کیف، ساری رات کے تھکے ہوئے ـــــ ایک چھوٹے سے تالاب کے کنارے بیٹھے، گندے پانی سے بار بار نکلتے اور اندر جاتے کیکڑے کا لطف لے رہے تھے ـــــ

'کیکڑے کے کتنے پاؤں ہوتے ہیں۔'

دوسرا زور سے قہقہہ لگا کر ہنسا ـــــ کیکڑے کی آنکھیں کہاں ہوتی ہیں، سمجھ میں نہیں آتا ـــــ'

'سالے میں نے پاؤں کے بارے میں پوچھا تھا۔

ـــــ 'اور میں نے آنکھوں کے بارے میں۔'

اُن میں ایک سن رسیدہ تھا۔ اُس کی بڑی بڑی دانشورانہ، آنکھوں میں چمک لہرائی۔ ' دیکھو، کتے کو......'

'کتا نہیں کیکڑا'

'ایک ہی بات ہے۔'

'ایک ہی بات کیسے، تم اور میں کیا......'

وہ ہمیشہ کی طرح سنجیدہ تھا ـــــ ایک ہی بات ہے...... دیکھو...... دیکھو کیکڑا مٹی سے پھر باہر نکل آیا۔

'بارش ہوگی۔'

'ان سالوں کو پتہ کیسے چل جاتا ہے۔'

'بارش کی اطلاع ملتے ہی کیکڑے اپنے بلوں سے باہر نکل آتے ہیں۔'

'اسی سنجیدہ قسم کے دانشور نے اطلاع بہم پہنچائی۔ کیکڑے کے بارہ پاؤں ہوتے ہیں۔

کینکڑے اپنے پاؤں کا حساب نہیں رکھ پاتے۔ انکے لئے زندگی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ یہ اپنی حفاظت بھی نہیں کر سکتے۔ دیکھو۔ دیکھو...... سالا گرا____

بارہ پاؤں نہیں۔ کینکڑے کے دس پاؤں ہوتے ہیں____

'آٹھ......'

'چھ......'

پہلے نے گفتگو کے رُخ کو ہی بدل دیا تھا۔ کیکڑے کے ہاتھ کہاں ہیں؟ آں؟ ہاتھ____

'ہاں، ہاتھ کہاں ہیں؟'

پہلا پُر اُمید تھا____ 'دراصل آپ لوگ جسے پیر سمجھ رہے ہیں وہ......'

'ممکن ہے۔'

'نہیں____ یا تو کیکڑے کے ہاتھ نہیں ہوتے یا پاؤں۔'

OO

دھوپ سخت تھی، لیکن اچانک بادلوں کا ایک کارواں دھوپ کے آگے سے گزر گیا۔

'بارش ہو سکتی ہے۔'

'نہیں بھی۔'

'کیکڑے زمینوں سے باہر آرہے ہیں، اس لئے ممکن ہے......'

کیکڑے زمینوں سے باہر نہیں آرہے ہیں، جان بچا کر بھاگ رہے ہیں۔'

'جان بچا کر____'

'بارش کے موٹے موٹے قطرے، پتھر بن کر......'

'معصوم کیکڑے۔'

'قطعی نہیں____' بیحد سنجیدہ نظر آنے والے دانشور نے منطق کا حوالہ دیا____ ایسے بدنما، بدصورت، بدہیئت اور اس گندے آکٹوپس کی چھوٹی قسم کو کیا نام دیں گے۔ یہ کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن معصوم نہیں ہو سکتا۔

وہ دیر تک سر جوڑے بے بنیاد، غیر دلچسپ گفتگو میں الجھے رہے کہ کیکڑہ عالم وجود میں کیسے آتا ہے۔ کیکڑہ دیکھتا کیسے ہے؟۔ کیکڑا زندہ کیسے رہتا ہے۔ کیکڑے کی زندگی کتنے دنوں کی

ہوتی ہے۔ یا، کیکڑوں کے پاس زندگی کا تصور کیوں نہیں ہے۔ کیکڑے اپنی حفاظت کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے۔ وہ دیر تک سر جوڑے بیٹھے تھے کہ بادلوں کی اوٹ میں گم ہوتے سورج نے ان کی تفریح طبع کے لئے بارش کی کچھ موٹی بوندیں آسمان سے بھیج دیں۔ کیکڑا کچھ لمحے تک تڑپا۔ پانی کے چھوٹے سے گڈھے میں 'اچھلا' کودا ـــــ اوپر نیچے کیا۔ بارش زرا تیز ہوئی تو چھوٹے سے گڈھے میں کیکڑے کی لاش تیر رہی تھی۔

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے اُٹھے ـــــ

ـــــ 'جو اپنی حفاظت نہیں کر پاتے ہیں'

دوسرے نے جوڑا ـــــ جو زندہ رہنا نہیں جانتے ہیں۔

تیسرا مسکرایا ـــــ اور جو اقلیت میں ہوتے ہیں...... اقلیت، وہ اس لفظ پر دل کھول کر ہنسا۔

'ہم نے جو کچھ دیکھا، وہی اس کی زندگی تھی۔ یعنی بس اُتنی ہی زندگی، جتنی ہم دیکھ سکے۔ اُس نے زرا سا ہاتھ پاؤں مارا اور ـــــ'

'اس کی لاش کا کیا کیا جائے۔' دانشور، سنجیدہ تھا۔ بارش سے گیلی ہوئی مٹی اُس نے دونوں ہاتھوں میں بھری۔ کیکڑے کے 'جسم' پر ڈالی۔ عقیدت سے آنکھیں بند کرتے ہوئے بولا۔

'رام نام ستیہ ہے۔'

دوسرے نے تڑکہ لگایا۔ 'جھوم کے بولو ستیہ ہے۔

'ناچ کے بولو ستیہ ہے'

'گا کے بولو ستیہ ہے۔'

'رام نام ستیہ ہے......'

بارش کی رم جھم جاری تھی۔ کپڑے بھیگ چکے تھے۔ چلتے چلتے 'یہ کئی' ٹھہر گئے۔ پہلے نے دوسرے کو ـــــ دوسرے نے تیسرے...... تیسرے نے چوتھے...... یعنی سب نے ایک دوسرے کو باری باری سے دیکھا ـــــ

پہلے کی آواز مدھم تھی...... 'رام نام......'

اس کے بعد کوئی کچھ نہیں۔ سب خاموش ہو گئے۔ اور اٹھ کر یونہی آوارہ گردی کے لیے

نکل گئے ——

کالی رات، مہذب لوگ اور تجربہ گاہ

وہ مہذب لوگ تھے۔ وہ اتنے مہذب تھے کہ اپنے مہذب ہونے کی دلیلیں دے سکتے تھے۔ اور اُن کی دلیلیں اتنی باوزن ہوا کرتی تھیں کہ اُن دلیلوں پر چپ چاپ لوگ سر جھکا لیا کرتے تھے۔

محترم قارئین، یہاں اُن بہت ساری سیاہ راتوں کا ذکر ضروری نہیں ہے، جو' تجربے ' کے لئے اُن کی لیبارٹری میں رکھی ہوئی تھیں۔ لیبارٹری۔ وہ تہذیب سے جڑی ہوئی ہر شئے کو اپنی تجربہ گاہ میں لے جاتے تھے۔ اُنہیں سائنس میں مکمل یقین تھا۔ ردرفورڈ' سے آئن اسٹائین اور گراہم بیل سے نیوٹنس لاء کے بارے میں اُن کی معلومات خاصہ وسیع تھیں۔ جیسے وہ جانتے تھے کہ ہر ایک عمل کا اُس کے مساوی اور مخالف ایک ردِّعمل ہوتا ہے۔ مادّہ کے فزیکل اور کیمیکل ریکشن پر اُن کی خاص نظر ہوا کرتی تھی۔ اور وہ اس بات پر فخر کرتے تھے کہ ہم آج تک کی، اس سب سے زیادہ مہذب دنیا کے، سب سے زیادہ مہذب باشندے ہیں۔ اور یہ بات اُنہوں نے اپنی گرہ میں باندھ لی تھی کہ اِس مہذب دنیا کا اصول ہے، جو طاقتور ہیں، وہی زندہ رہیں گے۔ یعنی جو اقلیت میں ہیں، کیڑے مکوڑے یا کیکڑے وہ ویسے بھی مُردہ ہیں اور اُنہیں جینے کا کوئی حق نہیں۔

تو یہ مہذب لوگوں کی لیبارٹری تھی، جہاں یہ جاننے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی کہ تہذیب اور جنگوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یعنی جنگیں ہی وہ بیش قیمت زیور ہیں، جن سے ہمیشہ سے تہذیبوں کو آراستہ کرنے کا کام لیا جاتا رہا ہے۔

تو فرض کر لیتے ہیں، یہ وہی تھے جو انسانی فضا میں، انسانی گھر میں اور انسانی عمل کے دوران ——

اور فرض کر لیتے ہیں کہ وہ سابرمتی آشرم سے دلّی کے آشرم چوک تک کہیں بھی پیدا ہو سکتے تھے ——

وہ کئی' تھے اور پچھلی کئی راتوں سے لیبارٹری کے لئے کام کر رہے تھے ——

اور یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ وہ کوئی بہت دل سے اپنے کام کو انجام نہیں دے رہے

تھے۔ نہ اُنہیں مجبور کیا گیا تھا۔ بلکہ وہ ایک 'چھوٹے' سے خوف کی بنیاد پر، کہ اس طرح مہذب لوگوں کی دُنیا سے اُنہیں 'دیش نکالا' مل سکتا ہے——وہ اپنے ضمیر کی آواز پر اس کام کے لئے تیار ہو گئے تھے——

اور اس لئے بھی—— کہ ان میں سے سب کے پاس ایک خاندان تھا—— خاندان میں ماں باپ تھے—— بھائی بہن تھے۔ بیوی تھی اور بچے تھے......

اور اس لئے بھی...... کہ بچے معصوم ہوتے ہیں——

اور اُن سے کہا گیا تھا۔ جو مضبوط ہوتے ہیں، بس اُنہیں ہی جینے کا حق ہوتا ہے۔ تہذیب کا فرمان بھی یہی ہے۔ اکثریت کی آواز بھی یہی——اور اقلیتوں کو......

اُنہیں چانکیہ کے اشلوک پڑھائے گئے تھے......

nqjtZuLFk p liZL; oja liksZ u nqtZu %A

likZs na'kfrdkys rq nqtZuLrq ins insAA

(بُرے انسان اور سانپوں میں اگر موازنہ کیا جائے تو
سانپ بہتر ہے کیونکہ سانپ اُسی وقت ڈستا ہے جب
موت آتی ہے اور انسان تو قدم قدم پر ڈستا رہتا ہے——)

اور اُنہیں بتایا گیا، اس سے پہلے کہ وہ آپ کو ڈسیں، آپ کی تہذیب کو۔ آپ......

○○

وہ کئی تھے——

اور کئی، گیس کے سلنڈروں سے بھرے ٹرک پر 'لد' کر ساری رات تہذیب کے نام نئی نئی فنتاسی کو جنم دیتے رہے۔ یعنی ایسی فنتاسیوں کو جن کے تذکرے نہیں ہو سکتے۔ جن پر گفتگو نہیں ہو سکتی۔ زندہ معصوم بچوں کو نئے نئے دلچسپ طریقوں سے آگ میں زندہ جلانے سے لے کر، آبروریزی اور حاملہ عورتوں کی کوکھ میں ہاتھ ڈال کر——

نہیں جانے دیجئے۔ فنتاسی لفظوں کا لباس اوڑھ لے تو ذائقہ جاتا رہتا ہے۔

آپ ایسا کیجئے۔ آپ خود ہی اچھی سی فنتاسی گڑھ لیجئے۔ کیونکہ آپ نے ایک طرف جہاں 'اتہاس' کے قصے پڑھے ہیں، وہیں ہٹلر، مسولینی، چنگیز خاں اور نریندر مودی کے نام بھی سُنے

ہیں۔آپ بابر سے بابری مسجد تک سب کچھ جانتے ہیں——
اس لئے ذائقہ دار فنتاسیاں گڑھ لیجئے۔ جس قدر چاہیے 'رس' یا 'گھول' ملالیں۔آپ کی مرضی——

○○

محترم قارئین،

وہ گئی تھے——

اور وہ وہی تھے جو سابرمتی آشرم سے دلّی آشرم چوک تک......

اور وہ وہی تھے جو انسانی فضا، انسانی گھر اور انسانی......

○○

سب کچھ آنا فانا ہو گیا تھا——

پچھلے کئی دنوں سے وہ 'تہذیب' کو بچانے میں لگے تھے۔ اور آپ جانتے ہیں، تہذیبوں کی حفاظت میں ایسی ہزاروں جانوں کا نقصان تو ہوتا ہی ہے—— ہزاروں جانیں لی گئی تھیں۔ وہ بھی ہزاروں طریقوں سے—— مگر—— اُس گھر میں جو کچھ ہوا، وہ نیا تھا۔ ایک اکثریتی فرقہ کے شخص نے اقلیتی فرقہ کے کچھ لوگوں کو 'پناہ' دی تھی، کہانی بس یہیں سے پیدا ہوئی تھی۔

وہ بس اُس آدمی کو دیکھ رہے تھے جو گھگھیائی ہوئی آواز میں اِن لوگوں کو دیکھ کر چیخ پڑا تھا۔

'مجھے نہیں۔ میں تو اکثریت......'

'اکثریت!'

'ہاں۔ میری متی ماری گئی تھی......' وہ پاگلوں کی طرح چیخا—— یہ میری بیوی ہے یہ بہن۔ یہ بیٹی ہے۔ اور یہ بیٹا۔ یہ سب میرے ہیں۔ ہاں اُنہیں۔ انہیں لے جاؤ۔ جو بھی کرنا ہے کرو۔ کرو۔ میری متی ماری گئی تھی۔ میں بیوی کے بہکاوے میں آگیا تھا۔ دوست ہے۔ بچالو۔ میں گھر لے آیا۔ مجھے کیا معلوم تھا۔ وہ چاروں...... لے جاؤ...... لے جاؤ......' وہ اپنے گھر کے لوگوں کو ایسے گھیر کر کھڑا تھا، جیسے چڑیا انڈے سیتی ہے۔ اُس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ بدن ڈول

رہا تھا۔ آواز میں گھبراہٹ تھی۔ بیوی، بہن، اور بچوں کی حالت بھی وہی تھی۔

'تم نے بچایا کیوں؟'

'میں نے کہا نا۔ بیوی نے......'

'میں نے نہیں۔' بیوی چیخی۔ 'جھوٹے ہو تم۔'

'م......م......میری بیٹی نے......'

'خیر جو بھی ہو۔' یہ کئی' اُن کی طرف گھومے۔ وجہ جو بھی ہو لیکن تم نے بچانے کی کوشش کی۔ اس لئے کہ......دوست!

'میں نے کہا نا متی ماری گئی تھی۔'

'یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ اقلیت ہے۔'

بیوی نے بیٹی کو ایک گندی سے گالی بکی' وہ اُس کے ساتھ پڑھتی ہے۔ اس لئے دوست لگتی ہے۔'

دوست کوئی نہیں ہوتا،' دانشور سنجیدہ تھا۔ دوستی برابر والوں میں ہوتی ہے۔ اکثریت کی اکثریت سے اور......'

'ہمیں چھوڑ دو......چھوڑ دو......انہیں لے جاؤ......'

دانشور نے اقلیت کے چاروں گنہگاروں کی طرف دیکھا۔ وہ سچ مچ ایک لاش بن گئے تھے۔ چہرے سپید پڑ گئے تھے جسم میں خون نہیں۔ چاروں مذبح کے جانوروں کی طرح اُداس کھڑے تھے۔ یعنی کس کی باری پہلے آتی ہے۔ پھر کس کی باری ــــــ

دانشور نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا۔

'باہر آؤ۔' اُس نے گھر کے لوگوں کو غصے میں اشارہ کیا۔ باہر کوئی نہیں بھاگے گا۔ جو جیسے ہے۔ جس حال میں ہے، ویسے ہی۔ میرا مطلب......

اکثریت والا اب بھی چلا رہا تھا۔ انہیں لے جاؤ......میری تو متی ماری گئی تھی۔

○○

یہ کئی' اب باہر تھے۔ باہر' ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے۔

'دیکھو ــــــ ' دانشور سنجیدہ تھا۔ ذرا سوچو۔ یہ ایک بے حد حسین تجربہ ہوگا، یعنی اس

سے پہلے جتنے تجربے ہم کر چکے ہیں، یا ہم کریں گے۔ یا ہم کرنے والے ہیں۔'

سب نے ایک دوسرے سے کانا پھوسیاں کیں۔ پھر پُر امید ہو گئے۔

'اب کیا ارادہ ہے!'——— دانشور جلد از جلد اپنی 'پیاس' کو انجام دینا چاہتا تھا۔

'باس۔ مکان مالک کا کیا کیا جائے۔'

'وہ تو اکثریت کا......' پہلا بولتے بولتے ٹھہر گیا۔

دانشور غصے میں بولا۔ پریشانی اب ایسے ہی لوگوں سے پیدا ہوئی ہے۔ ایسے ہی لوگ......یہی لوگ ہمارے اب تک کے تجربے کو ناکام کرتے رہے ہیں۔'

'تو سب سے پہلے......'

دانشور نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔" ساری باتیں یہیں کر لو گے کیا۔ کچھ اُن لوگوں کے لئے چھوڑو۔ اُنہیں معلوم ہونا چاہئے۔ اُن کے ساتھ کچھ لمحوں میں، آنے والے کچھ لمحوں میں کیا ہونے والا ہے۔"

اگلے ہی لمحے، یہ لوگ اندر تھے___ سامنے اکثریت اور اقلیت کے سہمے ہوئے 9 افراد ان کے فیصلے کے منتظر تھے۔

' آہ، فنتاسی۔' دانشور چلایا۔ دوسرے ہی لمحے اُس کی آواز بدل گئی——— تہذیب ہر بار انصاف کرتی ہے۔ جیسے کوتیا۔ یہ تہذیب کا اصول ہے۔ یہ، یہ بہت زیادہ چلا رہا تھا۔ اس کے منہ میں تیزاب کے قطرے ٹپکاؤ۔ تیزاب کے قطرے......آہ، اور اُس کی بیوی۔ وہ بہت تیز بولتی ہے۔ مرچی کی طرح۔ پہلے اُس کے جسم پر، آنکھوں میں مرچی کے پاؤڈر ڈالو——— بیٹی نے بچانے کی کوشش کی تھی۔ ہے نا۔ ایک بیحد پیاری عمر۔ اور اس عمر میں ایک بیحد پیارا چہرہ۔ جیسا ہونا چاہئے——— اسے بانٹ لو۔ ایسا کرو۔ دونوں بچیوں کو بانٹ لو۔ اِن کے سامنے۔ تفریح کرو——— اِن میں سے کوئی کچھ نہیں بولے گا۔ جسم تفریح کے لئے ہوتا ہے۔ کمسن کے گوشت زیادہ ذائقہ دار ہوتے ہیں۔

'اور___ اقلیت والوں کے لئے باس۔'

ایک بار میں ایک فنتاسی۔ ان کے لئے کچھ الگ سوچتے ہیں۔ سب سے پہلے اُس سنپولئے کو۔ اس کا بھیجا اُڑا دو۔ اقلیتی طبقے کا سنپولیا خطرناک ہوتا ہے۔ حرامی۔

بچے نے تھوک دیا تھا۔

پہلے نے ریوالور تان لیا ـــــ اور اس درمیان ایک گندی گالی بکتا ہوا اکثریت کا بچہ سامنے آ گیا تھا۔

''تو بھاگ جا ـــــ''

'دھائیں۔'

دوسرا بچہ ایک لمحے کے لئے دوسرے کمرے میں پھر...... رہ گیا۔ گولی دوسرے بچے کے سینے پر لگی تھی۔ سینے سے خون کے فوارے چھوٹ پڑے تھے۔ کوئی بھی نہیں چیخا ـــــ

سب جیسے اس کھیل کے خاتمے سے پہلے ہی انجام' کو جان چکے تھے۔

دانشور نے کھیل کا طریقہ سمجھایا ـــــ اسے پنکھے سے لٹکا دو۔ اُس کی ساڑی ہٹاؤ۔ پہلے بلیڈ سے وہاں تک...... پھر ـــــ 'اُس نے بچیوں کو جلتی آنکھوں سے دیکھا ـــــ یہ نئے کپڑے کی طرح ہیں۔ قینچی سے کبھی نئے کپڑے کو کاٹا ہے۔ ان کی چھاتیاں......' وہ مسکرا رہا تھا۔ بلیڈ گھماتے ہوئے' تم ایک عجیب سے نشے میں ڈوب جاؤ گے۔'

تو یہ کمرہ اب ایک لیباٹری تھا۔ تجربے چل رہے تھے۔ نئے نئے تجربے ـــــ موت۔ عورتیں اور مرد ـــــ جوان بچیاں اور فنتاسی ـــــ زندگی اور ایڈونچر ـــــ زمین پر ایک گھنٹے کی تفریح کے بعد آٹھ لاشیں بچی تھیں۔

'حکم باس۔' پہلا آہستہ سے بولا۔

یہ طے تھا کہ سب تھکن سے چور ہو گئے تھے۔

'ابھی آخری فنتاسی باقی ہے۔ یعنی آخری تجربہ۔ دونوں مرد کی لاش چھوڑ دو۔ باقی گھسیٹ کر اندر لے جاؤ۔ ہم ایک نیا تجربہ کریں گے۔'

'ان کے عضو تناسل کاٹ دو۔' دانشور سنجیدہ تھا۔ اور تم ـــــ تم سلائی جانتے ہو نا۔ ماڈرن ٹیلرس کے بچے۔ کپڑے سیتے سیتے انگلیاں ٹیڑھی ہو گئیں تیری۔'

'حکم...... حکم باس'

'ان کے عضو تناسل بدل دو۔'

'مطلب۔ مطلب باس۔'

''اِن سالے سوکالڈ......' اُس نے پھر گندی سی گالی بکی ـــــ ان سالوں کو بتانا ہے

اب۔ سمجھانا ہے ــــــ دھرم کو کھیل سمجھنے والوں کو مزہ چکھانا ہے ــــــ یہ، جو ہر بار ہمارے تجربوں کو ــــــ اُس نے پھر گالی کا سہارا لیا ــــــ اچانک چونکا ــــــ یہ آوازیں سن رہے ہو۔ ہمارے دوسرے ساتھی یہاں پہنچنے ہی والے ہیں ــــــ اُنہیں دیکھنے دو کہ ایسے لوگوں کے پاس نہ اپنا دماغ ہوتا ہے، نہ عضوِ تناسل۔ اب آپریشن شروع کرو ــــــ'

آپریشن شروع ہو گیا۔

پھر ٹیلر ماسٹر نے جیب سے قینچیاں، فیتے اور بلیڈ کا پیکٹ نکال دیا۔ وہ ایک منجھے ہوئے درزی کی طرح بدن کے 'چادر' کو لے کر بیٹھ گیا ــــــ چمڑے کی جھلّی، جو نئے انسانی وجود کے لئے زندگی کا امرت بن جاتی ہے۔ فنکاری اور صفائی سے بدل دی گئی تھیں۔ ٹیلر ماسٹر نے انتہائی مہارت سے اپنا کام انجام دیا تھا۔ ساتھیوں نے شاباشی دی۔ کندھے تھپتھپائے۔ دونوں لاشیں۔ باہر مین گیٹ پر ٹانگ دی گئیں ــــــ'

تجربہ کامیاب تھا۔

مگر کھیل اب شروع ہوا تھا ــــــ

تہذیب کے پیامبر ڈھول، تاشہ بجاتے آتے۔ عضو تناسل کو دیکھتے۔ گندی گالیاں بکتے پھر گزر جاتے ــــــ وہ دیر تک بلکہ کہنا چاہیے کئی گھنٹے تک اس کھیل سے مستفیض ہوتے رہے۔ چلتے وقت دانشور نے قہقہہ لگا کر کہا۔

'صرف بدن کی ایک چمڑی بدل دینے سے۔ تم سب سمجھ رہے ہو نا ــــــ آہ، کیا کیا دلکش کھیل تھا۔' آہ، اس کھیل کو ہم بہت دن تک بھول نہیں پائیں گے۔ اور ہمیں اُس۔ اُس مکّار مکان مالک کو اُس کے کیئے کی سزا بھی دینی تھی۔ اب اُس کی لاش دیکھو۔ اُس کی لاش کی تکا بوٹی ہو چکی ہے۔ جبکہ اقلیت کی لاش۔'

'باس' اُس پر تو پھول مالائیں چڑھی ہیں۔'

'اب چلو، اس کھیل کا سرور تا زندگی قائم رکھنا ہے۔'

وہ جھومتے ہوئے نشہ کی حالت میں آگے بڑھ گئے۔

OO

بچہ اور زندگی

'تمہیں وہ بچہ یاد ہے'

'بچہ؟'

'باس، وہ اقلیت کا بچہ، ہم تو اُس بچے کو بھول ہی گئے۔

'اُسے بچانے مکان مالک کا بچہ آگیا تھا۔'

'پھر ہم کھیل میں الجھ گئے۔'

'اور بچہ بھاگ گیا۔'

'وہ بچہ کہاں جا سکتا ہے——؟' دانشور کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔

'اُس کی نیلی نیلی آنکھیں' پہلا مسکرایا۔ تمہیں اُس بچے کی یاد ہے۔ اُس کے چہرے پر ذرا بھی ڈر یا گھبراہٹ نہیں تھی۔'

'اُس کے ہونٹ' دوسرا کہتے کہتے ٹھہرا......

'بولو...... بولو......' دانشور کی آنکھیں مند گئی تھیں

'کھٹے کھٹے بیر جیسے تھے۔ اور پیارے۔'

'اُس کا چہرہ۔' تیسرے نے اپنے خیال کا اظہار کیا—— یقیناً وہ ایک بہت خوبصورت بچے کا چہرہ کہا جا سکتا ہے۔'

'وہ کہاں چھپا ہوگا؟' دانشور کو اپنی غلطی پر غصہ آرہا تھا۔

'اُسے چھوڑنا مناسب نہیں ہے۔'

'اُسے مارنا......' پہلا کہتے کہتے ٹھہر گیا......

دانشور نے حیرانی سے پوچھا—— 'کہیں تم سب اُس بچے پر رحم تو نہیں کر رہے۔'

'نہیں باس۔ قطعی نہیں۔'

'مگر کیا اُسے مارنا......'

دانشور غصے میں گھوم گیا۔ مطلب۔ 'تم لوگ کہنا کیا چاہتے ہو؟

'بچہ ہے۔'

'بچے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔'

'کیوں نہ ہم اُسے اکثریت کا بنا دیں؟'

'اکثریت ——؟' دانشور چونک گیا تھا۔

'ہاں۔ دھرم پریورتن۔ بچہ تو پانی ہوتا ہے۔

دانشور کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ ابھی زیادہ گھنٹے نہیں ہوئے۔ بچہ بھوک پیاس سے بے حال ہو رہا ہوگا۔ وہ یقیناً چھپا اور زندہ ہوگا۔ ہمیں بچے کو تلاش کرنا چاہیے۔

'اور بچانا بھی۔'

پہلا ابھی بھی مطمئن نہیں تھا۔ کیا وہ وہاں موجود ہوگا —— میرا مطلب ہے......'

دانشور نے پُر امید لہجے میں کہا۔ فضول کی باتیں نہیں۔ ہم اس مدعے پر بہت باتیں کر چکے ہیں۔

'بچے کی زندگی ضروری ہے' —— ٹیلر ماسٹر نے لمبی سانس لی۔

'ہاں، اُس کی زندگی بیش قیمت ہے' —— یہ پہلا تھا۔

اُس کی زندگی سے، یعنی اب کی زندگی سے۔ نئی زندگی سے بہت کام لینے ہیں'۔ یہ دانشور تھا۔

OO

محترم قارئین!

تو یہ سارا کچھ اُس چھوٹے سے بچے کے لئے ہوا —— اُس چھوٹے سے آٹھ سالہ بچے کے لئے، جس کی آنکھیں نیلی تھیں، چہرہ خوبصورت تھا اور جس کا تعلق اقلیت سے تھا۔ تو یہ سب کچھ اُس چھوٹے سے بچے کے لئے ہوا، جس کے لئے اکثریت کے بچے نے، بچاتے ہوئے اپنی جان دے دی اور جو تہذیب کی اس جنگ کے دوران جان، بچانے کے لئے اپنے گھر میں ہی لاپتہ ہو گیا تھا۔ اور یقیناً ایسے بچے کو بچانا ایک اہم فریضہ تھا۔ اور جیسا کہ دانشور نے سوچا، تہذیب کے عروج کے لئے، مذہب کو ہی واحد ہتھیار کے طور پر سوچا جا سکتا ہے۔ بچے کا دھرم پریورتن ہو جائے تو......

اور یقیناً یہ ساری جنگ تہذیب کے لئے، تہذیب کے نام پر لڑی گئی تھی۔ اور اُن کے

سوچنے کا پڑاؤ وہی گندہ نالہ یا تالاب تھا، جہاں اُنہیں وہ کینکو املا تھا ــــــ یا بلوں سے نکلتی برساتی کالی چیونٹیوں کو انہوں نے پاؤں تلے روند دیا تھا۔

وہ دوبارہ جلے ہوئے مکانوں اور جلی ہوئی شاہراہوں سے گزرتے ہوئے اُس مکان تک پہنچ چکے تھے۔ آسمان پر کوؤں اور گدھوں کی اُڑان دور تک دیکھی جاسکتی تھی...... ابھی بھی آس پاس کئی مکانوں سے دھوئیں نکل رہے تھے۔

'بچے طاقتور ہوتے ہیں۔'

دانشور مسکرایا ــــــ ہاں'۔

'اور اسی لئے بچے سب کچھ سہہ لیتے ہیں۔ عذاب، بارش اور جنگ!'

'ہاں۔'

'بچے مرتے نہیں ہیں'

'ہاں'

'بچے مر کر بھی نہیں مرتے ہیں، دانشور پھر مسکرایا۔' اُسے آواز لگاؤ۔ کھوجو'

'لیکن ہم پکاریں گے کیا؟

'ہاں یہ مسئلہ تو ہے۔'

'بچہ۔ ہم اُسے بچہ کیوں نہیں کہہ سکتے'

'بچے تو سب ہوتے ہیں...... اکثریت......' پہلا کہتے کہتے ٹھہر گیا۔

دانشور کا چہرہ بجھ گیا تھا۔ 'نہیں اُسے بچہ کہہ کر آواز لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔

'پھر ــــــ؟'

'پھر۔ سوچتے ہیں۔'

'اُس کی آنکھیں نیلی تھیں'

'ہاں۔

'بال بھورے تھے۔'

'ہاں۔

'نیلی آنکھوں والا بچہ؟'

'یہ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔'

'بھوری آنکھوں والا ــــــ ؟'

'یہ بھی نہیں'

وہ شاہزادے جیسا دکھتا تھا؟ کیا شاہزادہ کہہ کر......'

'نہیں۔' دانشور سنجیدہ تھا ــــ اقلیت پر شہنشاہیت برسوں پہلے ختم کردی گئی۔ نہ تاج نہ تخت ــــــ نہ بادشاہ ــــــ نہ شہزادے......'

'لیکن اب تو وہ ہمارے ہو رہے ہیں۔ یعنی دھرم پریورتن......'

'اس کے باوجود نہیں۔'

'پھر ــــــ ؟'

'دانشور فیصلہ کرچکا تھا۔ اقلیت ۔ یہ نام بہت ہے۔ چلو، ہم اُسے اسی نام سے پکارتے ہیں۔'

'اُس نے کسی فوجی کی طرح 'کمانڈر' کا رول نبھاتے ہوئے کہا۔' ایسا کرو۔ تم اس طرف۔ تم اُس طرف۔ ایک میرے پیچھے پیچھے آئے......اور......'

باس، الگ الگ ہٹ کر ہم کمزور نہیں ہو جائیں گے ــــ ٹیلر ماسٹر کی آنکھوں میں چمک تھی۔

'پوائنٹ'

'اس طرح تو بچہ ہم پر حملہ بول سکتا ہے۔ وہ آٹھ سال کا ہے۔ آٹھ سال کے بچے کا دماغ انتہائی شیطان کا اور سازش سے بھرا ہوتا ہے۔'

'پوائنٹ'

'سب ایک ساتھ رہتے ہیں۔ بچہ سب کو ایک ساتھ دیکھ کر ڈر جائے گا۔' یہ بھی ٹیلر ماسٹر تھا......

'بچے کو ڈرانا نہیں ہے ــــــ بچانا ہے ــــــ' دانشور کا چہرہ غصے سے پیلا پڑ گیا۔ چلو دیر مت کرو۔ تلاش کرتے ہیں۔ اقلیت......اق لیت۔ بیٹے......؟

'اقلیت......'

'میرے اقلیت......'

'اقلیت ڈارلنگ......'

وہ بچے کو تلاش کر رہے تھے۔ گھر کی کوئی شئے سلامت کہاں تھی۔ زمین سے قالین،

دیوار سے لے کر کمرے اور کمرے کے مہنگے سامان ——— لاش کی ہڈیاں کتے، گدھ اور کوے کھا چکے تھے۔ سامانوں کے جنازے بکھرے تھے..... ٹوٹے ہوئے کھنڈر میں ان کی ملی جلی آوازیں باز گشت کر رہی تھیں۔

'اق..... لیت.....'

'میرے بچے اقلیت......

'یہاں تو کوئی نہیں ہے۔'

'اوپر۔ اوپر دیکھتے ہیں۔'

'بالائی منزل کی سیڑھیاں ٹوٹی ہوئی ہیں۔'

دانشور کی چیخ نکل گئی ——— 'سنبھل کر آنا'۔

پہلا چیخا۔ 'سر بچاؤ۔

چھت کا ایک چھوٹا سا حصہ بھڑ بھڑا کر تیز آواز کے ساتھ گرا ———

دانشور مطمئن تھا۔ بچہ اوپر نہیں ہو سکتا۔'

دوسرے کا خیال تھا۔ چھت بُری طرح بیٹھ چکی ہے۔ یعنی ایک کوا بیٹھنے کے تصور سے بھی ___ بچہ کا چھپنا تو دور کی چیز ہے۔'

'کیا بچہ اسی گھر میں ہوگا۔؟' ٹیلر ماسٹر نا امید تھا ——— 'یعنی وہ بھاگ کر کہیں اور بھی تو پناہ لے سکتا ہے۔ کہیں اور.....'

دانشور مطمئن تھا۔ 'بچہ کہیں اور پناہ لے ہی نہیں سکتے۔'

'کیوں؟'

'کیونکہ آندھی تیز تھی۔ درخت سارے گر گئے تھے۔'

دانشور اپنے جواب سے مکمل طور پر مطمئن تھا۔ ایسی صورت میں بچے کے سامنے اس کھنڈر میں چھپنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں بچتا ہے۔'

'آگے اندھیرا ہے۔'

'ٹارچ۔ ٹارچ نکالو'

اُن میں ایک نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ٹارچ نکالا۔ ٹارچ نکالتے ہوئے پھسپھسایا ___ ''سنتے ہیں، کچھ ملک ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں رات ہی رات ہوتی ہے، دن نہیں ہوتے۔'

'ہاں۔'

'باس یہاں بھی کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔'

دانشور کا لہجہ غصے سے بھرا تھا—— 'ہم ایک نیک مقصد کے لئے—— سمجھ رہے ہو نا، بچے کو بچانے کے لئے۔'

'وہ زندہ ہوتا تو ہماری آواز ضرور سنتا۔'

'وہ زندہ ہے اور یقیناً ہماری موجودگی سے گھبرایا ہوا ہے۔'

'اقلیت......'

'اقلیت بیٹے......'

مائی ڈارلنگ اقلیت،

آواز لگاتے ہوئے، وہ ایک بار پھر آگے بڑھ رہے تھے۔ آگے، ٹوٹے ہوئے کھنڈر کے ملبے میں—— دروازے، کھڑکیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے۔ کہ اچانک......

'کوئی ہے۔' آواز گونجی

'ٹارچ۔'

'کوئی ہے—— 'دانشور اندر ہی اندر خطرے کے سائرن' کے طور پر کانپ گیا تھا۔

پہلے نے ٹارچ جلایا—— '

دوسری آواز اٹھی—— بچہ ہے۔'

'کہتا تھا، نا......'

ٹارچ کی روشنی ٹوٹے ہوئے لاہوری اینٹے، بھربھرائی مٹی سے ہوتی ہوئی بچے کے چہرے پر ٹھہر گئی ہے......

'باس......'

ٹیلر ماسٹر نے چیخ کر کہا—— 'باس بچہ ہی ہے۔'

'اوہ گاڈ۔'

دوسری آواز آئی۔ 'بچے کی نبض دیکھو۔'

'کوئی ضرورت نہیں باس'۔

ٹیلر ماسٹر کی آواز گونجی—— 'بچے کی پیٹھ میں گولیاں لگی ہیں'۔

پہلے نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا—— بچہ مر چکا ہے۔
دوسرا ٹارچ کی روشنی میں بھیانک بدبو دیتے ہوئے بچہ کی لاش پر جھک گیا۔ 'بچہ کو مرے ہوئے کافی عرصہ گزر چکا ہے۔'

○○

محترم قارئین!

کہانی ختم ہو چکی ہے۔ لیکن یقیناً کچھ باتوں کا قیاس لگایا جا سکتا ہے۔ جیسے لوٹتے وقت یہ بہت مایوس رہے ہوں گے۔ ممکن ہے بچے کو نہیں بچا پانے کی صورت میں۔ یا اس سے زیادہ، ممکن ہے، دھرم پریورتن کے خیال کو عملی جامہ نہ پہنا پانے کی صورت میں—— یا ممکن ہے۔
کوئی اچھا سا قیاس آپ بھی کیوں نہیں لگا لیتے۔
لوٹتے ہوئے ان کے چہرے جذبات سے عاری تھے اور ایسے چہروں کا فائدہ ہے کہ آپ کچھ بھی قیاس لگا سکتے ہیں۔
لیکن قارئین، سب سے ضروری جو بات ہے، وہ یہی ہے۔ کہ یہ وہی تھے جو سابرمتی آشرم سے دلّی کے آشرم چوک تک——
اور جو انسانی فضا میں، انسانی گھر میں۔ انسانی کمرے میں...... اور انسانی عمل کے دوران—— کیا اب بھی آپ کو یقین نہیں ہے کہ یہ 'کئی' کبھی پیدا ابھی ہوئے ہونگے——!

○○○

بیٹی

(اپنی بٹیا صحیفہ کے لئے، کہ یہ کہانی بھی اُسی کے
تصور سے پیدا ہوئی تھی)

خوف

بیٹی باپ سے ڈرتی تھی، اس کے برخلاف ماں کو اپنا دوست سمجھتی تھی ____

ماں بیٹی سے ڈرتی تھی، اس لئے کہ بیٹی دنوں دن تاڑ جتنی لمبی ہوتی جارہی تھی......

باپ کو بیٹی سے بالکل ڈر نہیں لگتا تھا۔ اس لئے کہ باپ مصروف رہتا تھا ____ اس لئے کہ باپ کا زیادہ سے زیادہ وقت اپنے کاروباری قسم کے لوگوں کے پاس گزرتا تھا...... اور اس لئے کہ بہت تھوڑے سے وقت میں، جو باپ اکثر اپنی بیٹی کے لئے چرالیا کرتا تھا، اور باپ یہ لمحے اپنی بیٹی کے ساتھ ہی گزارنا پسند کرتا تھا ____ یہ اور بات تھی کہ یہ لمحے سال میں کبھی کبھی ہی باپ کو میسر آتے تھے......

○○

بیٹی کی مٹھیوں میں راتیں دبی ہوتی تھیں......

بیٹی کی مٹھیاں اکثر تنہائی میں کھل جایا کرتی تھیں...... اور نیلے آسمان سے اتری راتیں خاموشی سے اس میں سما جایا کرتیں......

پھر یہ راتیں چپکے چپکے اسے چھیڑنے پر آمادہ ہو جاتیں......

سنو......

وہ جیسے نشے میں ڈوبی آنکھیں لئے کسی اور دنیا میں گم ہو جاتی......

نیلے آسمان سے اتری راتوں میں شوخیاں سما جاتیں......

......اب تم ویسے نہیں ہنستی ہو جیسے......

......جیسے؟

ہاں، اب تم ویسے، پہلے کی طرح نہیں رہتی، جیسے......

تم بدل رہی ہو......

سُبک مسکراہٹ، فلک سے عربی نغموں کی سواریاں لے کر آجاتیں......

تم بہت بدل گئی ہو......کیا نہیں۔ ذرا اپنے آس کی ہواؤں کو دیکھوں...... باغوں کو ــــ دریا کو ــــ دریا میں ہولے ہولے تیرتی کشتیوں کو......کشتیوں کے کھلے، ہوا میں لہراتے بادبان کو ــــ پھولوں کو، خوشبو کو......اپنے اطراف اٹھی ہوئی عمارتوں کو ــــ اور اپنے اردگرد منڈلاتے بھونروں کو......

'بھونروں کو......' وہ چونک گئی۔

نیلے آسمان میں اترتی راتیں اچانک سہم گئی تھیں ــــ سب کچھ نیا، ہے نا۔ بالکل تمہاری عمر کے گھوڑے جیسا ــــ ایرانی گھوڑے جیسا ــــ شکر کرو کہ ابھی اس بارے میں تمہارے گھر والوں کو پتہ نہیں ہے۔

پھر کیا ہوگا......؟

وہاں ایک سویا، سویا سا ڈر جاگ جائے گا اور......

اور کیا؟

گھر کی آنکھوں نے ابھی تمہارے جسم کی سرگوشیاں نہیں سنی ہیں۔ ــــ پھر...... پھر وہ اچانک بے چین ہو جائیں گی......اور تم......قید کر دی جاؤ گی۔

رات کا سناٹا......گہرا سناٹا......

بیٹی نے ہولے سے جھولتے ہوئے، جھولے پر سے ایک پھول توڑ لیا۔ پھول بالوں کے گچھے میں لگا لیا، اور لہراتی ہوئی کسی خیال میں گم ہو گئی۔

تیزی سے آتے ہوئے باپ نے یہ منظر دیکھ لیا تھا۔
باپ الٹے پاؤں واپس لوٹ گیا تھا ـــــــ

○○

باپ حیرانی سے آئینے کے سامنے کھڑا تھا۔
باپ کو اپنا 'زمانہ' یاد تھا...... باپ کو سب کچھ یاد تھا...... لیکن دنیا، اسٹیٹس سمبل، پیسوں کے لئے بھاگ دوڑ میں الجھے باپ کے پاس سے جذباتی آنکھیں، آہستہ آہستہ غائب ہونے لگی تھیں...... پرانے منظر باپ کی یادوں سے پھسل کر غائب ہونے لگے تھے ـــــــ لیکن باپ اس لمحہ، اچانک، بیٹی، جوڑے اور پھول کو دیکھ کر چونک گیا تھا۔

برسوں پہلے اس منظر کی زد میں کوئی اور تھا۔
سرسراتی ہوا، ہلتے ہوئے پیڑ ـــــــ جھولا ـــــــ جھولے پر بیٹھی ہوئی ایک لڑکی ـــــــ جھولتے جھولتے لڑکی کے ہاتھوں میں ایک پھول آجاتا ہے اور پھول......
باپ نے اس منظر کو وہیں فریز کر لیا۔
باپ پھر اس لڑکی کو گھر لے آیا...... بیوی بنا کر۔
پھر باپ، زمانہ، اسٹیٹس سمبل اور پیسہ کمانے والی مشین کا غلام بن گیا۔ باپ حیران تھا......
تو کیا بیٹی......؟
باپ کو تعجب تھا۔ لیکن ابھی تو...... گیلی گیلی پھلیاؤں، کے منظر تو ـــــــ آنکھوں کو ابھی بھی سہانے ہیں ـــــــ ننھے ننھے ہاتھ پاؤں۔ توتلی باتوں کی پچکاریاں ـــــــ وہ گود میں اٹھا لیتا...... بھالو بن جاتا...... اور کبھی گھوڑا...... بیٹی کو جنگل پسند تھا اور جنگل میں رہنے والے۔
لیکن...... باپ کے پاس جنگل میں گھومنے کا وقت ہی کہاں تھا۔

○○

بھالو، گھوڑا...... بیٹی رات رات، سارا سارا دن باپ کا انتظار کرتی ـــــــ باپ جب کبھی گھر لوٹتا، مصروفیت کے بوجھ سے کندھے جھکے ہوتے ـــــــ پھر بھی وہ تازہ دم بنے رہنے کی

کوشش میں مصروف رہتا۔

بھالو، گھوڑا، جنگل...... باپ اچانک اس جنگل میں لوٹا تھا...... اور حیرانیوں کی بارش لے کر وہ بیوی کے پاس آ کھڑا ہوا۔

'تمہیں پتہ ہے' ہماری بیٹی اب......

ہاں پتہ ہے۔

پتہ ہے؟ باپ چونک گیا تھا۔

''ڈرومت...... پچھلے چار برسوں سے...... چار برسوں سے اس کا جسم میری آنکھوں کی دوربین میں ہے...... غلط مت سمجھو...... میں نے ایک لمحے کے لئے بھی اسے کھلی ہوا میں سانس لینے کا موقع نہیں دیا ہے۔''

''مطلب؟''

بیوی ہنسی...... ''مطلب وہ آدھا ہنستی ہے ــــــ آدھا میں نے قبضہ کر رکھا ہے ــــــ وہ آدھا اڑتی ہے ــــــ آدھی اڑان میرے قبضے میں ہے ــــــ اڑان، ہنسی، مسکراہٹ، خواب...... بڑے ہونے اور نافرمانی کرنے کے شک میں ــــــ میں نے ایک آدھا جسم اس کے پاس رہنے دیا ہے ــــــ اور آدھا......''

بیوی ہنس رہی تھی۔

بیوی اپنا زمانہ بھول گئی تھی۔

بیوی نے پھر پلٹ کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔ جیسے بیوی کو، اس کا جواب، اس کی دلیل، کسی کی بھی ضرورت نہ ہو......

OO
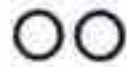
بیٹی حیران تھی...... جیسے بہت سے پلاش کے پھول اس کی ننھی منی ہتھیلیوں میں سما کر رنگ بن گئے ہوں...... رنگ...... پھر اس نے آدھے رنگوں کو اپنی ہتھیلیوں سے کھرچ دیا......

تو اس کا مطلب؟

باپ برسوں بعد اپنی بیٹی سے شیئر کر رہا تھا۔

ہاں۔

توتم آدھا ہنستی ہواور آدھا تمہاری ماں کی تحویل میں ہے۔

ہاں۔

اورتم آدھا اڑان بھرتی ہو۔

ہاں۔

پھرتم مکمل کہاں رہ گئیں...... آدھا آدھا...... بڑے ہونے سے اڑنے تک ____ بچپن سے جوانی اور جسم سے روح تک...... گھر سے کالج اور کالج سے گھر تک ____ آنکھوں سے مسکراہٹ اور مسکراہٹ سے خواب تک......

ہاں۔

''راتیں...... پُراسرار راتیں...... تمہیں پتہ ہے ____ تم ایک حسین زندگی کا صرف آدھا لطف لے رہی ہو...... ایک بے حد حسین کائنات کے صرف آدھے حصے کو تمہاری آنکھیں چھو رہی ہیں ____ جب کہ......''

باپ افسردہ تھا......

''تم نے پریم کیا ہے......؟''

واپس لوٹنے سے قبل باپ کا جملہ نپا تلا تھا...... پریم آدھا نہیں ہوتا۔ پریم مکمل ہوتا ہے...... اور بیشک تم عمر کے اس حصے میں ہو، جہاں تمہیں پریم کے احساس سے...... یعنی میرا مطلب تو تم سمجھ رہی ہو نا......

بیٹی ایک لمبی چپ لگا گئی تھی......

لیکن بیٹی کو باپ میں پہلی بار ایک دوست نظر آیا تھا۔

○○

باپ کی باتیں اس رات بہت دیر تک بیٹی کے کانوں میں گونجتی رہیں۔ وہ حیرت زدہ کرنے والی باتیں تھیں...... کسی بھی باپ کے منہ سے پہلی بار اس طرح کی باتیں اس کے کانوں میں گونجی تھیں۔ وہ ان جملوں کا ذائقہ ابھی بھی محسوس کرسکتی تھی......

'تم سن رہی ہو، نا اور تمہیں احساس ہونا چاہئے ____ 'باپ کا لہجہ کچھ کچھ برف جیسا سرد تھا۔ یعنی دنیا کہاں جارہی ہے ____ اور دنیا کہاں تک جاسکتی ہے۔ خوف اور اینتھریکس سے

الگ بھی ایک راستہ جاتا ہے...... پریم کا راستہ...... ہم ہر برس کے خاتمے کے بعد اپنے لئے ایک اینتھریکس کا خوف تلاش کر لیتے ہیں ـــــ ہے ناکتنی عجیب بات ـــــ اس مہذب دنیا میں اونچی اونچی عمارتوں کے درمیان ہمیں ڈرنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے ـــــ اور تم اپنے آپ کو دیکھو لڑکی...... تمہارا چہرہ کیسے ہو رہا ہے ـــــ یعنی سچ پوچھو تو کتنی ڈری سہی دکھائی دے رہی ہو تم ـــــ ؟

'ہاں' میں ڈر گئی ہوں۔

باپ چپ تھے...... باپ نے صرف اتنا پوچھا۔

اپنے آپ سے......؟

ہاں......

اپنی بڑھتی عمر سے؟

ہاں......

باپ کے ہاتھ کھلونوں کی طرح اپنی انگلیوں سے کھیلتے رہے......

''کیوں ڈر جاتے ہیں ہم۔ اینتھریکس وہ نہیں ہے جو ہر بار ورلڈ وار کے خطرے سے پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ کچھ اور بھی ہے...... باپ کے ہاتھ کھیلتے کھیلتے ٹھہر گئے تھے۔ لیکن نہیں...... بیٹی! سن رہی ہو نا تم۔ تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے...... لیکن کیا کرو گی...... سب ڈر رہے ہیں...... جیسے تمہارا چہرہ دیکھ کر لگتا ہے، تم اپنی ماں سے بھی ڈر رہی ہو گی۔ ماں، جو بیوی بننے تک ایک خوبصورت دنیا میں جیتی ہے اور ماں بنتے ہی ایک Cruel اور ایک کروسیڈر ـــــ اس کے وجود میں پناہ لینے لگتا ہے......''

باپ نے نظر نہیں ملائی...... صرف اتنا کہا......

'تمہیں اپنی ماں سے ڈرنا نہیں چاہئے۔ اپنی ماں کو سمجھانا چاہئے۔'

ماں

بیٹی اچانک بڑی ہونے لگی تھی ـــــ اور اس بڑی ہونے کے خطرے کو ماں نے بھانپ لیا تھا ـــــ ماں کمانڈوز کی طرح بیٹی کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ کہاں جا رہی ہو تم ـــــ نہیں۔ فون ہمیشہ نہیں سننا ہے...... اتنی دیر تک کس سے باتیں کر رہی تھی...... ماں کبھی کبھی اسے شکاری کی

طرح گھیر کر بیٹھ جاتی ـــــ ماں ایک فلاسفر کی طرح نان اسٹاپ شروع ہو جاتی...... اور اپنی ہر گفتگو میں ماں اتنی او باؤ، اتنی بوجھل باتیں کرتی نظر آتی کہ وہ اندر ہی اندر ایک عجیب سے دکھ کا شکار ہو جاتی۔ اسے، بس یہ الجھن گھیر لیتی کہ ماں اپنا زمانہ بھول گئی ہے یا ـــــ ماں...... کبھی بیٹی تھی ہی نہیں۔

'دیکھو تو ـــــ بدن پر کتنا گوشت آ گیا ہے۔'

'زیادہ سونا لڑکیوں کے لئے خطرناک ہوتا ہے ـــــ چربی چڑھ جاتی ہے۔'

'ڈائٹنگ...... ڈائٹ کنٹرول...... بوائل...... سب کچھ بوائل کھانا ہے تمہیں۔'

ماں کی ہر بات پر وہ اندر ہی اندر بوائلڈ ہوتی چلی گئی...... کبھی ماں ایک چھتنار درخت کی طرح لگتی ـــــ جس کے سایہ میں اس کی زندگی محفوظ ہے۔

لیکن کتنی محفوظ ہے؟

ماں کیا چاہتی ہے، یہ آہستہ آہستہ اس پر منکشف ہو رہا تھا...... یعنی ماں اسے دنیا کی نظروں سے بچائے رکھنا چاہتی تھی۔ ایک بے حد خاص موقع کے لئے...... بے حد خاص...... جیسا کہ اس کی ماں نے سوچ رکھا تھا...... ایک بڑی تپسیا اور...... ایک دن اچانک اسی، ان چھوٹے پودے کو نمائش گاہ میں رکھ دینا۔

یعنی ماں کے لئے، اس کے بڑے ہونے کا عمل، سب کچھ سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق ہو رہا تھا...... ماں، اس میں اپنے 'مستقبل' کو تلاش کر سکتی تھی۔ یعنی ایک ایسے برائٹ فیوچر کو، جہاں اس کے ساتھ ماں کی تقدیر بھی کھل سکتی تھی۔

'آہ، تم نہیں جانتی!'

یا پھر...... آہ، تمہارے لئے میں نے کیا کیا سوچ رکھا ہے، نادان لڑکی...... ماں کے ان جملوں کا مطلب تھا...... دیکھتی رہو۔ تمہیں صرف اشارے سمجھنا ہے اور چلنا ہے۔ بس اس سے زیادہ نہیں۔

ماں نے بہت زیادہ اس کے بارے میں سوچ رکھا تھا۔ ماں اس سے کہیں زیادہ اس کے بارے میں سوچ سکتی تھی ـــــ لیکن بیٹی ـــــ جیسے ہر بار معصوم چڑیا کی طرح اڑتے اڑتے وہ کسی خوفناک گدھ کو دیکھ لیتی......

ڈائٹ کنٹرول...... لیکن نتیجہ کے طور پر کیا برآمد ہوا تھا...... آنکھوں میں پڑے گہرے حلقوں میں خواب کہیں گم ہو گئے تھے...... کسی مخملی فرش پر کیٹ واک کرنے والے اس کے پاؤں تھرتھرانے لگے تھے...... ماں اسے لے کر انسٹی ٹیوٹ آف مثل ہیلتھ اینڈ سروسز گئی تھی۔

ڈاکٹر مونا برا سامنہ بنا کر بولی تھی۔ 'تم لڑکیاں...... کھانے کو دشمن کیوں بنا لیتی ہو......'
اس نے ماں کو دیکھا۔ ماں نے بیٹی کا ہاتھ دبا دیا۔
'اینوریکسیا۔ وزن میں کمی...... ڈاکٹر مونا نے برا سامنہ بنایا ــــــ کیلشیم اور فاسفورس کی کمی سے کیا ہوتا ہے ــــــ جانتی ہو...... ہارمون، ڈس بیلنس ہو جاتے ہیں ــــــ اور امینوریا ــــــ سمجھتی ہو نا ــــــ پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے ــــــ عورتیں بانجھ ہو سکتی ہیں۔

OO

'بانجھ ہارمون کا ڈس بیلنس ہونا...... بیٹی دکھ گئی ہے۔ زندگی سے کیلشیم اور فاسفورس تو ماں نے لے لئے ہیں...... وہ سچ مچ ڈس بیلنس ہو گئی ہے ــــــ نہیں...... اس نے توازن کھو دیا ہے...... وہ لڑکھڑا رہی ہے۔ وہ کبھی بھی گر سکتی ہے...... وہ جیسے ایک ٹھونٹھ درخت ہے۔ بانجھ...... امینوریا کی شکار......

''ایک دن جب تم خود کو دیکھو گی تو...... ڈاکٹر تو بولتے ہی رہتے ہیں۔''
اس نے دیکھا۔ ماں کی آنکھوں کی سوکھی پڑی جھیل کو۔ لیکن یہ کیا...... اس جھیل میں کوئی ہے...... کوئی ہے، جو کیٹ واک کر رہا ہے......
کون ہے؟
وہ اس چہرے کو پہچان سکتی ہے۔
ارے، یہ چہرہ تو اس کے خود کا چہرہ ہے ــــــ لیکن یہ چہرہ اتنا مرجھایا ہوا کیوں ہے؟

پہلی بار بیٹی نے اپنا جائزہ لیا تھا۔ اپنے جسم میں وہ کتنی ہے...... اپنی روح میں ــــــ؟ اپنے وجود میں ــــــ؟ اور اپنے آپ میں ــــــ؟

اس نے ماں اور باپ دونوں کو اپنے آپ میں رکھ کر دیکھا ـــــــ پھر مطمئن ہوگئی ـــــــ باپ کو وقت کہاں تھا اور ماں...... روح سے جسم اور جسم سے وجود تک ماں نے کسی بھی حصے کو ـــــــ اس کی اپنی آزادی کے نام نہیں کیا تھا...... آدھا بھی نہیں۔ وہ مکمل ماں کے قبضہ میں تھی۔

اس لئے پہلی بار ـــــــ باپ کی باتوں میں اسے ایک دوست نظر آیا تھا۔ دوست، جس کے سہارے وہ اپنی جنگ لڑ سکتی تھی۔

باپ

لیکن شاید بیٹی ابھی بھی مطمئن نہیں تھی۔ یا پھر بانجھ ہونے کا ڈر اس کے اندر کچھ زیادہ ہی بیٹھ گیا تھا...... بانجھ۔ عورت کے لئے سب سے بڑی گالی...... ایک ایسی گالی، کم و بیش بیٹی جس کا سامنا کرنے کو تیار نہیں تھی...... وزن کم کرنے کے لئے وہ امینوریا کی پیشنٹ بننے سے خود کو روکنا چاہتی تھی۔ دراصل بیٹی، باپ کو آزمانا چاہتی تھی۔ شاید اسی لئے کسی ایک مضبوط لمحہ، وہ چپ چپ باپ کی آغوش میں سر چھپا کر بیٹھ گئی۔ باپ آہستہ آہستہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے رہے۔

''میں کچھ بھی کر سکتی ہوں؟'' ذرا دیر بعد بیٹی کے لب ہلے۔

......'ہاں۔'

......' کچھ بھی؟'

......'تمہیں شک کیوں ہے؟'

'شک نہیں...... ماں کہتی ہے، لڑکی پیدا ہوتے ہی اپنا ایک پنجرہ لے آتی ہے۔'

باپ ہنسا...... 'لیکن تم سے پہلے تمہاری ماں اس پنجرے کو توڑ چکی تھی۔ اس نے لو میرج کی تھی ـــــــ'

ماں کہتی ہے' اس کے باوجود ہم پنجرے میں رہتے ہیں۔'

باپ نے مزاحیہ انداز اپنایا ـــــــ 'پنجرے میں پنچھی بھی نہیں رہتے!'

بیٹی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ 'تو میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔ اڑ سکتی ہوں۔ باہر جا سکتی ہوں۔ ڈسکو۔ تھیٹر، اور......

ڈائٹ کنٹرول......لیکن نتیجہ کے طور پر کیا برآمد ہوا تھا......آنکھوں میں پڑے گہرے حلقوں میں خواب کہیں گم ہو گئے تھے......کسی مخملی فرش پر کیٹ واک کرنے والے اس کے پاؤں تھرتھرانے لگے تھے......ماں اسے لے کر انسٹی ٹیوٹ آف منٹل ہیلتھ اینڈ سروسز گئی تھی۔

ڈاکٹر مونا برا سا منہ بنا کر بولی تھی۔ 'تم لڑکیاں......کھانے کو دشمن کیوں بنا لیتی ہو......'

اس نے ماں کو دیکھا۔ ماں نے بیٹی کا ہاتھ دبا دیا۔

'اینوریکسیا۔ وزن میں کمی......ڈاکٹر مونا نے برا سا منہ بنایا____ کیلشیم اور فاسفورس کی کمی سے کیا ہوتا ہے____ جانتی ہو...... ہارمون، ڈس بیلنس ہو جاتے ہیں____ اور امینوریا____ سمجھتی ہو نا____ پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے____ عورتیں بانجھ ہو سکتی ہیں۔

OO

'بانجھ ہارمون کا ڈس بیلنس ہونا......بیٹی دکھ گئی ہے۔ زندگی سے کیلشیم اور فاسفورس تو ماں نے لے لئے ہیں......وہ سچ مچ ڈس بیلنس ہو گئی ہے____ نہیں......اس نے توازن کھو دیا ہے......وہ لڑکھڑا رہی ہے۔ وہ کبھی بھی گر سکتی ہے......وہ جیسے ایک ٹھونٹھ درخت ہے۔ بانجھ...... امینوریا کی شکار......

''ایک دن جب تم خود کو دیکھو گی تو......ڈاکٹر تو بولتے ہی رہتے ہیں۔''

اس نے دیکھا۔ ماں کی آنکھوں کی سوکھی پڑی جھیل کو۔ لیکن یہ کیا......اس جھیل میں کوئی ہے......کوئی ہے، جو کیٹ واک کر رہا ہے......

کون ہے؟

وہ اس چہرے کو پہچان سکتی ہے۔

ارے، یہ چہرہ تو اس کے خود کا چہرہ ہے____ لیکن یہ چہرہ اتنا مرجھایا ہوا کیوں ہے؟

پہلی بار بیٹی نے اپنا جائزہ لیا تھا۔ اپنے جسم میں وہ کتنی ہے......اپنی روح میں____؟ اپنے وجود میں____؟ اور اپنے آپ میں____؟

اس نے ماں اور باپ دونوں کو اپنے آپ میں رکھ کر دیکھا ـــــــ پھر مطمئن ہوگئی ـــــــ باپ کو وقت کہاں تھا اور ماں...... روح سے جسم اور جسم سے وجود تک ماں نے کسی بھی حصے کو ـــــــ اس کی اپنی آزادی کے نام نہیں کیا تھا...... آدھا بھی نہیں۔ وہ مکمل ماں کے قبضہ میں تھی۔

اس لئے پہلی بار ـــــــ باپ کی باتوں میں اسے ایک دوست نظر آیا تھا۔ دوست، جس کے سہارے وہ اپنی جنگ لڑ سکتی تھی۔

باپ

لیکن شاید بیٹی ابھی بھی مطمئن نہیں تھی۔ یا پھر بانجھ ہونے کا ڈر اس کے اندر کچھ زیادہ ہی بیٹھ گیا تھا...... بانجھ۔ عورت کے لئے سب سے بڑی گالی...... ایک ایسی گالی، کم وبیش بیٹی جس کا سامنا کرنے کو تیار نہیں تھی...... وزن کم کرنے کے لئے وہ امینوریا کی پیشنٹ بننے سے خود کو روکنا چاہتی تھی۔ دراصل بیٹی، باپ کو آزمانا چاہتی تھی۔ شاید اسی لئے کسی ایک مضبوط لمحہ، وہ چپ چپ باپ کی آغوش میں سر چھپا کر بیٹھ گئی۔ باپ آہستہ آہستہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے رہے۔

''میں کچھ بھی کر سکتی ہوں؟'' ذرا دیر بعد بیٹی کے لب ہلے۔

......'ہاں۔'

......' کچھ بھی؟'

......'تمہیں شک کیوں ہے؟'

'شک نہیں...... ماں کہتی ہے، لڑکی پیدا ہوتے ہی اپنا ایک پنجرہ لے آتی ہے۔'

باپ ہنسا...... 'لیکن تم سے پہلے تمہاری ماں اس پنجرے کو توڑ چکی تھی۔ اس نے لو میرج کی تھی ـــــــ'

ماں کہتی ہے 'اس کے باوجود ہم پنجرے میں رہتے ہیں۔'

باپ نے مزاحیہ انداز اپنایا ـــــــ 'پنجرے میں پنچھی بھی نہیں رہتے!'

بیٹی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ 'تو میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔ اڑ سکتی ہوں۔ باہر جا سکتی ہوں۔ ڈسکو۔ تھیٹر، اور......

باپ نے اسے غور سے دیکھا...... بیٹی کے کندھے تھپتھپائے ____ پھر بولا ____
'سنو بیٹی۔ غور سے سنو...... تم پیدا ہوئیں، ہم نے سکھ تلاش کر لیا...... ڈھیر سارا سکھ ____ جو تمہارے رونے سے ہنسنے تک ____ کلکاری سے سوچنے سمجھنے تک ____ بولنے سے شرارت تک ____ کھڑے ہونے، گرنے سے انگلیاں تھامنے اور چلنے تک...... یعنی تم نے جو دیا، یا جو تم ہر لمحہ دیتی رہی ہو، کسی خزانہ سے بھی زیادہ تھا...... ہم تول مول نہیں کر سکتے تھے ____ باپ کو تول مول کرنا بھی نہیں چاہئے ____ کہ اس زندگی میں بچہ اپنے وجود کے احساس تک جو سکھ دیتا ہے ____ وہ امید کے خزانے سے کہیں زیادہ ہوتا ہے، ہے نا؟

باپ کو شاید اپنے باپ کی کہانی یاد آ گئی تھی۔ یکلخت وہ ٹھہر گیا تھا۔ بیٹی کے ہونٹوں پر معصوم مسکراہٹ تھی۔

'اس لئے بیٹی'...... باپ نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔ 'اس لئے جب تم اپنی جوانی کی زندگی شروع کرنے جا رہی ہو۔ سمجھ رہی ہو نا۔ اپنی اب کی زندگی...... تو اس زندگی پر صرف اور صرف تمہارا حق ہے۔ اپنے حصے کا سکھ ہم لے چکے ہیں اور اس کے بعد کے سکھ پر......'

'تو پنجرہ......؟'

باپ لڑکی کے بڑا ہونے کے احساس سے دکھ گیا تھا۔

'پنجرہ کوئی بھی اپنے ساتھ نہیں لایا تھا ____ اور سنو بیٹی۔ اب تم بڑی ہو گئی ہو۔ اپنے حصے کے خواب، خوشیاں ____ عمر ____ رونا، ہنسنا ____ سب کچھ اپنی ممی سے واپس مانگ سکتی ہو ____ اور بے شک تمہاری ممی کو تمہیں یہ سب واپس کر دینا چاہئے۔'

اس کے بعد باپ ٹھہرے نہیں۔ باپ کو آنکھوں میں امڈ آئے قطرے دکھانا گوارہ نہیں تھا۔ باپ واپس لوٹ گئے تھے۔

حسین شاہین

پھر بیٹی نے اڑنا شروع کیا۔
بیٹی کو اب ماں کے پنجرے پر یقین نہیں تھا۔
بیٹی کو اب کسی بھی ایسے پنجرے پر یقین نہیں تھا ____
بیٹی کو صرف اور صرف اڑنے پر یقین تھا ____

پہلی بار جب وہ رات کو دیر تک ڈسکو تھے کلب سے گھر لوٹی تو ماں اس کے کمرے کے دروازے پر آ کر کھڑی ہو گئی ـــــ ماں کے ہاتھوں میں ایک ٹوٹا ہوا پنجرہ تھا۔

'آہ! تمہارے باپ جیت گئے۔'

'اور اسی لئے تم نے پنجرہ توڑ دیا۔'

'ہاں......اس پنجرے میں ایک Sea-gull تھا۔ اس سی گل کی کہانی سنو گی۔'

'مجھے کہانیاں اچھی نہیں لگتیں۔'

ماں مطمئن تھی...... 'کوئی بات نہیں۔ تم نے اپنے لئے راتیں چنیں ـــــ اور رات سے انٹرنیٹ اور ڈسکو تھیے بنا لیا ـــــ ہے نا۔ پھر بھی تمہیں یہ کہانی سننی ہو گی۔

اس نے نائیٹی پہن لی۔

ماں کی کہانی جاری تھی۔ بے چارہ ننھا سا سی گل ـــــ شام میں جب دوسرے پرندوں کے پر، اڑان سے خالی ہو جاتے تو وہ اپنی اڑان شروع کرتا ـــــ پاگل کہیں کا ـــــ تھوڑی تھوڑی اڑان اور ایک دن......

'تم یہ کہانی پہلے بھی سنا چکی ہو ماں۔'

ماں نے پہلے دھیان نہیں دیا......ایک دن جوناتھن، یہی اس سی گل کا نام تھا ـــــ وہ اُڑا اور اپنے ننھے پروں سے آسمان ناپ لیا......اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی ـــــ اتنی اڑان تو اس کے پروجوں میں سے بھی کسی نے آج تک نہیں بھری تھی......اسے یقین تھا۔ وہ واپس لوٹے گا اور اس کی تاجپوشی ہو گی۔ سر آنکھوں پر بیٹھایا جائے گا۔ انعام سے نوازا جائے گا۔

'پور فیلو' بیٹی آہستہ سے بولی۔

ماں کی آنکھیں بند تھیں...... "لیکن اس غریب کو کیا معلوم تھا، دھرتی پر واپس لوٹتے ہی، ضرورت سے زیادہ اڑنے کے جرم میں اسے......"

ماں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

بیٹی نے سر پر چادر کھینچنے سے پہلے کہا ـــــ 'جو اڑتے ہیں، وہ کسی بھی چیز کی پرواہ نہیں کرتے۔'

OO

انٹرنیٹ پر Chatting سے برآمد لڑکے نے ڈسکو تھے میں، اچانک اس کے سامنے آکر حیرت زدہ کر دیا تھا۔

پھر بیٹی کی شاموں میں ٹوٹرس کی لاطینی حسین شامیں لکھ دی گئیں...... پہلی بار وہ اداس تھی۔

لڑکا زور سے چیخا تھا......'Cry'

وہ پھر ذرا سا ہنسا____ 'چیخو، چلاؤ، ناچو۔ بھول جاؤ کہ عمر کے گھوڑے کی رفتار کیا ہے۔ آگے کیا ہے اور پیچھے کیا ہے۔'

'بھول گئی۔'

وہ دیر تک نائٹ اسپاٹ پر تھرکتے رہے۔ لانج میں کچھ دیر 'ڈام موریس' کی پوئٹری کا لطف لیا____ پھر کچھ دیر تک ٹوٹرس کی آرٹ گیلری میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ٹہلتے رہے۔ بیٹی خاموشی سے کمرے کی پیلی چھتوں، نیلی دیواروں اور پینٹنگس کی آڑی ترچھی لکیروں کو گھورتی رہی۔ واپس آکر نائٹ اسپاٹ پر دونوں نے ایک ایک پیگ اور لیا۔ ریستوراں کی ڈم لائٹ میں 'چلڈ' یعنی ہر طرح کے پروگرام چل رہے تھے...... بیٹی نے اپنے جسم کو پورا پورا لڑکے کے بدن پر ڈال رکھا تھا۔ اطالوی کھانے سے فارغ ہو کر دونوں نے ایک دوسرے کو ریستوراں کی ڈم روشنی میں، چلنے والے چلڈ پروگرام کے حوالے کر دیا۔

OO

رات گہری ہو گئی تھی۔ بیٹی ابھی تک گھر نہیں لوٹی تھی۔ ماں نے کمرے میں ٹہلتے ہوئے کہا۔

......'دنیا بدل رہی ہے۔'

'دنیا ہمیشہ ایک جیسی رہتی ہے۔'

......'ہمارے زمانے کی دنیا اور تھی؟'

اس زمانے کی دنیا بھی وہی ہے۔'

......'کیا ہم اس طرح رات گئے......؟'

پہلے ہمارے شہر نے اس طرح رات پر قبضہ نہیں کیا تھا۔'

ماں گھبراہٹ میں ٹہل رہی تھی۔'

باپ مطمئن تھا۔ وہ اپنی فکر میں ڈوبا تھا۔ یعنی اس عمر میں...... اس عمر میں جب کہ اس کی بیوی کو، کوئی بھی ٹینشن نہیں لینا چاہئے...... 'وہ آہستہ سے مسکرایا۔

'بیٹی کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔'

'کیوں؟'

کیوں کہ اب اس کی آزادی کا دور شروع ہو گیا۔'

'آزادی؟'

'ہاں، ایک عمر آتی ہے، جب ہمیں ایک دوسرے کو از سر نو سمجھنا ہوتا ہے۔ از سر نو ـــــ سمجھ رہی ہو نا...... یہ وہ وقت ہوتا ہے، جب بچے اپنی عمر کے رتھ پر سوار ہو جاتے ہیں...... بیٹھو......'

باپ نے اسے اپنے بانہوں کے حصار میں لیا...... اب ہماری اپنی ایک نئی زندگی شروع ہو رہی ہے۔ بیٹی کی اپنی...... اس عمر کو سمجھنا بڑا کام ہے۔ نہیں سمجھو گی تو بوڑھی ہو جاؤ گی۔'

ماں ڈر گئی تھی......

باپ ہنسے...... ''بچوں کی آزادی میں اپنا حصہ نہیں ہوتا ـــــ ان کی عمر کا حصہ ہوتا ہے...... بیٹی اپنی آزادی سے بندھی ہے۔ وہ سنبھلتی ہے یا گرتی ہے، یہ اس کا کام ہے۔ ہم نہیں سنبھلے تو؟ یا بچے اور اپنے بیچ ایک دیوار نہیں اٹھائی تو...... ہم اچانک بوڑھے ہو جائیں گے۔''

لیکن...... وہ بیٹی ہے......

'ہمارا کام ختم...... باپ کا لہجہ سخت تھا...... 'جتنی خوشیاں، جتنے سکھ اس سے حاصل کرنے تھے، کر چکے۔'

'اور اب اسے گرنے کے لئے......'

باپ مطمئن تھا...... 'یہ اس کی سمجھ داری پر منحصر ہے' باپ نے پھر موضوع بدل دیا تھا...... 'کل سے میں نے دفتر کا کام کم کر دیا ہے۔ جلدی گھر آ جایا کروں گا۔ صبح کی چائے ختم۔ ناشتے میں......'

ماں اب کچھ بھی نہیں سن رہی تھی۔

کھلے دروازے سے بیٹی اندر آ گئی تھی۔

بیٹی کی زلفیں بکھری ہوئی تھیں۔
بیٹی کی آنکھیں......
بیٹی کے پاؤں......
بیٹی کا جسم......
باپ نے ماں کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا......''سو جاؤ۔ اس نے اپنی آزادی خرید لی ہے۔''
ماں نے سہمے ہوئے میمنے کی طرح خود کو باپ کے حوالہ کر دیا۔

خاتمہ

قارئین!
کہانی ختم ہو چکی ہے۔ یا آپ کہہ سکتے ہیں۔ کہانی کو یہیں پر ختم ہو جانا چاہئے تھا۔ ایسی کہانیوں کا کوئی خوشگوار انجام نہیں ہوتا ہے۔ ایسی کہانیاں ہر تبدیلی اور تاریخ کے جبر کے ساتھ پیدا ہوتی رہتی ہیں......زندگی نے اپنا دامن وسیع کیا تو لڑکیوں کے لئے سوچ اور فکر کے نئے دروازے بھی کھل گئے......یعنی تاریخ کے اس مقام پر جہاں لڑکیاں آزادانہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہیں، ایسی کہانیوں کا انجام یہی ہونا چاہئے کہ......

- لڑکی نے اپنی ایک آزاد زندگی کا انتخاب کر لیا۔
- لڑکی پھسلتی چلی گئی اور بالآخر اس کی زندگی کا انت ہو گیا......یا
- لڑکا اسے چھوڑ گیا اور لڑکی نے آتم ہتیا کر لی۔

قارئین!
ایسا کچھ بھی اس کہانی کے ساتھ نہیں ہے۔ اس لئے ــــــ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ــــــ تاریخ کے اس موڑ پر......اس بے حد اہم موڑ پر......بیٹی اچانک چونکتی ہے۔ جیسے کسی ڈراؤنے خواب سے جاگتی ہے اور کئی دن گھر سے غائب رہنے، بدن کے جبر کو سمجھنے کے بعد ــــــ ایک اندھیری صبح......جس وقت سڑک پر اِکا دُکا سواریاں بھی نہیں چل رہی تھیں ــــــ وہ اپنے گھر کے دروازے پر آ پہنچتی ہے۔ اور......بیل پر انگلی رکھتی ہے۔
تو قارئین یہ اس کہانی کا انت ہے......اور اس انت کے لئے میں اپنے آپ کو کتنا مجبور

محسوس کر رہا ہوں، یہ میں جانتا ہوں۔

OO

بیٹی کی آنکھیں نیم غنودگی میں ڈوبی تھیں۔ قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ باہر کہرا چھایا ہوا تھا۔ اس کا بدن ابھی بھی اطالوی جن کے دھویں سے بھرا تھا۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ بیل بجانے والے ہاتھ سردی سے ٹھٹھر گئے تھے۔ اسے غصہ آرہا تھا۔ سب کہاں مر گئے۔ بیل کی آواز سن کر کھولنے کے لئے کوئی آتا کیوں نہیں......

اس نے قدموں کی آہٹ سنی......

'آزادی......' اسے باپ کے لفظ اب بھی یاد تھے۔ اپنے حصے کا سکھ ہم لے چکے ہیں اور اس کے بعد کے سکھ پر......'

وہ باپ سے لڑائی کرنے آئی تھی...... نائٹ اسٹاپ کی رنگینیاں اچانک تھم گئی تھیں۔ ڈسکو تھیے کے Cry,Cry نغموں نے اسے لہولہان کر دیا تھا۔ Chatting سے برآمد لڑکے نے اس کے بدن پر ہزاروں خونی لکیریں کھینچ دیں ـــــ اور ایک نیپالی لڑکی کے ساتھ کسی دوسرے ٹوئٹرس کے چلڈ پروگرام میں کھو گیا تھا......

بیٹی نیند سے جاگی تو ماں کا پنجرہ ٹوٹا ہوا اس کے بازو میں پڑا تھا...... وہ چیخنا چاہتی تھی...... وہ لڑنا چاہتی تھی۔ پیسے ختم ہو گئے تھے......

وہ کئی دنوں سے گھر سے غائب تھی۔

اسے امید تھی۔ گھر پہنچتے ہی، جذباتی پاگل پن کے مظاہرے شروع ہو جائیں گے۔ شاید باپ نے پولیس میں ایف آئی آر بھی درج کی ہو ـــــ ماں کی آنکھیں روتے روتے سوج گئی ہوں اور......

ایک بے حد سرد صبح، کہرے میں ڈوبی ہوئی صبح...... وہ گھر پہنچے گی اور......

'کیلشیم فاسفورس...... ماں بولے گی...... وہ اسے ایک بے حد خاص موقع کے لئے تیار کر رہی تھی......

باپ کہیں گے...... تم کہاں چلی گئی تھیں بیٹی۔

اور ماں...... وہ اس جذباتی لمحے کی منتظر ہوگی، جب وہ اس کے بازوؤں میں گم ہو جائے گی......

OO

کوئی آرہا ہے...... قدموں کی آہٹ...... بیٹی کا جسم سردی سے تھرتھرا رہا ہے۔ دروازہ کھولنے کی آواز...... باپ نے لائٹ آن کردیا ہے۔ دروازہ کھولنے والی ماں ہے۔ لیکن......

وہ اچانک ٹھٹھک گئی ہے____

کیا یہ ماں ہے۔ سچ مچ ماں ہے۔ ماں ہے تو ماں جیسی کیوں نہیں لگ رہی۔ ماں اپنی عمر سے کتنی چھوٹی ہوگئی ہے۔ چھوئی موئی سی۔ اس کے چہرے پر، بیٹی کو لے کر مستقبل کے اندیشے یا فکر کی جھریاں نہیں ہیں____ یہ کوئی اور ہی ماں ہے____ تروتازہ____ ابھی ابھی جوان ہوئی اور لباس تو دیکھو...... ریشمی ساڑی۔ چہرے پر اتنا نکھار......

پیچھے باپ کھڑے تھے...... ہمیشہ کی طرح اسمارٹ...... اس وقت کچھ زیادہ ہی جوان......

ماں کی آنکھوں میں حیرانی امڈتی ہے......

'کون؟'

باپ کی آواز میں نشہ سا ہے......

'کون؟'

''4 ر اسکیم پار لے____ ماؤنٹ روڈ سے ذرا آگے____ تھرڈ لین۔ مسٹر آئی جے کے...... ریسیڈینس نمبر......' کہتے کہتے وہ ٹھہر گئی ہے۔ ''ایک زمانہ میں یہاں ان کی بیٹی رہتی تھی۔''

ماں نے پیار سے دروازہ بند کرتے ہوئے جواب دیا____

'آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے...... اب وہ یہاں نہیں رہتیں......'

بیٹی نے انجانے راستوں پر ٹھٹھرتی ہوئی کہرے کی اس صبح، اپنے قدموں کو ڈالتے ہوئے ماں کا جملہ پورا کیا......

'کیوں کہ اس نے اپنی آزادی خرید لی ہے۔ اب وہ کہیں اور رہتی ہے۔'

OOO

امام بخاری کی نیپکن

''ادب کے لئے مذہب ایک 'اسنابری' ہو جاتا ہے
جنگ کے نتائج کے طور پر/
مذہب میں نئے نئے راستوں کے منہ کھل گئے/
اور شاعر، خدا کو فیشنیبل رومالوں کی طرح استعمال کرنے لگے/
اس کے باوجود۔ بہت ہی معمولی رومال......''

......کافکا سے ایک مکالمہ

نیپکن ہے؟

ارے نہیں۔ نیپکن کا کیا کرنا ہے؟ نیپکن کو بھول گئے تھے، صلاح الدین قریشی۔ ابھی دن ہی کتنے گزرے ہیں۔ خدا قسم۔ کیا وہ جانتے تھے کہ نیپکن کیا بلا ہے۔ پہلی بار اپنے شہر کے ایم۔ ایل۔ اے کے ساتھ لنچ کرتے ہوئے وہ زور سے چونکے گئے۔

'کیا___ کھانے کے بعد نمکین۔ میٹھا تو سنا ہے سر......'

'ارے ہم ہاتھ پوچھنے کو بول رہے ہیں۔ آپ بُڑبکے رہ گئے صلاح الدین قریشی۔'

لیکن ٹھیک یہی 'لطیفہ' اس واقعہ کے دوسرے ہی دن انہوں نے اپنی بیوی کے ساتھ بھی دُہرایا تھا___ نیپکن کے نام پر 'تیسرے نمبر کی بیوی قریشہ بھی چونکی تھی___ 'پگلا گئے ہیں کیا آپ۔ ارے کھانے کے بعد لوگ تو میٹھا مانگتے ہیں___' زور زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے صلاح الدین قریشی نے رنگین، کچھ 'للی' اسٹائل کا نیپکن ہاتھ میں اُٹھاتے اور ہاتھ پوچھتے ہوئے ایم۔ ایل۔ اے صاحب والا جملہ دہرایا تھا___ 'بڑبک، کوئی کیا کہے گا۔ نیپکن بھی نہیں جانتی کیا۔ ارے ایسے

ہے......

'تو کیا۔ ہاتھ نہیں دھوئیں گے؟'

'پونچھ لیا—' صلاح الدین قریشی فخر سے مسکرائے تھے— سب بڑے لوگ یہی کرتے ہیں۔ وہاں کا پانی سے ہاتھ دھونے کی فرصت ہوتی ہے۔ کھایا پیا— پونچھ لیا۔ ایسے۔

بیوی کی آنکھوں میں حیرانی کی کیسی چمک تھی، صلاح الدین قریشی کے لئے ٹھہر کر اسے دیکھنا اہم نہیں تھا۔ اہم تھا تو صرف یہ سوچنا کہ اب وہ بھی بڑے آدمیوں میں شامل ہو گئے ہیں۔ ایک بڑے آدمی یا ایک بڑا مسلمان......

دلچسپ یہ تھا کہ اس چھوٹے سے نیپکن کے ٹکڑے میں برسوں کی تاریخ سما گئی تھی۔

دلّی کی جامع مسجد۔ مغلوں کی حکومت...... تہذیب کے سنہرے برس یا ماضی کے جھروکوں میں بند تہذیب کی نشانیاں— اردو اخباروں سے اُچھل اُچھل کر دل و دماغ میں جگہ بناتے امام بخاری اور اُن کے خاندان کی تاج پوشی کی خوبصورت کہانیاں— دیکھا جائے تو سب کچھ یکا یک ہوا تھا۔ دلّی، جامع مسجد، بخاری اور نیپکن— یکا یک ہی— اگر اِسے صرف محاورہ نہیں مانا جائے تو پیالے میں 'طوفان' جمع ہو گیا تھا۔

تین بیویوں والے صلاح الدین قریشی کو جیسے من مانگی مرادیں مل گئی تھیں۔

●

سیاست کا نشہ یکا یک نہیں چڑھتا۔ آہستہ آہستہ چڑھتا ہے اور جب چڑھتا ہے تو آنکھوں پر کالی پٹی باندھ دیتا ہے۔ دور کیوں جائیں، بچپن میں صلاح الدین قریشی نے ابا کے ساتھ فتوحہ کی سڑکوں پر وہ منظر دیکھا تھا۔ جادوگر کھرانا آنکھوں پر پٹی باندھے موٹر سائیکل دوڑا رہا تھا— فتوحہ، مین روڈ کے دونوں طرف، آنکھوں میں چمک لئے کھڑے لوگوں کے درمیان یہ دانتوں سے انگلی کاٹنے والا منظر تھا—

'سب نظر بندی کا کمال۔'

ابا کہتے تھے— ہنستے تھے— 'وہ اپنی نہیں، تمہاری آنکھوں پر پٹی باندھ دیتا ہے۔

'ہو ہو.....'

'لیکن......'

'آنکھ بند کر چل سکتے ہو کیا؟ ہو s ہو s پھر ابا دنیا بھر کے جادوگروں کے قصّے لے کر بیٹھ جاتے۔ ایسی ایسی کہانیاں، ایسے ایسے کرشمے، کہ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے، ابا کو دیکھ رہا ہوتا۔ تب پہلی بار مذہب کے کرشمے کے بارے میں بھی، اُس کے دل میں ایک چھوٹا سا وہم پیدا ہوا تھا۔ بڑے بھائی، سلیمان قریشی جو اُس سے کم سے کم 10-9 سال بڑے تھے، سمجھایا تھا۔

'جادوگروں اور پیغمبروں میں فرق ہوتا ہے۔ مذہب ایک اندھے عقیدے کا نام ہے۔ راستہ ذرا سا بھی مڑا تو دوزخ کا دروازہ حاضر......'

تب یہی کوئی پندرہ سال کی عمر رہی ہوگی۔ بڑے ہوتے صلاح الدین قریشی کے دماغ میں گھرانا جادوگر، موٹر سائیکل اور پٹی بندھی آنکھوں کی جو تصویر کل سمائی، اُس نے پھر حافظے سے نکلنے کا نام نہیں لیا۔ ہاں، بڑے ہونے تک وہ اس نتیجے پر ضرور پہنچ چکا تھا کہ سیاست کی جادوگری، جادوگر کے کرشمے سے بھی کہیں زیادہ بڑی اور بھیانک ہے اور یہاں جو کرشمہ ہو سکتا ہے، وہ بڑا سے بڑا جادوگر بھی نہیں دکھا سکتا۔ یہی وہ وقت تھا، جب مذہب ناگ پھنی کے پودے کی طرح صرف چھونے کے احساس سے بھی چبھنے لگا تھا۔ کبھی ڈھیروں سوال کھڑے کرتا۔ اُڑن کھٹولے سی فنتاسی، کہانیاں، جادوگر کے ڈبے سے نکلنے والے چوزے کی طرح اُسے گھیر کر بیٹھ جاتے۔ الگ الگ کمروں میں عقیدت و احترام سے نماز ادا کرتے بھائی بہنوں کا چہرہ نظر آتا تو کھڑکی سے باہر جھانکتی آنکھوں میں ایک لمحہ کو شرمندگی کا احساس پیدا ہو جاتا۔

امّی کہتی — 'نماز پڑھا کر بیٹے۔ طبیعت کو سرشاری ملتی ہے۔'

ہاتھوں میں تسبیح لئے ابا اُس کے پاس آ کر رُک جاتے۔ 'اب بڑے ہو گئے ہو۔ جتنا کہنا تھا۔ کہہ لیا لیکن — نماز پڑھو گے تو روح کو ٹھنڈک ملے گی۔ ویسے بھی ماحول اچھا نہیں ہے......'

'ماحول......؟'

ابا کے ساتھ ٹہلتے ہوئے صلاح الدین کی آنکھوں میں کتنے جلتے دیئے ایک ساتھ لرز کر رہ جاتے۔

ابا آہستہ آہستہ لفظ چبا رہے ہوتے — 'میاں آہستہ آہستہ سب کچھ ختم ہو رہا ہے ہمارا۔ پہلے لباس گیا۔ پھر نشانیاں — تہذیب کی اپنی نشانیاں ہوتی ہیں۔ کل جن پر ہم فخر کیا کرتے تھے۔ صدیوں کی بادشاہت۔ تاریخی مقامات۔ وقت میں بھی دیمک لگتی ہے

صاحبزادے...... ہے...... ہے...... تہذیبوں کے چراغ گُل ہو گئے۔ پچھلی بار دتی گیا تو آنکھوں میں آنسو آ گئے۔'

'کیوں بھلا؟'

'جامع مسجد کا کیا حشر کر دیا ہے جاہلوں نے۔ اردو بازار ایک گندہ مچھلی بازار بن کر رہ گیا ہے۔ یہ محض عمارتیں نہیں ہیں صاحبزادے۔ تہذیبی وراثت ہیں۔ نشانیاں ہیں۔ انہیں کھو کر ہم کہیں نہیں ہیں۔ ایک راز کی بات سنو......' ابا کی سرمہ لگی آنکھوں میں فانوس روشن تھے ____ 'سیاست میں اب اِسی دروازے سے آنا ہو گا۔'

'یعنی جو راستہ اردو بازار سے ہو کر جاتا ہے......؟'

ابا چپ تھے۔

'اردو بازار سے جامع مسجد اور لال قلعہ تک۔ لال قلعہ سے......؟'

ابا ایک بار پھر خاموش تھے۔

'سیاست نہیں ابا۔ یہ راستہ مسلمانوں کی سیاست سے ہو کر جاتا ہے ____' صلاح الدین کے دل میں آیا کہ پوچھیں، کہ کیا سیاست میں آنے کے لئے اس راستے کی پونچھ پکڑنا ضروری ہے ابا ____؟'

لیکن تب تک جامع مسجد سے بلند ہونے والے سیاسی خطبوں نے بتا دیا تھا کہ ابا نے کتنا پہلے مسلمانوں کی سیاست کے دروازے کو دیکھ، جانچ اور پرکھ لیا تھا۔ پہلی بیوی کی اچانک موت، دوسری سے دل نہ ملنے اور طلاق دینے کے بعد تیسری قریشہ سے 'ٹانکا' جڑنے تک صلاح الدین سیاست میں آنے کا من بنا چکے تھے۔ وہ بھی مسلمانوں کی سیاست میں ____ لیکن وہ یہ بھی جان رہے تھے کہ معاملہ جتنا سیدھا سیدھا نظر آتا ہے، اُتنا ہے نہیں۔ بلکہ کہا جائے تو ٹیڑھی کھیر ہے۔

'بانس پر چڑھنے کا تجربہ رکھتے ہیں کیا؟ نہیں نا۔ پھسل جایئے گا......'

صلاح الدین کے سیاست میں آنے کی خبر ملتے ہی یہ پہلا جھٹکا ملا تھا، ربانی گوشت والے کی دکان سے ____ صبح صبح گوشت لانے والی عادت ابھی تک تبدیل نہیں ہوئی تھی۔ اس سے دو فائدے تھے۔ قاعدے سے دیکھیں تو ذات برادری۔ لیکن وقت کے ساتھ پیشے بدل گئے تھے۔ پہلے یہاں ربانی کا باپ بیٹھتا تھا اور ابا گوشت لانے جاتے تھے ____ لیکن بچپن سے ہی ابا

کی انگلیاں تھامے، قصائی ٹولہ کی گلیاں ناپتے صلاح الدین کو بھی اچھا بُرا گوشت سمجھنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ کبھی کبھی کسی دن نہیں آنے پر ربانی مذاق بھی جڑ دیتا___ ' آجایا کرو صلاح الدین بابو۔ گوشت کی بوٹیاں، کاٹھ کے ٹھیپے پر کاٹتا ہوا وہ دوسرا لقمہ جڑ دیتا___ ایمان بھی تازہ رہتا ہے اور ذات برادری بھی...... وہ کیا کہتے ہیں...... 'انڈر اسٹینڈنگ' بھی باقی رہتا ہے......'

بس اسی بات پر صلاح الدین کے اندر تک آگ لگ جاتی تھی۔ س...... سالہ...... قریشی ہونے مطلب یہ تو نہیں کہ اُن کا خاندان بھی یہی کاروبار کرتا رہا ہو...... مگر وقت گزرتے ہی سیاست میں آنے کا خیال آتے ہی اُسے سمجھایا گیا تھا...... میاں پہلے اپنا ایک منچ تو بنالو___ قریش منچ۔ رجسٹریشن کرالو___ مہینے میں ایک بار میٹنگ کرلو۔ اردو اخبار تو کچھ بھی چھاپتے رہتے ہیں۔ لیٹر پیڈ پر رجسٹریشن نمبر ہوگا تو آپ کی ہر خبر شائع ہوگی۔ یہی تو راستہ ہے میاں۔ 'بڑی سیاست' میں جو بھی واقعہ پیش آتا ہے، قریش منچ کے پیڈ پر ایک خبر بنا کر بھیج دو۔ ہر پارٹی کو ایسے ہی لوگوں کی ضرورت پڑتی ہے، جن کے پاس 25-20 لوگ ہوں۔ ضرورت پڑے تو قصائی ٹولہ کے چھوکروں کو ٹرک میں بیٹھاؤ اور نیتا کے گھر اپنی طاقت کا مظاہرہ کرآؤ۔ یہی شارٹ کٹ ہے میاں جی___ سب یہی کرتے ہیں...... خبریں چھپنے لگیں گی تو لوگ بھی جاننے لگیں گے۔ نیتا لوگ بھی پوچھیں گے___ کون ہے یہ صلاح الدین قریشی___ بس بن گئی نا دھاک۔ سینہ چوڑا کرو اور قریشی برادری کا نام اونچا کرو۔

مگر 'بانس پر چڑھنے' کا تجربہ والی بات کہہ کر ربانی گوشت والے نے صلاح الدین کے، سیاست کی طرف بڑھتے پاؤں کو روکنے کی کوشش ضرور کی تھی اور یہاں بھی سیاست سے بھرا ہوا داؤ کھیلا تھا صلاح الدین نے۔ آنکھیں بھر کر دیکھا ربانی کو۔ کپڑے اُدھاڑے بیٹھا تھا۔ چالیس، بیالیس کی عمر۔ آس پاس والے سب ڈرتے تھے اُس کے نام سے۔ یہ بھی سننے میں آیا تھا۔ کئی قتل کر چکا ہے۔ مگر پولس ہاتھ رکھنے سے ڈرتی ہے۔

آنکھ بھر کر دیکھا صلاح الدین نے۔ پھر ریل کو پٹری پر لانے کی کوشش کی۔

'کیوں___؟ پھر کوئی بانس پر چڑھے ہی نہیں، کیونکہ تجربہ نہیں ہے......؟'

یہ تو میں نے نہیں کہا...... گوشت کاٹتے کاٹتے ربانی چونکا۔

'ہم تو منچ بنا چکے ہیں ربانی بھائی......' یہ صلاح الدین کی طرف سے پھینکا گیا سکسر

تھا......

'کیا؟'

دیکھتے نہیں۔ دیش بھر میں مسلمانوں کا، کیا حال ہو رہا ہے۔ توڑنے والے مسجد توڑ کر مندر بنا دیتے ہیں اور جو یہاں کی بھی مسجد توڑی جانے لگی تو......؟'

لال آنکھیں لئے لوہے کے 'چاپڑ' کو گھڑاک سے کھلی پر دے مارا ربانی نے...... آنکھیں غصے میں اُبل رہی تھیں۔ 'کوئی ایسا کر کے دکھائے تو...... دس...... پندرہ...... ایک سانس میں وزنی گالیوں کا بخار کم پڑا تو صلاح الدین مسکرائے......

'اب بتائیے۔ منچ چاہئے کہ نہیں۔ آپ کہتے ہیں۔ بانس پر کون چڑھے گا۔ اِدھر تو ہم بانس پر چڑھنے کا من بنا چکے ہیں۔ آپ چڑھائیں گے بانس پر۔ آپ کے ساتھ ہم چڑھیں گے۔ اب بولئے......

'معنے......؟'

'معنے یہ ربانی بھائی کہ ہم نے فیصلہ کر لیا ہے......'

ربانی نے اپنے لئے بھائی کا لفظ سنا تو اُس کا سینہ چوڑا ہو گیا......

'مطلب سمجھائیے۔'

'قریش منچ کے آپ سکریٹری ہیں آج سے —— دفتر ہو گا، ہمارے گھر کے پچھواڑے والا کمرہ۔'

'ہم سکریٹری ہیں......'

گوشت کاٹنا چھوڑ ربانی نے پھٹی آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ چاپڑ اور کھلی کو کنارے کرتے ہوئے، گوشت کا پونچھن تھما کر، 'اُگھاڑی' ہوئی شرٹ دوبارہ ننگے بدن پر ڈال کر ایسے اُٹھا، جیسے کوہ نور ہیرا حاصل ہو گیا ہو۔

'آپ عظیم ہیں صلاح الدین بابو......'

'نہیں۔ اس میں عظیم ہونے جیسی کوئی بات نہیں۔ منچ بن چکا ہے۔ کل کو ہم پارٹی سے بھی جڑیں گے یا اپنی پارٹی بنائیں گے۔ مگر طے رہا۔ آپ ہمارا ساتھ دیں گے۔'

'یہ بھی بھلا پوچھنے کی بات ہے۔'

صلاح الدین کے تیزی سے بڑھتے قدم کو ایک بار پھر ربانی گوشت والے نے ٹوکا

تھا——

سنیئے...... سنیئے صلاح الدین بابو۔ وہ کیا کہتے ہیں...... لیٹر پیڈ پر ہمارا نام چھپے گا نا......'

'کیا بات کرتے ہیں آپ۔ سکریٹری ہیں۔ آپ کا نام نہیں چھپے گا تو کس کا چھپے گا......'

ربانی کی آنکھوں میں چمک تھی—— ایسی چمک جو تازہ گوشت میں ہوتی ہے۔

2

سیاست کا پہلا قلعہ اس آسانی سے فتح ہو جائے گا، یہ سوچنا بھی صلاح الدین کے لئے مشکل تھا۔ ربانی کو شامل کئے جانے والی بات پر پہلا اختلاف تو گھر سے ہی شروع ہوا۔ قریشہ نے ڈرائنگ روم میں زور زور سے ہونے والی گفتگو سن لی تھی۔ چائے کے بہانے 'ذرا اِدھر تو آیئے' کا فرمان جاری کرنے والی قریشہ کے چہرے پر ناراضگی تھی......

'کیا بات کرتے ہیں...... وہ گوشت والا......'

'تم نہیں سمجھو گی قریشہ......'

'اب وہ گوشت والا آپ کی برابری کرے گا۔ یہی سمجھانا چاہتے ہیں نا آپ......؟'

'نہیں، یہ نہیں سمجھانا چاہتے ہیں......'

'پھر کیا سمجھانا چاہتے ہیں۔ آپ ہی بتایئے......'

'باہوبلیوں کا زمانہ ہے۔ ٹی وی نہیں دیکھتی ہو کیا۔ جیسے اکھاڑے میں پہلوان اُتارے جاتے ہیں، ویسے آج کل پارٹی میں یہ 'باہوبلی' اُتارے جاتے ہیں......

قریشہ کے چہرے پر آنے والی چمک نے ظاہر کر دیا تھا کہ وہ میاں کی سیاست کے اِس توڑ کو سمجھ چکی ہے۔ صلاح الدین نے آرام کی سانس لی۔ قریشہ تو مان گئی لیکن شاید ابا حضور کا زمانہ ہوتا تو وہ ہرگز نہیں مانتے۔ لمحہ بھر میں صلاح الدین ایوبی سے لے کر اسلامی تاریخ کے اوراق اُلٹ پلٹ دیئے جاتے۔ جس کا مفہوم ہوتا کہ اسلام 'باہوبلیوں' یا تلوار کے بل پر نہیں، اپنے اعمال سے پھیلا ہے۔ یہ تو یہودیوں کی سازش ہے کہ ساری دنیا میں مسلمانوں کو بدنام کر دیا جائے۔

ابا کے انتقال تک گھر کا بٹوارہ ہو چکا تھا۔ سلام بھائی کے گھر کے آگے بندھی ہوئی خصّی، بکریوں کی فوج اُسے ناگوار گزرتی تھی۔ وہ پنج وقتہ نمازی تھے۔ گھر میں بچے بچیوں کی لمبی

فوج تھی، جن کی روزانہ کی چیخ و پکار بٹوارے والی دیوار سے آتی ہوئی صلاح الدین قریشی کے مزاج کو ناگواری میں بدل دیتی تھی۔ کہاں تو نمازی پرہیزگار ــــ ہر سال بچوں کی لائین لگا دی ــــ ٹھیک ہے، بچے ہو گئے تو اُن کی ڈھنگ سے پرورش تو کیجئے ــــ بس، مسلمان صرف آبادی بڑھانے پر دھیان دیتے ہیں۔ اس لئے آر ایس ایس والے اِن سے چڑھتے ہیں۔

پہلے چھوٹا سا کباڑ کا بزنس شروع کیا صلاح الدین قریشی نے۔ بزنس میں فائدہ ہوا۔ چودہ طبق روشن ہو گئے ــــ مگر 'صلاح الدین کباڑی والے' کا نام اُن کے 'ایستھیٹک' کو بوجھل کر دیتا تھا۔ پیسے کی ریل پیل شروع ہو چکی تھی۔ فتوحہ مین مارکیٹ میں کپڑوں کی دکان کھل گئی۔ قسمت یہاں بھی چمکی۔ دیکھتے ہی دیکھتے مین مارکیٹ میں کپڑوں کے تین شوروم کھل گئے۔

کہتے ہیں، پیسے آتے ہیں تو آگے کے دس دروازے بھی کھل جاتے ہیں۔ پھر کیا تھا، ایم ایل اے اور ایم پی کے یہاں بھی آنا جانا شروع ہو گیا اور یہ وہی پارٹی تھی، جہاں پہلی بار صلاح الدین قریشی نے 'نیپکن' کا استعمال کیا تھا ــــ نیپکن کو نمکین سمجھنے والی بات پر ٹھہا کہ لگاتے ہوئے ایم ایل صاحب نے ہی سب سے پہلے اُسے سیاست میں آنے کی دعوت دی تھی۔

'ہم آپ کا احسان بھولے نہیں ہیں۔ الیکشن میں آپ کے لوگوں نے بڑی مدد کی ہے......'

'سو تو ہے...... اب آپ ہماری مدد کیجئے نا......'

'سب سے پہلے اپنے شہر کے مسلمانوں کو جوڑیئے، میرا مطلب ہے، ایک کیجئے ــــ چلئے مانتے ہیں، قریشی برادری پر آپ کا کنٹرول ہے اور باقی برادری پر ــــ ؟ ہم تو ایسے ناپتے ہیں صلاح الدین صاحب......' ایم پی نے کھانے کے بعد باہر نکلی آرام چیئر پر اپنے پاؤں پسارتے ہوئے کہا ــــ 'سمجھئے، ہی یاں روپئے میں دس آنا مسلمان ہیں تو آپ کے حصے میں ایک آنا بھی نہیں آیا ــــ پورے دس آنا کو اپنے قبضے میں کیجئے نا......'

'لیکن یہ کیسے ہوگا......'

'تھوڑا اس شہر سے باہر نکلئے ــــ باہر ــــ ایک پالٹکس جامع مسجد کی بھی ہے ــــ ہے کہ نہیں؟ وہاں بھونپو پر بخاری ایک بات بولتے ہیں۔ ہی یاں آگ لگ جاتی ہے ــــ کا ہے؟ کا ہے کہ دلّی کی جامع مسجد بولتی ہے......'

'وہ امام ہیں بڑے آدمی ہیں ــــ' صلاح الدین قریشی کہتے کہتے ٹھہرے۔

'آپ لوگ اُن کی آواز پر ناچتے ہیں کہ نہیں—؟'

'سب ناچتے ہیں۔'

'کاہے ناچتے ہیں؟ امام ہیں تو نماز پڑھائیں۔ پولٹکس میں آنے کی کیا ضرورت تھی......' مسکراتے ہوئے ایم ایل اے صاحب نے گولڈ فلیک کا سگریٹ جلالیا۔ مسکرائے— 'تو مانتے ہیں نا آپ— کہ سیاست میں دم ہے۔ سیاست سب کو نچا سکتی ہے۔ آپ بھی ناچیے......'

'ہم کیسے نچائیں— اور ایک بات جان لیجئے۔ امام صاحب کی مسلمانوں پر گرفت کمزور ہوگئی ہے۔ جب سے انہوں نے فرقہ پرست پارٹی کا ہاتھ تھاما ہے، مسلمان اُنہیں اپنا نیتا تسلیم نہیں کرتے......'

'یہی تو...... یہی تو آپ غلط سوچتے ہیں صلاح الدین۔ ایم ایل اے صاحب سنجیدہ تھے— 'اس ملک میں مسلمانوں کی آواز آج بھی امام ہیں۔ آپ نہیں ہیں۔ وہ پارٹی بدلیں یا بلنڈر بن جائیں— سرکار کو مسلمانوں کے کسی بھی مسئلہ پر بات کرنی ہوگی نا، تو وہ آپ کے پاس نہیں آئیں گے۔ امام کے پاس ہی جائیں گے— باقی معاملے، مقدمے بازیاں تو چلتی ہی رہتی ہیں— سیاسی سنکٹ کو کیسے ٹالنا ہے، یہ آپ نہیں امام جانتے ہیں اور جان لیجئے۔ آج کے زمانے میں بدلو اور دل بدلو کچھ نہیں ہوتا۔ نام بکتا ہے— لوگ، پچھلا، ماضی سب کچھ بھول جاتے ہیں— آپ پہلے امام صاحب کی پونچھ پکڑیئے— تھوڑا لائم لائٹ میں آیئے۔ پھر مرضی آپ کی— چاہیں تو آپ اُن کی پونچھوا چھوڑ دیجئے۔ جس پارٹی کی چاہیں، پونچھ پکڑ لیجئے اور ہاں سنئے۔'

'کیا؟'

'سنا ہے وہ کوئی اپنی مسلم پارٹی بنانے جا رہے ہیں۔ انہیں پورے دیش کے مسلمانوں کا ساتھ چاہئے— 'ایم ایل اے صاحب ہنسے تھے— پونچھ پکڑنے کا یہ بالکل صحیح ٹیم ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ یہی ہے...... رائٹ چوائس بے بی...... اہا'۔

3

حقیقت یہ ہے کہ امام بخاری کی نیپکن سے سیدھے سروکار ہونے کا قصہ بھی یہیں سے

جڑا تھا ــــــ اور سچ پوچھئے تو ایک وقت تھا، جب بڑے بخاری کی ایک آواز سے پورے ملک کے ماحول میں گرمی آجاتی تھی۔ لوگ انتظار کرتے تھے۔ کب جمعہ آتا ہے، کب دلّی کی شاہی مسجد سے مسلمانوں کے لئے نیا فرمان جاری ہوتا ہے۔ صلاح الدین قریشی، شاہی مسجد اور بخاریوں کے 'نشاۃ ثانیہ' سے واقف تھے۔ کہاں تو سمرقند و بخارا اور کہاں جامع مسجد سے جڑی ہوئی شاہی وراثت ــــــ لیکن اس شاہی وراثت میں پہلے بھی کم پیوند نہیں لگے ــــــ جب ایمرجنسی کے دنوں میں اندراجی کی بات پر، 'نسبندی پر مسلمانوں کا جھکاؤ' جیسے فیصلے پر بڑے بخاری نے آرام سے قرآن اور حدیث کی روشنی میں اپنا فیصلہ جاری کر دیا تھا ــــــ کیا ہندی اور انگریزی اخبار ــــــ اردو اخباروں میں تو بخاری ہی بخاری تھے ــــــ تب ٹی وی کہاں تھا ــــــ چینل کہاں تھے ــــــ کالے چشمے اور رعب دار سفید چہرے والی تصویر اپنے آپ میں کافی تھی۔ جس کا خوف آرام سے ہندو محلے میں محسوس کیا جا سکتا تھا ــــــ لیکن یہیں سے بڑے بخاری کے لئے مخالفت کا بازار بھی گرم ہوا تھا۔ سیدھے سادھے کٹر پنتھی مسلمانوں کو نسبندی کرائے جانے کی بات آسانی سے ہضم نہیں ہوئی۔ کچھ نے تو اُسے مغل شاہی مسجد کے حجرے میں، وزیراعظم کے ذریعہ بھیجے گئے نمائندے سے خفیہ اور منافع بخش سمجھوتے کا نام دیا تھا۔ تب ایک زمانہ تھا، جب بڑے بخاری کے خلاف میں لکھی گئی تحریریں یا اخبار و رسائل جامع مسجد کے گلیاروں میں نذر آتش کر دیئے جاتے تھے لیکن 'اس خفیہ سمجھوتے' سے مخالفت کا بازار بھی کھلا، ساتھ ہی مستقبل میں آنے والی حکومتوں کے لئے بھی ــــــ مسلمانوں کے ہر طرح کے مسائل کو سلجھانے کے لئے، شاہی مسجد کے دروازے کھل گئے۔

کہتے ہیں دلّی بولتی ہے اور سارا ہندستان سنتا ہے ــــــ شاہی مسجد کے گلیاروں سے نکلتی آوازیں فتوحہ کے گلی کوچوں میں بھی آرام سے پھیل جاتی تھیں ــــــ تب ابا زندہ تھے ــــــ ابا جو کہا کرتے تھے ــــــ کہ قومیں اپنی نشانیوں سے پہچانی جاتی ہیں...... لیکن اِن نشانیوں کے پالنہار اب سمجھوتہ پرست ہو گئے ہیں۔ موقع پرست ــــــ ایسے موقع پرست، مسلمانوں کے قائد نہیں ہو سکتے۔ برصغیر کی 800 سالہ مسلم دورِ حکومت میں بنائی گئی مسجدیں اور یادگار آج زوال کے قریب ہیں تو ان کا ذمے دار کون ہے ــــــ؟ ابا، مولانا عبدالکلام آزاد جیسے کمزور مسلمان رہنماؤں کی مثال لے کر آجاتے تھے۔ جن کی کانگریس سے خوشامد اور چاپلوسی کی کہانیوں نے کتاب لکھنے اور رسالہ نکالنے سے الگ، کبھی انہیں ایک بہتر قائد بننے نہیں دیا ــــــ

لبا کہتے تھے ـــــ 'آٹھ سو برسوں کی حکومت۔ بھلانے میں وقت لگتا ہے بیٹے۔ وشو ہندو پریشد جیسے نیتاؤں کو یہی تو ہضم نہیں ہوتا۔'

لیکن لبا اپنی داستانوں میں مغلیہ حکومت کے زوال اور انگریزوں کے عروج کا قصہ مسلم حکمراں کی کمزوریوں اور عیاشیوں سے تعبیر کرنے کو تیار نہیں تھے۔ ذرا سی کرسی اور پاگل پن کا نشہ تغلق سے بخاریوں تک پھیلا ہوا تھا ـــــ ایک بار تنقید کے دروازے کھلتے ہیں تو تسلیوں کے دس دروازے بھی کھل جاتے ہیں۔ اُنہی دنوں چھوٹے بخاری کے امام سے 'بلڈر' بن جانے کا بھی دھماکہ ہوا تھا ـــــ پھر بجرنگ اور شیوسینا کے طرز پر 'آدم سینا' بنانے اور آدم سینا' میں شامل ناموں کو سرکاری خفیہ فائل تک پہنچانے کا معاملہ بھی سامنے آیا تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ شاہی وراثت کے مینار اور گنبد ذرا سا دھندلے پڑ گئے تھے ـــــ شاہی مسجد سے آتی صداؤں میں اب پہلے جیسی گرمجوشی اور تمازت نہیں رہ گئی تھی۔ کالے فریم سے جھانکتی آنکھیں اپنا خوف اور رتبہ کھو رہی تھیں ـــــ ملک میں فرقہ پرستی کے رتھ گھومنے، بابری مسجد کے مسمار ہونے کے بعد سے لے کر مسلم سیاست میں اُٹھا پٹک تو کافی ہوئی لیکن دوسرے مسلم نیتاؤں کے ساتھ بخاری خاندان کا اثر بھی زائل ہوتا رہا ـــــ ایک وقت وہ بھی آیا جب بڑے بخاری مسلسل اپنی مخالفت سے گھبرا کر، اپنا تاج اپنے بیٹے کو سونپ کر، شاہی محل کے گلیاروں میں اوجھل ہو گئے ـــــ نئے امام بنے بخاری حکمراں، فرقہ پرست پارٹی کا ساتھ دینے کے لئے نہ صرف بدنام ہوئے بلکہ رہی سہی کسر چھوٹے بخاری نے پوری کر دی، جو بہار کے چھوٹے شہروں سے فتوحہ تک حکمراں پارٹی کی حمایت میں لگاتار دورے کر رہے تھے۔

صلاح الدین قریشی ایک بھیانک 'اگنی پریکشا' سے گزر رہے تھے۔ سچ اور غلط کی تعریفیں کسی قدیم زمانہ کی یاد دلاتی تھیں۔ کہاں اس گلوبل تہذیبی، گاؤں میں ماضی کے ایسے اوراق یاد رکھے جاتے ہیں ـــــ یاد رکھا جاتا ہے تو صرف حال۔ ممکن ہے آپ کا مستقبل خوبصورت ہو اور آپ کا حال شاندار ـــــ مگر آپ کا ماضی تو وہی رہتا ہے۔ آلودہ اور داغدار ـــــ

لبا کی باتیں کہیں دُھند میں اُتر گئی تھیں۔ قریش منچ کی آئندہ میٹنگ میں بخاری کو خط بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ جسے تھوڑی بہت تنقید کے ساتھ منظور کر لیا گیا۔ قریش منچ کے خوبصورت لیٹر پیڈ پر، محلے کے صحافی نبی احمد سے لیٹر ڈرافٹ کرایا گیا اور خط شاہی مسجد کے پتہ پر بھیج دیا گیا اور

اتفاق دیکھئے ــــ ایک ہی ہفتہ کے اندر جامع مسجد کے خوبصورت لفافے اور پیڈ پر جواب بھی آ گیا تھا۔ فوراً ملنے کو کہا گیا ــــ بلکہ یہ بھی لکھا گیا تھا کہ ہو سکے تو بیوی اور بچوں کے ساتھ آیئے ــــ

قصہ کوتاہ، لنگی جیسے دکھنے والی نیپکن کی کہانی تھوڑا اور آگے بڑھی۔

4

چارخانے کی لنگی، وہ بھی گھٹنے تک موڑ کر باندھنے والے، ربانی گوشت والے سے شروع شروع میں، صلاح الدین کو پریشانیوں کا سامنا تو کرنا پڑا لیکن برادری والوں کو ایک جٹ کرنے میں اُس کا بڑا ہاتھ رہا ــــ چارخانوں کی لنگی کی جگہ اُس نے کُرتا پائجامہ بھی پہننا شروع کر دیا تھا۔ اردو اخباروں میں قریش منچ کی چھپی خبروں میں اب اُس کا نام بھی آنے لگا تھا۔ یہ سب باتیں ربانی کو اب بڑا آدمی سمجھنے میں مدد دے رہی تھی اور ربانی گوشت والا ان سب کے لئے صلاح الدین کا شکر گزار تھا، جس نے چاپڑ سے بوٹی بوٹی گوشت کاٹنے والے کے اندر ایک مسلم سیاستداں کو ڈھونڈ نکالا تھا...... اور بقول ربانی، 'پالیٹشین' ایسے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ کوئی آسمان سے تھوڑے ٹپکتے ہیں......'

ربانی گوشت والے کی دو ایک باتوں سے صلاح الدین کو شروع شروع میں الجھن کا سامنا تو کرنا پڑا لیکن بعد میں اُس کے بھی نتیجے اچھے نکلے۔ جیسے ایک بار اُس کی غیر موجودگی میں ربانی نے قصاب ٹولہ کے قصابوں کی ایک ایمر جنسی میٹنگ بلالی ــــ مدّعا تھا گوشت کی قیمت میں اضافہ اور دوسرا، قصاب کے پیشے کو عزت کی نظروں سے دیکھا جائے ــــ اُن دنوں وہ کپڑے کے شوروم کی خریداری کے لئے باہر گیا تھا۔ واپس آنے پر پٹنہ سے شائع اردو اخباروں میں ربانی کی چھپی خبروں پر اُسے تعجب کی بجائے غصہ آیا لیکن اس کا اظہار کرنے سے وہ قاصر تھا ــــ لیکن اسی کا دوسرا پہلو تھا، جو اُسے ایک صحافی دوست نے سمجھایا کہ عوام کے درمیان بڑی بڑی خبروں کی بجائے ایسی خبروں کا اثر زیادہ ہوتا ہے جو چھوٹے طبقے سے وابستہ ہوں ــــ خاص طور سے جن میں چھوٹے چھوٹے مسائل پر دھیان دیا گیا ہو ــــ ہاں ایسی خبروں سے قریش منچ کو فائدہ ہوا لیکن زیادہ اُچھل کود مچانے اور نئی تکنالوجی کے غیر ضروری استعمال سے ربانی گوشت والے کو کافی نقصان بھی سہنا پڑا تھا ــــ ہوا یوں کہ اُس میٹنگ کے بعد، دبی اور یوا ے

ای سے آنے والوں کے منہ سے ڈبہ بند گوشت کے بارے میں سنتے سناتے ربانی نے اپنے پیشے کو نئی تکنالوجی کے آئینہ میں اُتارنے کی پہل کر ڈالی۔ ٹین کے ایک سائز کے ڈبے خریدے گئے — 'قریش مٹن کارنر' کا لیبل چپکایا گیا — ربانی تو اُس پر قریش منچ کا لیبل چپکانا چاہتا تھا، لیکن منچ سے جڑے لوگوں کی مخالفت کا ڈر بھی تھا — فتوحہ میں سائنس پڑھنے والے طلباء سے مشورہ ہوا۔ پلیٹ کے اندرونی حصّے کو سوڈیم اور کیلشیم کے ذریعے جمانے کی کوشش کی گئی۔ شروع میں ایسے 100 ڈبوں کو جانچ کے طور پر تیار کرنے کی ذمے داری تھی مگر بُرا ہو سائنس کا، جس نے کبھی بھی ربانی جیسے لوگوں کا ساتھ نہیں دیا — ڈبے سے بدبو آنے لگی — ناکام تجربہ کا وقت وہی تھا، جس کے ٹھیک دوسرے دن صلاح الدین اپنی بیوی قریشہ کے ساتھ امام بخاری سے ملنے کے لئے ٹرین پکڑنے والے تھے۔ ڈبہ بند گوشت کے ناکام تجربہ کے باوجود مطمئن، ربانی اور منچ سے وابستہ دوسرے لوگ ٹرین تک دونوں شوہر بیوی کو چھوڑنے آئے۔ سارا معاملہ سیاست سے جڑا ہوا تھا — جیسے وہاں سے واپس آتے ہی صلاح الدین قریشی، مسلم سیاست میں کسی نئے باب کی شروعات کرنے جا رہے ہوں۔

دلّی پہنچنے، جامع مسجد کے قریب رفیق ہوٹل میں کمرہ لینے، فون پر گفتگو کے بعد دوسرے دن سات بجے ملنے کا وقت طے ہوا اور رات کا کھانا ساتھ میں کھانے کی دعوت مل چکی تھی۔ پتہ نہیں کیوں، اِن سب سے گزرنے کے دوران اُسے وہ منظر بار بار یاد آتا رہا، جو اُس نے فتوحہ کی سڑکوں پر — آنکھ پر پٹی باندھے موٹر سائیکل چلاتے جادوگر کو ابّا کی انگلیاں تھامے کبھی دیکھا تھا۔

5

ابّا نے کہا تھا — تہذیبیں اور قومیں اپنی نشانیوں سے بھی جانی جاتی ہیں — لیکن نشانیاں کہاں — دھندلی ہوتی نشانیوں کے ساتھ پرانی دلّی کے بازار آباد تھے — اردو بازار، مچھلیوں کی بدبو اور سڑک پر افراتفری کے ماحول کوئی نئے نہیں تھے۔ نئے تھے تو اس بار دیوار پر لگے ہوئے، امام مخالف پوسٹر، جن کے بارے میں صلاح الدین نے سنا تو تھا، لیکن ایسے 'تاریخی پوسٹروں' کے دیدار پہلی بار ہوئے تھے۔

شام کی بتیاں جل چکی تھیں۔ پرانے بازار کی رونق اپنے عروج پر تھی۔ جامع مسجد کے

ٹھیک پیچھے بنا جنت نشاں، مغلیہ سلطنت کے دور کی یاد دلانے کے لئے کافی تھا۔ یہی وہ جگہ تھی، جہاں امام نے اُن کی ملاقات کی جگہ مقرر کی تھی۔ صلاح الدین نے سن رکھا تھا کہ اس جنت نشاں میں کچھ بیش قیمت جنگلی پرندے بھی ہیں۔ جیسے کرشن مرگ، بلیک بک، پاڑا ہرن، ہاگ ڈیر۔ وہی جنگلی جانور جن کے 'غیر ضروری استعمال' پر مینکا گاندھی کا قہر برستا تھا، یا سلمان خاں جیسے ہیرو کو جیل کی ہوا کھانی پڑتی تھی...... لیکن امام کا معاملہ اور پولیس ایسے 'مذہبی سنتوں' کی مخالفت میں کھڑی نہیں ہوسکتی۔ جامع مسجد کی لمبی، نہ ختم ہونے والی سیڑھیاں بتا رہی تھیں کہ اسی، پہلی سیڑھی سے آخری سیڑھی تک، مسلم سیاست کے تمام داؤ پیچ کھیلے جاتے ہیں...... اِن سیڑھیوں سے گزرنے اور جنت نشان میں پہنچنے تک صلاح الدین کی جگہ قریش منچ کا ڈائریکٹر لے چکا تھا۔ جسے آنے والے مستقبل کی تیاریوں کی اینٹ یہیں سے رکھنی تھی — پہلی اینٹ۔

جنت نشاں کے باغوں میں قمقمے روشن تھے۔ قریشہ کے لئے سب کچھ نیا تھا اور حیرت میں ڈالنے والا۔ میاں جی کی حیثیت اور بڑھتے رتبے سے ایسا سروکار شاید پہلی بار ہوا تھا۔

پھر جیسے ایک جھماکہ ہوا۔ بخاری آگئے تھے۔ اُن کے شامل کچھ لوگ تھے، جن سے آہستہ لب ولہجہ میں بات کرتے ہوئے اُنہوں نے پلٹ کر اُن دونوں کی طرف دیکھا تھا۔ پھر امام نے کچھ اشارہ کیا۔ ایک نوکر نفیس ٹرے میں شاہی چائے اور کچھ میووں کی پلیٹ رکھ کر کچھ دور پر کھڑا ہوگیا۔ بخاری نے قریب آکر سلام کیا۔ ہاتھ ملایا اور خبر پوچھی۔ قریشہ سے پوچھا — دتی پہلی بار آئی ہیں، یا پہلے بھی آئی تھیں، پھر جواب کی پروا نہ کرتے ہوئے، سیدھے اپنی گفتگو پر آگئے۔

'آزادی کے بعد مسلمانوں کی حیثیت کو کسی نے بھی نہیں سمجھا۔ ایک نے بھی نہیں'......

وہ تھوڑا رُکے، گلا کھکھار کر پھر بولے۔ 'آپ کیا سمجھے۔ ہم پارٹی بدل رہے تھے۔ مسلمانوں کی آزمائش تھی تو آزمائش ہماری بھی تھی۔ کہاں چلیں، کدھر چلیں۔ کانگریس کو بھی دیکھا۔ پھر سوچا بھاجپا کو بھی دیکھا جائے۔ دیکھنے میں کیا ہرج ہے۔'

چشمہ سے جھانکتی آنکھیں جیسے صلاح الدین کے اندر تک اُتر گئی تھیں — 'آزادی کے بعد مسلمان بہت بری حالت میں رہے، آپ کو تو احساس ہوگا۔ ایک نفسیاتی ڈر کے سائے میں۔ اقلیت۔ آپ کو لگتا ہے کہ آپ کی اپنی پارٹی ہو، تو آپ زیادہ بھروسہ کرسکتے ہیں...... مسلمانوں کی پارٹی۔ مجھے ہر شہر میں ایسے لوگ چاہئیں جو ہماری نمائندگی کرسکیں۔ آپ کریں گے......؟

خوشبوؤں سے معطر فضا نے صلاح الدین کو کہیں اور ہی پہنچا دیا تھا — کبھی یہاں

سے شاہی سواریاں گزرتی ہوں گی۔ ممکن ہے کبھی شاہی دربار بھی لگتے رہے ہوں۔ پھولوں کے گلیاروں سے آتی مہکتی خوشبوؤں کے درمیان وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ وہ یہاں کس مقصد سے آیا ہے......

''وہ ہمیں دلتوں سے بدتر بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں۔ سارے سرکاری چہرے ایک جیسے ہیں۔ سب مسلمانوں پر اپنی روٹیاں سیکنا چاہتے ہیں۔ کیوں؟ کیونکہ آپ سیکنے دیتے ہیں۔ اس لئے، آپ سیکنے مت دیجئے — آپ جانتے ہیں کہ وہ آپ کا کاروبار کر رہے ہیں۔ آپ اپنا کاروبار خود سنبھالئے — اپنا مستقبل خود لکھئے — ذرا سوچئے، کبھی ممکنات کے باوجود کیا آپ کی اقلیت آبادی کا کوئی شخص وزیر اعظم ہوسکتا ہے — ؟ ہوسکتا ہے — آج نہ کل وہ اکثریت میں بھی آجائے۔ کیوں؟ کل کس نے دیکھا ہے — اسی لئے چھوٹے شہروں میں چھوٹی سطح پر بھی مجھے آپ جیسے نمائندوں کی ضرورت ہے......''

چشمے کے اندر سے چمکتی بخاری کی آنکھوں نے پانسا پھینکا — 'سوچئے مت ساتھ دیجئے۔ ساتھ دینے کا وقت ہے۔ تنقید کا وقت نہیں۔ پھر دیر ہو جائے گی...... مسلمانوں کو آپ جیسے سیاسی لیڈروں کی ضرورت ہے — محنتی اور جاں باز۔ وہ آہستہ سے بولے — اور جن کے پاس پیسہ کی بھی طاقت ہو۔'

ٹھیک یہی وقت تھا، جب خدمت گار نے آکر بتایا۔ کھانا لگ چکا ہے......

انتہائی لذیذ ترین کھانے کے دوران نیپکن نے اپنا جلوہ دکھایا تھا۔ صلاح الدین چپ تھے — چپ سے زیادہ 'حیران' اور جذباتی — جامع مسجد کے گلیاروں میں لگے مخالف پوسٹر اور دنیا بھر کے الزام سے الگ جو شخص سامنے تھا، وہ ہزاروں طرح کی مخالفت کے باوجود مسلمانوں کی نمائندگی کرتا تھا۔ پورے ہندوستان میں مسلمانوں کی نمائندگی۔

سر پر آسمان روشن تھا۔ پھولوں کی کیاریوں میں قمقمے روشن تھے۔ جنت نشاں کے جنتی گلیارے میں آسمان کی ٹھنڈک کے سائے میں — تمام سیاسی لفظوں کے ساتھ، بالکل اچانک کھانا ختم کرتے کرتے ایک لفظ چپکے سے داخل ہو گیا......

'نیپکن......؟'

'کیا؟'

'نے......پ......کن......'

پتھر کی میز پر چنے ہوئے مخملی دسترخوان پر، خوبصورت قابوں، پلیٹوں کے درمیان ایک انتہائی حسین گلاس میں گلدستے کی صورت نیپکن نظر آرہے تھے۔ صلاح الدین نے مڑ کر دیکھا...... قریشہ نے کھانا ختم کرتے ہوئے ایک نیپکن نکال لیا تھا۔ انتہائی سفید خوبصورت نیپکن...... جیسے کوئی سفید طلسماتی چادر ہو، جس کا ذکر اُس نے 'داستانِ امیر حمزہ' جیسی کتابوں میں کبھی پڑھا تھا مگر صلاح الدین کو اُلجھن قریشہ کے اس طرح چونکنے اور پھسپھسانے کے لہجے پر ہو رہی تھی۔ کمبخت...... اِس میں حیرانی کی کون سی بات ہے۔ نیپکن دیکھا نہیں کیا___ جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو___ اب تو وہ گھر بھی لانے لگا ہے___ اور تو اور، دعوت پارٹی کے موقع پر بھی نیپکن کا ہی استعمال کرتا ہے...... مگر یہ نیپکن...... شاہی نیپکن، جس کے ذکر کے ساتھ جنت نشاں کی وہ وادیاں بھی شامل ہیں، جہاں کسی زمانے میں مغلیہ حکومت کی سرگوشیاں بھی اپنا سر نکالتی ہوں___

'سنئے نا...... رکھ لوں...... یادگاری کے طور پر......' ایک اُڑتی نظر امام صاحب کے سپاٹ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے قریشہ، صلاح الدین کے کان کے پاس پھسپھسا رہی تھی......

'کیوں۔ ہاتھ دھونا ہے کیا۔ یہ لیجئے نا......' امام نے اشارہ کیا۔ چاندی کے خوبصورت کٹورے میں لیموں کے ٹکڑے کے ساتھ گرم پانی بھی موجود تھا۔

'جی...... میں کہہ رہی تھی...... نیپکن......' ڈرتے ڈرتے قریشہ نے اِس بار صلاح الدین کی طرف بغیر دیکھے اپنے دل کی بات کہہ دی...... 'نشانی کے طور پر رکھ لوں......؟'

'ارے...... ہاں...... ہاں...... کیوں نہیں...... ضرور___' امام صاحب ہنس رہے تھے۔ 'رکھ لیجئے نا...... نشانیاں......' وہ تھوڑا مسکرائے تھے...... 'تو میں اپنی نشانیوں کے ساتھ بھی جانی جاتی ہیں......'

ایک لمحے کو چونک گئے تھے صلاح الدین...... برسوں پہلے ابّا نے بھی تو یہی کہا تھا...... دتی میں آٹھ سو برسوں کی نشانیاں دھندلی اور ختم ہونے لگی تھیں...... اب ایک نشانی نیپکن کے طور پر...... ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ لہرائی۔ صلاح الدین نے دیکھا، قریشہ اپنے پرس میں شاہی نیپکن کو حفاظت کے ساتھ رکھ رہی ہے۔

نیپکن کا سفر ابھی جاری تھا۔ اِس واقعہ کے کچھ ہی دن بعد دتی سے فتوحہ پہنچنے پر اِسی نیپکن نے سیاست کی ایک نئی بساط بچھائی تھی۔

6

ہوا کچھ یوں کہ قریش منچ کے چمک جانے کے بعد سے ہی سدانند بابو اُس پر ڈورے ڈالتے رہے تھے۔ بہار میں برسوں سے حزب مخالف کا رول نبھانے والے سدانند بابو ایم ایل اے کے چناؤ میں کئی بار ہار چکے تھے۔ چھوٹے شہر میں ملنا ملانا تو ہو ہی جاتا ہے، لیکن وہ ایک ایسی پارٹی سے منسلک تھے جہاں ملنے ملانے کے جرم میں اپنے ہی لوگوں کے ذریعے وہ تنقید کے شکار بھی ہو سکتے تھے ___ فتوحہ جیسے شہر میں تنگ نظر مذہبی پارٹی والے نیتاؤں سے ملنے ملانے کو یوں بھی اچھا تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ دس بیس برسوں میں فرقہ پرستی کے اندھڑ نے اُسے سدانند بابو سے دور رکھا تھا جبکہ قاعدے سے دیکھیں تو دونوں ایک ہی عمر کے تھے ___ صلاح الدین اور سدانند دونوں نے ایک ساتھ ہی اسکول اور کالج کا سفر طے کیا تھا ___ لیکن جن سنگھ والی ذہنیت سے جڑا سدانند کبھی بھی مسلمانوں کے درمیان اپنی جگہ نہیں بنا پایا ___ لگا تار چلنے والے سیاسی اُٹھا پٹخ کے درمیان اِدھر صلاح الدین سیاست کے نئے باب پڑھنے لگے تو اُدھر سدانند، صلاح الدین کے سہارے مسلمانوں کے درمیان اپنی ساکھ بنانے کو بے چین تھے۔ بچپن کا کلاس میٹ ___ مانے گا کیسے نہیں۔ راجنیتی میں کوئی دھرم ایمان ہوتا ہے ___ ہوتا ہے ووٹ بینک ___ اصل تو یہی ہے۔ قریش منچ کے دفتر میں صلاح الدین سے ملنے آنے والے سدانند بابو نے چلتے وقت ایک شگوفہ اور جڑ دیا۔

'کل بھابھی کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا کھاؤں گا...... کھلاؤ گے نا؟ نان ویج۔ بہت دن ہو گئے یار......'

'کیوں نہیں......' دلّی سے لوٹے صلاح الدین کو سدانند کی تجویز میں سیاست سے جڑی کوئی بات نظر نہیں آئی۔

صلاح الدین مطمئن تھے ___ قریش منچ کے بڑھتے اثر کو کیش کرنے کے لئے دوسری پارٹیاں بھی اُن کے پاس آئیں گی ___ سیاست میں مستقبل کے بیج تو ایسے ہی پھوٹتے ہیں۔ اب چاہے امام ہوں یا سدانند ___ ملنا تو سب سے ہی پڑے گا۔ تبھی اپنا راستہ چننے میں اُسے آسانی ہوگی۔

اور یہ دوسرے دن کا قصہ ہے۔ جب نیپکن ایک 'زندہ اور سلگتا ہوا مسئلہ' بن کر ایک بار

پھر اُس کے سامنے آیا تھا۔

قریشہ صبح سے ہی کھانا بنانے میں جٹی تھی۔ پلاؤ، قورمہ۔ بہار میں عام طور پر بریانی کا رواج نہیں ہے۔ فتوحہ میں تو بالکل بھی نہیں مگر بھلا ہوٹی وی چینلوں کا، جس نے بریانی، حیدرآبادی بریانی کا نام لے کر منہ کا ذائقہ بڑھا دیا تھا۔ کئی لوگوں سے قریشہ نے بریانی بنانے کا طریقہ پوچھا۔ ایک دوبار، اچھا بُرا بنانے کی پریکٹس بھی کی۔ آہستہ آہستہ کامیابی ملی تو گھر میں بریانی بننے کا رواج شروع ہوگیا۔ ہاں، یہ الگ بات تھی کہ صلاح الدین کو بریانی کا حساب پسند نہیں تھا۔ وہ کہتا بھی تھا۔ چاول میں گوشت ڈال دو۔ یہ گوشت کے ساتھ انصاف نہیں ہے ـــــ بریانی بن گئی۔ گوشت کے اور آئیٹم بھی تیار ہو گئے۔

رات 9 بجے سدانند 'پارٹی جیپ' پر آیا ـــــ اکیلے ـــــ پہلے وہ قریش منچ کے پیچھے والے دفتر میں بیٹھا صلاح الدین کو اپنی پارٹی کا منتر پلاتا رہا ـــــ یہ بتانے کی کوشش کرتا رہا کہ اب پارٹی میں 'بھید بھاؤ' کا دور ختم ہو چکا ہے ـــــ اب تو اُس کی پارٹی میں مسلم جوان نیتا بھی شامل ہیں ـــــ اُس نے یہ بھی کہا، آئندہ آنے والے چناؤ میں اُس کی پارٹی کا مستقبل روشن ہے۔ قریش منچ چاہے تو آسانی سے مسلم ووٹوں کے بٹوارے کو روکا جا سکتا ہے...... سیاست میں ہم گھوڑے ہوتے ہیں۔ گھوڑا گھاس سے یاری کرے گا تو کھائے گا کیا...... ہو...... ہو...... ہو......'

تیز ٹھہاکے، قہقہوں کے درمیان کھانے کا دور چلا اور یہیں وہ حادثہ ہوگیا، جس کے بارے میں صلاح الدین انجان تھے ـــــ قورمہ، بریانی، نان پر ہاتھ صاف کرنے کے بعد جب سدانند نے نیپکن کہا، تو وہ آہستہ سے بولے...... چلئے بیسن پر ہاتھ دھولیں......

'ارے یار...... یہ دلّی والوں نے اب عادت خراب کر دی ہے۔ نیپکن ہی بڑھانا۔ رکھتے ہونا؟' سدانند بابو نے پھر ٹھہاکا لگایا ـــــ رکھتے ہو یا ابھی بھی فتوحہ کے فتوحہ ہو......'

اپنی طرف سے مطمئن صلاح الدین آگے بڑھے۔ چلمن کے اُس پار قریشہ کا چہرہ نظر آرہا تھا۔ پہلے سوچا، آواز دے کر بلالیں۔ پھر اتنا 'ماڈرن' بننا اچھا نہیں لگا صلاح الدین کو۔ چلمن کے پار کھڑی قریشہ کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا تھا۔

'نیپکن تو نہیں ہے۔'

'نہیں ہے۔ ابھی تو لایا تھا۔'

'ختم ہوگئی۔'

'دیکھو شاید کہیں کوئی ٹکڑا۔'

'دیکھ لیا، نہیں ہے.....' کہتے کہتے اچانک قریشہ کو یاد آ گیا..... ارے ہاں ہے.....'

'ہے تو پھر لاتی کیوں نہیں.....'

'وہ پرس میں..... قریشہ نے یاد دلانے کی کوشش کی ___ 'بھول گئے۔ دتی میں امام صاحب کے ہی یاں.....'

'اب کیا کریں ___ وہی دے دو ___'

سدانند بابو امام صاحب کی نیپکن میں ہاتھ پونچھتے ہوئے اب بھی ہنس رہے تھے ___

'کھانا مزیدار تھا..... لیکن ہماری تجویز کے بارے میں سوچئے گا ضرور۔'

نشانیاں دھندلی ہوگئی تھیں۔

سدانند کی جھوٹی رکابی میں مڑا تڑا شاہی نیپکن، گوشت کی چوسی گئی، بڑی چھوٹی ہڈیوں کے درمیان چھپ گیا تھا ___

OO

بازار کی ایک رات

بازار

پہلے بازار اس طرح نہیں پھیلا تھا۔

وہ بازار کے، اِس طرح پھیلنے پر اُداس تھا۔ پہلے بازار میں اتنی بھیڑ نہیں ہوا کرتی تھی۔ پہلے بازار میں اتنی ڈھیر ساری دکانیں نہیں ہوا کرتی تھیں۔ پہلے دکانوں میں اِتنے سارے کام کرنے والے مزدور یا 'چیزیں' نہیں ہوا کرتی تھیں۔ پہلے گلیاں اتنی تنگ نہیں تھیں۔ سڑک پر آدمی آرام سے گزر سکتا تھا۔ آجکی طرح نہیں کہ پیچھے سے آنے والی بھیڑ آہستہ آہستہ آپ کو آگے کی جانب دھکا دے رہی ہے اور جسم پر پڑنے والا 'بوجھ'۔۔۔ بازار کی بھیانک شکل کے سامنے ہر لمحہ آپ کو بے بس اور لاچار کرتا جا رہا ہو۔۔۔!

پہلے بازار میں اچھے آدمی ہوا کرتے تھے۔ دیسی چیزیں ملا کرتی تھیں۔ اِس بار بازار میں غیر ملکی اشیاء کی باڑھ آئی ہوئی تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ بازار کی شکل ہی بدل گئی تھی۔ وہ اِس شہر میں دو تین برس کے بعد آیا تھا۔ دو تین برس میں شہر کا چہرہ اتنا بدل جائے گا، اُسے یقین نہیں ہو رہا تھا۔ جو دکان والے اُسے دیکھتے ہی آواز دے کر بلاتے۔۔۔ چائے پلاتے۔۔۔ سامان خریدتے۔۔۔ انہوں نے جیسے اُسے پہچاننے سے ہی انکار کر دیا تھا۔۔۔

نہیں، اُسے پختہ یقین تھا۔ یہ وہ لوگ نہیں تھے۔

''پھر اُن کے بیٹے ہوں گے؟''

نہیں بیٹے بھی نہیں۔ بازار کے ساتھ، اخلاق، زبان اور لوگ بھی بدل گئے تھے۔ شاید اسی لئے اُس کے دیسی برانڈ کو دیکھ کر کچھ لوگ ہنسے تھے۔

'یہ کیا ہے......؟'

'وہی جو ہمیشہ سے ہم سپلائی کیا کرتے ہیں۔'

ہنسنے کی آواز—— ''معنی، دیسی ہے—— پھر ہنسنے کی آواز۔ ''نہیں—— نہیں چلے گا۔''

''نہیں چلے گا——؟''

''لیکن دور دراز، گاؤں، قصبوں کے لوگوں کو تو......''

''جواب میں کہا گیا—— ''اب دور دراز کچھ بھی نہیں ہے۔ گاؤں، قصبے—— سب لوگوں کو غیر ملکی چیزیں پسند ہیں—— اور ہاں—— بازار میں ہم وہی کچھ فروخت کرتے ہیں، جس کے آرڈر آتے ہیں—— جو سکہ چلتا ہے، ہم وہی لیتے ہیں——

اِس بار ہنس کر کہا گیا تھا—— ''بازار بدل گیا ہے۔ تم بھی اپنے کو بدل ڈالو۔''

OO

وہ جیسے سناٹے میں تھا—— حوصلہ پست ہو چکا تھا۔ ایسا تو پہلے کبھی نہیں ہوا۔ وہ آتا تھا۔ سامان فروخت کرتا تھا۔ رات گئے ہوٹل میں آرام کرتا تھا—— بازار کے درمیان دو ایک 'دھندے' کی دکانیں تھیں۔ اُن میں سے کسی ایک طوائف کو پٹا کر لے آتا۔ ساری رات عیش کرتا۔ پھر دوسرے دن بڑا مال آرڈر لے کر اپنے گھر روانہ ہو جاتا۔

مگر اِس بار بازار نے جیسے اپنا مکمل چہرہ ہی تبدیل کر لیا تھا—— اُس نے سوچ لیا تھا—— یہ بازار اب تمہارا نہیں رہا۔ تمہیں اپنے لئے چھوٹے بازار تلاش کرنے ہوں گے۔ جہاں تمہارے سکے، تمہارے 'ٹکسال' چلتے ہوں۔ جہاں سستی دیسی سامانوں کی خرید و فروخت اب بھی ہوتی ہو—— اُس نے گھبرا کر واپس لوٹنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن لوٹنے سے قبل آج کی رات ہوٹل میں وہ آرام سے اور کچھ کچھ 'عیش' سے گزارنا چاہتا تھا—— ایک عدد طوائف کے ساتھ—— اُس نے واپسی کا پروگرام انتہائی خوبصورتی سے ترتیب دیا تھا۔ 'دھندے' کی جگہ تلاش کرنے میں اُسے دشواری نہیں ہوئی اور ایک بار پھر وہ چونک گیا تھا۔

OO

پہلے یہاں دو تین چھوٹی چھوٹی دھندے کی دکانیں ہوا کرتی تھی۔ اب اِنہیں توڑ کر

ایک بڑے بازار میں تبدیل کیا جاچکا تھا —— رنگین بورڈ۔ خوبصورت غالیچہ۔ گھماؤ دار سیڑھیاں۔ ریموٹ سے کھلنے والا دروازہ۔ دروازے کے اندر کھلنے والی جنت کی کنجی —— اوپر نیچے خوبصورت، حسین وجمیل، جنت کی اپسراؤں کو لے کر آتی جاتی نرم ونازک کانچ کی تعمیر شدہ ایک ایسی لفٹ —— جس کے آر پار کا تمام 'جغرافیہ' آسانی سے دیکھا اور پڑھا جاسکتا تھا —— ہر طرف پاگل اور مدہوش کرنے والی عطر کی مہک —— شاندار صوفے —— وہ اس نئے بازار کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا تھا —— اچانک 'وہ' نظر آگیا —— وہ —— وہ بالکل نہیں بدلا تھا۔ پہلے وہ اس دھندے میں 'دلاّ' کہلاتا تھا۔ سر پر ترچھی ٹوپی —— پاؤں میں لنگی —— منہ میں پان، گلے میں لال رومال اور ایک گندہ سا کرتا —— پچھلے دو تین برسوں میں وہ جانے کتنی کتنی بار اسی 'دلّے' سے اپنے لئے طوائف کا انتخاب کر کے، اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اُسے تعجب اسی بات پر تھا —— بازار کے ساتھ 'دلاّ' بھی بدل گیا تھا اور اس کے طور طریقے بھی —— 'دلاّ' سفاری سوٹ میں تھا۔ بال 'ہیئر بیونگ' سے، قائدے سے سیٹ کرائے ہوئے —— دلّے کے ساتھ کچھ بے حد خوبصورت لڑکیاں تھیں۔ ایک لڑکی پر جیسے اُس کی نظر ایسے چپک کر رہ گئی کہ ہٹنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی —— وہ کسی فلمی ایکٹریس سے زیادہ خوبصورت تھی —— لیکن اِس وقت وہ کسی گہری سوچ میں گم تھی —— دلّے کا چہرہ بھی دوسری طرف تھا —— ایک لمحے کو اس نے سوچا —— بازار بدل گیا ہے۔ اور یہ طوائف بازار بھی —— دلاّ بھی بدل گیا ہے۔ بہتر ہوگا، وہ چپ چاپ یہاں سے کھسک لے۔ دلاّ بھی اُسے کہاں پہچانے گا۔

مگر دوسرے ہی لمحے دلّے کی نگاہیں اُس کی جانب گھوم گئی تھیں —— اُس کی آنکھوں میں پہچان سے زیادہ ایک شکاری کی چمک آگئی تھی ——

'آیئے صاحب......'

'جی......' وہ ہکلا رہا تھا۔

''اب غریب خانے میں آہی گئے ہیں تو، شوق فرما کر ہی جانے دیں گے ہم......''

دلّے نے انتہائی مہذب انداز میں اُسے سیلیوٹ مارا —— آیئے۔ یہاں...... یہاں تشریف رکھئے۔ اُس نے لڑکیوں کو وہیں رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر اُس کی طرف گھوما۔

'سب کچھ بدل گیا...... کیوں......؟'

'ہاں۔'

'لیکن آپ نہیں بدلے صاحب — یہ جگہ نہیں بدلی — وہ کسی فلاسفر جیسے انداز میں، گہری سوچ میں ڈوبا ہوا کہہ رہا تھا — 'جگہ نہیں بدلتی صاحب، بس رنگ بدل جاتے ہیں۔ روپ بدل جاتا ہے — اور بازار تو بدلنے کے لئے ہی ہوتا ہے صاحب.....'

'تم بھی تو بدل گئے......؟'

'نہیں...... میں...... وہی دلاّ......' وہ قہقہہ مار کر ہنسا — صرف کپڑے بدلے — کپڑے بدلے۔ اِس لئے زبان بھی بدلنی پڑی۔'

اِس درمیان وہ اپسرا جیسی خوبصورت لڑکی دلّے کی طرف گھومی تھی —

'میرے لئے کیا حکم ہے۔ یا سونے جاؤں؟'

'نہیں...... ابھی ٹھہرو...... وسندھرا......'

'و...... سُن......' وہ جیسے اِس نام کے نشے میں ڈوب گیا۔ ایک بے حد پیارا سا خوبصورت چہرہ — ایسے خوبصورت چہرے بھی دلّے کی جنت میں مل سکتے ہیں، اُس کے لئے سوچنا بھی مشکل تھا۔ ایک بڑے بازار کی اپسرا کا مطلب تھا — 'مہنگی ہوگی۔' اُس کی جیب سے کہیں زیادہ مہنگی — انگور کھٹے ہیں — کھٹے انگور اُس جیسے تاجروں کے لئے نہیں ہیں، جسے بازار میں یہ کہہ کر ننگا کر دیا گیا ہے کہ اُس کے 'مال' بازار کے قابل نہیں ہیں — اُس کے لئے تو کوئی دیسی، 'قصبی' ہی چلے گی۔ مگر اِس بڑے بازار میں کیا ایسی قصبی ملے گی — ؟ اُس کے سوچنے کا سلسلہ ٹوٹ گیا — دلاّ اُسی اپسرا کے بارے میں اُس سے پوچھ رہا تھا۔

'صاحب۔ یہ چلے گی......؟'

'یہ......'

'ہاں، اِسی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔'

'مگر یہ تو......'

''میں نے کہا تھا نا۔ گھبرائیے مت صاحب۔ بس آپ کے چٹکی بھر کی دیر ہے۔ آپ کے پسند کرنے کی دیر۔''

اپسرا جیسی لڑکی ابھی بھی دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے اُسے فکر ہی نہیں ہو کہ ایک بڑے بازار کے ایک چھوٹے سے حصے میں اُس کی بولی لگنی شروع ہوگئی ہو — دوسری لڑکیاں اپنے اپنے کمروں میں لوٹ گئی تھیں۔ لفٹ کے اوپر نیچے جانے کا سلسلہ جاری تھا — کولڈ ڈرنکس

کی بوتل کے درمیان —— اس جنت نما کمرے میں —— جنت جیسی 'حور' کے لئے ——
لڑکھڑاتے ٹوٹتے الفاظ میں اُس نے اپنی بولی بڑھائی —— اور ایکدم سے چونک گیا۔'بولی' ایک مقام تک آ کر سمجھوتے میں بدل گئی تھی۔

''بازار میں ہم اپنے ہر طرح کے گاہک کا خیال رکھتے ہیں صاحب۔لڑکی اب آپ کی ہے۔آپ چاہیں تو یہاں بھی کمرہ ہے۔ہوٹل جانے کی فیس الگ ہے......قبول......؟''

'قبول!'

معاملہ طے ہو چکا تھا۔کسی روبوٹ کی طرح 'وہ' اُٹھ کر اُس کے سامنے کھڑی تھی۔ بالکل علاء الدین کے جن کی طرح —— اُس کے قدموں میں بچھ بچھ جانے کے لئے تیار۔

'میرے آقا! کیا حکم ہے۔'

پھر اُس نے دیر نہیں کی۔ٹیکسی پکڑی اور ٹیکسی اُس کے ہوٹل کی طرف روانہ ہوگئی۔

طوائف

ہوٹل کے چھوٹے سے کمرے میں نور ہی نور پھیلا تھا۔وہ آج کی رات کو کچھ کچھ 'تاریخی' یا یادگار بنانا چاہتا تھا۔پتہ نہیں کہاں سے اُس کے اندر ایک شاعر آ گیا تھا۔شاعر —— وہ اس شاعر کو، جنت سے اُتری ہوئی اپسرا کے سامنے کچھ زیادہ ہی 'قرینے' سے پیش کرنا چاہتا تھا۔حقیقت میں اس طرح سے رومانی وہ کبھی نہیں ہوا۔'مال' کی سپلائی۔آرڈر۔گاڑی اور بسوں کی تھکان —— پھر ایک عدد ویشیا کا ساتھ —— جنگلی پن کا مظاہرہ اور ایک ٹھنڈی ندی کا بہاؤ۔لیکن —— یہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔

لڑکی، شہزادیوں کی طرح بستر پر لیٹ گئی تھی —— مخمور آنکھیں —— گہری جھیل کی طرح لگ رہی تھیں۔سنگ مرمر کی طرح شفاف، چمکتا ہوا بدن۔ایک لمحے کو اُس نے کہا بھی۔

'کپڑے اُتاروں؟'

'نہیں۔ابھی نہیں......ابھی تو رات پڑی ہے......'

لڑکی نے کندھے اُچکائے۔اُس کی بانہیں ننگی تھیں —— گوشت کا ایک بے حد حسین ٹکڑا۔جینس کے پینٹ اور سلیولیس ٹی شرٹ میں اُس کا 'مغرور بدن' انگاروں کی بارش کر رہا تھا۔

ایک لمحے کو وہ ٹھہر گیا۔ لڑکی اُسی کی طرف دیکھ رہی تھی — اُس کی پریشانی یہ تھی کہ بات کہاں سے شروع کروں۔ مطلب کہاں سے رومانی ہوا جائے۔ وہ سوچ میں گرفتار تھا۔ اتنا بڑا شہر — پھیلتا ہوا — تیزی سے بڑھتا بازار — آلودگی — شور — شروعات شہر سے ہی کرنی چاہیے۔

اب وہ مطمئن تھا۔ ہونٹ گول ہو گئے۔ آنکھوں میں نشہ پیدا کیا۔ اپسرا کے چہرے کی طرف دیکھا اور لگا — الفاظ کے 'فوارے' چلنے خود بخود شروع ہو گئے ہوں......

''تمہارا شہر...... تمہیں یاد ہے — پیڑ پودے...... کھلکھلاتا ہوا گلشن...... گیت گاتی ہوئی ٹھنڈی ہوا...... یہ سب مجھے میرے اپنے لگتے تھے۔ جیسے ہوا صرف میرے لئے جھوم رہی ہو...... درخت صرف میرے لئے گا رہے ہوں...... اور شہر — میں یہیں پیدا ہوا ہوں...... اسی مٹی سے — یا پھر 'پنر جنم' کا کوئی گہرا لگاؤ ہوگا۔ میں کبھی یہاں بزنس کے خیال سے نہیں آیا — بس۔ یہاں کا — یہاں کی آب و ہوا بار بار مجھے اپنی طرف کھینچ لاتی تھی۔ جیسے شہر بین بجا رہا ہو...... میرے لئے...... بلا رہا ہو مجھے...... تمہیں آنا ہی ہوگا اور دیکھو —''

'یہ شہر میرا نہیں ہے —'

لڑکی نے درمیان میں ہی بات کاٹ دی۔ جیسے ہوا رُک گئی۔ 'بین' کا بجنا بند ہو گیا۔ سرسراتے پیڑ خاموشی میں بدل گئے — گیت رُک گیا......

وہ ایکدم سے چونکا — 'تمہارا نہیں، مطلب......؟'

'مطلب میرا نہیں ہے......'

'پھر —؟'

'میں ابھی حال میں آئی ہوں۔ پھر کہاں جاؤں گی۔ کہہ نہیں سکتی......'

'چلو...... کوئی بات نہیں......'

آگے بڑھ کر اُس نے کھڑکی کھول دی — کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اندر آ گئے تھے۔

'ٹی وی چلا دوں......؟'

'نہیں — اُس کی آواز خاموش لہروں کی طرح 'ساکت' تھی۔

وہ بھی کچھ دیر تک کھڑکی سے باہر بے مطلب دیکھتا رہا۔ جیسے اپسرا سے دوبارہ گفتگو کے

لئے نئے لفظ تلاش کر رہا ہو—— اُس نے آئینہ میں اپنا جائزہ لیا۔ سفید کرتا، پائجامہ۔ آنکھوں کا نشہ ابھی اُترا نہیں تھا۔ ہونٹ ابھی بھی گول تھے۔ اندر رومانی انسان موجود تھا۔ 'شہر' والا کارتوس تو فیل کر گیا۔ جانے دو۔ کیا ہوا۔ لڑکی اب کھڑکی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے کو وہ اُٹھی۔ لہرا کر کھڑکی کے پاس کھڑی ہوگئی—— جیسے کشتی کے 'بادبان' کھل گئے—— ہوا کے رتھ پر ایک خوبصورت سا چہرہ، 'جھولے' جیسا جھول رہا تھا۔

'وسو......' اُس کی آواز میں نشہ تھا...... وسندھرا...... کتنا پیارا نام ہے...... تمہیں پتہ ہے وسو...... دتے نے—— نہیں معاف کرنا مجھے—— پہلے ہم اُسے اِسی نام سے پکارتے تھے...... چلو، چھوڑو اِس بات کو۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ دتے نے جیسے ہی تمہارا نام لیا...... و...... سن...... دھرا...... پتہ ہے...... مجھے کیا لگا...... کبھی تم نے ریگستان میں، خاموشی کی ریت پر چلنے والے اونٹوں کی گھنٹیاں سنی ہیں—— نہیں۔ میں مندر یا گرجا گھر کی گھنٹیوں کی بات نہیں کر رہا...... ریت کی اُڑتی آندھی میں، ایک قطار سے چلے آرہے، اونٹوں کے گلے میں بندھی گھنٹیاں...... جیسے 'جلترنگ' بجتا ہے...... جیسے دنیا کے سب سے میٹھے ساز نے تمہارا نام پکارا ہو۔ و...... سن...... دھ...... را...... جیسے——'

'وسندھرا میرا نام نہیں ہے——'

وہ کھڑکی سے ہٹ گئی تھی۔ میں نے جائزہ لیا۔ وہ خاصی لمبی تھی۔ ایک خوبصورت اور پُرکشش جسم—— لیکن جیسے، دھیمی دھیمی آنچ پر جلتے پگھلتے جسم کی اُسے کوئی فکر ہی نہیں تھی۔ وہ اُٹھ کر کرسی پر بیٹھ گئی——

'تمہارا نام نہیں......' میں اٹک رہا تھا۔ لفظ ٹوٹ رہے تھے——

'ہاں......'

'مگر دتے نے تو......'

'ہاں' وہ ہر روز نام بدل دیتا ہے......'

ہر روز...... مطلب تمہارا اپنا کوئی نام نہیں۔'

وہ گہری سوچ میں گم تھی اور ایک ٹک میرے چہرے کو تکنے لگی تھی——

'تم سونا چاہتی ہو تو......'

'نہیں'—— اس کے الفاظ میں سختی نہیں تھی—— وہ سب کچھ ایک روبوٹ کی طرح

کر رہی تھی...... 'تم نے خریدا ہے مجھے۔ آج کی رات کے لئے۔ مجھے حکم ہے، میں وہی کروں جو تم چاہو گے......'

کہنے کے لئے تو اس کے پاس متعدد سوالات تھے — زندگی اور مجبوری سے جڑے سوالات — یہاں، اِس منزل تک کی تکلیفوں سے الجھے ہوئے سوالات — مگر ایسے 'بے رحم' سوالوں کی شروعات سے ایک اچھی، خوبصورت اور رومانی رات کا ستیاناس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک بار پھر بڑی ادا سے بستر پر لیٹ گئی تھی۔ 'قلوپطرہ، مونالیزا سے لے کر جنیفر لوپیز تک کتنے ہی نام ہونٹوں تک آ کر، ٹھہر گئے — یہ جسم، یہ لباس...... وہ اُس کے لباس کا جائزہ لے رہا تھا۔ آج جینس تو ہر دوسری تیسری لڑکی پہنتی ہے۔ سلیولیس فینسی شرٹ تو سبھی پہنتے ہیں...... مگر اتنا بولتا ہوا لباس...... چوائس کتنی اچھی ہے — ہیرا اپنی قیمت پہچانتا ہے۔

ہوا تیز ہو گئی تھی۔ کھڑکی کے پٹ ڈول رہے تھے — وہ آہستہ سے بولی۔

'کھڑکی بند کر دو......'

'اچھا۔'

وہ اپنی جگہ سے اُٹھا۔ کھڑکی سے، بادلوں کے کچھ ٹکڑوں کے درمیان، آنکھ مچولی کھیلتا ننھا سفید چاند آ گیا تھا۔ دروازہ بند کرتے ہی وہ تیزی سے مڑا۔ چاند اپسرا کے لباس میں گم تھا...... سفید ٹی شرٹ، بادل کے ٹکڑوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ چاند اِن ٹکڑوں میں سمٹ آیا تھا......

اپسرا دھیرے سے ہنسی —

'کیا دیکھ رہے ہو......'

'تمہارا لباس......'

'ل...... باس — ' اپسرا کہتے کہتے رُک گئی۔

'کتنا خوبصورت۔ کتنا پُرکشش ہے۔ جیسے......'

اُس کی کھنک دار ہنسی نے ایک بار پھر کمرے کا سکوت توڑ دیا تھا — 'یہ لباس بھی میرا نہیں ہے۔'

'مط...... لب۔'

اپسرا چپ تھی — ''مطلب میرا نہیں ہے۔ کل والی پارٹی نے دیا تھا۔ گفٹ۔ ایک

رات کا تحفہ...... کچھ سر پھرے ایسے بھی ہوتے ہیں۔ قیمت کے ساتھ ساتھ گفٹ بھی دے جاتے ہیں...... پاگل۔"

●●

باہر جیسے ہوا کا شور رُک گیا۔ بند کھڑکی سے بادلوں کے ٹکڑے، جیسے 'کُہر' بن کر کمرے میں سمٹ آئے۔ گھُپ اندھیرا۔ نمی کی پتلی سی چادر۔ پھر جیسے دھیرے سے چادر ہٹی۔ اندھیرا ختم ہوا۔ بادل کھڑکی سے باہر لوٹ گئے۔ وہ فکر مند تھا____ کیسی لڑکی ہے۔ نام بھی اپنا نہیں____ لباس بھی نہیں____ شہر بھی نہیں......

باہر جیسے ڈرم پیٹے جا رہے ہوں۔

وہ یکا یک چونک پڑا تھا۔ لڑکی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر یکا یک اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اب وہ اس کی آنکھوں میں کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ہوا پھر سے تیز ہو گئی تھی...... وہ.. بستر پر دوبارہ لیٹ گئی تھی...... اُس کے ہاتھ بارش بن گئے تھے...... اپنے ہی جسم پر مچلتے ہوئے____

'ہوا تیز ہے...... ہے...... نا......'

'ہاں......'

اُس نے ایک جھٹکے سے جینس ہوا میں اُڑا دی......

'کھڑکی کے پٹ ڈول رہے ہیں......'

'ہاں......'

سفید ٹی شرٹ، اس کے مخملی بدن سے الگ ہو چکی تھی۔ وہ سر سے پاؤں تک آگ تھی۔ نہیں جل مچھلی...... نہیں جل مچھلی نہیں...... فرانس کی شنگورافش کے بارے میں اُس نے سنا تھا____ ایک پانی میں تیرنے والی عورت____ بستر جیسے ہوا میں اُڑ رہا تھا...... ایک بے حد حسین چہرہ۔ لمبی گردن۔ قلوپطرہ کی طرح، تنا ہوا سینہ، گٹھا ہوا جسم____ جیسے کمان سے تیر چھوٹنے بھر کی دیر ہو۔ دو ننگے پاؤں____ جیسے پانی میں لہراتی دو ننگی حسین ڈالیاں......

گفتگو کا سناٹا، اُس کے حسین مچلتے جسم نے توڑ دیا تھا...... وہ کانپ رہا تھا۔ جذبات کی تپش میں...... بہتے سیلاب میں____ ٹھنڈے پانی اور گرم آگ میں...... وہ اُڑ رہا تھا...... نہیں بہہ

رہا تھا—— یہ لڑکی۔ نہیں ویشیا۔ نام بھی نہیں۔ شہر بھی نہیں۔ لباس بھی نہیں...... مگر یہ حسین جسم......
یہ حسین چہرہ......

سمندر میں چھلانگ لگانے سے پہلے وہ اُسے خوش کرنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ لڑکی اُس کے سوالوں سے بوجھل ہوگئی ہے۔ مگر اب آخری سوال—— آخری ہتھیار...... بستر پر آگ کا دریا بہہ رہا تھا...... اُس نے آگ کے دریا کو مدہوش ہو رہی آنکھوں سے دیکھا۔ آنکھوں میں خمار چھا گیا۔ ہونٹ گول ہوگئے۔ وہ ایک بار پھر رومانی تھا۔

''یہ...... تمہارا چہرہ...... تمہارا جسم...... تم یقین کرو گی۔ وسو...... یا جو بھی تمہارا نام ہو...... تم یقین......'

''یہ جسم میرا نہیں ہے، یہ چہرہ میرا نہیں ہے......' وہ کسی روبوٹ کی طرح اپنا پرس کھول رہی تھی—— 'ہاں۔ چونکو مت۔ اِس میں کچھ بھی چونکنے جیسا نہیں ہے......''

وہ ایک لمحہ کو رُکی——

باہر طوفان یکا یک تیز ہوگیا تھا۔ کھڑکی کے پٹ تیز تیز بجنے لگے تھے—— جیسے ابھی ہوا کا زور، پوری طاقت سے کھڑکی کے پٹ توڑ ڈالے گا۔ وہ کہہ رہی تھی......

'سنو...... اِس میں کچھ بھی نیا نہیں ہے۔ یہ چہرہ، یہاں تک—— ماں بتاتی تھی—— اُس کا ہے——یہاں...... یہاں سے یہاں تک یہ والا حصہ میرے باپ کا...... ماں میری ہاتھ کی انگلیوں کے بارے میں بتاتی تھی کہ...... ماں کہتی تھی پیر تو بالکل اُس کی جیسے...... اور یہ حصہ...... ماں کہتی تھی...... ماں کا ایک بوائے فرینڈ تھا......''

تیز ہوا سے کھڑکی کی سٹکنی ٹوٹ کر گر گئی تھی۔ وہ بچوں کی طرح تالیاں بجا رہی تھی——
ہا...... ہا...... یہاں بھی تم ہار گئے......'

بچوں کی طرح پرس میں ہاتھ ڈال کر اُس نے کنڈوم نکال لیا تھا——

''یہ میرا ہے۔ اِسے میں ساتھ لے کر چلتی ہوں......''

وہ بچوں کی طرح 'کنڈوم' کو پھونکنے، پھلانے کی کوشش کر رہی تھی—— کمرے میں یکا ک طوفان بڑھ گیا تھا۔

OOO

بھنور میں ایلس

(۱)

ادھر آنکھیں بوجھل ہوئیں، ادھر خواب کے در کھل گئے...... پھر جیسے کسی نے انتہائی معصومیت سے صدا لگائی ہو...... ''ایلس آنکھیں کھولو...... آنکھیں کھولو نا ایلس......''

''جاؤ نہیں کھولتی۔ ابھی مزے مزے کے سپنے جو دیکھ رہی ہوں...... آنکھیں کھلیں تو سپنا ہٹ ٹوٹ جائے گا......''

آواز پھر گونجی۔ ''اچھا خیر چھوڑو، یہ بتا، سپنے میں کیا دیکھ رہی تھی......؟''

''میں نے دیکھا کہ...... ایلس کہتے کہتے ٹھہر گئی...... نہیں پہلے تم بتاؤ...... لوگ مرنے سے گھبراتے کیوں ہیں؟''

''مرجانا ایک بھیانک ڈراونے خواب کی طرح ہے۔ جہاں آنکھیں بند ہوتے ہی ہم سب سے دور چلے جاتے ہیں۔ وہاں آسمان پر ٹمٹماتے تاروں کی طرح...... خود کو نہیں پانے، کھوج نہیں پانے اور ہمیشہ کے لئے کہیں گم ہو جانے کا احساس...... نہیں ایلس۔ تم نے بے وجہ مغالطے میں ڈال دیا ہے۔ ہنس مت پگلی، بتاؤ نا، خواب میں کیا دیکھا؟''

''بتاؤں گی تو ہنسنے لگو گی۔ میں نے دیکھا کہ میں مر گئی ہوں...... اور وہاں...... آسمان پر جو تارہ چمک رہا ہے نا وہ میں ہوں...... اچھا بتاؤ...... رات میں آسمان پر چمکنے والے تارے کتنے بھلے اور سندر لگتے ہیں...... اچھا سمجھ لو ہم مر گئے ہیں اور مر کر وہاں آسمان میں گل بوٹوں کی طرح چپک گئے ہیں۔ اس تارے کی طرح...... تو اس میں گھبرانے کی بات کیا ہے؟''

''گھبرانے کی بات کیسے نہیں ایلس...... ہم اکیلے تھوڑے ہی ہوتے ہیں، ایک خاندان ہوتا ہے اور خاندان سے بچھڑ کر آنکھیں موند لینا...... ایک دم سے ہنستی مسکراتی جیتی جاگتی دنیا سے کٹ کر گم ہو جانا...... ہوا میں تحلیل ہو جانا...... اب جیسے تم ہی سوچ کر دیکھو نا ایلس...... تمہارے شوہر ہیں، تمہاری ایک لڑکی ہے۔ اسکول سے آنے میں ذرا سی دیر ہوئی تو کیسے بوکھلا جاتی ہو تم؟ بوکھلا جاتی ہو نا...... اب ذرا سوچو...... آنکھیں بند ہو گئیں تو...... ان سب کی خیر خبر کون لے گا......؟''

''کون لے گا؟...... ایلس ہنستی ہے...... ارے تب اپنی خیر خبر یہ خود لیں گے...... اس میں گھبرانے کی بات کیا ہے۔ ذمہ داری سب سکھا دیتی ہے۔ ہاں تم پوچھا نہیں...... میں نے کیا خواب دیکھا...... میں نے دیکھا کہ...... نہیں ڈرو مت...... اپدیش مت دو۔ مرنا سب کو ہے۔ ہم امر بیل کھا کر تھوڑا ہی آئے ہیں جو ہمیشہ زندہ رہیں گے...... ہاں تو میں نے دیکھا کہ...... اب کیا بتاؤں...... ایسی روشنی...... چکاچوند روشنی...... دودھ کی نہریں...... سیب کے باغات...... مخمل و کم خواب میں لپٹے حسین خوبصورت چہرے...... میں نے دیکھا...... ندی کی لہروں کی طرح ان میں سے ایک میں بھی ہوں...... خوب سفید براق لباس میں...... اور ہوا کی طرح...... لہروں کی طرح میں ان کے درمیان تیر رہی ہوں...... میں نے دیکھا کہ میرا جسم بالکل ایسا ہی ہے جیسے ابھی ابھی ہے۔ نہیں اس سے بھی کچھ ہلکا ہو گیا...... جیسا کہ کالج کے دنوں میں تھا...... اور میں ان دنوں سے زیادہ سندر اور پریوں جیسی ہو گئی ہوں...... اور میں نے پایا کہ...... جسم کے باقی اعضا اپنی جگہوں پر ہیں...... مگر ایک شئے نہیں ہے...... دماغ والی جگہ خالی ہے، جیسے مرنے کے بعد نکال لیا گیا ہو...... یا صاف کر دیا گیا ہو...... اس لئے میں صرف تیر رہی ہوں۔ تیر رہی ہوں...... بس تیر رہی ہوں...... یوں کہ سوچ نہیں پا رہی ہوں کسی کے بارے میں بھی...... اچھا چھوڑ...... سپنے کی باقی باتیں رہنے دے...... یہ بتانا، لوگ مرنے سے گھبراتے کیوں ہیں؟''

OO

لیٹے لیٹے کتاب پڑھتے ایلس کی اچانک آنکھ لگ گئی تھی۔ کتاب ہاتھ سے چھوٹ کر سینے پر آ گئی —— لاشعور طور پر دایاں ہاتھ سینے پر چلا گیا...... جلتے ہوئے پھوڑوں کی جگہ...... جیسے کسی نے کباب لگانے والی سیخ اچانک اس کے سینے میں اتار دی ہو۔ ''تھلے'' کی مڑی تڑی چنری

میں اینٹھن پڑ گئی ہو — کہتے ہیں سینے پر ہاتھ آجائے تو ڈراونا خواب آجاتا ہے — مگر ڈراونا کہاں...... وہ تو جیسے خواب جزیروں کی نا آفریدہ وادیوں کی سیر میں گم تھی...... ہاں نیند اس وقت ٹوٹی جب اشرف کے مکڑے کی طرح رینگتے ہوئے ہاتھ اس کے کندھے تک آکر ٹھہر گئے۔ اس نے دونوں آنکھیں بند کر کے اشرف کے چہرے کو پڑھنا چاہا۔ پھر مزہ لینے کے لئے ایک آنکھ ذراسی کھول دی۔

اشرف کے تھرتھراتے ہاتھوں نے کتاب اٹھالی......

''ایلس، سوئی ہو کیا......؟''

وہ شرارت سے دونوں آنکھیں کھول کر مسکرا پڑی...... ''نہیں تو — ہاں، ہلکی سی نیند لگ گئی تھی۔''

''کتاب پڑھ رہی تھی؟''

وہ تیزی سے بچوں کی طرح اٹھ کر بیٹھ گئی —

اشرف نے اطمینان کی سانس لیا۔ پھر کتاب کی طرف دیکھا...... 'روشومین! یہ پڑھ رہی تھی؟''

''ہاں......'' وہ علی الصباح، سناٹے کو توڑنے والی...... اور نیند سے بوجھل ہو رہے لوگوں کو جگانے والی...... چڑیا کی طرح چہچہائی — ''جاپانی ناول ہے۔ میں اب تک سمجھتی تھی کہ یہ جاپانی کمبخت ایجادوں کے سوا اور کچھ جانتے ہی نہیں۔ چھوٹے ٹھگنے قد والے، ان کے دماغ میں دنیا کو جنت بنانے والے سپنے ہی بستے ہوں گے...... مگر دیکھو نا، کتنی عمدہ کہانی ہے......''

اشرف نے غور سے اس کے چہرے کو پڑھا — کہا کچھ نہیں۔

ایلس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ جاپان کی قدیم راجدھانی کیوتو کا عظیم الشان گیٹ روشومین وقت کے ساتھ کھنڈر بن چکا ہے۔ وہاں لاوارث لاشوں کا پایا جانا بہت معمولی بات ہے...... کیوتو شہر قدرتی آفات کی زد میں آگیا۔ ادھر سمورائی کے گھر سے نکالے جانے والا ایک بے بس نوکر ہے۔ جس کے لئے سب سے ضروری شئے ہے؟ اس کا زندہ رہنا۔ نیکی اور بدی سے اوپر اس نوکر کے ساتھ حقیقت صرف اتنی سی تھی...... زندہ رہنا اور سوزاکو کے کسی دیوار کے سامنے دم توڑنا...... اور اچانک روشومین کے ہولناک کھنڈر میں وہ ایک بوڑھی عورت کو دیکھتا ہے جو لاشوں کے سر کے بال اتار رہی تھی۔ نوکر خوفزدہ ہو کر اصلیت پوچھتا ہے...... تو معلوم...... بوڑھی

عورت نے کیا جواب دیا...... اس نے کہا...... میں لاشوں کے سر کے بال اتارتی ہوں، اور ان کی ٹوپیاں بنا کر بیچتی ہوں۔''

''غلط تو میں بھی ہوں۔ مگر تمہاری طرح ذلالت بھرے کام تو نہیں کرتا، نوکر نے پوچھا، تمہیں ایسا کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟''

بڑھیا نے کہا: ''ہوسکتا ہے یہ کام تمہارے نزدیک ذلت بھرا ہوا...... مگر بھائی جس عورت کی لاش سے یہ بال میں نے اکھاڑے ہیں کیا وہ مجھ سے بھلی تھی؟ بولو، مجھ سے بھلی تھی وہ؟ نہیں جواب دے سکتے پھر؟ مجھے ایک بُری اور مردہ عورت کے سر کے بال اتارنے کا حق کیوں نہیں؟''

ایلس نے اشرف سے کہا۔ جانتے ہو، اس پر سوزا کو کے یہاں سے نکالے گئے چور نے کیا کہا۔ اس نے کہا...... بھولی بڑھیا! یہ اچھی بات ہے۔ گویا زندہ رہنے کے لئے دوسرے کا لٹنا بھی ضرور ہے۔ سو اگر میں تمہیں لوٹ لوں تو یہ بھی کہیں سے غلط نہیں ہوگا کیونکہ اس کے عوض میں اپنی دوزخ شانت کروں گا اور زندہ ہوں گا۔''

ایلس کی آنکھوں میں تجسس کی موجیں تھی...... اشرف، لوگ زندہ کیوں رہنا چاہتے ہیں، ممکن ہے موت زندگی سے کہیں زیادہ خوبصورت ہو......''

''پھر وہی موت، اشرف زور سے چیخا۔ کسی نے کہہ دیا کہ تم مرنے والی ہو؟''

''اشرف...... اس نے جیسے آنکھوں کے رستے پلاش کے پھول بچھا دیئے ہوں......
''غصہ کیوں کرتے ہو...... موت حقیقت ہے تو اس سے بھاگتے کیوں ہو...... میں ہوا میں تحلیل ہوگئی تو زمانہ کی چال نہیں رک جائے گی یہ ایسے ہی اس وقت بھی قائم رہے گی جیسے ابھی ہے جیسے اس سے پہلے...... جیسے اس وقت تم ہو......''

وہ اپنی دھن میں کہے جارہی تھی...... ''ایک کھنڈر ٹوٹتا ہے اس پر دوبارہ ایک نئی عمارت تعمیر ہو جاتی ہے...... پھر؟ ایک شناخت مٹتی ہے نئی شناخت بنتی ہے ـــــ ہم گم ہو جاتے ہیں...... ہم سے بھی اچھے لوگ اس دنیا میں آجاتے ہیں...... کوئی کسی پر مسلط، حاوی یا ٹکا نہیں ہے۔ سب اپنی ضرورت ہیں...... جیسے وہ لاشوں سے بال اکھاڑ کر ٹوپیاں بناتی ہوئی بڑھیا! روشومین کے کھنڈر میں بڑھیا کو لوٹ کر اپنے زندہ رہنے کا سامان کرنے والا سوزا کو کا نوکر......''

پھر وہ تیز آواز میں بولی۔ ''میں کھو جاؤں گی، تب بھی یہ کارخانہ ایسے ہی چلتا رہے گا،

اشرف...... سمجھے!''

وہ ہنسی تو ایک کھنک دار ہنسی کمرے میں گونجتی چلی گئی۔ لیکن اس ہنسی میں کہیں کوئی درد انگیز کیفیت نہ تھی۔ ایک بے باک سی بیگانہ روش تھی جو ہمیشہ سے ایلس کے مزاج کا ایک حصہ رہی تھی۔

(۲)

کچھ سال پہلے کی بات ہے......

بس کچھ سال...... اور کچھ سال میں بہار دروازہ تک آتے آتے ٹھہر گئی تھی۔ سیڑھیاں چڑھتے ہی دائیں طرف ایلس کا کمرہ تھا۔ کمرے کے ٹھیک باہر جنگل سا تھا۔ کھڑکی کھول کر وہ گھنٹوں فرصت کے اوقات ہری بھری وادیوں کو دیکھتی رہتی۔ اشرف دفتر چلے جاتے تھے اور شاہانہ اسکول...... وہ گھر پر ہوتی تو خالی وقت میں ساتھی یا تو کتابیں ہوتیں یا قدرت کے یہ گل بوتے......

تب کڑاکے کی ٹھنڈی کم ہونے لگی تھی۔ آموں میں بور آنے لگے تھے۔ کوئل کی کوک سنائی دینے لگی تھی۔ سامنے جلتے انگاروں جیسے، پھولوں سے لدے پلاش کے پیڑ تھے۔ پیڑوں کے بارے میں جاننا اور پہچاننا اسے اچھا لگتا تھا۔ وہ ہاتھ کے اشارے سے بتا سکتی تھی...... کہ یہ ڈھاک ہے...... یہ ٹیسو، یہ کھاکھر...... چھیولا...... اور یہ پلاش...... بیوٹیما مونو سپرما یعنی فلیم آف دی فاریسٹ Flame of the forest

OO

پلاش کے پھول...... بچپن میں ان سے رنگ گندھا کرتی تھی وہ...... پانی میں گھول کر کتنے کتنے رنگ چرا لیتی تھی۔

ہوا تیز تیز چل رہی تھی۔ پلاش کے سرخ پھول ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ پھر کوئی تیز ہوا آئی۔ سرد سی ہوا اسے چھوتی ہوئی گزر گئی۔ اس نے دروازہ بند کیا۔ کچھ دیر تک وہیں پر، برف سی جمیکھری رہی...... یہ سینے کے پاس اینٹھن کیسی ہے؟ چمڑی کے اندر اندر اتر جانے والی اینٹھن؟

رات میں شاہانہ سو گئی تو بے اختیار ہو رہے، اشرف کے، بدن پر مکڑے کی طرح رینگتے ہاتھوں کو اس نے چھاتی کے گڈھوں پر لا کر ٹھہرا دیا...... یہاں چھوؤ تو سہی...... یہاں...... دیکھو''

''ہاں.....کیا ہے؟''

''کچھ محسوس ہوا.....؟''

''نہیں تو.....؟''

''نہیں تو.....؟''

''کچھ جلن سی ہے.....دیکھونا یہاں کچھ ابھر رہا ہے.....''

اشرف کے ہاتھوں کی آوارگی میں جیسے خلل پڑ گیا۔ وہ چونک پڑا۔ رات کے اندھیرے میں ٹکڑے سے سانپ بنتے ہاتھ اچانک خرگوش جیسے نرم اور خوفزدہ ہو گئے۔ ''ہاں ہے تو..... کچھ کچھ.....ابھرا سا.....ڈاکٹر کو دکھا لینا۔ اب سو جاؤ۔''

اسی کے ساتھ وہ کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک کیسا اتاؤلا ہو رہا تھا۔ اور ابھی اچانک.....اس کے ہونٹوں پر ایک شرارت بھری مسکان اتر گئی۔ خود غرض، مطلبی..... وہ بچوں کی طرح ہنسی.....لیٹ تو گئی مگر ہوا سے گرتے پلاش کے پھول نظروں میں گھومتے رہے..... اس سے ذہن گھومتا تو پھر وہیں چلا جاتا.....یہاں چھاتی میں اندر کا گوشت کوئی ایسے گھوڑ موڑ رہا ہے، جیسے دودھ کو اسٹیل کے برتن میں رکھ کر فریج کے Chiller میں رکھ دیا جائے تو.....؟ کیسے ایک دم سے سوکھ کر برف ہو جاتا ہے.....اور اوپر اوپر برف کی تہہ جم جاتی ہے۔ ٹھیک ایسے ہی..... چھاتی میں جمے دودھ اور خون کو کوئی چور چور کر، نچوڑ کر، برف کی جھلیاں بنا کر پیس رہا ہو.....اندر تک پورا بدن کنکنا رہا تھا.....

ایلس کمرے میں آ گئی۔ کمرے میں سوئی ہوئی شاہانہ کو ہولے سے چھوا۔ شاہانہ نیند میں بے خبر تھی۔ ایک دوبار مداخلت بُری لگنے کے انداز میں چونکی پھر کروٹ بدل کر نیند میں کھو گئی۔ ایلس نے شاہانہ کے بے حد معصوم شگفتہ لبوں پر انگلی پھرائی۔ یہاں سے ہو کر بیسن کے پاس لگے آئینہ کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

بلب روشن کیا پھر دھیرے سے نائیٹی کا، آگے کا ہوک کھولا۔ دو بھڑکتے شعلے نائیٹی سے باہر چھلچھلا پڑے اس نے چھاتیوں پر ہاتھ پھیرا.....یہاں.....

مگر چھاتیاں ویسی ہی روشن تھیں۔ ویسی ہی بھری ہوئی اور کسی کنواری لڑکی کے پستان کی طرح کٹھور.....شاہانہ دس برس کی ہو گئی اس نے ان دس برسوں میں اپنا فیگر کتنا مین ٹین کر کے رکھا تھا۔ ایک بار پھر پستان کو چھو کر مطمئن ہو جانا چاہا مگر.....چھاتیوں میں پڑی کوئی گرہ اس کے

ذہن پر بھی پڑ گئی تھی۔

ایک لمحے کو گھبرا کر، آئینہ میں اپنا خوفزدہ چہرہ دیکھا اس نے۔

''ایلس! کیا تم خوفزدہ ہو؟''

''بولو ایلس! کیا اس لئے کہ ایک دن گم ہو جاؤ گی تم......''

''ہاں، ابھی عمر ہی کیا ہے صرف 35 سال مگر 35 سال کی عمر بھی تو کوئی کم نہیں ہوتی۔ مان لو اگر گم ہو گئی تو......؟ کیا اسی لئے خوفزدہ ہو......وہاں، کمرے میں اشرف ہوئے ہیں۔ ایک بہت ہی پیار کرنے والے شوہر......بچوں کی طرح غیر ذمہ دار اور بے ترتیب......اور ننھی سی شاہانہ......تم سوچتی ہو۔ سب تمہارے سہارے زندہ ہیں؟''

OO

ایلس نے نائیٹی کا ہک بند کیا......کوئی کسی کے سہارے زندہ نہیں ہے ایلس......بس زندہ رہنے کا عمل ہے یہ کہ اصول، قاعدے اور ضابطے کی ایک دیوار اٹھ جاتی ہے......اور اس دیوار کے اندر ہی زندگی تلاش کرنی پڑتی ہے......یہ دیوار ٹوٹ بھی گئی تو، کہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا ایلس......''

وہ دھیرے سے مسکرائی......اب وہ پوری طرح مطمئن تھی......ایک بار پھر اس نے اپنے سراپا کو غور سے دیکھا......اور کچھ گنگناتی ہوئی کمرے میں آگئی۔

اس رات ایلس صبح دیر تک گھوڑے بیچ کر سوتی رہی۔ آرام کی نیند......

(۳)

کچھ ہی دنوں میں مسز گرو ور اس کی دوست بن گئیں۔ مسز گرو ور وہی عورت ہیں، جن سے اس کا علاج چل رہا تھا—سبک اور متین لہجہ......آنکھوں میں مادرانہ شفقت کی بو باس...... ہونٹوں میں نرمی اور مٹھاس......بھرے بدن کی ادھیڑ عمر کی عورت۔ بالوں میں سفیدی جھانکنے لگی تھی۔ چہرے سے گھریلو دکھنے کے باوجود کافی باوقار لگتی تھیں گرو ور......

تین چار چھوٹی چھوٹی ملاقات کے بعد ہی مسز گرو ور نے دھماکہ کیا تھا۔

''......ایلس کنگو جرا اور تل چٹا دیکھ کر تمہیں ڈر تو نہیں لگتا؟''

''...... نہیں تو مگر کیوں؟''

''...... میں ایک انکشاف کرنے جارہی ہوں۔ انکشاف ہمیشہ چونکانے والا ہوتا ہے ___ ہوسکتا ہے میرا اشک ہو......''

''آپ کہیں تو سہی وہ ہنسی تھی۔ میں دل برداشتہ تب بھی نہیں ہوئی تھی جب شاپن ہار کو اس کی تخلیق میں شکست خوردہ محسوس کیا تھا۔ لوگ اتنے نراشوادی کیوں ہوتے ہیں او شاپن ہار جیسا آدمی؟ اور مونٹانجین جیسا شخص خود کشی کے بارے میں دلیلیں دے دے کر اس کو صحیح ثابت کرتا ہے۔ کمزور اور بزدل۔ میں اس Spiritual Pessimism پر یقین نہیں رکھتی۔

''Spiritual Pessimism''...... مسز گرودور زور سے ہنسیں۔ اسی لئے تم سے باتیں کرتے ہوئے مزہ آتا ہے ایلس۔ ناامیدی میں بھی موہوم ہی سہی مگر امید کی کرن ہوتی ہے۔ اچھا بتاؤ تو سہی۔ اگر میں انکشاف کروں کہ تمہیں بریسٹ کینسر ہے تو......''

وہ جیسے اچانک ایک پل کو برفانی بارش میں نہا گئی۔ حلق میں کچھ الفاظ اٹک سے گئے۔ آنکھوں میں سراسیمگی تیر گئی۔ اس نے خود کو نارمل بنانے کی کوشش کی۔

''کیا یہ صحیح ہے مسز گرودور؟''

''میرا اشک بھی ہوسکتا ہے...... اور بھگوان کرے میرا اشک ہو۔ تمہارے عمر کی کی عورتوں کو ہمیشہ اس جانب سے فکرمند رہنا چاہئے۔ اگر سینے میں گانٹھ سوجن ہو چھاتی یا آس پاس کی چمڑی دھنس گئی ہو۔ پستان سے پانی رستا ہو۔ ان باتوں پر یوں غور کرو کہ یہ موضوع بھی تمہارے ہاتھ میں دبی کسی دلچسپ کتاب کی طرح ہے۔ تو کیا تم اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی کوشش نہیں کروگی...... اگر ہے بھی...... بھگوان نہ کرے...... تو کوئی غم مت رکھنا...... انسانی جسم امراض کا گھر ہے۔ کیوں ایلس تم گھبرا تو نہیں گئی......؟''

ایلس دونوں ہونٹ آپس میں بھینچتے ہوئے مسکرائی۔ مسز گرودور...... میں بالکل نہیں ڈری۔ مجھے اچانک کچھ یاد آگیا۔ وہ جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ الگو ینڈر سولز ے نیٹسن...... یہ نام یاد ہے نا آپ کو۔ آپ نے اس کی کینسر وارڈ پڑھی ہوگی۔ مجھے بس وہ عورت یاد آگئی۔ یاد ہے نا جو اچانک اپنا سینہ کھول کر اپنے بوائے فرینڈ کے سامنے جذباتی ہوگئی تھی۔ Suck it...... اسے منہ میں لے لو۔ چوسو! اس کا یقین کرو یہ دہکتا ہوا انگارہ۔ اس کا یقین کرو ابھی یہ اس جگہ ہے اور گواہ رہنا کہ یہ اس جگہ موجود تھا۔ کل یہ آپریشن کے بعد کسی گٹر یا ڈسٹ بن میں پھینک

دیا جائے گا...... مگر گواہ رہنا یہ اس جگہ موجود تھا...... اپنی تمام تر شعلہ سامانیوں کے ساتھ...... یہ دہکتا ہوا انگارہ......"

اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے......

مسز گروور نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ایلس! کیا تم ڈر گئی ہو؟"

"نہیں تو...... آنسو پوچھتے ہوئے وہ پھر مچل گئی۔ "ہولناک مسز گروور۔ انتہائی ہولناک۔ میں کینسر وارڈ کی حقیقت میں گم ہوگئی تھی ـــــ مسز گروور آپ قطعی پریشان نہ ہوں ـــــ کردار کی حقیقت نگاری نے مجھے کچھ دیر کے لئے گمراہ کر دیا تھا۔"

(۴)

اس انکشاف کے بعد گھر میں اچھا خاصا زلزلہ آ گیا تھا۔ اسے لگا ہر کوئی اس سے نظریں چرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ کئی کئی رات اس نے اشرف کو پاگلوں کی طرح بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے بھی پایا۔ کئی بار اندھیرے میں اس نے محسوس کیا کہ اشرف آنکھوں میں سمٹ آئے آنسوؤں کو پونچھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسے دیکھتا پا کر مسکرانے کی کوشش میں وہ اور بوجھل ہو جاتا ـــــ وہ دیکھ رہی تھی، شاہانہ کے چہرے پر غم کی کالی کالی بدلیاں تیر گئی ہیں ـــــ شاید وہ بھی اس انکشاف کے پردے میں بہت کچھ جان گئی ہے کہ ایک حقیقت جیسی شئے، ماں جیسی شفقت کا سایہ ہولے سے ایک دن آنگن کی دھوپ کی طرح گم ہو جائے گا۔

صبح میں اگر وہ دیر سے اٹھتی تو دیکھتی کہ اشرف نے اپنے سارے کام خود ہی انجام دے دیئے ہیں۔ شاہانہ کو اسکول کے لئے تیار کرنا، بریک فاسٹ کے لئے ٹوسٹ اور آملیٹ کا ریڈی میڈ ناشتہ تیار کرنا، کپڑے دھونا، استری کرنا، دھوبی دودھ والے کا حساب رکھنا...... اسے لگا، وہ کہیں سے چھوٹ تو نہیں رہی ہے...... وہ کچھ کرنا بھی چاہتی تو اشرف نظریں چراتا ہوا اس کے سامنے چھا جاتا......

"ریلیکس ایلس۔ کبھی کبھار آرام بھی تو کر لیا کرو۔"

"اب آرام ہی تو کرنے جا رہا ہوں ہمیشہ کے لئے......"

وہ چاہتی تھی، اشرف اس جملے ہمیشہ کی طرح Wit محسوس کرے مگر اشرف اچانک ہی غمگین ہو اٹھتا، آنکھیں بھر آ جاتیں تو وہ نظریں پھیر لیتا۔ زیادہ جذباتی ہو جاتا تو اس کو بانہوں میں

بھینچ لیتا۔ پاگلوں کی طرح...... ''تمہیں کچھ نہیں ہوگا ایلس! کچھ نہیں ہوگا......''

OO

ایک معمولی سی سرکاری نوکری جس کی امید میں آنکھیں جیسے مستقبل کی زمین میں دفن قارون کا خزانہ دیکھنے کی سعی کر رہی ہوتیں...... زندہ رہنے اور مطمئن کر دینے کے احساس سے زیادہ کا ''اتاولا پن'' اسے بے چین بنا دیتا۔ وہ محسوس کرتی۔ سرد و گرم موسموں کی تمازت جذب کرتا ہوا اشرف اب بکھر سا رہا ہو...... وہ محسوس کرتی تو کھلی کتاب کی طرح اس کی آنکھوں میں اتر جاتی پھر جھانکنے اور پڑھنے لگتی......

''میں نے کبھی تم سے کچھ زیادہ کی مانگ تو نہیں کی......''

''کبھی خود کو تم پر مسلط تو نہیں کیا؟''

''نہیں......''

''میں گرم ہوا کی طرح تم پر بار تو نہیں رہی۔ میں نے اتنا ہی چاہا، جتنا خود کو چاک کر کے چاہ سکتی تھی۔ پھر پاگل کویں بنتے ہو، خوفزدہ کیوں رہتے ہو؟ مر جاؤں گی تب بھی کچھ نہیں بدلے گا۔ سب ایسا ہی رہے گا۔''

''وہ اشرف کی سانس سانس میں اتر کر کہتی...... ''ممی ڈیڈی گزر گئے۔ جب زندہ تھے تب ان کی ہلکی سی آہ کراہ اٹھتی تھی، لرز جاتی تھی...... اور سوچتی تھی، دعا مانگتی تھی کہ اللہ میاں انہیں ہمیشہ زندہ رکھیو۔ وہ گزر گئے تو ابگزر جانے کے سوا کوئی سا بھی احساس باقینہیں ہے۔ آنکھیں کھلنے تک جذبات جسم سے روح کی طرح چمٹے ہوتے ہیں...... بس...... ڈونٹ بی ایموشنل۔''

''اس نے دیکھا، اشرف نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا۔ کرسی پر دھم سے بیٹھ گیا۔ کچھ اور نہیں ہوا تو بلند آواز میں رونےلگے۔

وہ جھکی ــــــ ''Spiritual Pessimism...... مجھے معلوم ہوتا کہ تم شاپن ہار میں سے ہو تو میں کبھی تم سے شادی نہیں کرتی......''

(۵)

اندھیرے کمرے میں جب کوئی نہیں ہوتا تو ایلس دیر تک خلاء میں اپنے سوالوں کا جواب تلاش کرتی رہتی۔ کیا سچ مچ وہ ایک دن گم ہو جائے گی؟ یوں غبارے سے نکلی ہوا کی

طرح...... پھر کہاں جائے گی...... اسے لگتا کہ کوئی اس کے قریب کھڑا ہے...... یہاں اس قبر میں لوسی سو رہی ہے۔ تم بھی سو جاؤ گی۔

وہ چونک کے اٹھتی ہے۔ پھر تالستائے کے ایوان ایلچ کے بارے میں سوچتی ہے۔ ایوان ایلچ مر گیا ہے—— کمرے میں اس کا جنازہ رکھا ہے۔ سوگوار گم سم کھڑے ہیں۔ حالانکہ ماحول ہی کچھ ایسا ہے مگر سب سوگوار ہونے کا ناٹک کر رہے ہیں۔ ایوان کے دوست رشتے دار یہاں تک کہ اس کی بیوی...... سب آخری رسوم کے جلد سے جلد فارغ ہونے کے انتظار میں ہیں۔ انتشار اور اضطراب سے الگ ایک ابدی سکون۔

وہ ٹھہری...... روح سب سے پہلے بدن سے، اپنا رشتہ کہاں سے منقطع کرتی ہے وہ آہستہ سے جانگھوں پر سے ساڑی ہٹاتی ہے۔ کمرے میں در آئی تیز ہوا کھڑکی کے پردے، جھٹکا کر اس کے پوشیدہ مقام، سے ہوتی ہوئی چپکے سے گزر جاتی ہے۔ یہاں سے...... ممکن ہے، یہیں سے عورت اپنے خالق کہلانے کا درجہ حاصل کرتی ہو۔ یہیں سے تسکین کے سوتے پھوٹتے ہوں اور عجب کیا کہ روح کی نجات بھی یہیں سے ہوتی ہو!

پیروں کو عریاں کئے۔ وہ دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرتی ہوئی اس مقام کی ''سنکری'' گلیوں تک آ کر ٹھہر جاتی ہے۔

(۶)

وقت ہوا کے جھونکے کی طرح اڑا اور ایلس کسی کمزور عمارت کی طرح ڈھ گئی۔ پہلے وہ سوچتی تھی۔ لوگ موت Enjoy کیوں نہیں کرتے۔ ایک انجانی سی منزل؟ جس کو کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ ایک انجانی سی دنیا جس کی دریافت کسی نے بھی نہیں کی...... وہ چاہے جنت ہو یا دوزخ یا محض تصور ہو...... موت اس کے لئے کسی چکاچوند گلیمر کی طرح تھی مگر دھیرے دھیرے تکلیف کی شدت نے اسے تنکا تنکا کھوکھلا کرنا شروع کر دیا تھا۔

جیسے نالے کا منہ کھل گیا ہو...... چھاتی کا ناسور اور اس سے رسنے والا مواد...... جیسے اندر سے، تھلے کو کوئی شئے چھوڑ رہی...... پہلے آئینہ کے سامنے نائٹی کا ہک کھولتے ہی جو شئے آنکھوں میں سب سے زیادہ جگمگاتی تھی اب اس سے گھن اٹھ رہی تھی۔

ہاں وہ تھک گئی ہے—— اٹھنے سے چکر آنے لگتے ہیں۔

شاہانہ اس کے پاس آکر پتھر کی مورت کی طرح ٹکر ٹکر اس کا چہرہ تکتی ہے اور کسی بڑے سمجھدار آدمی کی طرح کہتی ہے۔ ''ممی! اب مجھے اکیلے کمرے میں ڈر نہیں لگتا میں خود سے کنگھی بھی کر لیتی ہوں۔ مجھے سارے کام آتے ہیں۔ ممی......''

اشرف اس سے نظر بچانے کی کوشش کرتے ہیں...... جیسے اس کے بکھرتے وجود میں دن، مہینے اور برس گن رہے ہوں۔ کبھی کبھی کمرے میں پاگلوں کی طرح ٹہلنے لگتے ہیں۔

جبراً وہ مسکرانے کی کوشش میں صدا لگاتی ہے...... ''اشرف، گھبراتے کیوں ہو...... کسی اور کو لے آنا......'' وہ ہنستی ہے۔ ''ذرا سوچو، شاہانہ کی پیدائش کے دو سال بعد سے میں تمہارے لئے کیا رہ گئی ہوں۔ ایک ایسی ضرورت جو تم میرے سوا بھی پوری کر سکتے ہو۔ کسی سے بھی —— بس اسی ضرورت کے لئے میں یاد آؤں گی۔'' وہ زور سے ہنسی...... ''یو انڈین! اتنا پڑھ لکھ کر بھی تم لوگ دقیانوسیت کے خول میں کیوں بند رہتے ہو؟''

پھر اس نے اشرف کی گھٹی گھٹی سی آواز سنی۔ ''مائی ڈارلنگ ایلس!...... ایسا کیوں سوچتی ہو؟''

''اس لئے کہ اب تم لڑتے نہیں، بگڑتے نہیں، ناراض نہیں ہوتے —— تم موم بتی کے پگھل جانے کی راہ دیکھ رہے ہو۔ اس نے غور سے اشرف کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''موم بتی جب تک جل رہی ہے...... آخری شعلے تک...... وہ روشنی تو دے رہی ہے...... میں ابھی نہیں مر رہی...... جب مروں گی، تب دیکھا جائے گا۔ موت کو عام حقیقتوں کی طرح قبول کرنا سیکھو...... جینا سیکھو۔''

زندگی جینا اور ہر لمحے کو Enjoy کرنا...... مسز گروور سے یہی تو وہ کہتی ہے۔

OO

''سرخ پلاش کے پھول پھر کھل اٹھے ہیں۔ پچھلے سال بھی کھلے تھے۔ تب سے ایک سال گزر گیا۔ ایک سال زندہ رہی نا......؟''

''ہاں''

''اگر مسز گروور! ایک سال پہلے میں اداس ہوگئی ہوتی تو......'' وہ کہتے کہتے رک گئی...... کیوں مسز گروور میڈیکل سائنس کی دنیا میں ایسے معجزے نہیں ہوتے کیا......؟''

''ہو بھی سکتے ہیں؟''

مسز گرووَر کی لاچاری پر اسے ترس آتا ہے......

وہ جانتی ہے......وقت کم رہ گیا ہے......وہ دھیرے دھیرے موت کی طرف بڑھ رہی ہے موت میں فاصلہ بہت کم رہ گیا ہے، بہت سی باتیں، بہت سی کتابیں اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں جنہیں وہ کرنے پڑھنے اور جاننے کی خواہش مند ہے......وقت دریا کا پانی سوکھتا جا رہا ہے۔

پھر اس کا جسم نت نئے عذاب سے گزرتا چلا گیا۔ اشرف اسے لئے لئے پھرتے رہے......

اس کونے سے اس کونے، ایک شہر سے دوسرے شہر......آپریشن، ریڈیشن کے مختلف مرحلوں سے اس کا بدن گزرتا رہا......کیموتھراپی سے تھوڑی راحت ملی تھی لیکن مرض پھر بھی نہیں گیا......ریڈیم، بایوپسی، میموگرافی......میڈیکل سائنس کے ہر جبر کو جھیلنے اور سہنے کے لئے وہ شہروں شہروں اڑان بھرتی ہوئی بمبئی آ گئی تھی۔

○○

بمبئی ہاسپٹل......بمبئی دیکھنے کی کتنی خواہش تھی اس کی......مگر وہ ایک کینسر پیشنٹ تھی، اس کی دنیا محض کینسر وارڈ تک محدود تھی، جہاں چیخوں اور کراہوں کو سنتے سنتے اس کے کان پک گئے تھے......ڈاکٹر مریض، سب کے سب اسے کینسر پیشنٹ نظر آنے لگے تھے۔

وہ لہولہان ہوتی رہی......ہوتی رہی......لیکن ایک دن جب برداشت کی قوت ختم ہو گئی تو وہ اشرف کے سامنے پھٹ پڑی۔

''اشرف سنو! یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے، میرا جسم ان ڈاکٹروں کے تجربے کے لئے نہیں ہے۔ مجھے واپس وہیں لے چلو......مسز گرووَر کے پاس......''

وہ گڑگڑانے کے لہجے میں بڑبڑائی۔ یقین مانو اشرف یہ وہی پرانے تجربے مجھ پر کئے جا رہے ہیں جہاں سے انہیں کامیابی ملنے کی کوئی امید نہیں۔ اگر کامیابی ملنے کی ذرا سی بھی صورت دکھتی تو میں پہلی عورت ہوتی جو اپنے جسم کو ان کے تجربے کے لئے وقف کر دیتی مگر......''

وہ دم گھٹ رہے قیدی کی طرح ہانپ رہی تھی۔ ''یہ مجھے تھکا رہے ہیں۔ مجھے سب کینسر میں لتھڑے ہوئے نظر آ رہے ہیں جن کے گوشت کی جھلیاں پھٹ گئی ہیں اور ناسور باہر جھانک

رہے ہیں ——— مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے......"

اشرف بخ زدہ لہجے میں بولے۔"ایلس ڈارلنگ! یہ تمہیں ٹھیک کرنا چاہتے ہیں۔"

"نہیں یہ صرف ایکسپریمنٹ کر رہے ہیں۔ الٹراسونوگرافی، فائن نیڈل ایکسپریشن سائیٹولوجی۔ یہ جسم صرف ایک تجربہ گاہ ہے تمہارے ڈاکٹروں کے لئے...... یہ دیکھو......"

اچانک، بہت اچانک...... ایک بے ہودہ سا واقعہ پیش آیا ——— اس نے جھٹکے سے اوپری لباس ہٹایا اور اپنے سینے کی گولائیوں کو اس کے سامنے عریاں کر دیا......

"دیکھو...... غور سے دیکھو...... میں ابھی ابھی پورے ہوش و حواس میں ہوں...... اور کوئی ناٹک نہیں کر رہی ہوں۔ میں کینسر وارڈ کی اس عورت کی طرح یہ نہیں کہوں گی کہ دیدار کر لو اور گواہ رہنا کہ یہ کبھی تھا...... موجود تھا...... دیکھو یہ محض سڑے ہوئے گوشت کا بدبودار، جھولتا ہوا لوتھڑا رہ گیا ہے ——— اندر اندر مواد سے بھرا ہوا ہے۔ کیا تم اس سے محبت کر سکو گے...... اور اسے دیکھ کر محسوس کر کے مجھ سے......؟"

○○

اس رات ایلس نے چپکے سے ڈاکٹر کی نظر بچا کر ڈائری میں لکھا۔ زندگی صرف بھلی بھلی ہی اچھی لگتی ہے۔ شاید یہ بات سب کے ساتھ ہے۔ حسین، دلفریب، خوبصورت مناظر اور توبہ شکن پُرکشش جسم...... اپنی لٹکتی جھولتی مواد رستی چھاتیوں کو تکتی ہوں تو مجھے نفرت محسوس ہوتی ہے۔ ابھی اس نفرت کو جی سے لگا کر رکھنا چاہتی ہوں...... اس نفرت کے اگنے تک جینے کی خواہش کو برقرار رکھنا چاہتی ہوں۔ اشرف ناامید ہو گئے ہیں۔ مجھے لے کر وہ وطن واپس لوٹ رہے ہیں۔ شاہانہ، مسز گرور اور اپنا گھر...... سب مجھے بے صبری سے یاد آ رہے ہیں۔ اپنا شہر اور اپنے گھر کی بات ہی دوسری ہوتی ہے......"

(۷)

ڈاکٹروں کے مطابق اس کا بریسٹ کینسر اب تھرڈ اسٹیج میں پہنچ گیا ہے۔ یعنی جینے کے چانس بہت کم رہ گئے ہیں۔ امید، دھندلی سی امیدوں پر وہ زندہ نہیں تھی۔ وہ فخر سے کہتی تھی۔ یہ کتابیں...... ان کتابوں نے مجھے زندہ رکھا ہے...... وہ ذرا بھی خود کو چلنے پھرنے کے قابل محسوس کرتی تو مسز گرور کے یہاں پہنچ جاتی۔ وہاں وہ جتنی دیر بیٹھتی، آل انڈیا گائناکالوجی سوسائٹی اور

بریسٹ کمیٹی کی رپورٹ کا مطالعہ کرتی پھر مسز گروور سے جرح کرتی...... مسز ہار کر کہتیں۔ ''ایلس تم میں زندگی بہت ہے۔'' پھر ان کی آواز بھاری ہو جاتی...... ''میں تمہارے لئے پریئر کرتی ہوں میری بچی......'' مسز گروور کی آنکھیں نمناک ہو جاتیں۔

وہ دھیرے سے ہنس پڑتی۔ ''مسز گروور میں نے عالیشان مکان میں نہیں، عالیشان کتابوں میں پناہ ڈھونڈی ہے...... جینا جانتی ہوں مسز گروور......''

لیکن شاید بہت دور تک چلتے چلتے وہ ہانپ گئی تھی۔

(۸)

وہ دن بہت عام سا نہیں تھا۔

اور یہ سچ تھا کہ کئی دن سے مسلسل سوچ کر رہ گزر پر چلتے چلتے وہ ہانپ گئی تھی۔ ایلس کو احساس تھا کہ اب بہت کم وقت رہ گیا ہے۔ مٹھی بھر بھی نہیں، جب اچانک ایک پل میں آنکھیں بند ہوں گی تو پھر نہیں کھلیں گی۔ تب جانے وہ کہاں ہوگی پتہ نہیں، آنکھیں موند جانے کے بعد اس کے پیٹھ پیچھے جو بھی ہو رہا ہے، اس کے دیکھنے کا عمل باقی رہتا ہے یا نہیں...... شاید وہ بھی کچھ دیکھنا چاہتی تھی۔ ممکن ہے یہ کہ اشرف کیسے رہتے ہیں، شاہانہ کس طرح زندگی گزارتی ہے۔

وہاں پُراسراریت کے جنگلوں کو ہوا کی طرح عبور کر جاتی۔ کوئی شئے ہے جس نے ابھی تک اسے مضبوطی سے تھام رکھا ہے...... آخر وہ شئے کیا ہے...... کتابیں...... نہیں وہ نہیں مان سکتی۔ یہ کچھ اور بھی ہے...... ممکن ہے حقیقت کی تلخی کو وہ اپنی پناہ میں لینے سے خوف کھاتی ہو...... مگر نقاہت، چھاتی سے رسنے والے مواد، گوشت کے لوجھڑ چت کوبرے، تفتیش کے ہر نئے عمل سے باہر نکل کر وہ صرف یہی سوچ رہی ہے، ایلس راتیں اتنی لمبی کیوں ہوتی ہیں؟''

لیکن تعجب...... اس روز رات مختصر ہو گئی اور دن ایسا یک خاص تجربے کے لئے ودیعت کیا ہوا نظر آیا۔

OO

اس دن وہ صبح سویرے ہی اٹھ گئی۔ آنکھوں کے آگے سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ اس نے پاس لگے آئینہ میں چہرہ دیکھا۔ خود کو پہچاننا چاہا۔ اپنی بکھرے بکھرے سے بیمار زدہ وجود کو دیکھا۔ پھر جیسے خود سے بڑبڑائی...... کیوں، بہت بیمار لگتی ہوں نا، ایلس۔ مرتے وقت لوگوں کو دھوکہ دینا

چاہتی ہوں کہ بیمار کہاں تھی...... ابھی سب سوئے پڑے ہیں۔ ۸ بجے شاہانہ کی بس آتی ہے......
ساڑھے چھ بجے سے پہلے اشرف اور شاہانہ میں سے کوئی بھی نہیں جاگتا...... سب سے پہلے اشرف
جاگتے تھے۔ گھڑی کا الارم سن کر...... پھر شاہانہ کو جگاتے...... ٹوسٹ گرم کرتے، آملیٹ بناتے،
ٹفن تیار کرتے، کتابیں کھوجتے اور شاہانہ کا ہاتھ پکڑ کر بس تک چھوڑ جاتے۔ اب اس کی جگہ یہ سارا
معمول اشرف نے سنبھال لیا تھا۔ اس نے سوچا آج کا دن خدا نے اسے ودیعت کیا ہے۔ وہ اس
دن کا بھرپور استعمال کرے گی۔

کپڑوں کی الماری سے اس نے اپنے لئے ایک نفیس ساڑی کا انتخاب کیا۔ پھر اس
سے میچ کرتا ہوا بلاؤز لے کر باتھ روم کی طرف بڑھ گئی...... ایک نئے احساس نے جسم کی نقاہت
بھلادی تھی...... باتھ روم کا دروزہ بند کر کے اس نے سارے کپڑے ایک ایک کر کے اتار دیئے۔
ایک لمحے کو وہ ٹھہری۔ ہاں، وہ دبلی ہوگئی ہے۔ یہاں سے۔ اور یہاں سے...... ناف کے اوپر
کا حصہ اور...... یہاں تک...... جانگھوں پر سے جیسے گوشت کی پرت اتر گئی...... بس ایک سال میں
کشش نام کی دھوکہ باز چڑیا اس سے اپنا رشتہ توڑ کر اڑ گئی۔ اس نے سوچا...... رات کے وقت پہلو
بدلتا ہوا اشرف......''

دھیرے دھیرے جسم پر ہاتھ پھراتے پھراتے وہ ٹھہر گئی۔ آگ اچانک برف کی طرح
سرد کیوں ہے؟ ایک بے حس، بیمار زدہ عورت اس میں کروٹ لے رہی تھی......

''مجھ میں زندگی کیوں نہیں ہے......؟''

''اپنی حرارت گرمجوشی میں کہاں بھول آئی ہوں......؟''

OO

وہ غسل کر کے اٹھی تو ایک نئی عورت کے ساتھ شادابیوں سے لبریز تھی۔ شاہانہ کو دیر تک
پیار کرتی رہی۔ اس کو چوما، گالوں کو سہلایا—— شاہا نہ میری بچی، میرا پیار،

شاہانہ ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ فق ہورہا تھا۔

''ممی اب میں تمہیں تنگ نہیں کروں گی۔ میں جانتی ہوں، تم بیمار ہو۔''

''پگلی'' اس نے پھر پیار سے لپٹایا۔ چہرے پر انگلیوں سے لکیر بناتی ہوئی بولی۔ ''میں
بیمار نہیں۔ دھوپ ہوں! آنگن سے دھوپ کیسیا تر جاتی ہے۔ ویسے ایک دن میں بھی کھو جاؤں گی۔

مگر مجھے کھو جنا مت...... جو چیز گم ہو جائے اس کا غم مت کرنا......"

اس روز، وہ سارا دن شاہانہ سے کھیلتی رہی۔ اشرف بھی اس دن آفس نہیں گئے۔ سارا دن اسے گھورتے رہے...... اس دن وہ بہت کم بولے۔ بار بار پلٹ کر اپنی تیز نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیتے تھے۔ سارا دن وہ ایسے ہی گم سم رہے۔

○○

رات ہو گئی۔ شاہانہ کو سلا کر وہ چپکے سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ اشرف سگریٹ پی رہے تھے۔ اس نے سگریٹ اس کے ہاتھوں سے چھین لیا...... پھر ایش ٹرے میں آگے بڑھ کر سگریٹ بجھا دی...... پھر دھیرے ہنسی......

"سنو، میں کیسی لگ رہی ہوں......؟"

سارا دن چپ رہنے کے بعد اشرف تیز آواز میں بولے "ایلس مجھے جینے دو ایلس......" وہ کانپتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔

"میں کب جینے نہیں دے رہی ہوں۔" پیار سے ہاتھ پکڑ کر اس نے اپنی طرف کھینچا...... جینے پر سب کا اپنا حق ہوتا ہے، اشرف...... جینے کا حق میں کہاں چھین رہی ہوں۔"

"پھر یہ الجھی الجھی باتیں کیوں کر رہی ہو...... آج جو دن بھر کرتی رہیں، وہ سب کیا تھا؟"

"مجھے لگا، بس آج کا دن ملا ہے مجھے" وہ کھلکھلائی...... "ایک پورا دن...... ہزاروں لاکھوں سیکنڈ...... کئی کئی گھنٹے...... وہ گرم ہوا کے تھپیڑے کی طرح گزر گئے...... میں گم ہو رہی ہوں اشرف!"

اس نے کپکپا دینے والی سانسوں کی ہلچل سنی۔

"سنو، تم مجھے یاد نہیں کرو گے۔"

وہ پلٹ کر بولی۔ "ایک چیز جو نہیں ہے، اسے یاد کرنے اور جذباتی ہونے سے کیا حاصل؟" وہ رک رک کر سانس لے رہی تھی۔ "میرے پاس شاید بہت کم وقت ہے۔ میں آج کی رات کو یادگار بنانا چاہتی ہوں۔ یاد کرو ایک سال سے تم نے مجھے چھوا نہیں...... چھونے کی کبھی خواہش نہیں ہوئی نا...... وہ ہنسی۔ چھونے سے پہلے ایک ڈرپوک مرد تم میں جاگتا ہو گا جسے مجھے

چھونے سے گھن آتی ہوگی۔"

اشرف نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

اس نے حکم صادر کرتے ہوئے کہا۔"چلو، کپڑے اتارو، میری بیماری سے مت ڈرو۔ تم گھبرا رہے ہو۔ نہیں میں سڑ نہیں گئی ہوں۔ تمہارا ساتھ دے سکتی ہوں۔ اتنا ول پاور بچا ہے میرے پاس۔"

وہ خود ہی آگے بڑھی۔ اشرف کے کپڑوں کے بٹن میں اس کی انگلیاں الجھ گئیں۔ ایک سرسراہٹ ہوئی، ایک سنسنی سی اندر تیر گئی——

وہ آہستہ آہستہ اس پر پھیلنے لگی۔"—— ہاں، پہلے مجھے لگتا تھا کہ تمہارے ہاتھ خوبصورت نہیں ہیں—— تمہارے یہاں سے...... یہاں تک کا حصہ، وہ سینے پر انگلیوں سے شگاف ڈال رہی تھی...... بدصورت ہے...... دیکھونا، کتنی مدت بعد تمہارے اس گلستاں کی سیر کر رہی ہوں۔ میں غلط تھی اشرف۔ تمہارے بدن میں کسی حسین عورت کے خطوط کی طرح گداز اور پیچ موجود ہیں۔"

وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ اشرف نے بوکھلا کر سانپ کی طرح سرسراتے اس کے ہاتھوں کو دیکھا—— وہ سرکا—— پیچھے ہٹا۔"نہیں...... خدا کے واسطے...... نہیں ایلس۔"

"بس اپنی موجودگی کا گواہ رہنے تک۔" اس نے انگلیوں کا رقص بدستور جاری رکھتے ہوئے کہا۔" آج تم وہی کرو گے جو میں چاہوں گی۔ اس کے بعد نہ میں چاہوں گی اور نہ اس کے لئے موجود رہوں گی، ہاں تم ہو گے تمہاری دنیا ہوگی، اور تم اپنی ضرورتوں کے لئے آسمان میں سیر کرتی چڑیوں کی طرح آزاد ہو گے۔ چلو مجھے سیراب کرو......"

پھر وہ کسی ناگن کی طرح لہرائی، سمندر کی طرح گرجی اور کسی سیلاب زدہ ندی کی طرح بہتی چلی گئی۔

(۹)

قارئین! اس کے بعد کہانی بہت کم بچی ہے۔

ایلس مرگئی۔ شاید اسے اپنے مرنے کا علم ہو گیا تھا۔ اس رات کے بعد ایک رات اس کی زندگی میں اور آئی...... مگر وہ بے لذت اور بستر مرگ پر کروٹیں بدلتے ہوئے مریض کی آخری

شکی طرح ہولناک اور اذیت ناک تھی...... پھر ایلس ہمیشہ کے لئے بادلوں میں کھوگئی۔ اس شب مرنے سے پہلے کچھ لمحے کی مہلت نکال کر وہ اپنی خواب گاہ کی میز پر کچھ لکھ رہی تھی......

''میں موت کو دیکھنا چاہتی تھی...... اس لئے اس کے بارے میں دسیوں طرح کے پُراسرار تصور آنکھوں میں سجائے تھے...... میں جینے کی طرح جیئی اور مرنے کی طرح مرگئی۔ میں اپنے سانس سانس کو بٹور کر اس میں زندگی رکھ کر جینا چاہتی تھی...... مرنے سے پہلے میں تشنہ نہیں رہنا چاہتی تھی...... مجھے خوشی ہے۔ میں تشنہ نہیں رہی۔ میں نے شاہانہ کو کبھی بے بس اور لاچار نہیں سمجھا...... اس لئے کبھی اسے اپدیش نہیں دیا۔۔۔۔ کسی کے چلے جانے سے کوئی بدنصیب نہیں ہوجاتا...... (کاٹی ہوئی لائن)...... زندگی جس کے پاس ہے...... (پھر کاٹی ہوئی)...... اس میں اس کے ہونے کا احساس ہی اس نیا کو پار لگا سکتا ہے۔ اشرف پر بھی ترس نہیں آتا۔ می جانتی ہوں۔ (حرف موٹے ہوگئے ہیں) اپنی سب طرح کی ضرورتوں کے لئے خواہ وہ مرد ہو یا عورت، غلام نہیں ہے...... وہ اس ضرورت کو کسی نہ کسی طرح پورا کرلے گا...... میں دونوں کی طرف سے مطمئن ہوں۔ دونوں کے سامنے زندگی کے دھارے کھلے ہیں تاوقتیکہ موت نہ آجائے...... ایک انجانے سفر پر نکلتے ہوئے اپنے تجس کو زندہ رکھنا چاہتی ہوں میں۔ یا یوں کہیں کہ میں چاہتی ہوں...... (کچھ سطر کاٹی ہوئی) پتہ نہیں انجانے سفر میں انسان کو کیسا لگتا ہوگا اور یہی چیز مجھے مطمئن کررہی ہے۔''

اس کے بعد حروف ترچھے ہوگئے۔ جیسے لکھتے لکھتے قلم کی نب ٹوٹ گئی ہو...... یا ہاتھ کانپنے لگے ہوں۔ ایک چھوٹی سی لکیر کے ساتھ عبارت ختم ہوگئی تھی۔

○○○

غلام بخش

وہ غلام ملک میں پیدا ہوا۔ اس لئے باپ نے اس کا نام ہی غلام بخش رکھ دیا۔

مجھے یقین ہے، مرنے سے پہلے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ کچھ بتانا چاہتا تھا۔ لیکن اس سے پہلے ہی وہ مر گیا ـــــ وہ بوڑھا تھا ـــــ قبر میں پیر لٹکائے بیٹھا تھا ـــــ اسے مرنا تھا اور وہ مر گیا ـــــ ممکن ہے اس کے مرنے کا یہی اندازہ لگایا جائے اور ایک بے حد معمولی سا آدمی، جس کے آگے پیچھے کوئی نہیں، اس کے بارے میں زیادہ سوچنے یا غور کرنے کی فکر ہی کس کو ہے...... وہ جیے یا مرے، کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ جیا بھی تو بیکار اور مر گیا تو مر گیا ـــــ حد تو یہ ہے کہ جہاں وہ کام کرتا تھا وہاں بھی اس کے بارے میں یہی رائے تھی ـــــ اور اس لئے جب میں نے کتابوں کے سیکشن کے انچارج شری واستو کو بہت زیادہ کریدا تو، فائل بند کر کے اور میز پر ایک طرف رکھ کر وہ غور سے میری طرف دیکھنے لگے۔

''ہاں بھائی ہاں...... وہ مر گیا...... لیکن وہ زندہ کب تھا......؟''

●●

مجھے لگتا ہے، میں نے کہانی غلط جگہ سے شروع کر دی۔ لیکن اتنا طے ہے کہ اپنے آخری وقت میں وہ مجھے کچھ دکھانا یا بتانا چاہتا تھا اور چونکہ دکھانا یا بتانا چاہتا تھا۔ اس لئے اس کی موت میرے لئے معنی رکھتی ہے۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ اپنے وجود میں برسوں کی پُر اسرار خاموشی رکھ کر، چپ چپ، خود سے باتیں کرنے والا غلام بخش کچھ کہنے کے لئے منہ کھولے...... اور کچھ بتانے سے قبل ہی ہمیشہ کی نیند سو جائے ـــــ اس کے اندر اگر 'یہ بہت کچھ' بھرا نہ ہوتا تو سچ کہوں، مجھے بھی

اس کے مرنے کا اتنا غم نہ ہوتا...... اس مشینی دور میں آنکھیں کھولی ہیں نا ___؟ اتنا تو اثر ہونا ہی چاہئے ___ قدم قدم پر موت، حادثے ___ موت کب، کیسے نکل کر اچانک سامنے آکر دبوچ لے گی، کون کہہ سکتا ہے۔ اچانک کسی بھی لمحے آکر چونکا دے گی ___ لو آ گئی ___ اب بولو ___؟ مرنے کے واقعات اور حادثات کی یورش نے پتھر جیسا بے حس بنا دیا ہے مجھے ___ لیکن اس کے باوجود غلام بخش کی موت کو میرا دل عام واقعہ یا حادثہ ماننے کو قطعی تیار نہیں۔

جی ہاں صاحب، آپ مانیں چاہے نا مانیں، وہ واقعی بہت اہم تھا ہمارے لئے اور یقین جانئے صاحب، وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ سے زیادہ پُراسرار آدمی تھا ___ فرق صرف اتنا تھا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ چونکہ پاگل اور خبطی تھا، اس لئے وہ بول بول کر، چیخ چلا کر، اپنی حرکتوں سے اپنی باتیں کہہ ڈالتا تھا اور یہ بوڑھا خبطی ___ اسے تو دین دنیا سے کوئی مطلب ہی نہیں تھا۔ ہمیشہ خود سے باتیں کرنے والا۔ بڑبڑ کرنے والا، کبھی من ہی من میں ہنسنے لگتا۔ کوئی آتا تو گیٹ کھولتا۔ اس کی طرف دیکھتا۔ لیکن خود سے باتیں کرنا جاری رہتا۔ ایسا بھی ہوتا کہ گیٹ سے اندر آنے والے اجنبی نے اس سے کچھ پوچھا ہوتا لیکن جواب دینے کے عمل میں بھی اس کی وہی بڑبڑاہٹ جاری رہتی۔ اجنبی کی کھسیاہٹ کو دائیں طرف کرسی پر بیٹھنے والے شری واستو جی دور کرتے۔

'ادھر آجایئے۔ وہ کچھ بھی نہیں بتا سکے گا۔' اس تیز جملے پر بھی یہ نہیں ہوتا کہ غلام بخش چونک کر شری واستو یا اجنبی کی طرف دیکھتا ___ جی بالکل نہیں۔ وہ اپنی دنیا میں مگن رہتا۔ من ہی من بڑبڑاتا ہوا۔ پہلی بار لگا تھا، جیسے اس کے اندر قصے کہانیوں کا عجیب وغریب سنسار ہو ___ ایسا سنسار جسے مجھے فوراً لپک لینا چاہئے۔ اچک لینا چاہئے۔ سچ کہوں تو پہلی بار میں ہی غلام بخش کی طرف متوجہ ہوا تھا ___ پھر آپ یقین نہیں مانیں گے، میں صرف اور صرف اسی کے لئے آتا رہا۔ برابر۔ ہر دو چار دن کے بعد۔ چاہے کام ہو یا نہ ہو، شری واستو کی سامنے والی کرسی پر بیٹھ جاتا اور اس کی حرکات وسکنات کا جائزہ لیتا رہتا۔ گرمیوں کے موسم میں اسے مکھیاں بھی تنگ کرتیں۔ مگر جیسے اسے کسی بات کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ کہاں بیٹھتی ہیں۔ کہاں تنگ کرتی ہیں۔ وہ تو اپنی داستانوں میں اتنا الجھا یا کھویا ہوتا کہ ان بیکار کی باتوں یا مکھیاں 'ہکانے' کے لئے اس کے پاس وقت ہی نہیں تھا۔

ٹھہریئے۔ ابھی بھی بہت سی باتیں رہ گئی ہیں جو ضروری ہیں اور میں نے ابھی تک جن کی وضاحت نہیں کی ہے اور وضاحت کے بغیر بوڑھے غلام بخش کو سمجھنا آسان بھی نہیں ہے۔

یہاں یہ بات ضروری ہے کہ بوڑھے غلام بخش سے اپنی ہمدردی یا خود غرضی کی بھی وضاحت کرتا چلوں، تو اس لمبی تمہید کے لئے معذرت!......اب میں اصل واقعے پر آتا ہوں، لیکن اس سے پہلے مختصر سا اپنا تعارف بھی کرانا ضروری ہے۔

●●

میں یعنی اظہر بائجان، ایک معمولی سا ادیب ہوں، — یہ بائجان کہاں ہے؟ کیا ہے؟ مجھے خود نہیں پتہ، مگر جب مستقبل کو گولی مار کر، لکھنے اور وہ بھی اردو میں لکھنے کا جنون سوار ہوا تو اپنے اچھے بھلے نام اظہر کلیم سے کلیم کو علیحدہ کر کے بائجان جوڑ لیا — گو کہ اس کے معنی کچھ نہیں، لیکن یہ نام چونکانے کے لئے کافی ہے اور اس سے خاصا انوکھے پن کا بھی گمان ہوتا ہے۔ لیکن یہاں میں اپنے نام کے انوکھے پن کی تفصیل سنانے نہیں بیٹھا ہوں۔ جیسا کہ ظاہر ہو گیا، میں لکھتا ہوں اور مجھے لکھنے کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ یہاں ایک چھوٹی سی بات کی وضاحت اور بھی کرتا چلوں کہ ہر نئی چیز، ہر نئی بات کو انوکھے انداز میں لکھنے میں مجھے بڑا مزا ملتا ہے، لیکن آپ بہتر جانتے ہیں کہ فقط لکھنے سے، وہ بھی اردو میں لکھنے سے مستقبل کے گیسو نہیں سنوارے جا سکتے اور یہاں تو دھن تھی کہ بس لکھنے کو ہی ذریعہ معاش بنانا ہے — تو میں اظہر بائجان، یعنی ایک چھوٹے سے قصبہ نما شہر کا باشندہ، چھلانگ لگا کر، راجدھانی کی چوڑی چکلی سڑکوں پر آ کر ایک دم سے بھوت بن گیا۔

'جی ہاں۔ بھوت......'

بھوتوں کی مختلف دنیائیں ہیں، پتہ نہیں آپ کو سابقہ پڑا ہے یا نہیں — لیکن زندگی کے کئی معاملوں میں حقیقت چھپاتے ہوئے ہم بھوت بن جاتے ہیں — اور ایسے میں بھوت بنے رہنا ہی اچھا لگتا ہے — جیسے خواہش ہوتی ہے کوئی آپ کو پہچانے نہیں۔ جانے نہیں۔ جی ہاں جناب، ایسی بھی خواہش ہوتی ہے اور خاص کر ادب میں — روزی روٹی کے لئے آپ کو فرضی ناموں، گھوسٹ (بھوت) ناموں سے بھی کبھی کبھی رائٹنگ کرنی پڑتی ہے اور سچ مچ کا بھوت بن جانا پڑتا ہے۔ تو میں ایسا ہی بھوت بن گیا تھا۔ دلّی کی چوڑی چکلی سڑکوں نے آوارہ نڈھال قدموں کو راستہ بھی دکھایا تو رائل پبلشنگ ہاؤس کا۔ جو کتابوں کا ایک بڑا نامی گرامی ادارہ تھا اور جہاں فرضی ناموں سے لکھنے والوں کا ایک پورا ٹیبل موجود تھا۔ جب راجدھانی میں گنے چنے پریس

عجب عجب کرتا رہے گا جیسے کچھ جانتا نہیں، کسی سے کوئی مطلب نہیں۔ لیکن ذرا اس کے سامنے پاکستان کا نام لے کر دیکھئے ــــــ کیسے سن لیتا ہے اور خوش ہوتا ہے......"

"اچھا......" یہ میرے لئے حیرانی کی بات تھی۔

اور اس سے پہلے کہ میں نوین صاحب والا واقعہ بیان کروں، میں آپ کو بتا دوں کہ شری واستو جی کی بات مان کر میں نے وہ تجربہ بھی کیا اور یقین جانیے۔ اس کی آنکھوں میں پہلی بار بچے جیسی چمک اور خوشی کا رنگ نظر آیا۔

"پاکستان......"

"تم پاکستان میں رہتے ہو......؟"

"تمہارا پاکستان میں کوئی اب بھی رہتا ہے......؟"

"پاکستان جانا چاہتے ہو......؟"

"پاکستان تمہیں بے انتہا پسند ہے......؟"

وہ خود سے اڑم بڑم کرتا، میری طرف دیکھ کر بچوں کی طرح مسکرائے جا رہا تھا۔ بس کوئی جواب نہیں۔ اس کی بڑبڑاہٹ جاری تھی اور اس سے پہلے کہ میں اپنے طور پر غلام بخش کے بارے میں کوئی نظریہ قائم کروں نوین صاحب نے مجھے ایک بالکل نئی دنیا میں پہنچا دیا تھا۔

●●

تب آزادی نہیں ملی تھی۔ نوجوانوں میں گاندھی جی اور آزادی کا جوش ضرورت سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ چرخہ کاتنے والے گاندھی جی کی تصویر غلام بخش کے اندر ہی اندر بس گئی تھی۔ سودیسی آندولن کا نعرہ ہو یا انگریزو بھارت چھوڑو ــــــ غلام بخش کے نوجوان ہاتھ بھی فرنگیوں کے خلاف اٹھ گئے۔ یہ پڑھائی کی عمر تھی ــــــ غلام بخش کا باپ کریم بخش تھا جو مولا حویلی تاج بخش کے پاس رہتا تھا۔ یہ جگہ پرانی دلّی کے علاقے میں تھی۔ آج یہ جگہ چتلی قبر اور بلی ماران کی نئی نئی دکانوں اور عمارتوں کے بیچ کہاں گم ہو گئی۔ اسے کھوجنا مؤرخ کا کام ہے۔ کریم بخش کچھ زیادہ پڑھے لکھے تو نہیں تھے۔ ہاں تھوڑی بہت عربی فارسی آتی تھی۔ اردو کے استاد تھے ــــــ بچوں کو پڑھا کر گزارا کرتے تھے اور مولا حویلی تاج بخش محلے میں تین کمروں کا چھوٹا سا مکان تھا۔ جو باپ دادا پردادا کے وقت سے چلا آ رہا تھا۔ کریم بخش کے تین لڑکے تھے۔ منجھلا تھا غلام بخش، بڑا مولا بخش اور چھوٹا

ظہور بخش۔۔۔۔ اس وقت تک پاکستان نہیں بنا تھا لیکن قائد اعظم کا بہت شور تھا۔ کریم بخش بھی اس وقت کے زیادہ تر مسلمانوں کی طرح مسلم لیگ کے اہم ممبر تھے اور قائد اعظم کے حق میں تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمانوں کا اپنا الگ ملک ہو۔۔۔۔ غلام بخش اس وقت نوجوان تھا۔ عمر 20-19 ہوگی۔۔۔۔ پتہ نہیں کیوں اسے ابا کی بات معقول نہیں لگتی تھی۔ گاندھی جی کی بات تو سمجھ میں آتی تھی کہ سب مل جل کر رہو۔۔۔۔ ملک کا بٹوارہ ہو جائے۔ ہندو مسلم دو حصوں میں بٹ جائیں۔ اسے کب گوارہ تھا۔ کریم بخش نے ''لے کے رہیں گے پاکستان'' کا نعرہ تو لگایا لیکن پاکستان کو بنتے ہوئے نہیں دیکھ سکے۔۔۔۔ کہتے ہیں ایک بار وہ کسی جلوس کے ساتھ نعرے لگاتے جا رہے تھے کہ برٹش سرکار نے گولی چلوا دی۔۔۔۔ مرنے والوں میں غلام بخش کا باپ بھی شامل تھا۔

فرنگی حکومت سے غلام بخش کی نفرت اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ ایک بار اسے معلوم ہوا کہ قریبی گیسٹ ہاؤس میں وائسرائے کی سواری رکتی ہے۔ اس وقت بہت سے ہندو مسلمان بم بنانا جان چکے تھے۔ غلام بخش نے خود اپنے ہاتھوں سے بم بنایا اور ایک بم وائسرائے کے کمرے کی طرف اچھال کر جو بھاگا تو 'بم پولیس' میں جا کر دم لیا۔ اندھیرے کا وقت تھا۔ شہر فرنگی جوتوں کی دہشت سے گھرا ہوا تھا۔ یہ جگہ ریلوے کراسنگ کے پاس تھی۔ جہاں بڑے بڑے بے حیا کے درخت تھے اور چاروں طرف موت پاخانے کی تیز بدبو...... کہتے ہیں فرنگی گولی کے ڈر سے غلام بخش اسی گوموت یعنی 'بم پولیس' میں ہفتوں پڑا رہا۔ اسے یہ بھی خوف تھا کہ پولیس اس کی تلاش میں ہوگی اور صبح اس جگہ میدان کرنے والوں کی ٹولی آجائے گی۔ جیسے تیسے پورے ایک ہفتہ تک وہ اس بم پولیس میں ادھر ادھر چھپتا رہا۔

یہ اسی زمانے کی بات ہے جب انگریزوں نے ''ڈیوائڈ اینڈ رول'' فارمولے کے تحت ہندو مسلمانوں کو آپس میں لڑا دیا تھا اور ملک میں چاروں طرف ہندو مسلمان کٹ کٹ کر گرنے مرنے لگے تھے۔ پھر جب پاکستان بنا تو عدم تحفظ کے احساس سے دو چار مسلمانوں نے پاکستان جانے میں ہی بھلائی سمجھی۔ غلام بخش کا علاقہ بھی دہشت کی لپیٹ میں تھا۔ پاکستان چلنے کا اعلان ہوا تو بڑے بھائی مولا بخش نے غلام بخش کو بھی چلنے کے لئے کہا۔ غلام بخش راضی نہیں ہوا تو اس نے سمجھایا۔

''مکان کا موہ چھوڑو۔ پرانی دلی کا حشر بھی بُرا ہونے کو ہے۔ وہاں چل کر کسی اچھے سے مکان پر تالا لگا دیں گے۔''

غلام بخش پھر بھی چلنے کو راضی نہیں تھا۔ بڑے بھائی نے بڑی مشکل سے دونوں بھائیوں کو راضی کیا۔ اس وقت تک مولا بخش کی بیوی آ چکی تھی اور اس کا ایک چھوٹا سا بچہ بھی تھا۔

●●

لاہور تو آ گئے پر مکان کا ملنا اب بھی نہیں ہوا تھا۔ مکان ڈھونڈھا بھی تو غلام بخش نے ___ اور بڑی مشکل سے دوڑ بھاگ کے بعد ایک بہتر سا مکان نظر آیا۔ بھائیوں کو خبر کی۔ بھائی آئے۔ خوش ہوئے۔ قاعدے سے اس مکان پر تو غلام بخش کا ہی حق ہونا چاہئے تھا۔ مگر مولا بخش کی بیوی نے ایسا ہونے نہیں دیا ___ مکان بڑا ضرور تھا لیکن نصیبن چاہتی تھی کہ یہ مکان اس کے حصے میں رہے ___ سو اس نے اپنے میاں کو پڑھانا شروع کیا کہ اگر یہ بھائی زیادہ دن تک یہاں ٹکے رہے تو یہاں بھی بٹوارے جیسی صورت حال پیدا ہو جائے گی اور جو یہاں بھی اس مکان کے تین حصے لگ گئے تو سوچو بچے گا کیا ___ دونوں بھائی تو کنوارے ہیں۔ کچھ بھی نہیں جائے گا۔ لیکن اس کی تو گھر گرہستی ہے۔ اس لئے سوچنا بھی اسی کا کام ہے۔ مولا بخش نے دماغ لگایا تو بیوی کا شک صحیح لگا۔ بھائی کی نیت سے تو غلام بخش واقف ہو ہی چلا تھا۔ لیکن جب بھائی نے سیدھے طور پر مکان سے نکل جانے کو کہا تو اسے بھی تاؤ آ گیا۔ غصے میں بولا۔ جاؤ نہیں نکلتا ___ میرا مکان ہے۔ دخل بھی میرا ہے۔ پہلے میں نے دیکھا تھا ___ کہتے ہیں یہی وقت تھا جب پاگل پن کا ہلکا ہلکا دورہ غلام بخش کو پڑا تھا۔ بھائی سے ان بن ہو جانے کے بعد وہ بیٹھا بیٹھا بڑبڑاتا رہتا۔

"لے کے رہیں گے پاکستان
پاکستان میں ایک مکان
ایک مکان میں ایک دکان......
لے کے رہیں گے......پا......کس......تا......ن......"

کہتے ہیں بھیا اور بھابی سے دل ٹوٹنے کے بعد ادھر ادھر مکان کی تلاش میں بھٹکتا رہا۔ کراچی سے لاہور، لاہور سے کراچی...... بہت دنوں تک انار کلی میں بھی پھیری لگائی۔ دل نہیں لگا تو پرانے مکان کی تلاش میں ہندوستان واپس آ گیا اور پھر اس پر جیسے ہنسی کا دورہ پڑ گیا...... جس مکان کو 'منحلا' اور لاوارث چھوڑ کر بھاگا تھا۔ وہاں کسی دوسرے کا قبضہ ہو گیا تھا۔ بیچارے "ٹوبہ ٹیک سنگھ" کو تو یہ سوچ کر پریشانی ہوتی تھی کہ اس کا گھر پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں ___

لیکن اس سے بھی بُری حالت بیچارے غلام بخش کی تھی۔ اپنا گھر، اپنا دوار۔ وہ یہاں سے بھی گیا۔ وہاں سے بھی۔ بہت دنوں تک مولا حویلی تاج بخش کے اپنے گھر کے سامنے ڈیرہ ڈال کر وہ یہی گاتا پھرتا......

''لے کے رہیں گے پاکستان
پاکستان میں ایک مکان
ایک مکان میں ایک دکان''

کوئی پوچھتا...... ''کیوں میاں۔ پاکستان تو مل گیا، اب وہاں مکان کب لے رہے ہو، اور مکان میں دکان کب بنوا رہے ہو___؟''

غلام بخش گندی سی گالی بکتا___ اسی بھڑوے نے ہتھیالی۔ ورنہ دیکھا تو میں نے تھا۔

●●

'لیکن یہ سب باتیں؟' میں نے نوین صاحب کی طرف دیکھا...... 'آپ کیسے جانتے ہیں؟'

نوین صاحب نے میری طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھری___ بھائی، اس وقت تقسیم کا اثر سب کے دل و دماغ پر تھا۔ ہندو مسلم دنگوں نے تھوڑا بہت نقصان سب کو ہی پہنچایا تھا...... اور دلّی تو دل کھول کر لٹی برباد ہوئی تھی۔ اس لئے جب یہ وقت کا مارا روزی روٹی کو ترستا، پاپا کے پاس پہنچا اور پاپا نے اس کی کہانی سنی تو فوراً رکھ لیا___ اب مدت گزر گئی۔ مرنے سے پہلے پاپا نے مجھ سے بھی کہا تھا___ غلام بخش کو نکالنا مت۔ بے ضرر انسان ہے۔ باہر اسٹول پر پڑا پڑا چوکیداری ہی تو کرتا رہتا ہے۔ نہ کسی سے لڑتا جھگڑتا ہے۔ اس لئے میں نے بھی رہنے دیا۔

نوین بھائی نے میری آنکھوں میں جھانکا___ دراصل اس کی بڑبڑاہٹ تو ادھر پانچ ایک برسوں میں شروع ہوئی۔ مکان نہیں ملا تو کھوجتے کھوجتے اس کی ملاقات رحمان درزی سے ہوئی۔ جن کی آنکھوں کی بینائی کمزور پڑ گئی تھی اور جواب سینے پرونے کا کام کرنے کے لائق بھی نہیں تھے۔ غلام بخش انہیں رحمان چاچا کہتا تھا۔ رحمان کے پاس اپنا ایک ٹوٹا پھوٹا سا مکان تھا۔ رحمان کریم بخش کے پکے یاروں میں تھا اور ایک نمبر کا مسلم لیگی۔ سو رحمان نے اسے اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ کچھ دنوں کے بعد ہی رحمان مر گیا اور یہ مکان بھی ایک طرح سے غلام بخش کا ہی ہو گیا۔ اب

تو اس مکان کی قیمت بھی کافی ہوگئی ہوگی۔ پاپا برابر کہتے رہے۔ مکان بیچ دو۔ اچھے پیسے مل جائیں گے۔ مگر غلام بخش کو پیسے کوڑی سے مطلب ہی نہیں تھا۔

••

مجھے معاف کیجئے میں جہاں سے چلا تھا۔ پھر وہیں لوٹ رہا ہوں ___ آخر اس پرانی ہوچکی داستان میں ایسا کیا ہے۔ میں جسے لکھنے کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں ___ تقسیم، ہجرت، فساد، کچھ کہانیاں تو وقت کی زنبیل میں کب کی دفن ہوگئیں ___ پھر اس پرانی پڑ گئی راکھ کو کریدنے سے فائدہ ___؟ لیکن صاحب، راکھ کے اسی ڈھیر کو کریدا جاتا ہے جہاں سے کچھ ملنے کی توقع ہوتی ہے۔

نوین بھائی نے آگے بتایا۔ ان دنوں ہندوستان پاکستان میں جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ ہر طرف جنگ کے تذکرے تھے۔ اس وقت پاپا دفتر میں ہی بیٹھے تھے۔ اچانک اسٹول پر بیٹھے بیٹھے غلام بخش لپکتا ہوا پاپا کے پاس آیا ___ پہلے تو وہ سمجھے کہ پیسوں کے لئے آیا ہوگا۔ جیب میں ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ غلام بخش نے روک لیا۔ نہیں جی پیسے نہیں چاہئیں۔

''پھر......''

''میں کیا کروں جی......؟''

پاپا نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔ غلام بخش نے سوالیہ آنکھوں سے پاپا کی آنکھوں میں جھانکا ___ یہ جنگ ہو رہی ہے جی۔ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میرا مکان تو ہندوستان میں بھی چھن گیا۔ پاکستان میں بھی ___ یہ آفس والے چھیڑتے ہیں جی۔ کہ ہندوستان، پاکستان پر بم گرائے گا۔ اچھا گرائے گا جی۔ مان لیا۔ پھر مجھے کیا کرنا چاہئے اور اگر پاکستان ہندوستان پر بم گراتا ہے جی، تو مجھے کیا کرنا چاہئے۔

پاپا نے زور سے ڈانٹا ''تم جا کر چپ چاپ اسٹول پر بیٹھ رہو اور کسی کی مت سنو۔''

''اچھا جی......''

وہ اسٹول پر جا کر بیٹھ گیا۔

میں دھیرے سے مسکرایا ___ 'دراصل وہ طے نہیں کر پا رہا تھا کہ اسے کہاں کے لئے ایماندار ہونا چاہئے اور یہی اس کی زندگی کا سب سے اہم پہلو ہے۔'

نوین بھائی ہنسے ـــــ پھر تو پاکستان کے نام پر وہ دفتر والوں کا مذاق بن گیا۔ کوئی پاکستانی کہتا۔ کوئی کہتا، پہلے تو صرف مکان ہی چھنا ہے۔ اس بار جاؤ گے تو کھدیڑ دیئے جاؤ گے۔ ہندو پاک کے درمیان کرکٹ کا میچ چلتا تو وہ کھسکتا ہوا ٹرانزسٹر کے قریب آ جاتا۔ پھر پوچھتا۔ پاکستان کے کیے رن ہوئے جی۔ پاکستان جیتے گا نا جی۔ ایسا باؤلا ہو گیا تھا۔

نوین بھائی نے ٹھہر کر کہا۔ شری واستو کی میز کے پاس تم نے نجمہ بین کو دیکھا ہوگا۔ پتہ نہیں کیا بات تھی۔ نجمہ کو بہت مانتا تھا۔ جب شروع شروع آئی تھی۔ تب سے جو بھی کھانے کی چیز خریدتا، نجمہ کے پاس لے کر پہنچ جاتا ـــــ جب آفس والوں نے نجمہ کو چڑانا شروع کیا تب ایک بار نجمہ نے اس کا ٹھونگا پھینک دیا تھا ـــــ تب سے ایسا ناراض ہوا کہ نجمہ کو دیکھتا بھی نہیں۔ تم کیا جانو۔ اس کے اندر کتنا غصہ ہے ـــــ اتنا غصہ جسے وہ اپنی مستقل بڑبڑاہٹ میں تھوڑا تھوڑا کر کے نکالتا رہتا ہے۔

''چائے پئیں گے آپ؟''

نوین بھائی نے میری طرف دیکھا۔ بس جو معلوم تھا بتا دیا۔ ہاں ایک چھوٹی سی بات اور رہ گئی۔ آخر وقت میں اس نے پاپا کو بہت تنگ کیا۔ جب تب کہتا، پاکستان بھیج دو۔ جب پاپا کی ارتھی اٹھی تب بھی وہ آنگن میں ایک طرف بیٹھ کر وہی پرانا گیت الاپ رہا تھا۔

''لے کے رہیں گے پاکستان
پاکستان میں ایک مکان
ایک مکان میں ایک دکان''

میں خود اسے پکڑ کر کنارے لے گیا اور سمجھایا ـــــ ''چپ ہو جاؤ غلام بخش۔ پاکستان میں مکان بنوانے والا نہیں رہا۔ پاپا مر گئے ہیں۔ چپ ہو جاؤ۔'' پھر یوں ہوا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ بلک بلک کر۔ پہلی اور آخری بار ـــــ پھر میں نے اسے کبھی روتے ہوئے نہیں پایا۔ پتہ نہیں کم بخت کے اندر کتنی داستانیں بھری ہیں۔ اسٹول پر بیٹھا بیٹھا بڑبڑاتا رہتا ہے۔

●●

غلام بخش کی کہانی اتنی ہی تھی جتنی میں سنا چکا۔ بیچ کے واقعات میں کچھ نہیں۔ سوائے اس کے کہ وہ اسٹول پر بیٹھا بیٹھا بڑبڑاتا رہتا تھا اور میری خواہش تھی کہ اس کی بڑبڑاہٹ میں کسی

معنی خیز جملے کو دریافت کرسکوں۔۔۔۔۔ لیکن یہ میری بیوقوفی تھی۔ وہاں صرف سانسوں کے تھپیڑے تھے۔ جنہیں سمجھنا آسان نہ تھا۔ ہاں اب جو میں بتانا چاہتا ہوں۔ وہ بہت اہم ہے۔۔۔۔۔ جیسے یہ کہ مرنے سے کچھ دن قبل وہ ٹھیک ہو گیا تھا اور یہ ماننے کو کوئی بھی تیار نہیں کہ وہ گھوسٹ غلام بخش جو مرنے سے کئی عرصہ پہلے ہی مر چکا تھا۔۔۔۔۔ مجھے کچھ بتانا بھی چاہتا ہوگا۔۔۔۔۔ اور سچ کہوں تو اس کے اس طرح اچانک مرنے سے مجھے دھکا پہنچا تھا۔۔۔۔۔ اور وہ جن حالات میں مرا، مجھے یقین ہے وہ اپنے زندہ ہونے کی کوئی تو شہادت پیش کرنا چاہتا ہوگا اور اسی لئے میں کہتا ہوں کہ مرنے سے قبل وہ مجھے کچھ بتانا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ جیسے ایک ٹائر میں اگر بہت زیادہ ہوا بھر دیجئے تو وہ پھٹ سکتا ہے۔ لیکن تھوڑی سی ہوا چارج کر دیجئے، تو اس کے پھٹنے کا خوف نہیں رہتا۔۔۔۔۔ غلام بخش اپنے اندر سے تھوڑی بھی داستان نکال دیتا تو وہ بچ جاتا اور میرا زور اسی بات پر ہے کہ وہ اپنی داستان باہر نکالنے کے لئے تیار تھا۔

''تمہارا یقین ہے وہ تمہیں کچھ بتانا چاہتا تھا۔؟'' نوین بھائی چونک کر بولے۔

''ہاں......اس نے مجھے گھر چلنے کو کہا تھا۔''

''تم اس کے گھر گئے تھے؟''

میں اظہر بائجان، میں نے ٹھنڈی چائے منہ کے اندر انڈیلی۔۔۔۔۔ نوین بھائی کو غور سے دیکھا۔ پھر کہا۔۔۔۔۔ اب جو بتانے جا رہا ہوں۔ ممکن ہے آپ کو یقین نہ آئے اور آپ سن کر حیرت کریں۔۔۔۔۔ تو سن لیجئے۔ مرنے سے پہلے میں واقعی اس کے گھر گیا تھا۔۔۔۔۔ میں ایک لمحے کو رُکا۔ آپ کے پاپا ٹھیک کہتے تھے۔ وہ مکان جس جگہ ہے، اب اچھے داموں پر فروخت ہوگا۔ لیکن اب اس جگہ پر رحمان درزی کے بھائی بھتیجوں کا قبضہ ہو گیا۔ میں سب معلوم کر کے آیا ہوں۔ دراصل مجھے تجسس اس کے سامان کا تھا۔ کم بخت کے پاس یادگار کے طور پر کچھ تو ہوگا۔

''پھر کیا ملا......؟''

میں نے ان تجسس مزید بڑھایا...... ''آپ کو تعجب ہوگا۔ غلام بخش اپنے اس گھر میں مجھے نہیں ملا۔۔۔۔۔ بلکہ اپنے پرانے والے گھر میں......''

میں نے ٹھہر کر کہا۔ ''اچھا یہ بتایئے۔ مرنے سے 7-6 روز قبل کیا وہ دفتر آرہا تھا؟''

''نہیں......''

''آپ نے تلاش کیا؟''

''ہاں، ہم نے پیون بھیجا تھا۔ اس کے گھر۔ وہ نہیں ملا تھا۔''
''غلام بخش جیسا ایک بوڑھا آدمی وہاں نہیں ملا، کیا یہ تشویش کی بات نہیں تھی۔''
''تھی لیکن میں کیا کرتا۔''

''اب مجھ سے سنئے۔ وہ وہاں ملتا بھی کیسے۔ وہ تو اپنے پرانے گھر گیا تھا۔ جی ہاں اسی گھر میں جو مولا حویلی تاج بخش میں، کسی زمانے میں تھا اور جہاں آج کسی دوسرے کا قبضہ ہے۔''

نوین بھائی مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ''لیکن تم وہاں تک کیسے پہنچ گئے؟''

میں نے ایک بوجھل سانس لی ــــــ مجھے معلوم تھا۔ وہ وہیں مل سکتا ہے۔ چتلی قبر اور بلیماران کے علاقے میں وہ جگہ تلاش کرنے میں مجھے زیادہ پریشانی نہیں ہوئی۔ اب وہاں بالکل نئی عمارت ہے ــــــ عمارت کے مکین نے بتایا کہ ایک پاگل نما شخص آیا تھا۔ جو گھر اور گھر کے کمروں کی طرف اشارہ کر کے پتہ نہیں کیا کہہ رہا تھا۔ لیکن کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ان لوگوں نے اسے نکالنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن...... لیکن وہ گیا نہیں۔ دھنی مار کر باہر ہی جم گیا۔ ڈرانے دھمکانے پر بھی نہیں گیا۔ باہر برآمدے میں ہی سو گیا ــــــ جانتے ہیں ایسا کیوں ہوا ــــــ میں نے نوین صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں ــــــ ممکن ہے اچانک اسے خیال آیا ہو۔ کیا اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی وہ اپنے مکان کو اپنا مکان نہیں کہہ سکتا۔ بس۔ اس طویل دشمنی کی آخری جنگ لڑنے وہ اپنے اس مکان میں گیا تھا۔

''اس کے پاس سے کچھ برآمد ہوا؟''

'وہی بتانے جا رہا ہوں میں نے ٹھنڈی سانس چھوڑی ــــــ اس کے پاس تھا ہی کیا؟ جو ملتا۔ زندگی بھر کی کمائی بس ایک جھولا۔ کچھ پرانے کاغذ پتر، جس کی لکھائی اتنی دھندلی پڑ گئی تھی کہ کوئی مورخ ہی پڑھ سکتا تھا۔ ہاں کچھ چوڑیاں تھیں۔ ان چوڑیوں سے یاد آیا نجمہ بین سے اس کی والہانہ محبت کے پیچھے کوئی جذبہ کہانی کی شکل میں ضرور رہا ہوگا، جو اس کی موت کے ساتھ ہی راز، رہ گیا۔ بہر کیف اب میں جس چیز کی طرف آ رہا ہوں وہ یقیناً آپ کو بھی چونکا دے گی۔

نوین بھائی نے کرسی پر ــــــ کروٹ بدلی ــــــ

میں نے ان کے تجسس کا زیادہ امتحان لئے بغیر کہا۔ وہ چیز تھی ویزا۔ پاکستان جانے کا ویزا۔ جس پر حال فی الحال کی تاریخ پڑی تھی۔ آپ کہتے ہیں وہ ہوش وحواس کھو چکا تھا۔ مدتوں پہلے ہی مر چکا تھا۔ لیکن کیا مرنے سے پہلے وہ پاکستان جانے کا خواہش مند تھا۔ لیکن۔ کیوں؟

دراصل......

نوین بھائی مضحکہ خیز ہنسی ہنسے۔ ''ہوسکتا ہے وہ آدھی موت یہاں مر چکا ہو اور آدھی موت کے لئے۔''

''نہیں......'' میرا لہجہ اچانک تھوڑا سخت ہوگیا۔ یہیں پر آپ چوٹ کھا گئے نوین بھائی اور یہی غلام بخش کی کہانی کی سب سے سنسنی خیز اور آخری کڑی ہے۔ اب جو میں بتانے جارہا ہوں وہ بہت معمولی مگر بہت اہم ہے۔

میں نے ان کی آنکھوں میں جھانکا ___ 'یاد رکھئے، اس کہانی کا سب سے اہم حصہ غلام بخش کے آخری ایام ہیں۔ آخری وقت میں یہ احساس اس کے اندر پیدا ہوا تھا کہ یہ مکان کیا اتنے برسوں بعد بھی اس کا نہیں ہے؟ اس نے اپنے اس موروثی گھر کے لئے کوشش کی ___ ظاہر ہے گھر نہیں مل سکا ___ اس نے پاکستان جانے کا ارادہ کرلیا ___ ویزا تک بنوالیا ___ حقیقت یہی ہے کہ اس نے فوقیت اپنے مکان کو دی۔ وہ پاکستان گیا نہیں۔ کیونکہ یہ تلخ حقیقت اسے معلوم ہوگئی تھی کہ اب یہی اس کا گھر ہے اور اسے اسی گھر کے لئے کوشش کرنی ہے اور......'

میں اظہر بائیجان، میں نے گھوم کر نوین صاحب کی طرف دیکھا ___ جو سکتے کے عالم میں میری طرف دیکھ رہے تھے اور میری ہر بات کے ساتھ ان کے چہرے پر بل بھی پڑنے لگے تھے۔ میں توقف سے مسکرایا اور یہ رہی سب سے معمولی، سب سے اہم بات ___ مرتے وقت اس نے اپنے ہونے کی آخری کیل ٹھونک دی۔

''مطلب؟'' نوین بھائی نے کرسی پر پہلو بدلا۔

میں دھیرے سے مسکرایا ___ ''مرا بھی کم بخت تو اپنے اسی باپ دادا والے پرانے گھر میں ___ ایسا کیوں کر ہوا۔ اس کا مطلب بتا سکتے ہیں آپ؟''

میں نے غور کیا۔ نوین بھائی کے چہرے کا مانس ذرا سا کھنچ گیا تھا ___

ooo

آپ اس شہر کا مذاق نہیں اُڑا سکتے

(1)

وہ بہت آرام سے باتیں کر رہا تھا۔ اتنے آرام سے، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ لیکن شاید جو 'حادثہ' بھی ہوا تھا، کوئی زلزلہ جیسا بھیانک المیہ بھی اتنا خوفناک نہیں ہو سکتا تھا۔ (یہ میرا ماننا ہے۔ میں کون؟ ـــــ میں یعنی کہانی کار) لیکن وہ جیسے ان تمام امکانات سے الگ اپنی سچائیوں کا اظہار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''نہیں! اس کے لئے شہر قصوروار نہیں ہے۔ سارا کا سارا قصور شہر پر ڈالنا ٹھیک نہیں۔ اگر کوئی قصوروار ہے تو؟...... شہر اگر کسی خوفناک راکشش کی طرح پھیل رہا ہے تو...... سمجھ رہے ہیں نا...... شہر کا کوئی قصور نہیں ہے۔''

OO

جب وہ پہلی بار ٹکرایا تھا تو ایک سیدھا سادا معصوم سا 'گنویڑی' تھا۔ یعنی گاؤں سے آیا ہوا ایک بھولا بھالا جانور۔ کسی بھی بات کی تمیز نہیں تھی۔

''کیسے آئے؟''

''وہاں کام نہیں تھا۔''

''پڑھے ہو؟''

''ہاں، گاؤں کے چھوٹے درجہ تک ہی...... ہی...... ہی۔''

یہاں کیسے، ایسے ہی آ گئے؟''

''گاؤں کا ہی ایک آدمی ہے۔ یہیں رہتا ہے۔''

''اُس نے بلوایا ہوگا۔ کہا ہوگا، یہاں نوکری کی کیا کمی ہے۔ آجاؤ۔''

''ہاں، یہی کہا تھا اُس نے۔''

''پھر وہ نہیں ملا؟''

''پہلی بار میں نہیں ملا۔''

''بعد میں بچنے کی کوشش کی۔ ہے نا؟''

''ارے آپ تو سب جانتے ہیں۔''

''اس مہانگر میں یہ باتیں، سب ہی جانتے ہیں۔ اب کیا کرو گے،

''سوچا نہیں۔''

''واپس لوٹ جاؤ گے؟''

''نہیں۔''

یہ ایک گنویڑی کا فیصلہ تھا۔ بعد میں جو بھی حادثات پیش آئے وہ شاید اسی مضبوط فیصلے کی دین تھے۔ اُسی کے لفظوں میں —— ''کبھی کبھی شہر وہ نہیں رہتا جیسا کہ ہم یا آپ سمجھتے ہیں۔ ایک بے جان احساس، بے جان سڑکوں، گلی کوچوں، عمارتوں، بھاگتی گاڑیوں میں اپنی موجودگی درج کرانے والا —— اور جیسا کہ اُس نے بتایا —— شہر اُس کے روبرو کھڑا تھا۔ اتنے نزدیک کہ وہ شہر کے دھڑکنوں تک کو سن سکتا تھا...''

مجھے اچھی طرح احساس ہے۔ شہر کہیں پاس میں کھڑا تھا۔ وہ مجھے ایسی عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ ایک پل کو مجھے ڈر کا احساس ہوا۔ لیکن نہیں، وہ مجھے پرکھ رہا تھا۔ پرکھ رہا تھا کہ میں اُس کے گربھ میں رہنے کے لائق ہوں یا نہیں...... یا میں جلد ہی یہاں سے فرار ہو جاؤں گا۔

رات سرکنے تک پلیٹ فارم پر سوئے لوگوں کے خراٹے بجنے لگے تھے۔ کبھی کبھی اس خراٹے کو پلیٹ فارم پر تیزی سے لگنے والی گاڑی کی چیخ توڑنے کی کوشش کرتی، مگر بے سدھ پڑے لوگوں کو تو جیسے نیند پیاری تھی اور وہ کسی بھی طور نیند سے سمجھوتہ کرنے کو تیار نہ تھے۔

میں نے آواز سنی...... کوئی مجھ سے دھیمے دھیمے لہجے میں کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن کون تھا وہ؟ یہاں مجھے جانتا ہی کون تھا۔ جو جانتا تھا، اُس نے صاف لال جھنڈی دکھادی تھی —— لیکن پھر بھی کوئی تھا۔ سرگوشیوں کے باوجود —— پلیٹ فارم پر بجتے خراٹوں اور گاڑیوں

کی آوازوں کے باوجود میں اُس کی آوازیں سن سکتا تھا...... کوئی تھا...... بہت ہی قریب...... جو مجھ سے ہی مخاطب تھا۔

''واپس کیوں نہیں چلے جاتے؟''

''واپس!''

''اب پریشان ہو کر اِدھر اُدھر مت دیکھو۔ یہ میں ہوں میں...... شہر......۔''

''تم......''

''حیران ہونے کی ضرورت نہیں...... ذرا سوچو، واپس چلے جاتے تو تھوڑی سی شرمندگی اٹھانی پڑتی۔ بس...... یعنی دو چار روز کے لئے ذرا سا بے شرم ہونا پڑتا۔''

''بس میں بے شرم نہیں ہونا چاہتا تھا۔''

''پاگل ہو۔ یہاں بے شرم کون نہیں ہے...... شہر ہنستا ہے...... رنڈی سے راجنیتی (سیاست) تک...... لیکن وہاں گاؤں میں سب کچھ چار دنوں کے لئے ہوتا...... چار دن میں سب ہنسی اُڑا کر ساتھ گھوم رہے ہوتے۔ موج کر رہے ہوتے۔ اور یہاں...... پلیٹ فارم کے پتھر چبھ تو نہیں رہے؟''

''اگر ہاں کہوں تو؟''

''عادی ہو جاؤ گے۔ شہر کسی سانپ کی طرح پھپھکارا تھا۔ اب بھی وقت ہے، یعنی اتنے جوان ہو تم کہ نصیحت کی جا سکتی ہے۔''

''مجھے تمہاری نصیحت نہیں چاہئے۔''

''نصیحت کی ضرورت تو اب تمہیں قدم قدم پر پڑے گی''—— شہر ہنسا—— ''دیکھو کوئی آ رہا ہے۔ اِدھر نہیں اُدھر دیکھو...... کیا سمجھ رکھا ہے—— پلیٹ فارم باپ کی جاگیر ہے—— یہاں جتنے بھی بھکاری سوتے ہیں سب ٹیکس دیتے ہیں—— دیکھو وہ پولیس والا سیدھے تمہارے پاس ہی آ رہا ہے...... اچھا...... تو تم اُس سے جتنی مرضی چاہو، اُلجھ لو۔ میں پھر ملوں گا''—— شہر کی سرگوشیاں سو گئی تھیں۔

اُس نے ادھ کھلی آنکھوں سے دیکھا۔ کوئی پولیس والا تھا جو ڈنڈے سے اُس کے بدن کو ایسے ٹٹول رہا تھا جیسے وہ آدمی نہیں، کوئی سامان ہو۔

''اے......؟...... یہاں کون سو گیا ہے......'' اُس کی آواز بھیانک تھی۔

سہما سادہ اُٹھ بیٹھا—

''میں...... میں......''

''میں...... میں کیا...... کوئی نام تو ہوگا۔ اچھا چل— نام سے کیا لینا دینا۔ یہاں کیا کر رہا تھا؟''

''سو رہا تھا۔''

''سو رہا تھا؟ یہ جگہ تیرے باپ نے بنائی ہے نا؟'' سو رہا تھا؟ چل نکال، جیب میں کتنے پیسے ہیں؟''

''پیسے؟......''

''ہاں پیسے...... انگریجی نہیں بول ریا ہوں۔ کم بخت کہاں کہاں سے چلے آتے ہیں؟''— اُس نے گندی سی گالی دی—''

''پیسے نہیں ہیں......''

اُس کی آواز رات کے اندھیرے میں دور سے آتی ہوئی کسی گاڑی کے شور وغل کے بیچ کہیں کھوگئی تھی۔

''پیسے نہیں ہیں اور یہ جگہ تیرے باپ نے خریدی ہے۔''— اس بار اُس نے ڈنڈا چمکایا تھا۔ نیم غنودگی میں ڈنڈے کی مار اُس کے پورے وجود کو لہولہان کر گئی تھی۔

گاڑی اسٹیشن پر رُک گئی تھی۔ مسافر اُتر رہے تھے۔ پولیس والے نے ایک بیڑی جلائی۔ ڈھٹائی سے مسکرایا— ''جا اب اِدھر مت دِکھنا، کیا سمجھے۔ ٹائم کھوٹا کر دیا......''

وہ اندھیرے میں ایک طرف بڑھ گیا۔ کنارے لوہے کی ریلنگ کے پاس وہ ایک دو مسافر بیٹھے بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ اُس نے بھی ایک کانپتا ہوا ہاتھ ریلنگ پر رکھا۔ تبھی کوئی ہنسا...... زور سے— اُس نے پلٹ کر دیکھا، کوئی نہیں تھا، مگر کوئی تھا۔ اس بار اُس پر لفظوں سے حملہ کیا گیا تھا۔

''مل گئی نصیحت۔ اب کیا سوچا ہے؟'' یہ شہر تھا...... ''یعنی کوئی بھی گاڑی پکڑ کر گاؤں واپس—؟''

''نہیں''— اُسے کبھی کسی زمانے میں اپنے باپ کی کہی گئی ایک بات یاد رہ گئی تھی— ''جو دکھ جھیلتے ہیں وہی جیتے ہیں۔ وہ جیتے بھی اسی لئے ہیں کہ دُکھی ہوتے ہیں۔ وہ اسی

وجہ سے جیتے ہیں۔ شاید یہ دیکھنے کے لئے کہ کبھی تو...... کبھی تو بدن سے دُکھ کا خاتمہ ہوگا۔''

''تو تم نہیں جاؤ گے؟''

''نہیں ـــــ!''

اُسے احساس ہے۔ شہر کانپ گیا تھا۔ کیوں؟ ـــــ وہ نہیں کہہ سکتا، اگر چہ اُس نے شہر کو دیکھا بھی نہیں تھا۔

(2)

''پھر کیا ہوا؟''

(ایک بار پھر سے بطور کہانی کار مداخلت کے لئے آپ سے معافی چاہوں گا۔ مگر وہ اطمینان بھری نظروں سے اب بھی میری طرف دیکھ رہا تھا۔)

''میں جانتا ہوں آپ میری بات کا یقین نہیں کریں گے۔ ہی...... ہی...... ہی...... آپ اُسے جھوٹ سمجھیں گے۔ ٹھیک اُسی طرح جیسے کوئی آپ سے رات کو یہ کہے کہ یہ دن ہے اور آپ بھولے پن سے اُس کی بات مانتے ہوئے حامی میں سر ہلا بیٹھتے ہیں...... آپ سمجھ رہے ہیں...... ٹھیک ویسے ہی......''

اُس نے نظر جھکالی تھی۔ کسی مہانگر میں میرے جیسے گنویڑی کو جو کام مل سکتا ہے یعنی ٹھیلا اُٹھانے، بوجھ ڈھونے سے لے کر مزدوری تک ـــــ پھر ایک دن اُسے مجھ پر رحم آ گیا ـــــ

''کون؟''

''تھا کوئی آپ کی طرح رحم دل؟''

''کہانی کار ـــــ''

''کہانی کار بھی ہو سکتا ہے۔ ہی ہی...... ہی......'' وہ ہنس رہا تھا ـــــ وہی بڑی باڑی باتیں۔ غریبی، امیری، دُکھ کے اتہاس کی ـــــ ''آپ سمجھے نہیں؟ ہی ہی۔ دکھ کا اتہاس ـــــ اُسی نیک آدمی نے بتایا تھا مجھے ـــــ ''اتہاس امیروں کا نہیں ہوتا ـــــ امیروں کا صرف جغرافیہ ہوتا ہے۔ کتنی جغرافیائی زمین پر قبضہ کرنا ہے انہیں ـــــ اتہاس صرف دکھی دل والوں کا ہوتا ہے ـــــ میں ایک ٹھیلے کے ساتھ اُس کے گھر پہنچا تھا اور اُس نے مجھ میں کوئی کہانی ڈھونڈ لی تھی۔''

''کہانی ـــــ؟''

''ہاں وہ سارے راستے آپ ہی کی طرح پوچھتا رہا مجھ سے ـــــ یعنی کون ہوں میں ۔کوئی بھوت ۔ہی ہی......''

''پھر ـــــ؟''

گھر آ کر وہ جذباتی ہو گیا۔ پتہ نہیں، شاید میرے گاؤں کی بدحالی کا سن کر ـــــ اُس کی آنکھیں نم تھیں ۔ وہ دھیرے دھیرے کچھ کہہ رہا تھا، یعنی ایسا کچھ جو مجھے سننے میں نہیں آ رہا تھا...... ہاں ٹھیک سے مجھے یاد کر لینے دیجئے ۔ وہ کہہ رہا تھا ـــــ دنیا میں جب تک ایک بھی آدمی ۔ ایک بھی آدمی تمہاری طرح ہے ـــــ سچ میں اپنے آپ کو نہیں روک پاتا ـــــ ایسا کیوں ہے؟ ایک طرف ایک حیران کرنے والی دنیا ہے۔ فلمی گلیمر، ڈسکوتھک سے ڈزنی لینڈ تک ۔ ڈسکوری چینل سے ایم ٹی وی تک ۔ اور ایک طرف تم لوگ ہو ـــــ کیڑے مکوڑے ـــــ ایک طرف اس گلوبل ولیج میں انٹرنیٹ اور سائبر اسپیس تک پھیلے ہوئے، کمپیوٹر کی طرح مشتعل کرنے والے دماغ ہیں ـــــ اور دوسری طرف تم ہو ـــــ اسپیس ایج اور کلوننگ کی طرف بھاگتے ہوئے ہم سکھ اور شانتی کے کلون کیوں نہیں بناتے ـــــ؟ تم کیوں رہ جاتے ہو، ہر بار ہمارے پاس ـــــ ہمارے پاس...... رونے کے لئے ـــــ دُکھ کے لئے ۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑا تھا ہی ـــــ ہی ہی...... کہا تھا ـــــ ''رہ جاؤ یہیں ۔ بہت پیسہ ہے میرے پاس ۔ اس میں تمہارا حصہ بھی ہے ۔ کیوں؟...... کیوں نہیں؟...... دُکھ شیئر کرتے ہو تم مجھ سے ۔ میں تم سے سکھ شیئر کروں گا۔''

ـــــ ''اُس نے سکھ شیئر کیا ـــــ''

''ہاں، کیا ـــــ اُس کے پاس واقعی بہت پیسہ تھا ۔ اُس کی بڑی سی حویلی کے بڑے سے صحن کو میلا کرنے کے لئے روز میرے جیسے کتنے ہی آ جاتے ۔ وہ نعرے لگاتے...... چیختے چلاتے ۔ وہ چپ کراتا ۔ پھر وہ سب کو لے کر پتہ نہیں کہاں نکل جاتا ۔ لوگ کہتے ہیں......''

ـــــ ''نیتا ہے۔''

''نہیں، وہ کیا ہے ۔ لال منڈل ۔ کمنڈل ہی...... ہی...... جانے دیجئے...... وہ بس وہی تھا ۔ اُس کے چہرے پر بھی کافی لالی تھی مگر ـــــ اُس کی بیوی کسی دوسرے مرد کے ساتھ بھاگ گئی تھی ۔ بچے باہر ملک میں پڑھتے تھے ۔ وہ اکیلا تھا اور ہمارے دُکھ سنتا تھا ۔ اپنے سکھ شیئر کرتا تھا۔''

ـــــ ''پھر؟''

میں وہیں رہنے لگا۔ ایک طرح سے اُس نے روک لیا تھا مجھے۔ 'تم...... تم اب یہیں رہو گے۔ سمجھ گئے نا؟ ٹھیلہ ــــ ؟ انسان، انسان کو بٹھا کر رکشہ کھینچتا ہے ــــ تم ٹھیلہ کھینچتے ہو ــــ سماج واد کیسے آئے گا بھائی۔ آں......؟'

وہ سچ مچ بہت دُکھی تھا۔ اُس نے مجھے باہر والا ایک چھوٹا سا کمرہ دیا۔ کہا، اپنے سامان یہیں لے آؤ۔ یہیں کھانا بناؤ۔ کھانا کھاؤ، مستی کرو۔ تھوڑا بہت صحن میں آنے والے لوگوں کے ساتھ چیخو چلاؤ۔ بس، مجھے کام سمجھا کر وہ اپنے دوسرے کاموں میں مصروف ہو گیا تھا۔ اُس رات...... اُس رات...... ہاں اُس رات مجھے اچھا لگا۔ چلو مہانگر میں ایک بھلے آدمی سے ملاقات ہوئی۔ ایسے آدمی، ایسے عظیم شخص...... رات مجھے دیر تک نیند نہیں آئی۔ وہ آدمی، اُس کا چہرہ بار بار مجھے یاد آتا رہا۔ مگر اچانک پتہ نہیں کیا ہوا، میں چونک گیا۔ وہی سرگوشیوں والی آواز...... کوئی میرے قریب تھا۔ بہت قریب اور ــــ یقیناً یہ شہر تھا اور میں شہر کی دھڑکنیں سن سکتا تھا۔

''کیا تم مجھے دیکھ رہے ہو؟''

''نہیں۔''

''دیکھو مجھے'' ــــ شہر نے مجھے ڈانٹ پلائی تھی۔

خوف زدہ ہو کر میں نے آواز کی سمت دیکھا۔ وہاں خوف اور شک کے میل سے ایک ٹیڑھی میڑھی شبیہ بن گئی تھی ــــ تو کیا یہ شہر تھا؟

''ہاں، یہ میں ہوں۔''

مجھے ڈر سا لگا۔

شہر نے مجھے پھر خبردار کیا ــــ ''واپس کیوں نہیں چلے جاتے ــــ اچھا مت جاؤ لیکن میری بات سنو ــــ یہاں صرف اپنے دماغ کی سنو ــــ لفظ، زبان کے جادو میں مت پھنسنا ــــ کیوں کہ یہ صرف مہانگر نہیں مایا نگری ہے ــــ اور ہر مہانگر مایا نگری ہوتا ہے۔ جینا ہے تو حساس مت بننا ــــ رسّی بننا، کنویں کا پتھر مت بننا ــــ جسے رسی گھس دیتی ہے۔ سمجھ رہے ہو نا۔''

شہر غائب تھا......

وہ ٹیڑھی میڑھی شبیہ ــــ شہر اب کہیں بھی نہیں تھا۔

مجھے ڈر سا لگا۔ شہر کا چہرہ اتنا عجیب سا کیوں ہو گیا تھا —— کیا شہر ہنس رہا تھا —— ؟ کیا شہر رو رہا تھا —— ؟ میں بار بار شہر کے پیکر کو ٹٹول رہا تھا اور ہر بار شہر کا چہرہ پیلی دھوپ کی طرح لہولہان ہوتا مجھے نظر آرہا تھا۔

(4)

''پھر —— ؟''

کہانی کار ہونے کے ناطے، میرے اشتیاق کا اچانک بڑھ جانا ضروری تھا۔

''پھر'' گنویڑی اپنی سوچ میں گم تھا —— ''پھر شاید ہم ہی غلط ہوتے ہیں۔ ہر جگہ۔ وہ نیک آدمی تھا، بھلا مانس۔ شروع میں دو بار ایک ہی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر اُس نے مجھے کھانا بھی کھلایا۔ دو بار —— مجھے یاد ہے۔ وہ میری کوٹھری میں کھانے کی اپنی اور میری تھالی لے کر آ گیا تھا —— ''جو مزہ زمین پر بیٹھ کر کھانے میں ہے......'' پھر ایک دن اُس نے میری تعریف کی —— تم وہاں، فلاں جگہ جس طرح چلائے تھے، سمجھ رہے ہونا...... تم جیسے چلائے تھے۔ اُس وقت وہاں تم، تم نہیں تھے۔

''پھر کون تھا؟''

—— ''اس وقت تم میں ہزاروں، کروڑوں غریبوں، جدوجہد بھرے ہاتھوں کی نمائندگی ہو رہی تھی —— نمائندگی —— اور کون کر رہا تھا —— ؟ تم —— تم میں ایک انقلابی کا غصہ اُبھر آیا تھا۔ یہ اصل تم تھے، یعنی تم جو دِکھتے ہو، تم وہ نہیں ہو —— تم یہ ہو —— فائر، آگ —— تمہارے اندر ایک پورا آتش دان چھپا ہے —— سمجھ رہے ہونا تم —— آج میں سارے راستے، تمہاری جلتی آنکھیں، جلتا وجود اور بھینچی ہوئی مٹھیوں کو پڑھتا آیا —— اسے رکھو، رکھو پیارے —— ہمیشہ قائم رکھو۔''

گنویڑی کی آنکھوں میں چمک تھی...... ''اُس رات بھی دیر تک خالی زمین پر میں کروٹیں بدلتا رہا...... لفظ...... مایا جال۔ اُس کے لفظ بار بار چوٹ کر رہے تھے...... فائر...... آگ...... اسے قائم رکھو...... تمہارے اندر...... ایک آتش دان...... چھپا ہے...... آتش دان......''۔

''آہ......''۔

میں نے اچانک آواز سنی ...... کوئی تھا۔ جو نہ رو رہا تھا، نہ ہنس رہا تھا—— نہ دُکھی تھا نہ سکھی تھا—— کوئی تھا، میرے، بہت قریب—— اور یقیناً یہ شہر تھا۔ وہ پورے زور سے چیخا تھا——

''میرا پیکر تک دیکھ چکے ہو۔ اب جہاں ہو وہیں رہو۔''

''لیکن تم کیوں آجاتے ہو۔ ہر بار، ہر رات؟''

''میں سب کے پاس جاتا ہوں—— شہر کی آواز میں بے رُخی تھی۔ جو بھی آتا ہے، نیا اجنبی اس شہر میں۔ اُسے سمجھانا میرا کام ہوتا ہے۔''

—— ''مجھے سمجھا چکے۔''

''نہیں......'' شہر رنجیدہ تھا۔

—— ''سمجھانا بھی مت، اب مجھے راستہ مل گیا ہے۔''

''خوب''—— شہر نے پھر مذاق کیا۔ ''وہ تمہارے ساتھ اٹھتا بیٹھتا، کھاتا پیتا ہے اس لئے......''

''ہاں!''

—— ''اور تم...... بدلے میں تم کیا کرتے ہو—— اُس کے ساتھ—— جگہ جگہ جاتے ہو، گلا پھاڑ کر چلاتے رہتے ہو۔ جانتے ہو تم جیسی قوم اب اس مہانگر میں کیا کہلاتی ہے۔''

''مجھے نہیں سننا۔''

—— ''مت سنو، کل تک پیسوں کے لئے چلانے والے کہلاتے تھے تم...... اب نہیں...... آگے جان کر کیا کرو گے۔ مگر چلاتے چلاتے تمہارا گلہ درد نہیں کرتا——؟''

''کرتا ہے۔''

—— ''پھر ایک دن گلہ پھٹ گیا تو؟''

''تو؟''

''تمہیں کیا لگتا ہے۔ وہ تمہیں اپنے بغل میں جگہ دے گا۔ یعنی اپنے کمرہ میں، اپنے ڈرائنگ روم، اپنے گھر کی اُس کی کوٹھری میں جو تم کو دی ہوئی ہے......؟ وہ سیاست کرتا ہے تم سے۔''

''نہیں، اُس کے پاس اصول ہیں۔''

''پاگل ہو۔ اصول اور سیاست سب ایک دوسرے میں مل گئے ہیں۔ اب —— عجب گھال میل ہے۔ سیاست اور اصول نے ہر اگلی سیڑھی کیلئے کئی تعریفیں ڈھونڈ لی ہیں —— ایک قدم والی سیاست، دوسرے قدم پر نئے روپ بدل لیتی ہے —— جو رات میں اصول بنتے ہیں، صبح آتے آتے برباد ہو جاتے ہیں —— جیسے جیسے سیاست گھومتی ہے اصول محور کی طرح اُس کے اردگرد چکر لگاتے رہتے ہیں —— یعنی سیاست کون سی کروٹ لے رہی ہے —— جس کروٹ لے رہی ہے اصول، قاعدے قانون کو اُسی سمت مڑنا ہوتا ہے۔ جانے دو تم نہیں سمجھو گے، جب سمجھو گے تو......''

شہر سنجیدہ تھا۔ اُسی طرح جیسے آدمیوں کے چہرے پر آڑھی ترچھی لکیریں اُبھر آتی ہیں۔ میں اُس چہرے کا صرف تصور کر سکتا تھا، یعنی ایسی بے شمار آڑی ترچھی لکیریں شہر کے چہرے پر بھی اُگ آئی ہوں گی۔

''مجھے ایسا کیوں لگا۔ پتہ نہیں۔'' پھر بھی شہر سنجیدہ تھا۔

گنویڑی کچھ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ مجھے ایسا بالکل نہیں لگا تھا۔ میرے لئے حیرت کی بات یہ تھی کہ میری اتنی کامیابی پر شہر فکر مند اور سنجیدہ کیوں ہے؟

''تو کیا حالات بدلے۔'' یہ ایک بار پھر کہانی کار کی مداخلت تھی۔

گنویڑی دھیرے دھیرے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

(5)

مجھے یاد ہے۔ اُس دن پھر وہ میری کوٹھری میں حاضر تھا۔ اُس کے چہرے پر گہری خاموشی تھی۔ کسی نئی بات کے لئے شاید وہ لفظوں کو چننے کی کوشش کر رہا تھا۔

''ایک جلسہ کرنا ہے مجھے —— بتانا ہے کہ تم ہو —— ''اس لئے ہم ہیں —— یا شاید اُس کی آنکھیں پوری طرح میرے چہرے پر گڑی تھیں۔

''سمجھ رہے ہونا۔ جلسہ کرنا ہے......'' وہ کہیں اور دیکھ رہا تھا۔ مجھے اُس کی آواز کہیں بہت دور سے آتی سنائی دے رہی تھی —— نہیں سمجھو گے تم لوگ —— لیکن سب کچھ بدل گیا ہے۔ دھرتی بھی اور دھرتی پر رہنے بسنے والا انسان بھی —— سمجھ رہے ہونا —— اختیار، تعلق، رشتے، سب معنی بدل گئے ہیں —— ختم ہوتی ملینیم صدی میں صرف دو چیزیں رہ گئی ہیں ——

صارف اور صنعت —— پروڈکٹ اینڈ کنزیومر —— ایک فروخت ہونے والی شئے ہے اور ایک بیچنے والا ہے —— سب برانڈ ہیں یا بن گئے ہیں —— رشتے بھی —— پہلے دنیا کی تمام بڑی کمپنیاں اپنے اپنے برانڈوں کو ہندوستان کے عظیم بازار میں پیش کرنے کے لئے دن رات مصروف رہتی تھیں۔ سوئی سے ہوائی جہاز تک، کوک سے پیپسی تک —— لیکن اب بساط الٹ گئی ہے۔ کل ہندوستان بازار میں آنے والی بین الاقوامی کمپنی پر ہنگامہ ہوتا تھا —— ملک، بیداری، عوام اور بھارتیتا کی دُہائی دیجاتی تھی اور اب —— وہ بھی آرہے ہیں اور ہم بھی —— یعنی ہندوستانی بھی سارے تعلقات اور ماضی بھول کر صرف اور صرف صارف اور برانڈ بن چکے ہیں۔

وہ اچانک اُس کی طرف مڑا تھا۔

''جیسا کہ میں نے کہا —— مجھے ایک جلسہ کرنا ہے۔ سمجھ رہے ہونا تم —— تم غریبی کا برانڈ بن جاؤ —— تمہیں غریبی کا برانڈ بننا ہی ہوگا میرے لئے ——''

اُس کے آخری لفظ پر میں چونک گیا تھا —— ''آخر اتنا خرچ کیا ہے میں نے تم پر، تمہاری ذات پر۔''

وہ چپ چاپ کمرہ سے نکل گیا تھا۔ گنویری کی آنکھوں میں دہشت تھی۔ اُس رات میں نے ایک بے چین کرنے والا خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا —— یہ اُسی کا گھر ہے۔ گھر میں سب چیزیں پڑی ہیں۔ ٹی وی، فریج، واشنگ مشین، ایئر کنڈیشنز اور —— ان میں ہی کہیں بیچ میں، میں کھڑا ہوں...... یعنی کنزیومر —— محض ایک پیدا کرنے والی چیز...... میرے جسم میں سنسنی ہوئی، میں شاید زور سے چیخا بھی تھا۔

میں نے دیکھا —— شہر میرے بغل میں کھڑا ہے۔ مجھے آنکھیں دکھا رہا ہے۔

''اب......اب کیا کروگے؟''

''جیسا وہ چاہتا ہے'' —— میری آواز صحیح معنوں میں گھبرائی ہوئی تھی۔

—— ''پروڈکٹ بننے کے لئے تیار ہو تم؟''

''راستے کل بھی میرے پاس نہیں تھے۔''

—— ''یعنی پروڈکٹ بن جاؤ گے؟''

''لیکن وہ میرا کیا کرے گا۔''

شہر ہنسا —— ''انجان ہو، بھولے بھالے معصوم، پاگل —— اُس نے تم سے تمہاری غریبی نہیں سب کچھ مانگ لیا ہے۔ سنو! وہ صحیح معنوں میں تمہارا استحصال کر رہا ہے۔ اُس کا سارا فلسفہ یہیں تک محدود تھا۔ یعنی تمہیں عالمی کمپنی کے دروازے تک لانے کے بیچ —— سنو، کھل کر کہوں تو دنیا میں ہندوستان کی غریبی فروخت ہوتی ہے۔ اور وہ بس تمہیں فروخت کرنا چاہتا ہے —— سونے کی قیمت میں۔

شہر اچانک مجھ پر غصہ ہوا تھا۔ مجھے لگا، اب کسی بھی پل وہ مجھے مار بیٹھے گا —— بولے گا —— سالے اور کوئی جگہ نہیں ملی —— یہاں کیوں آیا —— یہاں عمارتیں بستی ہیں آدمی نہیں اور تم ابھی اس مہذب سماج میں عمارت نہیں بنے۔ ابھی بھی نہیں، تم ابھی معمولی آدمی ہو، بس۔

شہر مجھ پر کھلکھلا رہا تھا۔ اس طرح جیسے میں اُس کی نظر میں کوئی مسخرہ تھا۔ ریڈی کیولس مین —— نہیں، شاید یہ غلط تھا —— شہر نے تو مجھے دیکھنا تک بند کر دیا تھا —— اب یہ کوئی اور تھا —— میرے جیسا ہی —— جو اچاک اس شہر میں آنکلا تھا اور شہر اُس کے ساتھ بھی وہی سلوک دہرانے والا تھا جو میرے ساتھ کر چکا تھا۔

(6)

''پھر ——؟''

میں نے سوچ لیا تھا۔ بحیثیت کہانی کار اب اس کے بعد میں کوئی سوال نہیں کروں گا۔ سچائی یہ تھی کہ مجھے اس کی اس کہانی سے اب ڈر لگنے لگا تھا۔ سچائی یہ تھی کہ اُس کی کہانی میں بھی، جیسا کہ اُس نے بہت سارے اگر مگر کے بیچ بتایا۔ یا تو وہ آدمی سیاست داں تھا یا کہانی کار —— یا جیسے دونوں ایک دوسرے میں مل گئے تھے —— صنعت اور صارف کی طرح ...... اور شاید اسی لئے اب مجھے اُس سے اُلجھن ہو رہی تھی —— جب کہ مجھے اس کہانی کا اختتام معلوم تھا۔ یا یہ کہ ایسی کہانیوں کا اختتام یہی ہوتا ہے۔ پھر بھی اپنے تجسس کو باقی رکھتے ہوئے آخری بار میں نے پوچھ ہی ڈالا ——

''اور اُس کے بعد؟''

گنو یڑے نے اپنی خاموشی توڑی۔ گہرا سانس لیا ——

اور پھر —— جیسا کہ مجھے یقین نہیں ہوا —— وہ جلسہ گھر، وہ جلسہ —— وہ کھادی کی

ٹوپیاں ــــــ وہ سر ہی سر۔ کیا وہ بھیانک اندھیرا تھا ــــــ ایک خوفناک خواب تھا ــــــ

ہوا کیا تھا؟ میں نے ڈر کر پوچھا ــــــ ''کیا کنٹھ کام نہیں آئے، گلا سوکھ گیا؟''

''نہیں...... آہ...... اسی کا تو افسوس ہے۔'' ــــــ اُس کے چہرے پر عجب سی فریاد تھی۔ آپ یقین نہیں کریں گے، میں بھی چیخ رہا تھا۔ مگر...... بازو...... اپنی جگہ ٹکا ہوا تھا۔ ہونٹ چیخ رہے تھے، مگر جسم کے دوسرے اجزاء نے اچانک ہڑتال کر دی تھی۔ پیر ساکت و جامد تھے۔ ہاتھ بے جان تھے اور اچانک ــــــ سب میری طرف گھورنے لگے۔ میں نے اُس کے چہرے پر غصے کو پڑھا۔ اُس کی ہتھیلیوں میں پتھر تھا۔ خاکی ٹوپیاں دھیرے دھیرے کھسک رہی تھیں۔ وہ تیز چیختا ہوا پتھر اُٹھا کر مجھے مارنے کو جھپٹا تھا۔ اور...... اور...... نہیں جانے دیجئے۔

گنویڑی کے دانت اس شدید گرمی میں بھی بج رہے تھے، ''جانے دیجئے۔ آگے کی داستان کا آپ کیا کریں گے۔ اُس رات میں نے کہاں گزاری، یہ بھی جانے دیجئے......''۔

''مگر وہ میرے بے حد قریب کھڑا تھا۔ ارے وہی شہر۔ اُس کا دھندلا پیکر چپ چاپ میرے سامنے لمبا ہو گیا تھا۔ پھر میں نے اچانک اس کے پیکر کو ٹوٹ کر گرتے دیکھا۔ ہاں ــــــ یقین کریں آپ ــــــ کیا میرے لئے شہر مر گیا تھا ــــــ یا شہر کے لئے میں مر چکا تھا ــــــ شاید شہر کو اب مجھے ٹوکنے، روکنے یا غصہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ شہر کی نظر میں، میں ایک بے ضرر انسان تھا۔ یعنی لاچارے مائی باپ، جس پر نہ رویا جا سکتا ہے، نہ ڈھنگ سے ہنسا یا اُداس ہوا جا سکتا ہے۔

اور اُسی پل میں نے فیصلہ کر لیا کہ......''

○○○

بوڑھے جاگ سکتے ہیں

اور وہ واقعہ ہو گیا جس کے بارے میں وپن لال سوچتے تھے کہ نہیں ہونا چاہئے تھا......
لیکن کیوں نہیں ہونا چاہئے تھا، کا جواب فی الحال ان کے پاس نہیں تھا......آخر کیوں نہیں ہونا چاہئے تھا——؟ وہ بہت دیر تک بلکہ کہنا چاہئے کہ دوسرے بہت سے سوالوں سے فارغ ہو کر جیسے بس اسی سوال تک لوٹ آتے۔ بالکل ہونا تو یہی چاہئے تھا اور آخر بچوں نے انہیں سمجھ کیا رکھا ہے؟ ایک کھوسٹ بیکار بڈھا۔ بڈھے وہ خود ہوں گے—— آئینے کے سامنے کھڑے ہوں تو چندیا کے کالے بال اب بھی ایسے چمکتے ہیں کہ جوان آدمی بھی رشک کھا جائے اور ابھی بھی، انہوں نے جیسے خود کو چھو کر دیکھا اور مطمئن ہو گئے کہ ہاتھوں کی مچھلیاں اور پیروں کے پٹھے تو اس طرح پھڑکتے ہیں جیسے تالاب میں ایک پتھر اُچھال دو۔ پھر دیکھو جوش، حرکت اور ترنگیں—— اور آخر انہیں ایسا محسوس کرنے کا حق کیوں نہیں ہے—— اور انیل—— کیا اسے چاہئے تھا، کہ اپنی ماں یا اس سے، یعنی اپنے باپ سے اس طرح کے واہیات سوال پوچھے—— کہ آخر آپ....

○○

......انہیں تعجب ہے، آداب و اخلاق کے اس صفحہ پر آخر روشنائی کیسے گر گئی جس پر انگلی پکڑ کر بچپن میں انہوں نے انیل کو سبق رٹوائے تھے۔ نہیں......انہیں کسی بات پر تعجب نہیں ہونا چاہئے......مگر......ساٹھ سال کا ایک بوڑھا اپنی مرضی سے اپنی بیوی کے ساتھ سونا چاہے تو بچوں کی نظر میں، اس میں حیرانی کی کون سی بات ہے——؟ کیا ساٹھ سال کے بڈھے کو......

نہیں وپن لال، گھر خاندان کا پورا جغرافیہ بدل چکا ہے اور تم بڑھے ہو چکے ہو...... ساٹھ سال کے...... ساٹھ سال مطلب، ایک بوڑھا کھوسٹ، سامنے ہر پل موت دیکھتا ہوا بڈھا — اور بیوی بھی کیسی...... ساٹھ سال کے آدمی کی بیوی — جس کے چہرے کی جھریاں بدن کی جھریوں سے زیادہ اداس اور بے جان ہوں۔ بدن کے ڈھیلے، جھر جھر، لتھڑے مانس، جہاں جگہ بناتی ہوئی دنیا بھر کی بیماریاں ہوتی ہیں اور ہوتی ہے بیزاری، لمبی تھکن...... ایسی بیوی جو زندگی کی سیڑھیاں در سیڑھیاں چڑھتی ہوئی، تجسس کے سارے سوال طے کرتی ہوئی آخر میں بس یک بے رس جواب رہ جاتی ہے۔ ایسی بیوی...... اور بچے پوچھتے ہیں...... آخر آپ کیوں سونا چاہتے ہیں، ساتھ ساتھ؟''

OO

وپن لال اپنے آپ کو چھو کر ٹٹول کر محسوس کرانا چاہتے ہیں کہ وہ بوڑھے ہو گئے ہیں۔ لیکن اندر سے کوئی جھلا کر صاف انکار کر دیتا ہے۔ مان لو اگر اُن کی عمر سو برس ہوئی تو — ؟ ذرا اپنے آپ کو غور سے دیکھو...... یعنی اگر چالیس برس اور ہوئی تو...... چالیس سال کی عمر بھی اپنے آپ میں بھگوان کی دی ہوئی نعمت ہے — اور چالیس برس اپنے اندر کتنے ہی موسم، بچپن، لڑکپن، جوانی اور ادھیڑ پن کی داستانیں سمیٹے ہے...... کتنی کتنی داستانیں...... اندر سے کوئی چڑ چڑا ہو کر گالیاں بکتا ہے — چہرے کے مانس بھنچ جاتے ہیں۔ ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں۔ وہ ایک بار خود کو چھو کر ٹٹو لتے ہیں اور خاموش ہو جاتے ہیں۔ ریٹائر ہو گئے تو کیا ہوا؟ وہ ابھی جوان ہیں۔ اور ابھی بہت دنوں تک جوان رہیں گے اور جوان ہیں اس لئے......

کھانے میں کریلا انہیں کبھی پسند نہیں آیا۔ بڑھاپے کا احساس ان کے پورے وجود کو کریلے جیسا کڑوا بنا دیتا ہے۔ سب سے گھناؤنی چیز بڑھاپا ہے...... نہیں...... یہ جو عمر ہے...... عمر، جو دھیرے دھیرے بڑھتی ہے اور ہمارے معاشرے میں 40 پار کرتے ہی اس شخص کو طرح طرح سے دیکھنا شروع کر دیا جاتا ہے — دیکھا، بڈھا کیسے گھور رہا تھا۔ فلاں کی عورت سے کیسے مزے مزے کی باتیں کر رہا تھا۔

غیر ممالک میں تو اس عمر میں آ کر تجربے سانس لیتے ہیں۔ معنویت گہری اور پختہ ہوتی ہے۔ عورتوں کا رجحان بھی ایسے تجربہ کار بوڑھوں کی طرف مخصوص ہوتا ہے۔ مگر ان کے یہاں، اس

ملک میں......اب یہ اڑوس پڑوس کی گندی ذہنیت والے، ذرا باہر نکل کر فلم انڈسٹری کی طرف نظر ڈالیں۔ دھرمیندر ہے، دلیپ کمار ہیں، جیتندر ہیں۔ اس عمر میں کیا کیا لٹکے جھٹکے ہیں۔ ہیروئنوں کے ساتھ باغوں میں مٹک مٹک کر گانا ہو رہا ہے......اور وہ...... وپن لال اس عمر میں سٹھیا گئے ہیں۔ گانا چھوڑ تفریح کے لئے دو بول نہیں بول سکتے۔ آخر کیوں بھئی۔ کیوں کہ وہ ساٹھ برس کے ہو گئے ہیں۔ اس لئے......ساٹھ برس، مطلب ایک مقدس ہستی......اور بچوں کو حق حاصل ہے کہ وہ اس مقدس ہستی کی پر۔تما بنا کر، گھر کے کونے کھدرے میں ڈال کر ان کی توہین کر سکیں۔ اپنے دل کی بھڑاس نکال سکیں۔

OO

ولوڈیئر...... وپن لال کا شارٹ فارم ہے۔ جب کبھی تنہائی میں ہوتے ہیں تو مزے لے لے کر خود کو اس نام سے یاد کرتے ہیں۔ اور خوش ہوتے ہیں......ولوڈیئر۔ وہ خود مسکراتے ہوئے کہتے ہیں...... جانتے ہو اس عمر میں بوڑھے لوگ متقی اور پرہیزگار کیوں ہو جاتے ہیں...... نہیں جانتے......ہاہا......تو سنو......نہیں، تم ہنسنے لگو گے......حیرانی کی بات نہیں ہے ولوڈیئر...... بڑھاپا آیا تو محسوس ہوا جوانی کے سارے گناہ ایک طرف۔ اب جو یہ بڑھاپا سامنے ہے......یہ بڑھاپا......اس کا احساس، یہ سب سے بڑا گناہ ہے......اور ولوڈیئر......ہنسو نہیں۔ یہ انکشاف ہوتے ہی کئی بوڑھے بستر پکڑ کر عبادت اور دھرم سے ناطہ جوڑ لیتے ہیں......نہیں یقین ہے تو بتاؤ...... بوڑھے آدمی کو لوگ عبادت اور شردھا کی دستو کیوں بنا دیتے ہیں۔ کیوں کہ گھر کا ایک آدمی گودام میں رکھے، پکے آم کی طرح زندگی کی اتنی گرمی کھا چکا ہے اور اتنا سنکی اور بوڑھا ہو چکا ہے کہ بس—— آشیرواد دینے اور پاپ پنیہ کی باتیں چھوٹوں کو بتانے تک زندہ ہے—— وپن لال ہنسو نہیں۔ اب تمہیں بھی بچوں نے ایسی ہی پر۔تما بنا کر گھر کے کونے کھدروں میں ڈال دیا ہے......آشیرواد دینے اور پاپ پنیہ کی باتیں سنانے کے لئے۔

وپن لال کو لگتا ہے جیسے سب انہیں چڑھا رہے ہوں......انہیں جی بھر کر غصہ آتا ہے۔ پاگل ہیں سب کے سب......بدھو، بے وقوف، جبکہ سب کے سب جانتے ہیں سب کو بوڑھا ہونا ہے ایک دن۔ اگر بوڑھے ہونے سے پہلے مر نہیں گئے تو......پھر جب انہیں بھی ان کی ہی طرح عقیدت کے وار پر چڑھایا جائے گا تو؟ الو کے پٹھے! باہر سے ہنستے ہنساتے آئیں گے اور ان

کے سامنے آتے ہی پتھر بن جائیں گے...... ہنسی، قہقہوں اور رنگینیوں کی باتیں ایسے رک جائیں گی جیسے عبادت گاہ میں، ہاتھ میں چپل لئے احترام سے داخل ہو رہے ہیں۔ بس یہاں تک...... اس کے آگے ہماری اپنی آزادی کا شہر ہے اور اس شہر میں ہماری بے باک ہنسی ہے۔ زندہ دلی اور قہقہے ہیں اور عریاں مناظر کی نشیلی وادیاں ہیں......

○○

عریاں مناظر —— بوڑھی نسوں میں کھنچاؤ کے لئے کچھ تو چاہئے...... شریانوں میں دوڑنے والے گرم گرم خون کے لاوے کو محسوس کرتے ہیں وہ...... سب کی سب، آس پاس گھومتی لڑکیاں —— ان کی بہو اور پوتیاں تو نہیں ہیں...... پھر گرما گرم خیال کے تندور میں سینکی جانے والی روٹیوں تک ان کی پہنچ کیوں نہیں ہو سکتی؟ کیا جل جائیں گے وہ...... یا ذہن کچوکے لگانے لگے گا کہ سالے بڈھے حرامی پن سے باز آ...... دیکھ اپنی عمر...... اس عمر کی تیری پوتیاں ہیں۔ بہو ہے۔ لڑکیاں ہیں...... یہ سب ان کی سنسکرتی میں سمائی جھوٹی آستھائیں ہی تو ہیں...... سب بھلا ایک کیسے ہو سکتی ہیں۔ بہو بہو ہے، غیر تو غیر ہیں...... سب ایک ہوتے تو بھلا سمبندھ کیسے ممکن تھے۔ نہیں وپن لال...... غلط اگر غلط ہوتا تو من میں وچار ہی کیوں اٹھتے۔ جب کنوارے پن میں یہ وچار آتے تھے تو سوچتے تھے چلو اب نہیں آئیں گے۔ للتی آ گئی تو سوچا چلو ایک زندہ کتاب آ گئی ہے۔ کھیلنے، خوش ہونے کو...... بستر سے سانٹھ گانٹھ رکھنے اور دوستی نبھائے جانے والے، بھٹکتے سلسلوں کو ایک منزل ضرور مل گئی...... مگر منزل کہاں...... خیالوں کی حسین آوارگی کی اپنی جنت ہے اور یہ جنت تو عمر کے ہر دور کو ذائقہ دار، لذیذ ترین کھانے کی طرح پسند ہے۔

○○

وقت گزرا۔ سال پر سال گزرے...... انیل، وکاس اور لجو کے ساتھ ذمہ داریوں کی پتوار بھی سنبھالنی پڑی۔ مگر وہ بھٹکتے سلسلوں والی آوارگی کی حسین جنت...... مسائل اور الجھنوں سے گھبرا کر وہ اس جنت کے اسیر ہو جاتے ہیں اور ایک ندامت بھرے لطف میں اپنی الجھنیں پیوست کر کے آزاد ہو جاتے —— تین بچے...... عمر کی ڈالی جیسے اچانک پھلوں سے بھر گئی اور جھک گئی...... جھول گئی...... پھل نہیں آئیں تو کہاں جھکتے ہیں پیڑ —— بچوں میں پر پھوٹتے رہے اور بچوں میں پھوٹتے پروں، کو موٹی موٹی کتابوں سے بھرے تھیلوں کو دیکھتے دکھاتے بھی وہ اپنی للتی

میں جیتے ضرور تھے اور اپنی مخصوص دنیا میں بھی...... جہاں گھر، بال بچوں کی فکر سے بے نیاز عریاں مناظر کی نشیلی نشیلی وادیاں ہوا کرتیں اور پھر جیسے پانی میں ایک پتھر چھکا—— موجوں میں کچھ دیر ہلچل مچی اور ایک لہر ساری لہروں کو ملاتی ہوئی شانت اور غائب ہوگئی—— وپن لال کو کچھ بھی بُرا نہیں لگتا...... کہ اپنی گھر گرہستی کے بعد آوارگی کی اس حسین جنت میں داخل ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے...... وہ کبھی جرم اور گناہ کے بہاؤ میں نہیں بہے۔ وہ اسے بھی ایک ضرورت مانتے تھے اور کبھی کبھی تو نلنی کے مچلنے پر مذاق میں کہہ دیتے......

''آج نہیں—— ارے کیا بتاؤں—— آج تو تمہاری دودھ والی یا وہ جو ترکاری سبزی بیچنے آئی تھی اس کے سنگ—— یا مسز فلاں کے ساتھ—— یا پڑوس کی نئی گورنس کے ساتھ خیالی سیر سپاٹے کو نکل گئے تھے۔ بس......''

''بک......'' نلنی آنکھیں تریرتی تو وہ زور سے قہقہہ مار کر ہنس پڑتے۔ کبھی سناٹے میں جب سارا شہر سو جاتا، نلنی اس کے کھلے سینے کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی ہوئی پوچھتی......

''ایسا صرف تم کرتے ہو یا دوسرے مرد بھی......''

''کیا جانوں۔ پر سب کرتے ہوں گے۔ کیوں، تم لوگ...... تم لوگ نہیں کرتی ہو کیا؟''

نلنی خفا ہوتی تو وہ ہنستا ہوا کہتا۔ ''نہیں اس میں بُرا ہی کیا ہے...... رہنا تو ہم تم دونوں کو ساتھ ہی ہے۔ زندگی بھر...... میں کسی دوسرے کے پاس تو نہیں گیا۔ کسی کے پاس پہلے تو تم جانے ہی نہیں دو گی۔ دوسرا احساس گناہ...... بچپن سے کھونٹ کی طرف خود سے باندھا گیا احساس...... پھر نلنی ذرا خود ہی سوچو...... رہنا سہنا سب کچھ تمہارے ساتھ ہی ہے اور روز بس ایک سی یاترا—— یہ یاترائیں بھی کچھ نیا چاہتی ہیں......''

پھر وہ دیر تک ہنستا ہے...... ''بتاؤ۔ مت بتاؤ نلنی...... پر تم لوگوں نے بھی ایسا کوئی راستہ ضرور نکالا ہوگا۔ لیکن تم عورت ہو نا۔ پیٹ رکھنے والی......''

○○

وہ دیر تک ہنستے ہیں۔

ولوڈیئر۔ چلو سو جاؤ...... نیند نہیں آ ہی تو ویلم فائیو لے لو...... لیکن سو جاؤ...... نہیں سوتا—— کیا کرلو گے—— بوڑھے کو خود پر جھلاہٹ ہوتی ہے۔ یوں بھی بستر پر لیٹ جانے

کے بعد ہوتا ہی کیا ہے...... ساٹھ سالہ زندگی کی ضخیم کتاب کھل جاتی ہے اور اس کتاب کے اتنے باب ہوتے ہیں کہ...... اور کیسے کیسے باب...... بھیانک، جذباتی، رنگارنگ...... تب کی نلنی کا، ایک ایک رنگ انہیں یاد ہے...... بچوں کی شادی تک یہ رنگ ان کے چہرے کو کیسا شاداب، تروتازہ اور گرم رکھتا تھا...... رات میں نلنی کا ملائم سا بدن بے خیالی میں ان کے بدن پر ایسے پسرا ہوتا کہ نیند کھل جاتی تو وہ بس زیرلب معصوم تبسم کے ساتھ اس منظر کو آنکھوں کے حسین فریم میں سجا کر زندہ کر لیتے...... اور پھر صبح خوشبو کی طرح لہراتی تو نلنی چائے کی قلفی تھامے کھڑکی سے جھانک رہی چور، شرارتی شعاعوں کی طرح اسے گدگدانے، اٹھانے پہنچ جاتی......

''اٹھو...... چائے پی لو......''

''نہیں...... ابھی سونے دو، نا......''

''ارے اٹھو۔ بچے کیا کہیں گے۔ تم دیر سے اٹھو گے تو بچو پر بھی بُرا اثر پڑے گا۔''

OO

سپنا، ایسے ٹوٹتا ہے...... بچے، بُرا اثر...... اچھی بھلی زندگی اور زندگی کی رعنائیوں کو، بچوں کی خوشیوں کے آگے بھینٹ کیوں چڑھائی جاتی ہے۔؟ بچے بڑے ہو رہے ہیں—— یہ مت کرو۔ وہ مت کرو۔ ساتھ مت سوؤ۔ کمرہ مت بند کرو۔ دیر تک بیوی کے ساتھ کمرے میں مت رہو...... آخر کیوں بھائی...... بچے آگئے تو کیا ماں باپ کی زندگی کا سارا گلیمر ختم ہو گیا۔ ارے ان کی اپنی بھی زندگی ہے۔ حقیقت سے بھری زندگی اور یہ دو آنکھیں جو بچوں ہی کی طرح مسرت اور نت نئی لذتوں سے ہم آہنگ ہونا چاہتی ہیں...... بڑھتی عمر کا مطلب یہ تو نہیں کہ ان سارے احساسات کو کچل دیا جائے...... ارے کل کو ان کی بھی شادی ہوگی، ان کے بچے ہوں گے۔

نلنی ان کی باتیں سن کر ہنستی ہے...... ''تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔ خیالی بستی تو ہے ہی تمہارے پاس۔ گھومنے پھرنے کو۔ میرے سامنے مجھے بتائے بغیر بھی اتنی آزادی تو چھین سکتے ہو تم۔ خیالی بستی والیاں چلی تو نہیں گئیں۔''

''چلی گئیں۔'' ان کو ہنسی آتی ہے۔ ''وہ بھی بوڑھی ہو گئیں ہماری طرح......''

''پھر...... اب کیا کرتے ہو؟''

''اب نئی بستیاں آباد ہیں۔ وہ پڑوس والی اجیت کور ہے۔ شانتا منموہن ہیں اور وہ

نتاشا......''

''نتاشا۔'' نلنی نے پہلی بار سچ مچ کھا جانے والی نظروں سے دیکھا...... ''تمہیں خبط ہو گیا ہے۔ وہ تمہاری لجو کی سہیلی ہے۔''

''لجو کی نا......؟''

نلنی کی آنکھوں میں الجھنوں کی پھوٹتی چنگاریاں تھیں...... ''لجو تمہاری بیٹی ہے اور نتاشا تمہاری بیٹی کی عمر کی۔''

○○

پہلی بار لگا، نلنی نے مذاق میں ہاتھ نہیں بٹایا۔ ہنسی میں ساتھ نہیں دیا...... آنکھیں کسی نشتر کی طرح آنکھوں میں چھپے کسی بوالہوس بوڑھے کی ٹوہ میں ہیں کہ وہ بوڑھا سامنے دکھے تو اس کے ہوسناک تیور کی خبر لی جائے۔ وپن لال کی آنکھوں میں اسی دم اندر بسنے والا وہ خوش مذاق جوان ریت کے تودوں کی طرح گرتا، تڑپتا اور بے دم ہوتا ہوا دکھائی دیا۔

نلنی سنجیدہ تھی...... ''یہ مذاق بہت ہو چکا۔ اب تمہیں ایسا۔''

کوئی پگھلا ہوا سیسہ ان کے کانوں میں انڈیل رہا تھا۔۔۔۔ ''نہیں سوچنا چاہئے...... کیوں کہ...... کیوں کہ تم ایک بڈھے خرانٹ ہو...... ایک جوان لڑکی کے باپ ہو......''

انہیں احساس ہوا، مذاق 'بچانے' والی عمر سے باہر نکل گئی ہے نلنی...... جہاں اس کے چہرے کی جھریاں، اس کے چہرے پر بڑھتی عمر کی لکیروں سے زیادہ تجرباتی، مقدس اور عمر دراز ہو گئی ہیں...... اتنی مقدس کہ اب یہ حسین آوارگی کے قصے، اس کے سخت ہوتے رخسار پر منقش نہیں کئے جا سکتے...... نلنی میں ایک بوڑھی عورت آ گئی ہے۔ اس سے زیادہ عمر کی ایک بوڑھی عورت۔۔۔۔ جو ایسے مذاق پر انہیں گھور کر دیکھتی ہے۔۔۔۔ بچوں کی اونچ نیچ پر پھٹکار برساتی ہے۔ لجو کی الٹی سیدھی حرکتوں پر اسے بُری طرح جھڑکتی ہے اور......''

بس، نلنی کی اس بڑھتی عمر سے پہلی بار خوف محسوس ہوا تھا انہیں...... اور اپنے گرد ایک حصار کھینچ کر بیٹھ گئے تھے وہ...... ہنسی قہقہوں کی باتوں کو دفتر سے واپس آتے ہی، سلانے لگے تھے...... کتابوں میں، بچوں کے حال چال میں، ان کی پڑھائی کی رپورٹ میں...... ملنے جلنے والے رشتہ داروں میں...... اور یہ حصار دھیرے دھیرے وہ گھر یا ہر دفتر سب جگہ کھینچنے پر مجبور

ہو گئے۔ کیونکہ اب لجو بیاہنے کو آ گئی تھی اور وہ رنگین مزاجی کے الزام سے بھی بچنا چاہتے تھے۔

اس عمر میں اپنی ہی بنائی ہوئی سولی پر چڑھنے کا احساس بھی کم خوفناک نہیں ہوتا......

وپن لال گھوم پھر کر نتاشا والی کہانی پر لوٹ آتے...... ارے لجو کی دوست ہے تو کیا...... وہ جان بوجھ کر تھوڑے ہی گئے تھے۔ خیالی بستی میں — اس عمر میں تو خود پر اتنی گرفت رہتی ہی کہاں ہے اور حرج ہی کیا ہے...... نتاشا جب گھر آتی ہے تو بیٹی بیٹی کرتے ان کا بھی منہ نہیں دکھتا — تنہائی میں ضمیر اور اصول سے بھی تھانے دار کے سے انداز میں نپٹ چکے تھے وہ۔ قاعدے قانون اور مذہب کی پڑھی کتابیں بھی کھول کر تنہائی میں بڈھے کو ندامت کا احساس دلا چکے تھے — مگر نہیں...... تلنی کی نظروں میں یہ جرم ثابت ہو چکا تھا — اب نتاشا آتی تو تلنی جیسے ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ جاتی — وہ کیا کر رہے ہیں۔ کہاں گئے ہیں۔ کہاں دیکھ رہے ہیں......''

وپن لال سے برداشت نہیں ہوا تو وہ ایک دن غصے میں برس پڑے۔ ''میں نے تو مذاق کیا تھا۔''

تلنی گم سم سی انہیں دیکھتی رہی تھی۔ جیسے یقین اور بے یقینی کے بیچ کی کھائیاں ناپ رہی ہو...... وہ اسے سمجھانا چاہتے تھے کہ تلنی...... ہر ذہن کا اپنا ایک چور دروازہ ہوتا ہے۔ سب کا ہوتا ہے...... تمہارا بھی ہوگا۔ خود کو ٹٹولو...... تب جانو کہ یہ دروازہ عمر کے ہر پڑاؤ پر کھلا رہتا ہے۔ سوال تو صرف اس دروازے میں داخل ہونے کا ہے۔ اب دیکھو...... اصول، قاعدے، قانونوں میں لپٹے ہم اتنے کمزور ہوتے ہیں کہ اس دروازے میں جھانکنے، داخل ہونے سے بھی خوف کھاتے ہیں۔ اب اگر اس چور دروازے میں اپنا بڑھاپا کچھ دیر کے لئے آرام کرنا چاہتا ہے تو...... اسے روکو مت...... ٹوکو مت......''

OO

لیکن غلط کون تھا — ہاں جو چور دروازہ کھلا رہ گیا تھا۔ وہاں سے سچ مچ کا ایک بڈھا ان کے اندر اتر آیا تھا۔ وقت کافی گزر چکا تھا۔ بچے کام دھام سے لگ گئے تھے۔ لجو کی شادی کی فکر تھی۔ سو اس کی شادی بھی خوب دھوم دھام سے کر دی۔ ہاں لجو کی بدائی کے بعد سچ مچ ٹوٹ گئے۔ آئینہ میں چہرہ دیکھا تو ٹھٹھک سے گئے...... لگا، سامنے ایک بوڑھا کھڑا ہے، اور بوڑھے کے سامنے کھڑی ہے...... اس کی موت — عمر، جو دن دن جوڑتی ہے اور کم ہوتی جاتی ہے......

''ہاں بوڑھا ہو رہا ہوں...... ولوڈیئر...... چڑ چڑے ہو کر انہوں نے خود کو ڈانٹا۔ لیکن یاد رکھو ولو...... بوڑھا نہیں ہوں گا...... نہیں ہوں گا......

بستر پر آئے تو آوارہ خیالوں کی آندھی چل رہی تھی۔ اس آندھی سے لڑتے ہوئے وہ سچ مچ ہانپ رہے تھے—— تھوکتا ہوں تم پہ میں...... آخ تھو...... تم سڑے ہوئے آدمی ہو۔ کتے ہو تم...... جیسے ضمیر کو ہوش آ گیا تھا۔ وہ خود سے لڑ رہے تھے۔ ہاں تھوکتا ہوں تم پر...... جیسے چاروں طرف سے، اچھالی گئی تھوک سیدھے ان کے منہ پر گر رہی تھی...... پہلی بار وہ جسمانی کمزوری محسوس کر رہے تھے۔ اس قدر کہ اب وہ میڈیکل چیک اَپ کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ ہانپتے ہوئے وہ نلنی کے کمرے میں آئے...... نلنی کے پاس بیٹھنا چاہا تو وہ ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''ایسے کیوں آ گئے...... انیل، وکاس کوئی آ گیا تو......''

''ہاں...... مجھے نہیں آنا چاہئے تھا۔'' وہ کمزور آواز میں بولے۔ ''مجھے سچ مچ نہیں آنا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ تم بڑھاپے سے سودا کر چکی ہو۔''

OO

پھر وہ وہاں رکے نہیں...... اپنے کمرے میں واپس لوٹنے تک لگا، پہلی بار ان میں کوئی موج، کوئی ترنگ پیدا نہیں ہوئی تھی۔ دریا میں پتھر اُچھالنے کے بعد بھی...... نہیں...... وہ ڈاکٹر سے رجوع کریں گے۔ کسی اچھے Sexologist سے۔ اب وہ مطمئن تھے۔ انہیں اپنے دوستوں پر حیرت ہوتی تھی۔ جو روگ کو بس ڈھوئے جاتے تھے...... ندامت، بچوں کی بڑھتی عمر اور حیرت کے وزنی بوجھ سے دبے، گھٹ گھٹ کر اپنی زندگی ختم کر دیتے تھے۔ اپنی زندگی، جس کا بچوں اور بچوں کی زندگی سے الگ بھی ایک حسین اور انفرادی تصور ہے...... بچے بھلا اپنی دنیاؤں سے ان بوڑھوں کے لئے کتنا وقت چرا پاتے ہوں گے اور ایک یہ ہوتے ہیں...... بوڑھے لوگ—— 'موت' سوچتے سوچتے بچوں کے سامنے ختم کر دیتے ہیں۔ اپنی بے رنگ زندگی—— اور سچ پوچھو تو سارا قصہ بس ڈاکٹر کے یہاں سے نکلنے کے بعد ہی شروع ہوا تھا۔

وقت کی سوئیاں کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھیں۔ بچے اپنے اپنے حصوں کی ذمہ داریوں پر دستخط کر چکے تھے۔ اب ان کی اپنی دنیائیں آباد تھیں۔ ان کے سکھ میں ان کا حصہ اتنا بھر ہوتا کہ وہ بچوں سے خیریت پوچھ لیتے—— منا کیسا ہے۔ بہو کی طبیعت کیسی ہے۔ ڈاکٹر نے کیا کہا——

ایسے میں وہ تلنی کو دیکھتے...... وہ بجھی بجھی سی ہوتی۔ نہیں بجھی نہیں۔ اپنے آپ میں سمٹی...... اپنی عمر سے تھکی۔ وہ جیسے ابھی سے موت کو سمر پت تھی۔ بچوں کے بچوں میں الجھی اور کھوئی کھوئی—— تلنی وکاس کی بچی اشونی کے ساتھ چھوٹی دالان میں سوتی تھی۔ چھوٹی سی کوٹھری۔ عمر نے یہ بھی کرشمہ کیا تھا کہ اب وہ اوپر کے دالان میں سوتے تھے۔ تلنی کی کوٹھری میں ایک چھوٹا سا مندر بھی تھا اور ان کا اپنا کمرہ کتابوں سے بھرا ہوا—— موت کے بارے میں ان کا اپنا الگ نظریہ تھا—— جیسے وہ سوچتے تھے کہ جو چیز ابھی نہیں ہے اس کے بارے میں زیادہ کیوں سوچا جائے...... ہوسکتا ہے۔ باقی بچی زندگی میں ایک لمبی زندگی چھپی ہو...... تو اس باقی بچی زندگی کو اداس، بے رنگ کیوں کیا جائے۔ وہ باقی بچی زندگی کو پیسہ کمانے کے ڈھونگ سے الگ رکھنا چاہتے تھے۔ اس لئے خوب پڑھتے تھے۔

وہ سمجھتے تھے، میڈیکل چیک اَپ ہونا ضروری ہے...... Sex ایک ضروری چیز ہے...... ہاں، یہ الگ بات ہے کہ کہیں شادی کے بعد، ایک سمجھوتہ کرلینا پڑتا ہے۔ اندر حرارت تو ہونی چاہئے تھی—— تمازت اور حرارت کہ اپنے مرد ہونے کا احساس بنا رہے—— آخر بوڑھوں کو یہ حق، حاصل کیوں نہیں ہے۔ Sexologist کے یہاں سے نکلے تو انیل کے دوست ول سے ملاقات ہوگئی، جو آنکھیں ترچھی کر کے طنز بھری نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں کسی کی بھی بے جا مداخلت کو پسند نہیں کرتے تھے۔

○○

لیکن اس دن وہی ہوا جو انہوں نے پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ شام کو دفتر سے آکر انیل نے ٹوکا۔

"بابو جی...... آپ ڈاکٹر اشوک کے پاس گئے تھے؟"

"ہاں۔"

"لیکن وہ تو......" انیل کہتے کہتے ٹھہر گیا۔

"Sexologist" ہے......" ان کی آواز نپی تلی تھی۔

"ہاں وہی تو—— مجھے حیرت ہوئی"—— انیل اپنے کمزور لفظوں سے پریشان تھا۔ یا شاید باپ کے سامنے کچھ اس طرح کے اظہار کے لئے لفظ نہیں جٹا پا رہا تھا......

''آخر آپ وہاں......؟''

اس نے نظریں نیچی کرلیں۔

وپن لال نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔'' کچھ پرابلم تھی اس لئے......''

''کوئی پرابلم تھی تو مجھے بتاتے...... میرے کئی ڈاکٹر دوست جاننے والے ہیں......''

''نہیں پرابلم کچھ دوسری طرح کی تھی۔''

انہوں نے دیکھا ــــــ انیل نے کچھ سمجھنے کے لئے آنکھیں ملانے کی کوشش کی۔ مگر ان آنکھوں کا درجہ حرارت کچھ اتنا زیادہ تھا کہ وہ تاب نہ لا سکا اور خفگی اوڑھے اپنے کمرے میں لوٹ گیا...... رات میں کھانا لگا تو انہوں نے دیکھا، انیل کتنی ہی بار چور نگاہوں سے اس کا جائزہ لیتا رہا...... جیسے پس و پیش میں ہو۔ آخر بابو جی کو...... ایک کشمکش ان کے اندر بھی چل رہی تھی۔ زندگی کے اتنے پڑاؤ میں کبھی اس طرح کے بے جا سوال سے ان کا واسطہ نہیں پڑا تھا۔

OO

آخر بچے سمجھتے کیا ہیں ــــــ Sexologist کے یہاں جانے میں برائی ہی کیا ہے ــــــ آخر اس عمر میں اپنے جذبات کو سلانے کا اپدیش گیتا کے کس ادھیائے میں دیا گیا ہے......؟ نہیں...... وہ اپنے طور پر مطمئن تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر انگریزی کی جاسوسی کتاب لئے دیر تک پڑھتے رہے۔ خیالوں میں خون کا گرما گرم رقص جاری تھا۔ انہیں اپنی دنیا کو مایوس اور پیروں فقیروں کی دنیا بنانے سے سروکار نہیں تھا...... وہ اس عمر میں بھی زندگی کی تمام رعنائیوں اور دھڑکنوں کو زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ ٹھیک اپنے جوان بچوں کی طرح...... اور وہ اپنے آپ سے پوری طرح مطمئن تھے۔

OO

ڈاکٹر کی دوائی نے اثر دکھایا تھا۔ وقتی طور پر جو کمزوری اور تھکان ان کے اندر پیدا ہوئی تھی وہ کسی قدر دور ہوگئی تھی۔ دو چار روز میں ہی وہ خود کو پہلے سے بہت اچھا محسوس کر رہے تھے۔ انہیں انیل سے زیادہ اپنے معاشرے میں بوڑھوں کے لئے پیدا کئے جانے والے احساس سے شکایت تھی۔ اچھا برا دیکھنے اور سمجھنے کی نگاہ نے ہی غلطی اور انہیں تقسیم کر رکھا تھا...... ایسا نہیں ہے، ان کے کئی دوست اپنی بیویوں کے ساتھ آج بھی سوتے تھے ــــــ مگر اس معاملے میں غلطی ہی کچھ

زیادہ دھارمک اور دقیانوسی ثابت ہوئی تھی ــــــ یا پھر بڑھتی عمر اور بچوں کو کھلانے والے احساس نے اسے کسی گمراہ کن مغالطے میں ڈال رکھا تھا ــــــ پرانی کتابوں کے پنوں سے 'جل کمبھیوں' کی طرح ملائم اور ریشم جیسی نلنی نے سر نکالا تو وہ سوچنے پر مجبور ہو گئے۔ اب تو نلنی کو دیکھے ہوئے بھی مدت ہو جاتی ہے اور جب سے نلنی نے نیچے اکیلے سونا شروع کیا ہے تو جیسے ان کی دنیا ہی بدل گئی...... اب پوچھتی تک نہیں کہ چائے ملی یا نہیں؟ چائے میں کتنی شکر لو گے...... دنیا کیوں بدلتی ہے ولوڈ ییر۔؟

○○

وہ خود سے پوچھ رہے تھے...... بدلتی اس لئے ہے ڈیئر کہ تم دنیا کو اپنی نظروں میں اداس اور بے رنگ کر دیتے ہو۔ جیسے نلنی نے ــــــ جیسے اس نے اب تمہارے ذکر تک کو چھوڑ دیا ہے۔ پہلے بستر کی سلوٹوں پر ہاتھ پھراتی تھی۔ ہولے ہولے اور خمار آلود آنکھوں سے صبح صبح، چائے کی قلفی لے کر آتی تھی...... وہ رومانی قصے، بڑھتی عمر کی جھریوں میں کیوں چھپ گئے ــــــ؟ اس لئے کہ بچوں کی دنیا حسین بنانے کے پیچھے تم اپنی دنیا کو بھول گئے۔......

نہیں...... اس دنیا کو زندہ کرنا ہوگا ــــــ!

وہ ایک مضبوط فیصلے کے تحت کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ دروازہ کھولا۔ جذبات کی گرمی نے ان کے اندر کے تندور میں آگ لگا دی تھی۔ نلنی کے کمرے تک گئے ــــــ کمرہ ہلکا سا بھڑا ہوا تھا ــــــ انہوں نے دروازے کو آہستہ سے کھولا ــــــ سامنے نلنی وکاس کی بچی اشونی کو جھری بھرے بازوؤں میں دبائے بے فکر خراٹے بھر رہی تھی ــــــ سینے سے آنچل ڈھلکا ہوا تھا۔ ٹخنوں تک ساڑی اٹھ گئی تھی۔ کچھ بھی ہو وہ اس منظر کو جوان احساس کے سہارے دیکھنا چاہتے تھے ــــــ ہاں جوان احساس کے سہارے اور گرم گرم انگاروں پر چلنا چاہتے تھے...... وہ جی بھر کر دیکھتے رہے...... لیکن وہ اس طرح کیوں دیکھنا چاہتے ہیں؟ کسی اجنبی لڑکی کو، خواہ وہ تماشا ہی کیوں نہ ہو ــــــ گھورتے تو کوئی بات بھی تھی ــــــ مگر وہ عورت جو چالیس برسوں تک پل پل ان کے پاس رہی ــــــ جس کے جسم کے ہر حصے، ہر سرد و گرم کو بخوبی پہچانتے ہیں ــــــ وہ اسے اس طرح...... اچانک وہ ٹھہر گئے ــــــ جیسے برف کی سلیوں میں، اچانک گرم گرم آتشدان سے نکلی سرخ لوہے کی تیلی پیوست کر دی گئی ہو ــــــ اور گرم گرم بھاپ سے برف پگھلی ہو ــــــ اندر

تک ـــــ اور گرم تیلی برف میں گھستی چلی گئی ہو ـــــ انہوں نے محسوس کیا۔ ہاں ظنی میں ابھی گرمی باقی ہے ـــــ اور بچوں کے ڈر سے اپنی بزدلی کی جھریوں میں، وہ اس گرمی کو پی کر بھول گئی تھی ـــــ

○○

دوسرے دن کھانے پر انہوں نے فیصلہ کن انداز میں وکاس سے کہا۔

''اشونی کو آج سے اپنے پاس ہی سلاؤ۔''

بہونوالہ لیتے لیتے ٹھہر گئی......

''اماں کو کچھ پریشانی ہے کیا ـــــ ؟''

''نہیں......'' وہ دھیرے سے بولے۔ ''مجھے پریشانی ہے۔''

''بابوجی......دراصل مجھے دقت ہو جاتی ہے۔ صبح میں دفتر جلد جانا پڑتا ہے۔''

وکاس بے چارگی سے انیل کی طرف دیکھ رہا تھا ـــــ

بہو دھیرے سے بولی ـــــ ''کمرے میں مچھر زیادہ ہیں۔ اماں کو وہاں آرام نہیں ہے کیا؟''

انیل نے کچھ شک سے ان کی طرف دیکھا ـــــ ''اماں آج کل زیادہ کھانسنے لگی ہیں اس وجہ سے تو نہیں......''

''نہیں......'' لقمہ ہاتھوں میں لے کر انہوں نے انیل وکاس اور دونوں بہوؤں کو دیکھا ـــــ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

انیل اور وکاس اب بھی حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے......وہ جیسے اندر ہی اندر ڈھہ رہے تھے۔

''آخر بوڑھے آدمی کو بوڑھی بیوی کی ضرورت کیوں پڑتی ہے......تم کیا سوچتے ہو میں نہیں جانتا ـــــ میں نہیں جانتا کہ تم میرے یا ہمارے بارے میں کیا سوچ سکتے ہو......تم نئے زمانے کے ہو ـــــ وہ ذرا طنز سے بولے ـــــ ''ماں باپ کے بارے میں یا یوں بھی اچھا برا کچھ بھی سوچنے کی ٹھیک یا ذمہ داری تمہاری ہے......رہی ہماری بات......کئی دنوں سے سوچ رہا تھا۔ تم لوگوں سے پوچھوں۔ ایک آدمی کنبہ میں بوڑھا ہو جاتا ہے تو تم یہ کیوں سوچتے ہو کہ وہ ابھی مرجائے

گا۔۔۔۔ یا اس کے مرنے میں بہت کم دن باقی ہیں۔ایسا تم پورے وثوق سے کیسے سوچ سکتے ہو......؟''

انیل نے شک کی حالت میں انہیں ٹٹولا۔۔۔۔ ''میں سمجھا نہیں بابو جی۔''

''سمجھو گے بھی نہیں......'' انہوں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔۔۔۔ اس لئے کہ تمہاری ماں اور ہم میں سے کسی کے بارے میں ابھی یہ طے نہیں ہوا کہ ہم بس مرنے والے ہیں......اور جب مرنے والے نہیں ہیں تو ساتھ رہیں گے اور رہی ضروری بات۔۔۔۔ تو رات برات ہم دونوں کو اٹھنے میں تکلیف ہوتی ہے۔۔۔۔ بڑھاپے میں پتی پتنی ایک دوسرے کے لئے سہارا ہوتے ہیں۔''

انہوں نے دیکھا۔اس آخری جملے سے انیل اور وکاس کے چہرے پر پڑی ہوئی کائی چھٹی تھی۔گو اب بھی ان کے چہرے بنے ہوئے تھے: جیسے اندر ابھی بھی اتھل پتھل مچی ہو......وہ کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔۔۔۔ باہر دروازے کے پاس ظلنی اشونی سے کھیل رہی تھی۔

OO

رات ہوگئی۔انہیں لگا جیسے کسی پُر اسرار طلسم کو توڑتے ہوئے وہ خواب کی دنیا میں واپس آگئے ہوں۔شاید برسوں بعد...... برسوں بعد ظلنی کے تھری بھرے بدن کی ٹھنڈی آگ چیخی تھی۔ وہ آج بڑھاپے کے احساس کو ایک دم سے بھلانے پر تلے تھے۔۔۔۔ انہوں نے ظلنی کو چھیڑا بھی۔ گدگدایا بھی۔موج میں آئے تو شرارت سے کمرے میں دوڑایا بھی...... جیسا کہ وہ شادی کے وقت تھے۔۔۔۔ وہ بالکل بچہ بن جانا چاہتے تھے۔۔۔۔ جیسے ظلنی کوئی شہزادی ہو اور شہزادی دیو کے قلعے میں قید ہو۔وہ ظلنی کو اس قید سے کسی شہزادے کی طرح چھڑا کر لائے تھے اور اس فتح کا بھرپور جشن منایا چاہتے تھے۔ وہ موج میں تھے۔کبھی چٹکلے سناتے۔ظلنی زور سے ہنستی تو انہیں اچھا لگتا۔انہوں نے پوچھا۔

''اتنے دنوں تک چپ کیوں رہیں؟''

ظلنی ہنسی۔''بچوں میں یاد ہی نہیں رہا کہ ہماری بھی......'' وہ اٹک سی گئی۔''اب تمہاری طبیعت کیسی رہتی ہے؟''

''بالکل چنگا۔'' وہ ہنسے۔

''نہیں دبلے ہوگئے ہو...... ئلنی کے چہرے پر اداسی تھی۔ غلطی میری بھی تھی۔ تمہاری فکر کرنی چھوڑ دی تھی......''

وہ اس کی ذات پر بچھ جارہے تھے...... جیسے پہلی بار، پہلی رات ئلنی کو آغوش میں بھرنے کے لئے انہوں نے پلنگ پر پھول سجائے تھے...... ئلنی کے استقبال کے لئے وہ ان خوشبوؤں کو ئلنی کے جسم سے دوبارہ بولتے ہوئے سننا چاہتے تھے—— وہ جیسے گہرے نشے میں ڈوب رہے تھے......

''سو جاؤ ئلنی...... مجھے نیند آرہی ہے۔ سنو...... اپنا مندر یہیں لے آنا...... ارے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ میری لائبریری، وہ ہنسے...... وہ تو اس طرف ہے...... تم دن بھر مندر میں رہنا...... میں کتابوں میں——'' وہ ہنس رہے تھے۔ مگر اب آنکھوں میں غنودگی لہرا رہی تھی۔ سو جاؤں؟

ہاں سو جاؤ—— ''ئلنی نے مسکراتے ہوئے سر پر ہاتھ رکھا۔''

ولوڈیئر...... وہ اپنی فتح پر نثار ہو رہے تھے...... ولوڈیئر، بچے بیوقوف ہوتے ہیں جو یہ نہیں سمجھ سکتے کہ ایک دن بوڑھے جاگ سکتے ہیں۔ تمام بوڑھے جاگ سکتے ہیں۔ ئلنی پاس میں لیٹ گئی۔ نیند نے ان پر بُری طرح حملہ کر دیا تھا۔ وہ گھوڑے بیچ کر دنیا و مافیا سے بے خبر ہو کر سو گئے تھے۔

صبح ہوگئی...... جیسے وہ ایک دم سے چونک گئے...... کوئی ہولے ہولے ان کا سر سہلا رہا تھا۔

''چائے!''

انہوں نے نظر گھمائی—— ئلنی کھڑی تھی—— کچھ دیر کے لئے وہ ایک دم چونک گئے۔ یہ ئلنی شادی کے فوراً بعد والی ئلنی سے بالکل الگ نہیں لگ رہی تھی—— وہ زیر لب مسکرائے—— ئلنی میز پر چائے کی قلفی رکھنے کے بعد سامنے سے کھڑکی کا پردہ ہٹا رہی تھی اور دھوپ چھن چھن کرتی ہوئی کمرے میں اتر رہی تھی۔

○○○

واپس لوٹتے ہوئے

کاش عشق زبان رکھتا/ تا کہ عاشقوں کے پردے اٹھ جاتے/ جب زبان
عشق کے راز اور انداز کو بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے، آسمان پکارتا ہے،
اے عشق کو چھپانے والے/ کیوں چھپاتا ہے؟ اون اور روئی میں آگ ہے/
جب تو اس کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے، وہ اور زیادہ ظاہر ہو جاتا ہے۔
-(مثنوی مولانا روم، دفتر سوم، صفحہ 448)

تب کمپیوٹر نہیں تھا

'تم اُسے بھول گئے نا؟'
'نہیں کہہ سکتا......'
'لیکن میں یقین سے کہہ سکتی ہوں، اِن پانچ مہینوں میں وہ تمہارے اندر کہیں نہیں ہے......'
رات کی تاریکی میں ترانہ کی آواز برف کی مانند سرد لگ رہی تھی......
'تمہیں ایسا یقین کیوں ہے؟'
وہ آہستہ سے ہنسی— 'کیونکہ وہ صرف ایک تصوراتی دنیا ہے— ایک پرستان— پرستان تو بچوں کا ہوتا ہے۔ مگر جب تم جیسے مرد جاتے ہو تو اپنے اندر کے تمام ترچور کے ساتھ— اندر کی تمام ناکام اور دبی خواہشات کے ساتھ۔ جسے ایک بیوی کے ساتھ بھی شیئر نہیں کر سکتے تم...... وہ تھوڑی سی سنجیدہ ہو گئی تھی۔ لیکن صرف پانچ مہینے میں اُسے بھول جانا۔ سانیال، کم سے کم تم

تو دوسرے مردوں کی طرح مت بن جاؤ—'

تاریکی مجھ پر حاوی ہو چکی ہے۔ ایک ایسی تاریکی جو چپ چاپ خاموشی سے بالکنی میں آنے کے باوجود، میرے پورے وجود پر حاوی ہے۔ سب کچھ اچانک ہوا تھا نا...... سب کچھ— جیسے اچانک پوری دنیا بدل گئی۔ اچانک جیسے لہروں کی طرح بدلتے وقت کے ہاتھ میں جادو کا ڈنڈا آ گیا۔ وقت نے اُس جادو کے ڈنڈے کو نچایا۔

'سنو عمر۔ اتنا تیز مت بہو۔ وہیں ٹھہر جاؤ...... نہیں پیچھے جاؤ......؟

زندگی کے جھرنے جیسے، بہتی عمر کی ناؤ کھیتا، چالیس کی پائیدان پر کھڑا شخص پھر سے جوان تھا— وقت نے جادو کا ڈنڈا پھر سے لہرایا۔ سامنے ایک بے حد حسین اپسرا کھڑی تھی......

لیکن شاید وقت یا جادو کے ڈنڈے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم وہاں، اس دنیا میں جاتے ہی رومانی ہو جاتے تھے— اُس دنیا میں جہاں بجلی کا ایک معمولی سوئچ آن کرتے ہی، کمپیوٹر اسکرین پر انٹرنیٹ کے دروازے کھل جاتے تھے......

یہاں جادو نہیں تھا—

جادو کا ڈبہ نہیں تھا—

عمر کا گھوڑا بھی نہیں— پر اسرار، پریوں کے دیس میں لہراتی ہوئی ایک ندی ہوتی تھی— حسن کا بازار ہوتا تھا اور اچانک کسی کرشمہ، جادو کی طرح کسی بھی ملک، کسی بھی مذہب، کسی بھی کمیونٹی کی کوئی لڑکی اچانک آپ کے سامنے آ کر پوچھ دیتی تھی— ڈو یو لائک رومانٹک چیٹ......؟

اور ایک بے حد حسین اور پر اسرار پرستان کا تصور اپنی تمام تر اداؤں اور جلوہ سامانی کے ساتھ 'کیم' یعنی 'نیٹ کیمرے' پر روشن ہو جاتا— کانوں میں مائیکروفون کے تار ہوتے— پانی کی لہروں پر جادوئی آواز کے ساتھ، عمر کا بہتا دریا کہیں بہت پیچھے آگ کے انگاروں کے درمیان گم ہو جاتا......

●

تب یہ دنیا شاید اس قدر نہیں پھیلی تھی......

تب یہ دنیا شاید اس قدر نہیں سکڑی تھی......

آسمان پر چاند روشن تھا۔ تارے ٹمٹما رہے تھے...... نیلے آسمان پر دو ایک بادلوں کے

ٹکڑے نظر آئے۔ مگر رم جھم چمکتے تاروں کے قافلوں نے جھومتے ہوئے بادلوں کی اس چادر کو اوڑھ لیا— پھر اس چادر کو وہیں چھوڑ، جھومتے کارواں کے ساتھ یہ تارے آگے بڑھ گئے......

تب کمپیوٹر نہیں تھا۔

انٹرنیٹ نہیں تھا۔ اپسرائیں نہیں تھیں...... عمر کی اپنی حدیں مقرر تھیں— اور ان حدوں سے تجاوز کرنا بغاوت سمجھا جاتا تھا۔ تب جادو کا گھوڑا نہیں تھا۔ مگر تب بھی تھی محبت— شاید موجودہ وقت سے زیادہ آزاد اور پلوٹونک— جسم کی جگہ سیدھے روح میں اُتر جانے والی محبت— تب چاندنی راتیں تھیں۔ سولہ برس پیچھے لوٹوں تو ہندوستان کے اچھے خاصے چھوٹے شہر کسی گاؤں یا قصبے جیسے لگتے ہیں۔ فون نہیں، ٹیلیفون نہیں۔ موبائیل تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ چھوٹے شہروں میں اپنی تمام تر دقتوں اور پریشانیوں کے باوجود بھی زندگی حسین اور پیاری لگتی تھی۔ تب محبت کی اپنی الگ شکل تھی۔ اپنی ترنگ اور اپنی لہر تھی— بارش اور خوشبو جیسے تصورات میں محبت کی گنگناتی موجوں کی طرح— اور آسمان پر دور چمکتے کسی ننھے چمکتے تارے کی طرح— مگر اس تارے کو دیکھ یا چھو لینا سب کے بس کی بات نہیں تھی—

لیکن شاید عمر کی نازک پائیدان پر ادب سے دوستی ہوتے ہی میرے لیے محبت کے معنی بھی بدل گئے تھے۔ ایک سنسناتی ہوا— جو آپ کے تمام جسم کو اپنی روانی میں بہالے جائے۔ بہتے یا اڑتے ہوئے آپ یہ بالکل بھی نہیں سوچیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے— بلکہ آپ اس لمحہ کی آنچ میں اپنے تمام وجود کو ڈال دیں اور ایک ایک لمحہ کی زندگی اور فضا سی کو محسوس کریں—

اور اچانک ترانہ کی شکل میں چھوٹے شہر میں جیسے خود کو خوش قسمت سمجھنے کا موقع مل گیا تھا— ہرنی سی ترانہ۔ اپنے وجود کی خوشبو کے ساتھ جیسے بس اسی کے لیے بنائی یا لکھی گئی ہو— چھوٹی چھوٹی دو چند ملاقاتوں کے بعد ہی ہوا میں اڑنے کا احساس— تب چھوٹے شہر کے لوگ شاید اتنے مہذب نہیں ہوئے تھے۔

یا اتنے زیادہ کمرشیل......

باتیں اڑنے لگی تھی۔ پھیلنے لگی تھیں۔ کالج سے گھر تک قصے کہانیوں کا بازار گرم ہونے لگا تھا۔ سانیال۔ ترانہ—

ترانہ— سانیال......

لیکن شاید ہم دونوں میں ہی بغاوت بھری تھی۔ یا ہم دونوں کے گھر والے اس بغاوت

سے واقف تھے۔ اس دن ترانہ ملی تو جیسے آہستہ آہستہ اپنی روانی میں بڑھتا پیار ایک نئی خوبصورت سی کہانی لکھنے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی تنگ ندی تھی۔ جہاں ہم کھڑے تھے۔ دور ایک ریہڑی والا پیاز اور آلو فروخت کر رہا تھا۔ دو چھوٹے گندے بچے ہماری طرف دیکھتے ہوئے ہنس رہے تھے......

ترانہ نے میرے ہاتھوں کو چھوا— 'تم گھر کیوں نہیں آئے۔ کیوں ڈرتے ہو......؟'

'نہیں۔ ڈرتا نہیں......'

'جھوٹ مت بولو۔ ڈر گئے ہو تم۔ کیونکہ شاید ہمارے قصے پھیلنے لگے ہیں۔ معلوم......

اس نے میرے ہاتھوں پر اپنی گرفت سخت کرلی— میں ساری ساری راتیں جاگتی ہوں۔ گھر کھڑکی، دروازے سب غائب ہو جاتے ہیں— جیسے کوئی ہوا محل ہو— میرا پورا چہرہ صرف ایک مسکراہٹ میں بدل جاتا ہے— اور تم ایک خوبصورت رات کے تصور میں ڈھل جاتے ہو...... میں تمہارا ہاتھ تھامتی ہوں۔ بوسہ لیتی ہوں، اڑتی ہوں۔ اور...... ہوش کہاں رہتا ہے مجھے۔ گھر کے آنگن میں برسوں پرانا ایک کنواں ہے— اس کنویں پر خاموش سی آکر بیٹھ جاتی ہوں۔ سب سوئے رہتے ہیں۔ اور میں آسمان کے چاند کو دیکھتی رہتی ہوں۔ چاند چھپ جاتا ہے...... اور تم...... آجاتے ہو...... یہ کیا ہے۔ سانیال...... کیا ہے...... یہ؟

'سوچنے دو......'

بتاؤ نا کیا ہے یہ......

ریہڑی والا پیاز لو، آلو لو کی صدائیں لگا رہا ہے۔ دونوں گندے بچے ابھی بھی ہماری طرف دیکھ رہے ہیں...... ترانہ کے ہاتھ میرے ہاتھوں پر سخت ہو گئے ہیں— بتاؤ نا، کیا ہے یہ......'

'بتاؤں......؟'

'ہاں...... بولو نا......'

'تمہارے اندر 'ڈوپامائن' اور 'نورے پنیکرین' کیمیکل کی سطح بڑھ گئی ہے—'

'وہاٹ'...... ترانہ چونکتی ہے— یہ کیا ہے...... ڈوپامائن؟'

'کیمیکل ہے...... جو دماغ میں خاموشی سے ایک نہیں ختم ہونے والی خوشی کی ترنگیں رکھ دیتا ہے۔'

'ترانہ مسکرائی— یعنی پیار۔ اور وہ۔ نورے......؟'

'نورے پنیکرین.....'

'ہاں وہی.....تم بھی نا سانیال، یہ کیا ہے؟'

'یہ بھی ایک کیمیکل ہے جو دل میں ہلچل اور جوش پیدا کرتا ہے.....'

ترانہ چونکی— 'تو تمہارا پیار بس اتنا ہے۔ ڈوپامائن اور نورے پنیکرین کی سطح تک— اتنا ہی ہے پیار.....ادب سے کیمسٹری کی دنیا کی طرف چلے جانا— اور کل جو میرے ساتھ ہوا۔ پتہ ہے— آدھی رات— گھر کا دروازہ کھول کر خاموشی سے گلی میں تمہاری تلاش میں نکل پڑی۔ پھر اچانک احساس ہوا۔ ارے، یہ میں کیا کر رہی ہوں۔ جاگی تو یکایک ڈر کا احساس ہوا۔ ساری گلی سنسان تھی۔ لوگ اس وقت مجھے دیکھتے تو پتہ نہیں کیا کہتے مجھے۔'

'کچھ نہیں۔ یہ سیروٹونن کی مسلسل گرتی ہوئی سطح کی وجہ سے ہوا.....'

'مطلب.....؟'

'محبت میں پاگل پن کی حد تک۔ خود کو فنا کر دینے کا احساس.....'

'ماروں گی تم کو.....' ترانہ زور سے کھلکھلائی تو ہمیں دیکھنے والے وہ دونوں بچے بھی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

بالکنی سے رات روشن تھی۔ تارے آنکھ مچولی کا کھیل' کھیل رہے تھے— سولہ برس پہلے کا احساس ایک دم بارش کی طرح برس جانا چاہتا تھا۔ تب دل و دماغ پر بس ایک ہی نام کا بسیرا تھا.....ترانہ۔ اور اس نام کے ساتھ ہی جیسے خوشبوؤں کے در کھل جاتے۔ ہوا سرسراتی ہوئی جیسے سارے بدن میں ایک طوفان اٹھا دیتی— اور تنہائی کے کسی پراسرار لمحے ترانہ کا ایک جملہ میرے ہوش و حواس پر حاوی ہو جاتا۔

'میں بس اتنا جانتی ہوں، جسے پیار کروں، وہ مجھے ملنا چاہئے۔'

اس دن دوپہر کے تین بج رہے ہوں گے۔ گھر کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی معلوم ہوا۔ ترانہ اسپتال میں ہے..... بھابھی نے بتاتے ہوئے ایک لمحہ کو میرا چہرہ دیکھا۔ چوکی پر خاموشی سے بیٹھے پاپا نے بھی میری طرف نظریں کر لیں۔ میں نے کتاب وہیں میز پر رکھ دی.....

'میں جا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے رات میں بھی نہ آؤں.....'

اتنا کہہ کر میں کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ میرے لیے کہنا مشکل تھا کہ ترانہ کے اندر ڈوپامائن' اور 'نورے پنیکرین' کی سطح کتنی بڑھ گئی تھی یا پھر 'سیروٹونن' کی سطح کتنی گھٹ گئی تھی— جو

اچانک پاگل پن کی حدوں کو چھوتے ہوئے وہ اسپتال میں بھرتی ہوگئی تھی— لیکن شاید سب کچھ معمول کے مطابق نہیں تھا۔ کیونکہ گذشتہ ہفتہ ہی اس نے میرے وجود کے ریشے ریشے میں گھلتے ہوئے اپنی جنگ کا اعلان کردیا تھا......

'میری سانسیں سیوئیوں کی طرح ٹوٹتی بکھرتی جارہی ہیں۔ کیونکہ یہ ہر وقت بس تمہیں دیکھنا چاہتی ہیں— تم کیوں چلے جاتے ہو سانیال— کیوں نہیں ایسے رہتے، جیسے میرے کمرے میں میرا ٹھہرا ہوا وقت رہتا ہے۔ اس لمحہ جب تمہیں سوچتے ہوئے تمہارے وجود میں گھل جانے کی خواہش ہوتی ہے......'

اس کی ہتھیلیوں میں انگارے جمع تھے...... 'کبھی اچانک ایک دھند سی کمرے میں بھر جاتی ہے۔ پھر دنیا بھر کی باتیں میرے کمرے میں گونجنے لگتی ہیں۔ تم یکا یک دھند میں کھو جاتے ہو تو لگتا ہے، یہ سانسوں کی سیوئیاں بھی ٹوٹ سی گئی ہوں...... کہیں مت جاؤ پلیز۔ میرے ساتھ رہو۔ اس سے پہلے سانیال، یہ سانسوں کی سیوئیاں بکھر جائیں......'

قدم تیز تیز اٹھ رہے تھے...... وہ جنرل وارڈ میں تھی۔ جہاں دو چار مریض اور بھی تھے۔ چھوٹے شہروں کی اپنی تاریخ اور تہذیب ہوتی ہے۔ اسے گھیرے ہوئے اس کے محلے کی کئی عورتیں جمع تھیں۔ مجھے دیکھ کر جو اجنبی سی خوشی اس کے چہرے پر لہلہائی، وہ الفاظ میں بیان نہیں کی جاسکتی۔ دوسرے ہی لمحہ جنرل وارڈ میں بہت سے لوگوں کی موجودگی کے باوجود وہ میری بانہوں میں تھی...... کمزور بیمار سی...... وہ مجھے بتا رہی تھی...... وہ بول نہیں پا رہی ہے...... آواز چھن گئی ہے۔ میں نے اسے زور سے سینے سے بھینچ لیا— ترانہ رو رہی تھی...... 'میں اسے سینے سے بھینچے ہوئے محبت میں ڈوبی انگلیوں کو اس کی آنکھوں کے پاس لہراتا کہہ رہا تھا۔'

''میں ہوں نا...... تمہارا سانیال۔ تمہاری آواز۔ تم کہتی تھی نا، ساری دنیا میں کوئی بھی تم سے اچھا نہیں بولتا۔ کسی کی بھی آواز تم سے زیادہ خوبصورت اور سحر انگیز نہیں ہوسکتی۔ ابھی اس لمحہ صرف تمہیں سننا ہے مجھ کو۔ کیونکہ میں اپنی ترانہ کے لیے روح، جسم اور نغمہ سب بن گیا ہوں...... تمہاری آواز...... اس آواز کا سنگیت تمہارے ہونٹوں پر رکھوں گا ترانہ اور تمہارے ہونٹ دنیا کی سب سے حسین لڑکی کے ہونٹ بن جائیں گے...... اور جب تم میرے سُر میں سُر ملا کر جواب دو گی تو یہ کائنات کی سب سے سُریلی آواز ہوگی...... مگر ترانہ...... آج میں تمہاری آواز ہوں۔ اپنی آواز کو بھول کر میری آواز کا لمس محسوس کرو......''

ترانہ سمٹ گئی...... میری پشت پر اس کی ہتھیلیاں سخت ہو گئیں۔ میری شرٹ گیلی ہو رہی تھی۔ میں نے اس کا چہرہ اٹھایا تو وہ مسکرا رہی تھی۔ ایسی مسکراہٹ — جسے شاید دنیا کی چند عظیم شاہکار مصوری کے نمونے میں ہی تلاش کیا جا سکے۔

اس رات میں جنرل وارڈ میں اس کے پاس والی چوکی پر ہی سویا۔ یہ سب جانتے ہوئے کہ چھوٹے شہر کی سنسنی دیتی ہوائیں ہم دونوں کی کہانی کی خوشبو کو لیتی ہوئی اڑ گئی ہیں۔

اب یہ کہانیاں اڑیں گی۔ پھیلیں گی...... مگر شاید آگے کی صورت حال پر غور و فکر کرتے ہوئے میں مطمئن تھا۔ یا پھر یوں کہنا چاہئے کہ اب مجھے کسی کی بھی پروا نہیں تھی —

●

تب نیٹ نہیں تھا، موبائیل بھی نہیں تھے...... چھوٹی چھوٹی آسانیاں بھی ہم سے بہت دور تھیں۔ لیکن محبت کا کرشمہ اور جادو اپنی پوری شدت کے ساتھ تب بھی موجود تھا، اور شاید آج سے بھی زیادہ تھا — باہر بالکنی میں دودھیا چاندنی کی روشنی میں ستاروں کا رقص جاری ہے۔ سولہ برس پہلے کے احساس زندہ ہو گئے ہیں...... میرے پورے وجود پر حاوی —

●

لیکن جیسے کل تک ایک کہانی شروع ہوتی تھی — دادی اماں، نانی اماں کے منہ سے نکلی کہانیاں — چاندنی راتوں میں — آسمانی چادر کے نیچے بچھی ہوئی پلنگوں پر — بچوں کی حیران آنکھوں کی اپنی ایک طلسمی دنیا بن جاتی...... ایک تھا راجہ...... ایک تھی رانی...... ایک تھا راکشس...... ایک تھا جادوگر...... سولہ برس بعد جدید ترین دنیا کی یہ کہانی شاید ایسے شروع ہو گی — ایک تھا کمپیوٹر۔ نیٹ پر ایک اپسرا لہرائی۔ مگر کوئی جادو نہیں۔ اپسرا نے پانی میں تیرتے ہوئے پوچھا...... ڈو یو لائک رومانٹک چیٹ؟ کی بورڈ پر تیرتے ہاتھوں نے چپکے سے ٹائپ کیا — اوہ بس......

اور اس اکیسویں صدی کی آغوش میں محبت کی ایک نئی کہانی کی شروعات ہو گئی تھی —

تم سے کیا رشتہ ہے اس کا؟

ترانہ زندگی میں آ گئی۔ ہم مہانگر کی بھیڑ کا حصہ بن گئے۔ پھر ایک چھوٹا سا بیٹا بھی ہو گیا۔ مہانگر کی بھیڑ کا حصہ بنتے ہوئے بھی اندر کا ادیب مرا یا سویا نہیں، کیونکہ ترانہ نے اس ادیب کو کسی بھی لمحے سونے نہیں دیا۔ اس کی محبت لمحاتی یا چھلاوہ نہیں تھی۔ وہ شادی کے بعد بھی سانیال کو

ایک محبوب کے طور پر ہی دیکھتی رہی۔ ادب سے سیریل کی دنیا تک جیسے ترانہ نے اپنا سب کچھ مجھ پر نچھاور کر دیا تھا۔ سولہ برسوں میں اگر کچھ تبدیلی آئی تھی تو صرف ایک جسمانی تبدیلی کہ اپنے ہی جسم سے اپنے پیار کا ایک حصہ نکالتے یا بڑا ہوتے دیکھنے کا احساس اُسے ایک پختہ عورت میں تبدیل کر گیا تھا۔ مگر اپنی تمام تر محسوسات کی سطح پر وہ صرف ترانہ رہی۔ وہی سولہ برس پہلے کی ترانہ......مگر ایک دن—

گھر میں کمپیوٹر آ گیا۔ نیٹ لگ گیا......اور ایک نئی کہانی شروع ہوگئی۔ کیا بہت پیار کرنے کے باوجود آپ میں کہیں کوئی ایک دبی ہوئی خواہش باقی رہ جاتی ہے—بہت پیار کرنے والے بچے اور بہت زیادہ چاہنے والی بیوی کے باوجود کیا نیٹ پر اپنی محبتوں کی دنیا آباد کرنے والا شخص کہیں تقسیم نہیں ہوتا ہے؟ نیٹ کی دنیا نوجوانوں، ادھیڑ اور بچوں کے لیے معصوم اور متجسس ذہن میں، سیکس دیکھنے والی ایک دنیا تھی— آرکٹ سے لے کر فیس بک، لو ہیپنس (Love Happens) ......ڈریم کمس ٹو ڈاٹ کام تک......فرضی ناموں کا سہارا لینے والی لڑکیوں اور لڑکوں کا ایک بڑا ریکیٹ پوری دنیا میں پھیلا ہوا تھا۔ بچوں سے بوڑھوں تک کے لیے تجسس کا ایک دلفریب سامان— کہیں کوئی جرم کا احساس بھی تھا میرے اندر— ترانہ کے رہتے ہوئے یہ دنیائیں کیوں آباد ہو جاتی ہیں؟ یعنی ہم کسی اجنبی لڑکی سے دوستی کرنا ہی کیوں چاہتے ہیں۔ وہ بھی صرف ایک نہیں......ہزاروں ملک، کمیونٹی، مذہب......نیٹ کی ایک پھیلی ہوئی دنیا— اس جادو نگریا میں سیراب ہونے کا احساس کیا حقیقت میں ایک جرم ہے؟ کبھی لگتا، سب کرتے ہیں...... پھر لگتا گھر، اپنوں کی بے پناہ محبت کے باوجود نئی تکنالوجی نے یکا یک، نہ ختم ہونے والے پیار کا ایک سرچشمہ اندر تک گھول دیا ہے— آپ محض گھر کے پیار سے سیراب نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ بہت سا پیار چاہیے آپ کو......کیونکہ خون کے اندر تک شامل ہوس کی آگ کل کی تہذیب تک تو خاموش رہی، لیکن آہستہ آہستہ نئی تکنالوجی کے آتے ہی دھماکہ خیز اور پر تشدد ہوگئی......لیکن شاید اس دنیا میں بھی بدصورت چہروں کے علاوہ کچھ عام اور بیحد اچھے چہرے بھی ہیں۔ برائیوں کے علاوہ بہت کچھ اچھائیاں بھی ہیں— سیکس کے علاوہ ایک دوسرے کو جاننے کی چاہت بھی ہے۔ اور اچانک ایک دن......

نیٹ اُپن کرتے ہی یا ہو اسکرین پر ایک میسیج ملا تھا—

معزز قارئین! اور یہیں سے اس کہانی کی شروعات ہوگئی۔ میسیج میں لکھا تھا— میرا نام

مہک ہے۔ مہک احمد۔ لاہور کی ہوں۔ عمر 23 سال، پانچ سال کی تھی، ماں گذر گئی۔ چھوٹی عمر سے ہی دو چیزوں کی عادت پڑگئی۔ ادب پڑھنے کی اور ٹیلی پیتھی — تمہاری ایک کہانی پڑھی۔ لگا یہ کہانی تو میری ہی ہے۔ پھر مہینہ لگ گیا۔ تمہارا میل آئی ڈی تلاش کرنے میں — زیادہ وقت نہیں ہے میرے پاس کچھ بھی کہنے کے لیے۔ شاید یہ پورا نظام اب اڑنے، تیز اڑنے کو مجبور کرتا ہے۔ کیونکہ پیار کرنے لگی ہوں تم سے — بغیر جانے، بغیر سمجھے۔ کیونکہ تمہاری کہانی کا لمس اندر تک محسوس کیا ہے میں نے۔ تمہاری عمر اگر 80 سال کی ہوئی تب بھی پیار کرتی تم سے۔ میرا میل مل جائے تو فوراً جواب دینا، اور ہاں — یاہو میسینجر میں تمہیں ایڈ کر رہی ہوں۔ ہو سکے تو شام میں آنا۔ ۲ بجے۔ پاکستان اور ہندستان کے وقت میں آدھے گھنٹے کا فرق ہے۔ آؤ گے نا؟ تمہاری مہک۔

پتہ نہیں، اس میسج کو کتنی بار پڑھا۔ پڑھتا گیا، ادب اور سیریل کی اس دنیا میں اس سے پہلے کتنی ہی چٹھیاں آئی تھیں میرے پاس۔ کتنی ہی لڑکیاں ٹکرائی تھیں۔ مگر یہ ای میل جیسے دل و دماغ پر چھا گیا تھا۔ جیسے ہوا میں اڑ رہا تھا۔ جیسے اندر، خون کا دوران بڑھ گیا تھا...... تمہاری عمر اگر ۸۰ سال بھی ہوتی' نظریں بار بار اس کے لکھے جملوں پر دوڑ رہی تھی۔ میری عمر ۲۳ سال ہے...... اندر کوئی تشنہ خواہشات والا شخص تھا کیا؟ یا چالیس کی دہلیز پر کھڑا ایک ادھیڑ جسے اس بات سے سکون ملا ہو کہ کوئی ۲۲۔۲۳ سال کی لڑکی بھی اس سے پیار کر سکتی ہے۔ میں نہیں جانتا وہ کون سا لمحہ تھا...... 'یورس سانیال' لکھنے تک میں اپنا ای میل اسے سینٹ کر چکا تھا۔

اور اسی شام وہ پہلی بار یاہو میسینجر پر آئی اور جیسے حقیقت میں پرستان جیسی کسی نئی دنیا کے دروازے میرے لیے کھلتے چلے گئے — پھر تھوڑے سے دن گزر گئے۔

●

جب آپ پیار کرتے ہیں تو پھر آپ کو بتانا نہیں پڑتا۔ مشک کی طرح اس کی خوشبو آپ کے پورے وجود سے پتہ چل جاتی ہے۔ کئی بار ترانہ کے سامنے آتے ہوئے، یا اسے بازوؤں میں لیتے ہوئے چور سا بھی احساس ہوا۔ مگر یہ بات ایک مرد کے طور پر پوری ایمانداری اور سچائی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ترانہ کے ساتھ محبت کے کسی بھی لمحے میں مہک کہیں بھی موجود نہیں تھی۔ تو کیا وہ ایک لمحاتی کشش سے زیادہ نہیں تھی اور ترانہ مکمل طور پر میرے وجود پر حاوی — یا یہ ترانہ کا پیار تھا کہ مہک میری زندگی میں داخل تو ہونا چاہتی تھی — مگر ہو نہیں پا رہی تھی یا یہ کہ ایک خاندان اور اس کی اخلاقیات سے بندھے ہونا بھی میری مجبوری تھی؟ یا پھر یہ کہ نیٹ کی اس چکا چوند دنیا میں ہم

مکمل وجود کے ساتھ کہاں ملتے ہیں۔ شاید یہ بات مجھے کسی حد تک مطمئن کر رہی تھی — مگر سرحد پار ہی سہی، مہک کا جسم موجود تھا اور میں نیٹ کے کیمرے میں اس کے ہونے کی موجودگی کو پڑھ چکا تھا — کیا یہ محبت تھی۔ کیا ترانہ کی محبت میں کہیں کوئی کمی آئی تھی، جس نے اچانک مجھے مہک کی طرف موڑ دیا تھا۔ یا پھر ایک چالیس پار کے مرد کی مردانگی کو ملنے والی تھوڑی سی راحت تھی — ایک کم عمر کی لڑکی کا ساتھ پا کر — خاص کر ایک ایسی لڑکی کا، جو نہ صرف اس سے پیار کرنے لگی تھی، بلکہ اسے حقیقتاً پانا بھی چاہتی تھی......

شاید ترانہ سے بہت دن تک یہ سب کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ کیونکہ جنگل میں آئی آندھی کی طرح ایک دن وہ اس سچ کو جان گئی...... وہ چپ تھی......

'کیا تم بھی اسے پیار کرتے ہو؟' ترانہ کے لفظ برف کی مانند سرد تھے۔

'نہیں جانتا......'

'شاید کرتے ہو......' اس نے لمبی سانس کھینچی...... مگر دوسرے ہی لمحہ اس کی آنکھوں میں برسوں کا پیار تھا — وہی دیوانگی اور جنون — ایک بار پھر اس نے مجھے میرے گلٹ کی کینچلی' میں جانے سے روک دیا تھا۔

جاتے ہوئے وہ صرف اتنا کہہ پائی — 'کوئی لڑکا اگر میری زندگی میں آجاتا تو تمہیں کیسا لگتا — ؟'

'سانیال' — اپنی ہی اگنی پریکشا سے گزرتے ہوئے میں خود سے بولا...... 'سانیال۔ کیا کرو گے — آگے کیا کرو گے سانیال...... وقت تمہیں بہالے جانا چاہتا ہے اور یہ، تمہارے اندر کوئی مضبوط سا احساس ہے — جو تمہیں روک رہا ہے۔

شام میں نیٹ آن کرتے ہی مہک احمد آن لائن مل گئی۔ اے او اے — آن لائن ہوتے ہی سب سے پہلے اے او اے یعنی السلام علیکم لکھتی تھی۔ پھر الفاظ کا دریا نئے یوٹوپیا کے دروازے کھول دیتا۔ اور اس وقت...... شاید میں کسی پرستان میں تھا۔ مہک کے لفظ خوشبو بن گئے تھے۔

چیٹ روم سے

اس نے پوچھا — اس نے بہت کچھ پوچھا۔ اس نے پوچھا کہ پرندے اور خواب میں بہتر کون ہے۔ جواب تھا...... پرندے۔ کیونکہ پرندے سانس بھی لیتے ہیں اور بارش یا ساون کے

موسم میں محبت کا ترانہ بھی گاتے ہیں — خواب تو ہرجائی ہوتے ہیں — آتے ہیں اور گم ہو جاتے ہیں۔

اس نے پوچھا — مور، تتلی اور بارش میں تمہیں کیا پسند ہے؟

اس نے پوچھا...... 'آسمان میں چمکنے والا، اس کی اپنی پسند کا ایک تارا، چودھویں کے چاند سے بھی بہتر کیوں نظر آتا ہے؟'

اس نے پوچھا — تم گلاب کیوں نہیں ہو، جسے میں توڑ کر اپنے سینے کے پاس لگا لیتی۔ تم میری دھڑکنیں میری سانس میں خوشبو کی طرح سما جاتے......

'تم تتلی کیوں نہیں ہو؟ جسے گلاب کی کیاریوں کے درمیان، مدہوش سی گھومتی ہوئی میں، پکڑنے کی کوشش میں کسی کانٹے سے اپنے ہاتھ زخمی کر لیتی ......اور رسنے والی خون کی ہر بوند میں پاگل کر دینے والی حسرت کے ساتھ محبت لکھ دیتی۔

اس نے پوچھا...... بارش میں دعا جیسی پہلی ہتھیلی پر گرنے والی پہلی بوند کیوں نہیں ہو تم؟ جسے چوم کر اپنی پیشانی سے لگا لیتی میں......اور پھر — نہ جینے کے خواب کے ساتھ — اسی ایک بارش کے قطرے میں تمہارے احساس کو لے کر گم ہو جاتی میں......

اس نے پوچھا...... تم سے پہلے یہ دنیا اتنی خوبصورت کیوں نہیں تھی۔ یا مجھے نہیں لگتی تھی؟

اس نے پوچھا...... ایک لمحے میں ہزاروں لمحے کیوں نہیں ہوتے؟ اور ہزاروں ہزار لمحے، تمہارے ساتھ کے — تمہارے ساتھ ٹھہر جانے والے —

اس نے پوچھا...... تمہارے ساتھ کی موت تو زندگی سے بھی زیادہ خوبصورت ہوگی نا — ؟ ہے نا...... آؤ...... میرا کانپتا ہوا ہاتھ اپنی ہتھیلیوں میں بھر کر آنکھیں موند لو...... ہمیشہ کے لیے — تمہارے ساتھ کا احساس اور میرا — زندگی کے سب سے خوبصورت نشے میں، جھومتا ہوا بدن — اور چمکتی گاتی آنکھیں...... یہ آنکھیں ایک ویران جزیرے میں کھلیں — جہاں دور تک تمہارے علاوہ کوئی نہ ہو......

اور پھر اس نے پوچھا — سنو! اتنا پہلے کیوں پیدا ہو گئے — ؟ مجھ سے کافی پہلے — ؟ یہ کیسا انتقام ہے تمہارا — ؟ چلو! پیدا ہو گئے...... تو میرا انتظار کیوں نہیں کیا؟ میرے خواب کیوں نہیں دیکھے؟ میری آہٹ کیوں نہیں محسوس کی؟ اس لیے کہ زمین کے ذرّے ذرّے میں، آگے کے بھی کئی شاندار برسوں تک میں کہیں نہیں تھی؟ مگر — میری خوشبو تو تھی جان...... میرا احساس تو

تھا۔ میری دھوپ...... میرا سایہ تو تھا...... بس تم ہی محسوس نہیں کر پائے......'

اس نے پوچھا...... تم نے شادی کیوں کر لی مجھ سے پہلے؟ میرا انتظار کیوں نہیں کیا؟

اس نے پوچھا...... تمہیں کون کون مجھ سے زیادہ جانتا ہے؟ لیکن میں چاہتی ہوں تمہیں کوئی بھی مجھ سے زیادہ نہ جانے—— تمہارے اندر، پھول، خوشبو اور خواب سے زیادہ میری مہک ہو—— بیوی، چاند اور سورج سے زیادہ میں تمہیں دیکھوں—— سرسراتی ہوا سے زیادہ میں تمہیں چھوؤں...... میں تمہارے اندر کسی موسلا دھار بارش سی اُتر کر بس برستی رہوں۔ تا عمر......'

اور اس نے کہا...... ہماری زندگی کی پالکی کسی ویران جزیرے میں پھولوں کی سیج پر رکھی ہو۔ مرا سر تمہارے شانے پر ہو...... اور تمہاری بانہیں نازک شاخوں کی طرح میرے بدن پر پھیل جائیں...... اور پھر اس نے پوچھا—— سچ کہنا...... میرے سوا اس وقت کوئی اور تو تمہارے اندر سانس نہیں لے رہا ہے—— ہے نا......؟

اس نے ٹھہر کر پوچھا...... تمہاری بیوی؟

●

گہرے سناٹے اور پر اسرار اُداسی کی اپنی ایک الگ شاعری ہوتی ہے۔ ہوا کی اپنے موسیقی—— خوشبو کے اپنے سرتال—— اور محبت کے اپنے راگ ہوتے ہیں۔ ممکن تھا یہ کہانی جنم ہی نہیں لیتی۔ وہ بھی میرے یعنی سیلان جیسے شخص کے لیے جس کی زندگی کے لیے ٹھہرے ہوئے پانی یا سمندر کی، خاموش لہروں کی مثال ہی دی جا سکتی ہے۔ لیکن معاف کیجئے گا، اس کہانی کے شروع ہونے کا وقت سنگین ہے۔ اور اس کہانی کے لیے آج کے سنگین وقت اور وقت سے جڑے انسانی حقوق کو گواہ بنانا ضروری—— اور اس سے بھی ضروری یہ—— کہ محبت کی رواں لہروں پر تیرتے محبوب کا یہ سوچنا...... کہ ہم پرندے یا جانور کیوں نہیں—— اور انسانی حقوق کا آنکھیں تریر کر یہ دیکھنا کہ یہ مردانہ سماج تو ہمیشہ سے حقوق نسواں کا استحصال کرتا رہا ہے—— لیکن معاف کیجئے گا یہاں کسی عورت کے حقوق کا استحصال نہیں ہوا ہے—— بلکہ خاموشی سے چالیس پار کے ایک شوہر کی زندگی میں آہستہ سے ایک اپسرا آجاتی ہے—— وہ اپسرا پوچھتی ہے...... میرا حق تو صرف محبت ہے...... تو یہ حق مجھے کیوں نہیں دیتے تم...... اور اس سے بھی زیادہ یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ عورت' کوئی بیوی نہیں تھی—— ایک 22 سال کی دوشیزہ تھی' جس کی آنکھیں میرے یعنی سیلان کے لیے ہر لمحہ بارش، خواب اور اندر دھنش بن جاتے تھے۔

اس نے ٹھہر کر پوچھا...... مجھے میرا حق لاؤ۔

جواب میں کہا گیا...... یہ حق کسی اور کا ہے۔

'نہیں؟'

'حق دوسرے کا ہوتا تو تم یہاں نہیں ہوتے۔ بولو، کیوں ہو یہاں تم۔ اس کے پاس کیوں نہیں ہو، جس کے پاس تمہیں ہونا چاہئے—'

شاید وہ کھلکھلائی تھی...... لیکن وہ اب بھی پوچھ رہی تھی...... اور اس نے پوچھا...... 'میرا حق مجھے دیتے ہوئے ڈرتے کیوں ہو۔ محبت کا یہ حق کھو چکے ہوتے تو کیا میں یہاں ہوتی— تمہارے پاس— تمہاری سانسوں کے قریب...... تمہاری جنبش، تمہاری بیتابیوں میں— تمہاری حیرانیوں میں...... اور تمہارے ہاتھوں کی انگلیوں میں...... جو کمپیوٹر پر ٹائپ کرتے ہوئے حرف سے محبت اور لفظ سے شدت بن جاتے ہیں...... آنکھوں سے خواب اور ہونٹوں سے نغمہ بن جاتے ہیں۔'

اور پھر اس نے کہا۔ سنو سیلان...... میں اڑتی ہوں۔ تیرتی ہوں۔ شبنم کے دھاگے سے لہروں کے جال بنتی ہوں۔ وقت چھوٹے چھوٹے رنگین پروں والی تتلیوں کی طرح اڑتا ہے— میرے آس پاس۔ ان تتلیوں کو تمہارا احساس سمجھ کر اپنی مٹھیوں میں جکڑ لیتی ہوں۔ سارے کا سارا دن میرے جسم پر 'ڈینے' ہوتے ہیں۔ ست رنگے آسمان میں اڑنے کے لیے اور ساری رات...... میں تتلیوں میں اڑتے وقت کو تمہارے احساس کے ساتھ — ہرے ربن سے اپنے جوڑے میں بند کر لیتی ہوں......

اور پھر اس نے پوچھا...... 'تمہارے بیٹے کو پتہ ہے کہ تمہاری زندگی میں اس کی ماں کے علاوہ بھی کوئی آ گیا ہے؟'

یہ وہی وقت تھا، جب وینس کا دل دھڑکا تھا— اور سیاروں کے جھرمٹ میں نویں سیارے کے روپ میں جانے گئے پلوٹو کو دیس نکالا دیا گیا تھا۔

●

میں نے خاموشی سے نیٹ بند کر دیا۔ کچھ دیر تک خاموشی سے کمپیوٹر کے خالی اسکرین کو دیکھتا رہا...... حرف غائب تھے۔ نہیں۔ حرف چمک رہے تھے...... اور ان حروف کے میل سے آہستہ آہستہ سپنوں کی وادی سے آئی کسی دوشیزہ کا چہرہ بن رہا تھا— مہک احمد...... آنکھیں جیسے

سیلان کی آنکھوں کے جزیرے میں گم...... پھول کی پنکھڑیوں سے ہونٹوں پر کے سارے لفظ جیسے بس صرف اسی کے لیے تھے...... جسم میں کپکپی تھی۔ میں اٹھا۔ بازو والا دروازہ کھولا اور بالکنی سے جھانکتے نیلگوں آسمان میں، مہک احمد کے ٹائپ کیئے الفاظ کو اندر تک محسوس کرنے لگا— وہ جیسے بالکل سامنے تھی اور پوچھ رہی تھی— کتنا پیار کرتے ہو مجھے......؟

جیسے تارے ٹوٹے۔ جیسے دھماکہ ہوا۔ جیسے بدن میں لرزش ہوئی......

'یکم' پر ٹائپ کرتے دنیا کے سب سے حسین ہاتھوں میں تھرتھراہٹ تھی اور آنکھیں پاکیزہ اور شرارتی، دونوں طرح کی مسکراہٹ لیے اس کی طرف دیکھ رہی تھی......

'بولتے کیوں نہیں۔ کتنا پیار کرتے ہو مجھے......'

'نہیں کرتا......' میں نے آہستہ سے دو لفظ ٹائپ کیے۔ وہ موسلا دھار بارش کی طرح برس گئی...... 'کرتے ہو' مگر ڈرتے بھی ہو...... اچھا، ترانہ کتنا پیار کرتی ہے تمہیں......؟'

'بہت۔'

'مجھ سے زیادہ۔'

'ہاں۔'

'نہیں— مجھ سے زیادہ نہیں کر سکتی......' وہ مطمئن تھی...... مجھ سے زیادہ کوئی نہیں کر سکتا۔ خود تمہارے جسم میں دھڑکنے والا دل بھی نہیں...... نگاہوں سے محبت کا ترانہ چھیڑنے والی آنکھیں بھی نہیں...... اور— میرا نام لینے والے تمہارے ہونٹ بھی تمہیں اتنا پیار نہیں کر سکتے جتنا میں کرتی ہوں......

مہک رک گئی ہے— 'یکم' پر میرے اندر چل رہی 'یہ سونامی' یا طوفان کو دیکھا جا سکتا ہے۔ آنکھوں میں ایک لمحہ کو ہزاروں پرچھائیاں آکر رخصت ہو گئیں...... دوبارہ اس کے ہاتھ ٹائپ پر ہیں۔ میرا دل انجانے سوالوں کے سیلاب سے دھڑک اٹھا ہے......

اس نے پوچھا...... اچھا سنو...... کتنا چھوا ہے ترانہ نے تم کو...... میری بھی خواہش ہوتی ہے۔ ساون بن جانے کی۔ بارش بن جانے کی...... ترانہ کی انگلیاں تمہارے بدن پر کیسے مچلتی ہیں......؟ بہت آہستہ...... بہت خاموشی سے— پیڑ کے سبز پتے پر گرنے والی اوس کی بوندوں کی طرح— کتنا دیکھا ہے اس نے تمہارے جسم کو— کتنا جانا ہے ترانہ نے—؟ صرف اتنا ہی نا، جتنا ایک بیوی نبھائے جانے والے رشتوں کی بنیاد پر جان سکتی ہے— صرف اتنا ہی نا، جتنا کہ

ایک جسم کا دردیا بھوک ہوتی ہے...... صرف اتنا ہی نا، کہ ایک وقت، اس بھوک میں ایک ساتھ واسنا کی لہریں بھی شامل ہو جاتی ہوں گی— لیکن...... وصال کے کسی بھی لمحے وہ کتنا تم کو جان پاتی ہے— ؟ تمہارے روم روم میں کتنے خواب دیکھ پاتی ہے— ؟ تمہاری سانسوں کی ہلچل میں کتنا ڈھونڈ پاتی ہے تم کو؟ ترانہ تم میں ہر بار ایک نئے سیلان کو دیکھنے کی کوشش کرتی ہے یا نہیں......؟ ایک نئے گیت، نئے سپنے، اور نئے سیلان کو......

مہک ٹائپ کرتی جارہی تھی اور جیسے ہر لمحہ حیرتوں کی بارش میں، میں نہاتا جارہا تھا— کیا ہے یہ؟ مہک کے آتے ہی اتنا بے بس کیوں ہو جاتا ہوں میں۔ اندر سے سوالوں کے کیکٹس خاموشی سے سر نکال رہے تھے...... ایک بارہ سال کا بیٹا ہے تمہارا...... مکمل جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے کی تیاری میں— مہک اس سے دس ہی سال تو بڑی ہے۔ ایک ہندوستانی خاندان میں جنم لینے کے بعد عمر کی چالیس بہاروں کو پار کرنے کا مطلب جانتے ہو؟ ایک سنجیدہ شخصیت۔ خاندان کے لیے...... بچوں کے لیے اپنی ذمے داریوں کو محسوس کرنے والا— اس عمر میں آنے کے بعد تو ایک پختہ مرد سانس لیتا ہے— جسے تمہارے مہذب سماج میں عزت واحترام کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے...... کیونکہ یہ سماج جانتا ہے، یہ شخص ہمارے مہذب سماج کی علامت ہے— یہ شخص محبت نہیں کر سکتا۔ کسی دوسرے کے ساتھ سیکس کے بارے میں سوچنا اس کے لیے کسی قیامت سے کم نہیں۔ اور یہاں کسی بھی طرح کے ناممکنہ حادثے کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ پھر بھی مہک آچکی تھی۔ ایک ایسے چور دروازے سے، جو پتہ نہیں میرے اندر کیسے کھلا رہ گیا تھا...... وہ آگئی تھی...... وہ اپنی محبت کا حق مانگ رہی تھی......

ترانہ— اور سوال

محبت ایک عجیب سا سچ ہے کہ اس سچ کو جانے والے راستے بھی نہ سمجھ میں آنے والے اور خوشبو سے مہکے ہوتے ہیں— اور محبت کی طرح، محبت سے آنے والی زمینی اور جغرافیائی تبدیلیاں بھی اسی سچ کا ایک حصہ ہیں— ارتقاء کی اس لمبی ریس میں ہماری اس عالمی برادری کے ساتھ چمتکار اور معجزے کی ایک نہ ختم ہونے والی قطار بھی شامل ہے۔ معجزے سے ایجاد تک، برین کو ڈاؤن کوڈ کیے جانے سے لے کر انسان کے کلون بنائے جانے تک— جادو کی اس نگری میں عرصہ پہلے وینس کا دل دھڑکنا بند ہو گیا— آسمان پر چمکتا ایک ننھا سا روشن تارا، جس کا نام محبت

تھا، ٹوٹا اور اس کی کرچیاں دور تک آسمانی چادر میں پھیلتی چلی گئیں۔ اور یہ وہی وقت تھا، جب محبت کی یہ نئی کہانی لکھی جا رہی تھی۔ اور یہ وہی وقت تھا، جب کہکشاں میں پھیلی ہوئی نہ ختم ہونے والی اداسی ہماری اور آپ کی اس دنیا سے پوچھ رہی تھی...... کہ محبت گم کہاں ہوگئی— اور برسوں بعد ایجاد و اختراع، معجزہ اور جراسک پارک کے اس عہد میں۔ ایک نئی کہانی خود بہ خود شروع ہوتی چلی گئی— سیلان کے روپ میں— ترانہ کے روپ میں— یا پھر مہک احمد کے روپ میں—

لیکن اس بار یہ کہانی مختلف تھی۔

جیسے اس دن— خاموشی کے جلتے ریگستان میں پانی کی ایک بوند ٹپ سے گری اور بھاپ بن کر اڑ گئی۔

مہک غائب تھی— اور ترانہ اپنے مکمل وجود کے ساتھ وینس کا دھڑکتا ہوا دل بن گئی تھی—

'اچھا تم نے کیا سوچا؟' ترانہ کی آنکھیں میری آنکھوں میں جھانک رہی تھیں۔

'پتہ نہیں۔'

ایک ایمانداری تو ہے تم میں— محبت کا اظہار کرنے سے نہیں گھبراتے کہ تمہیں بھی مہک سے پیار ہے......

میں خاموشی سے خلاء میں دیکھتا رہا۔

'اچھا بتاؤ، تم اس سے رومانی باتیں بھی کرتے ہو؟'

'ہاں......'

'بہت؟'

'شاید۔'

'سامنے ہوتے تو شاید اس کا ہاتھ بھی تھام لیتے......' ترانہ کی آواز برف جیسی یخ تھی—

'شاید......'

'شاید نہیں۔ تھام لیتے۔ یا ممکن ہے، اس سے بھی آگے— ' وہ کہتے کہتے رکی...... مہک سے بات کرتے ہوئے ایک لمحہ کو بھی میری یاد نہیں آئی...... مان لو۔ ایک دن میں تم نے اس کے ساتھ تین گھنٹے گذارے تو ایک مہینے میں ۹۰ گھنٹے ہوئے نا...... یاد ہے سانیال—

ترانہ نے میرے ہاتھوں کو تھام لیا۔ اس کی آنکھیں پرانی یادوں کو محسوس کرتے ہوئے تھوڑا سا نم تھیں — یاد ہے...... تم کہا کرتے تھے...... جو مرد اپنی بیوی کے علاوہ، باہر کی دنیا میں کسی دوسری عورت سے ملا۔ اُسی پیار کے جذبے سے...... تو سمجھو اس نے اپنا ایک عضو کاٹ لیا۔ یاد ہے نا...... بار بار ملتا رہا تھا تو...... باہر کی دنیا میں۔ پرائی عورتوں سے...... تو اس کے سارے عضو کٹ گئے۔ یاد کرو کہتے تھے نا...... یہ بھی کہتے تھے...... کہ پھر ایسا آدمی، اسی پختہ جذبے کے ساتھ، اپنی بیوی سے بانہیں پھیلا کر کیسے مل سکتا ہے؟ اور اپنے بچوں سے؟ کیونکہ اپنے پیار کے سارے اعضاء کو کھو چکا ہے وہ...... ترانہ نے اس کی طرف دیکھا — مسکرائی — تمہارے اعضاء تو سلامت ہیں نا سانیال؟ میرے لیے؟ اور میرے بچوں کے لیے......؟

میرے اندر جیسے میری اپنی چیخ برف کی متعدد سلیوں کے درمیان لہولہان تھی...... اس ایک لمحہ اپنے ہی درد سے لڑتے، ابھرتے شاید میں نے کوئی فیصلہ لے لیا تھا۔

'وہ نیٹ کا سچ ہے، جسم کا نہیں......'

'اوہ!'...... ترانہ زور سے ہنس پڑی۔

'نیٹ سارے کرتے ہیں۔ کون نہیں کرتا۔ لوگ تو ایسی باتیں اپنی بیویوں سے شیئر بھی نہیں کرتے......'

'میں لوگوں کو نہیں جانتی جان۔ سانیال کو جانتی ہوں'...... ترانہ کی آواز میں کہیں بھی غصہ کا اظہار نہیں تھا...... تم نے کہا، وہ نیٹ کا سچ ہے۔ جسم کا نہیں۔ تم اس سے رومانٹک چیٹ بھی کرتے تھے؟

ہاں......

ہاتھ تھامتے تھے......؟

ہاں......

کس (Kiss)......؟

شاید......

شاید نہیں ہاں بولو

ہاں......

ہونٹوں پر......

ہاں......

چلو ہونٹوں پر، آنکھوں پر یا تمہاری مرضی۔ کیونکہ پیار کے کسی بھی لمحے کی شدت کو بیان کرنا آسان نہیں ہوتا۔ مگر تم شاید سامنے ہوتے تو...... وہ سب کرتے نا سانیال......؟'

'سامنے ہوتے تو نا......؟'

'سامنے ہوتے تو شاید سنامی بن جاتے...... ہے نا۔ ڈرو مت سانیال...... کبھی کبھی بہت چھوٹی چھوٹی باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ کل دیر تک سوچتی رہی۔ ہاری کہاں میں؟ سولہ برسوں میں تمہارے اندر کہاں ایک خلا چھوڑ دیا۔ کہاں سانیال' بتاؤ مجھے۔ اس سے یہ مت سمجھنا کہ میں تمہیں روکوں گی۔ سمجھاؤں گی۔ کیونکہ محبت تم سے میں نے کیا ہے۔ میں نے بہت محبت کی ہے۔ سانسوں سے سانسوں کی محبت۔ پہلی سانس سے آخری سانس کے سارے پھول۔ بس اسی کچی عمر میں تمہارے نام چن لیے — روکوں گی نہیں۔ سوچ لوں گی کہ شاید اتنی ہی محبت لکھی تھی میری تقدیر میں — کیونکہ جہاں محبت پر روک یا بندھن لگ جائے، وہاں محبت نہیں ہوتی۔ خود غرضی آجاتی ہے......

'پھر یہ سب......'

'تم بتاؤ۔ کیا سوچا ہے تم نے......'

'میری آواز جیسے گلے میں پھنس گئی — مہک شادی کرنا چاہتی ہے مجھ سے......'

'تو......'

'وہ کہتی ہے، وہ انڈیا آجائے گی......'

'تو لے آؤ نا......' ترانہ نے آہستہ سے میرا ہاتھ تھام لیا — لے آؤ مہک کو......

'اور تم......؟'

ترانہ آہستہ سے ہنسی...... جانتے ہو نا اپنی ترانہ کو — بچپن سے بٹوارا کبھی پسند نہیں آیا...... بس مہک کا ہاتھ تمہارے ہاتھوں میں پکڑا کر چپکے سے نکل جاؤں گی۔'

اس نے سر گھما لیا تھا......

●

میرے اندر جیسے زور سے بادل گرجے تھے...... اور اس درمیان سولہ برسوں کی ترانہ کا ہر رنگ و روپ — ہر سنگار نظروں کے سامنے تھا...... لگا، پرستان میں جانا کہیں زیادہ آسان ہوتا

ہے۔ پتھر جیسی حقیقت پر چلنا مشکل— آنکھوں میں کہیں چھن سے مہک کی پایل بج گئی— اور آنکھوں کی پتلیوں پر ترانہ چھا گئی...... تو لے آؤ نا اسے......

●

مجھے نہیں معلوم، داستان، قصے کہانیوں کی اب تک کی تاریخ میں ایک بیوی نایکا یا ہیروئن کیوں نہیں بنتی—؟

مرد کی زندگی میں آنے والی دوسری یا تیسری عورت ہی 'نایکا' یا ہیروئن کیوں بنتی ہے۔ کیا صرف اس لیے کہ ایک مکمل زندگی کے ساون اور سپنے اپنے مرد کو بانٹتے ہوئے وہ کہیں کھو جاتی ہے۔ مگر اپنی تکمیل کے ساتھ ایک ہی گھر میں ہر لمحہ، دکھ سکھ کی سب سے بڑی ہیروئن وہی رہتی ہے۔

میں کسی بھی طرح کے ایلیوژن یا ڈائیلما میں نہیں تھا—

محبت کے جھرنے اور بارش سے الگ میں ترانہ کے تمام رنگوں کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور اس دن— شاید میرے جذبات مہک تک پہنچ گئے تھے۔ اس نے آخری بار پوچھا تھا—

'بولو۔ میں دہلی آجاؤں؟ میں تم پر بوجھ نہیں بنوں گی سانیال۔ معاشی طور سے بھی نہیں۔ بس تمہارا ساتھ، تمہارا وجود چاہئے۔ ہاں۔ یا نا...... مجھے اسی لمحے تمہارا جواب چاہئے۔'

میرے اندر کسی بھی طرح کے پٹاخے یا آتش بازی کے چھوٹنے کی کوئی آواز نہیں تھی......

میں نے آہستہ سے ٹائپ کیا— بہت سوچ سمجھ کر— 'نہیں۔'

مہک 'سائن آؤٹ کر گئی تھی۔ کیم پر اندھیرا تھا۔ مہک غائب تھی—

پھر وہ نہیں ملی......

اور دیکھتے ہی دیکھتے لمحے، مہینوں کا سفر کر گئے۔ شاید پانچ مہینے گزر گئے تھے۔

●

شاید یہ وہی وقت تھا، جب آسمان پر ایک ٹوٹتے تارے کو دور تک لکیر، پھر صفر میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھ کر میں گھبرا گیا تھا...... لیکن شاید ایسی ہی کسی دھند، کسی خاموشی سے ایک نہ بھولنے والے، آنسوؤں میں ڈوبے گیت کی تخلیق ہو جاتی ہے...... یا پھر صدیوں میں کوئی ایسا ہی پیار، تاج محل جیسی زندہ تخلیق دے کر محبت کرنے والوں کے لیے ایک مثال بن جاتا ہے۔

•

کوئی کوئی پیار
'تاج محل' ہو جاتا ہے۔

لیکن شاید تب سوچا نہیں تھا، آسمان میں ٹوٹتے ہوئے تارے میں آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے گیت کو سننا اور پھر محبت کی علامت تاج محل کو محسوس کرنا، آنے والے دنوں میں مجھے اس طرح حیران بھی کر سکتا ہے—

ترانہ پوچھ رہی تھی۔ تم اسے بھول گئے نا؟

'شاید......

'اگر وہ سچ مچ آجاتی تو؟'

'نہیں جانتا؟'

'جھوٹ بولتے ہو......' پیار کے لحاتی احساس سے اس کی آنکھیں شرارتی بن جاتیں— وہ آتی تو خود پر قابو نہیں رکھ پاتے۔

'نہیں کہہ سکتا۔'

'ایسا کیوں ہوتا ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہوتے ہوئے بھی اچانک زندگی میں خاموشی سے کوئی دوسرا کیوں آجاتا ہے— وہ ٹھٹھکی— کہیں کوئی کمی نہیں تھی، شاید؟ کہیں کوئی خالی پن بھی نہیں چھوڑا تھا ہم نے— جیسے ان رشتوں میں اکثر ایسے خالی پن رہ جاتے ہیں— خالی دروازے جیسے— جس چور دروازے سے کوئی بھی آپ تک چھلانگ لگا سکتا ہے— لیکن شاید ایک بار ملی زندگی کا اپنا کوئی آزاد صفحہ بھی ہوتا ہے۔ اس صفحے پر کسی دوسرے کا نام لکھتے ہوئے شاید کوئی 'گلٹ' یا پچھتاوا بھی نہیں جاگتا— کیونکہ یہ اپنے اور اپنے دل کے درمیان کی بے حد اکیلی اور ذاتی سڑک ہوتی ہے، جس پر اس کی بیوی اور بچے نہیں چل سکتے۔

ترانہ اس کی طرف مڑی— اچھا مان لو۔ وہ اچانک کسی لمحہ تمہارے سامنے آکر کھڑی ہو جائے تو—؟ کیا کرو گے تم سانیال—؟ منع کر دو گے—؟ جانے کو کہو گے یا کہو گے کہ اس سے کوئی رشتہ نہیں ہے تمہارا یا پھر...... بولو......؟

آسمان میں کتنے میزائل ایک ساتھ چھوٹتے چلے گئے تھے۔

•

بشنواز نے چوں حکایت می کند
و از جدائی ہا شکایت می کند
(مولانا روم کی مثنوی سے)

(بانسری سے سنو وہ کیا بیان کرتی ہے،
ہماری جدائیوں کا شکوہ بیان کرتی ہے۔)

وہ ایک عام سی صبح تھی۔ لیکن شاید وہ بے حد عام سی صبح نہیں تھی۔ وہ بیحد عام سی صبح ہو بھی نہیں سکتی تھی — اور خاص کر سانیال کے لیے — کہ بس ایک رات پہلے ہی مہک کے گم ہو جانے کا تذکرہ ہوا تھا۔ ایک رات پہلے تک سب کچھ معمول پر تھا۔ دریا کے پانی میں پتھر کی اچھال کے بعد تیز بھنور تو بنے تھے لیکن پھر سناٹا چھا گیا تھا — لہریں خاموش تھیں — اور اچانک اس خوبصورت، جگمگاتی صبح جیسے پانی میں ایک کے بعد ایک کتنے ہی پتھر اچھال دیئے گئے...... اور ندی کے پانی میں لہروں کے کتنے ہی جال بنتے چلے گئے۔

صبح سات بجے کی دستک......

بیل کی گھنٹی جیسے کسی انجانے طوفان کو لے کر آئی تھی۔ دروازہ کھولنے والا بیٹا حیرت سے سامنے کھڑی عورت کو دیکھ رہا تھا — سانولا چہرہ، آسمانی رنگ کی قمیض اور اس سے میچ کرتی شلوار۔ کندھے سے جھولتا ہوا دوپٹہ......

'تم آصف ہونا......؟'

ترانہ کے سامنے آنے تک وہ اس کے گلے سے لگ کر بہنوں کی طرح رو پڑی تھی......

اور آپ ترانہ......؟ میں مہک ہوں۔ پاکستان سے کل رات ہی آگئی۔ سانیال کہاں ہے؟

جیسے کمرے میں اچانک تیز زلزلہ آگیا ہو۔ بیٹا حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ترانہ کی آنکھیں ابھی بھی معصومیت میں ڈوبی یا اپنی کیفیت کو چھپاتی ہوئی اس کی طرف دیکھ رہی تھیں — میں باہر نکلا تو دو پراسرار آنکھیں جیسے مجھے دیکھ کر طلسماتی کہانیوں سے نکلی، پتھر والی ساحرہ میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ وہ انگلی سے میری طرف اشارہ کرتی رہی تھی — لفظ گونگے تھے اور چہرہ، جسم جیسے جذبات کی کتاب بن گئے تھے — ایسی کتاب جو شاید آج تک کسی بھی انسانی زندگی کو نصیب نہ ہوئے ہوں گے۔

مہک کی آواز میں لرزش تھی......

'ترانہ، ہم کیا دو منٹ کے لیے اکیلے میں مل سکتے ہیں۔ باتیں کر سکتے ہیں......؟

بیٹا، ماں کی بانہوں میں سہما سا تھا— ترانہ مسکراتی ہوئی کہہ رہی تھی......

'ہاں۔ کیوں نہیں......'

لیکن شاید ترانہ کی آنکھیں میری طرف دیکھ پانے میں کامیاب نہیں ہوئی تھیں— یا میں ترانہ، یا بیٹے کی طرف دیکھ پانے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا— وہ کب اور کیسے میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئی، مجھے پتہ بھی نہیں چلا۔

'تمہارا کمرہ کون سا ہے؟'

اس کی آواز برف جیسی تھی۔ پاکستانی لباس سے اٹھنے والی خوشبو، ہندوستانی خوشبو سے مختلف نہیں لگی۔

●

کمرہ جیسے دنیا کے کسی آٹھویں عجوبے میں تبدیل ہو گیا تھا— اندر تک جیسے آگ میں ڈوبی ایک لہر تھی— شاید جس نے میرے پورے وجود کو اس وقت جلا کر رکھ دیا تھا۔ لفظ کسی سرنگ یا گپھا میں کھو گئے تھے۔ باہر بیٹے یا ترانہ کے بارے میں کچھ بھی سوچ پانا مشکل تھا۔ کمرے میں یکا یک زلزلہ آ گیا تھا۔

وہ مجھے چھو رہی تھی...... انگلیوں کے پور پور کو، ناخن کو...... میرے لباس کو...... میرے وجود کو...... میری روح کو یا میری سانسوں کو......

'تم سانیال ہو...... نا۔ کیسے یقین کروں خود پر...... نہیں، اتنی خوش قسمت نہیں ہو سکتی میں...... تم...... اتنے قریب۔ اتنے پاس۔ نہیں۔ رو کو مت...... چھونے دو مجھے۔ یہ تمہاری انگلیاں ہیں۔ یہ تمہارا لباس۔ تمہیں دیکھ سکتی ہوں۔ چھو سکتی ہوں۔ اتنی قریب ہوں تم سے اور تمہیں دیکھتے ہوئے...... زندہ کیسے ہوں...... سانیال— کاش، مجھے موت آ جاتی، اس لمحے...... تمہیں تم دیکھتے، محسوس کرتے اور جیتے ہوئے...... تم نے کبھی سوچا نہیں تھا نا، کہ مہک یہاں بھی آ سکتی ہے۔ ایک دن تمہارے دیس، تمہارے شہر، تمہارے گھر میں— اپنی سانسوں کی گونج میں خاموشی سے ایک گھروندہ بنا کر رکھ لیا تھا تمہیں— سوچا بھی نہیں کہ ایسا کرتے ہوئے تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہو گی— تم ٹھیک ہو نا...... بولتے کیوں نہیں سانیال۔'

’تم کیسے آئی......‘ آہستہ سے کوہ قاف کی وادیوں سے جیسے کوئی آواز گونجی ہو۔ جیسے جسم میں سمائی سانسوں نے سب کچھ بھول کر اس کے نام کا کلمہ پڑھنا شروع کر دیا ہو۔

’یونیورسٹی کی طرف سے دہلی کی قدیم عمارتوں کو دیکھنے کے لیے 20 لڑکے اور لڑکیوں کا ایک وفد آیا ہے۔ ہم کل رات ہی آگئے تھے۔ رات کا ایک ایک لمحہ جیسے تمہارے نام کی جاگتی تسبیح بن گیا تھا۔ ساری رات تمہارے ہونے کی عبادت سے گزرتی رہی۔ پھر سورج کی پہلی کرن کے ساتھ سجدے سے فارغ ہوئی اور کسی کو بتائے بغیر......‘

’تم نے کسی کو بتایا بھی نہیں......؟‘

’نہیں......‘

اگر کسی نے تمہاری تلاش شروع کی......؟ زلزلے کا یہ پہلا جھٹکا تھا۔

وہ معصوم سی اب بھی میری انگلیوں کو چھو رہی تھی۔ ’حنا جانتی ہے تمہارے بارے میں......مگر زیادہ نہیں......‘

’حنا کون ہے؟‘

’میری ایک دوست......‘ وہ آہستہ سے بولی...... آج دس بجے ہمیں پولس ہیڈ کوارٹر بھی جانا ہے...... فارملٹی پوری کرنے...... لیکن میں تو جا ہی نہیں سکتی......‘ وہ کانپ رہی تھی...... اس کی آنکھیں بند تھیں......بس تمہارے ہونے کے احساس کو خود میں سمیٹ لینا چاہتی ہوں۔ پھر......’وہ آہستہ سے بولی...... دنیا میں آنکھیں کھولنے کا مقصد پورا ہو جائے گا میرا......‘ وہ بچوں کی طرح میری طرف مڑی...... پھر کمرے کو دیکھنا شروع کیا...... یہ تمہارا بستر ہے نا۔ تم اسی بستر پر سوتے ہو نا......لیٹ جاؤں؟ تھوڑی دیر...... بستر کی شکن میں بھی تم ہو گے — ہے نا سانیال؟ تمہارا لمس ہوگا...... لے لوں یہ سارے کے سارے لمس...... بولو نا......؟

جھٹکے سے وہ آگے بڑھی اور بستر پر لیٹ گئی...... لمحے بھر کو آنکھیں بند کر لیں...... پھر اٹھی...... آنچل برابر کیا۔ وہ ہنس تھی۔ نہیں وہ رو رہی تھی...... ’چلو اپنے گھر بھی آگئی۔ اپنے بستر پر بھی سو لیا...... مجھے رکھ لو نا یہیں......؟ مجھے کہیں مت جانے دو— میں تو بس تمہارے لیے آئی ہوں۔ مجھے روک لو نا یہیں...... مجھے مت جانے دو۔‘

کہیں دور مولانا روم کی بانسری کے سر گونج رہے تھے...... بانسری سے سنو، وہ کیا بیان کرتی ہے...... بانسری نے ان لمحوں کو قیامت کے لمحوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ میرا چہرہ کسی بت کا

چہرہ تھا۔ باہر ترانہ اور بیٹے کے بارے میں سوچتے ہوئے اندیشے کے ہزاروں گھنے بادلوں کے درمیان کہیں خود کو محسوس کر رہا تھا...... اور مہک قریب، بند آنکھیں لیے میرے سینے پر سر رکھے، آنکھیں بند کیے جیسے کسی اور ہی دنیا میں گم تھی...... میں شاید کانپ رہا تھا...... آہستہ سے اپنا کانپتا ہاتھ اس کی پیٹھ پر رکھا تو وہ جیسے میرے سینے، میری سانسوں میں گم ہوتی چلی گئی — لیکن اندیشے، سوالوں کی برچھیاں لے کر کھڑے تھے...... 'مہک نہیں گئی تو؟ مہک کو جانے کے لیے کیسے کہوں؟ مہک کے نہیں جانے سے کتنا بڑا ہنگامہ کھڑا ہو سکتا ہے۔' معاملہ پاکستان سے آئی ہوئی ایک لڑکی کا ہے۔ اور لڑکی غائب؟ پھر؟ دہشت گردی سے لے کر سوسائیڈ بم تک کتنی کہانیاں اس ایک لمحے مجھے پریشان کر گئی تھی۔ مگر شاید مہک سے کچھ بھی کہہ پانا ممکن نہیں تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ مہک میرے وجود سے الگ ہو...... اس کی محبت، معمولی نشے سے آگے بڑھ کر، عبادت بن کر میرے وجود میں گھل رہی تھی...... پھر جیسے وقت ٹھہر گیا...... وہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی۔ میری طرف مڑی۔ پتھرائی آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک جزیرہ آباد تھا۔

'جا رہی ہوں۔ تمہیں پریشان نہیں کروں گی...... اپنے محبوب کو پریشان دیکھ بھی نہیں سکتی۔ مگر تمہیں ایک بار دیکھنا ضروری تھا۔ تمہیں چھونا۔ تمہارے لمس کو اپنے اندر محفوظ کرنا......'

اس کے چہرے پر انوکھی سی مسکراہٹ تھی...... مجھے روکنا مت...... اور ہاں۔ اس غلط فہمی میں مت رہنا کہ میں پاکستان واپس چلی جاؤں گی......'

وہ آہستہ سے ہنسی...... 'تمہارے دیس' تمہارے شہر میں رہ نہیں سکتی۔ لیکن...... مر تو سکتی ہوں نا......!'

آگے بڑھ کر اس نے اپنے گرم ہونٹ میرے ہونٹ پر رکھ دیے۔ پھر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتا، محسوس ہوا، جیسے پاؤں کے نیچے کی زمین کانپ رہی ہو۔ بانسری کی آواز قریب آ گئی تھی۔

'جب تو نے مجھے مست کر دیا، مجھ پر حد جاری نہ کرو
شریعت مستوں پر حد جاری نہیں کرتی ہے۔

چونکہ مستم کردۂ حدّم مزن
شرع مستاں رانیاد حد زدن

ooo

نفرت کے دنوں میں

(26/11 کے نام—)

(**نــــوٹ:** خدا کو حاضر و ناظر جان کر، کہ جو کچھ یہاں بیان کیا جا رہا ہے، اس کا ایک ایک لفظ سچ پر مبنی ہے۔ ممکن ہے پہلی بار میں آپ کو یقین نہ آئے یا ممکن ہے، سارے واقعات، جو اس کہانی میں پیش آئے ہیں، آپ کو بے حد ڈرامائی نظر آئیں— اور آپ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں — کہ یہ کہانی تو بہت فلمی ہے دوست، لیکن اس کے باوجود— یقین کیجئے، اس کہانی کا جھوٹ سے دور دور کا واسطہ نہیں۔ یا پھر...... جیسے یہ کہا جائے کہ دھندلے دھندلے سے بادلوں سے ڈھکے چاند کے درمیان ایک بڑھیا رہتی ہے...... یا پھر — جانے دیجئے — اگر آپ 9/11 یا 26/11 جیسے ناقابل فراموش حادثوں پر، دل پر پتھر رکھتے ہوئے یقین کر سکتے ہیں تو ان واقعات پر بھی یقین کیجئے جو بے حد ڈرامائی انداز یا ماحول میں اس کہانی میں واقع ہوئے ہیں......)

''بے حد نفرت کرنے والے کیڑے بھی۔
یہیں کہیں آس پاس ہوتے ہیں۔
جہاں محبت کی لہریں اپنی پوری رفتار میں بہہ رہی ہوتی ہیں۔''

•

شاید کوئی دکھ اتنا گہرا نہیں ہوسکتا، جیسا کہ میں اس وقت محسوس کر رہا ہوں۔ آنکھوں کے آگے دھند کی چادر میں غیر واضح مکالمے یا آہٹیں جمع ہو رہی ہیں۔ لیکن جیسا، بھیانک سردی کے دنوں میں اکثر ہوتا ہے، آپ کے کان سن...... سے ہو جاتے ہیں۔ پھر چہرے پر صرف برف کی ایک گیلی ٹھنڈی چادر رہ جاتی ہے، جو دماغ سے لے کر آپ کے سارے جسم کو سلا دیتی ہے۔ اس کنکنپا دینے والی سردی میں نفرت کے ان مکالموں کو سن رہا ہوں، جو موت یا سنامی سے زیادہ بے رحم ہیں میرے لیے— جہاں تیزی سے پھیلتی جنگل کی آگ کی طرح صرف وہ شور رہ گئے ہیں جو اس وقت بھی میرے کانوں میں گونج رہے ہیں— تیز تیز ڈرم بجنے کی آوازوں کے درمیان خنزیر کے گوشت بھوننے کی بدبو پھیل رہی ہے، اور تہذیب و تمدن سے بے نیاز انسانوں کے ہڑدنگ......

لا......لا......لا...... ہے...... ہو...... ہو...... ہو...... ڈرم...... ڈرم......

شاید انسان ہونے کے احساس سے جانور ہونے کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں— اندر ہی کہیں باہر نکلنے کی تیاری میں بیٹھا ہوتا ہے ایک جنگلی جانور، جو ایک ہی جھٹکے میں محبت کے احساس کو پنجے سے مار کر، باہر آکر ٹھٹھا کر ہنستا ہے— صرف ایک جھٹکے میں— جیسے ذبح کیے ہوئے جانور ہوتے ہیں...... یا عام طور پر ہماری فلموں کے ایسے اداکار جو مینٹل ڈس آرڈر یا ملٹی پل ڈس آرڈر کے شکار ہو کر ایک ہی وقت میں دلکش اور بے حد بدصورت جنگلی شکل دکھا کر ناظرین سے واہ واہی لوٹ لیے جاتے ہیں......

وہ ہنس رہے ہیں۔ قہقہہ لگا رہے ہیں۔ اُنہیں ایک منچ دیا گیا ہے۔ کسی بھی بڑے ٹی وی چینل کا ایک بڑا منچ— وہ ناچ رہے ہیں۔ گا رہے ہیں۔ وہ اپنے مخصوص لہجے میں ہمارا دل بہلا رہے ہیں— اینکر سے لے کر معزز ججوں کو بھی وہ پسند ہیں۔ وہ مسلسل ہنسا رہے ہیں۔ پھر وہ ہمارے ہی خاندان کے ممبر ہو جاتے ہیں کہ ہم ان کا انتظار کرنے لگتے ہیں— ایک عام خاندان

کے ممبر کی طرح، جہاں نہ دشمنی ہے نہ دیواریں — نہ سرحد، نا باڑ کے کنٹیلے تار۔ جیسے منظر بدلتا ہے۔ وہ اچانک کنٹیلے تار کے، اس پار کے دشمن بن جاتے ہیں — ایک بھیانک دشمن۔ کسی بجرنگ دل، کسی سنگھ کا شخص اچانک سیٹ پر آتا ہے اور اس کے گلے پر ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ آج وہ ناچ نہیں رہا ہے۔ ہنسا نہیں رہا ہے، رو نہیں رہا ہے، آج وہ سارا رول بھول کر ایک عام آدمی یا سہا ہوا جانور بن گیا ہے — جہاں اس پر وہی، اسے عزت سے نوازنے والے چیخ رہے ہیں...... 'یہ ہمارے روزگار تک چھین کر لے جاتے ہیں......'

اداکار نہیں، صرف ایک غیر محفوظ شخص رہ گیا ہے — جنگ کی پیشن گوئیوں کے درمیان — جنگلوں سے گزرتی فوجی ٹکڑیاں — آسمان پر منڈراتے ہیلی کاپٹر — سیاستدانوں کے بیان اور جنگ کے شعلے......

میں شاید اس گھنے کہرے یا جنوری کی اس کپکپا دینے والی بھیانک سردی کا ایک حصہ بن گیا ہوں۔ اور جیسا کہ بچپن کے کسی لمحے بابوجی کی آنکھوں میں اس جنگ کے شعلوں کو پڑھنے کی ہمت کی تھی میں نے......

''جنگ کبھی نہیں ختم ہوتی...... جاری رہتی ہے......''

''لیکن کیسے......؟''

''بس یہ ہماری بھول ہوتی ہے، جو سمجھتے ہیں کہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ ہم خیریت سے ہیں۔ لیکن دراصل ایسا نہیں ہوتا......''

''پھر۔''

''ایک جنگ سے نکل کر ہم اہستہ آہستہ صفر میں دوسرے بڑے اور بھیانک جنگ کی طرف بڑھتے رہتے ہیں۔ چین کی جنگ ختم ہوئی کیا — ؟ 62 کو گزرے تو جیسے ایک صدی گزر گئی۔ لیکن کیا چین سے ہماری نفرت مٹی — ؟ یہ نفرت ہی جنگ ہے۔ جو تھوڑی دیر کے۔ لیے جنگ پر روک یا سیز فائر لگا دیتی ہے۔ لیکن جنگ نہ ہونے، نہ دکھنے پر بھی جاری رہتی ہے — پاکستان سے جنگ ختم ہوئی کیا......؟ بابوجی اس وقت اپنے 'سنکھی' لہجے میں بول رہے تھے — ''وہ یہاں موجود ہے۔ یہاں...... وہ اپنے دل کے پاس اشارہ کر رہے تھے — 'اپنی ہر لمحے تیز ہوتی نفرتوں میں — جبکہ یہ جنگ تو 66 یا 71 میں ہی ختم ہوگئی تھی۔ لیکن کیا اصل میں ختم ہوئی......؟ جنگ ایک بار شروع ہو جائے تو ختم نہیں ہوتی۔ وہ یہیں کہیں رہ جاتی ہے۔ کبھی ہمارے بدبودار کپڑوں میں

کبھی پورے جسم میں......"

جیسے میزائلوں کا رقص جاری ہو......!
جیسے جنگی ٹینک، بارودی شعلے اگل رہے ہوں۔ آسمان پر دور تک دھوئیں کی چادر......
آہستہ آہستہ اس نہ ختم ہونے والے دھوئیں میں ایک سہما سا معصوم چہرہ ابھرتا ہے۔
'جو پوچھوں سچ بتانا...... بتاؤ گے نا......؟'
'ہاں...... پہلے پوچھو تو......'
'دیکھو جھوٹ بالکل نہیں......'
'ارے بابا...... بکو تو......'
'اچھا سوچنے دو...... چلو سوچ لیا......' اس کی بے حد حسین آنکھوں میں، پیار کی گہرائی کے ساتھ ایک خوف بھی شامل تھا۔
'دوسروں کی طرح کہیں تم بھی ہم سے نفرت تو نہیں کرتے......؟'
جیسے پورے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ ایک لمحہ کو لگا، جنگ کے دھماکے کو میرے چہرے پر آرام سے پڑھا جا سکتا ہے۔ یقینی طور پر دوسری طرف 'کیمرے میں، میرے چہرے پر آئی کپکپی کو وہ شاید پڑھ رہی تھی......
'سچ بتانا...... جھوٹ بالکل نہیں......'
'ہاں تم سے پہلے نفرت کرتا تھا......'
ایک لمحہ کو محسوس ہوا، جیسے اس کے چہرے کا رنگ بدلا ہو—— دوسرے ہی لمحے وہ اپنے خوفزدہ چہرے پر پیار کے بے شمار رنگ اور پھولوں کی ہزار خوشبوؤں کا تحفہ لے کر موجود تھی——
'مجھ سے...... یا میرے ملک سے......؟'
'تمہارے ملک سے......'
اب میری باری تھی—— جیسے اندر مندر کی گھنٹیاں یا شنکھ پھونکنے کی جگہ مسلسل پھٹنے والے آر ڈی ایکس یا بم کے دھماکے جاگ گئے ہوں——
'شائستہ، اگر یہی سوال میں تم سے پوچھوں تو......؟'
'شاید...... میں نفرت کر سکتی تھی...... تمہارے یہاں ایک چوہا بھی مرتا ہے تو الزام

میرے لوگوں پر آتا ہے— مگر اپنی کہوں تو میں نفرت نہیں کر سکی......'

'لیکن کیوں؟'

'تاریخ کی کتابوں نے تمہارے ملک کے لیے اتنی نفرتیں لکھیں کہ یہ نفرت آہستہ آہستہ پیار میں بدل گئی۔ پھر تم مل گئے۔'

کمرے میں گھنے کہرے کے بادل چھا گئے ہیں۔ میں اس گھنے کہرے سے باہر بھی نکلنا چاہوں تو شاید یہ ممکن نہیں ہے۔ کیا سیاست صرف جنگ کے آر یا جنگ کے پار دیکھتی ہے۔ یعنی کہیں کوئی آپشن نہیں— جنگ اکیلا آپشن ہے— شاید ہماری حفاظت ہماری زندگی کے لیے— سب جیسے اندھیرے میں ایک بھیانک تاریخ لکھے جانے کے لیے......شاید اسی لیے کبھی جھوٹی تاریخ سے پیار نہیں ہو سکا مجھے— شاید اسی لیے ایک بار اس نے بے حد ناراضگی سے کہا تھا۔

'تاریخ میں ہم صرف دو، نفرت کرنے والے ملک ہیں جن کے درمیان کبھی بھی امن کی کوششیں ممکن نہیں۔'

ایک کھلکھلاہٹ بھری آواز ابھری تھی......لیکن کتنا عجیب اتفاق ہے۔ دیکھو نا۔ میرا ایک بھائی یہاں کی آرمی میں ہے۔ جانتے ہو، وہ ہم پر اپنا غصہ کیسے نکالتا ہے— 'ایک ہم ہیں جو لڑ رہے ہیں— حملے کے منصوبے بناتے ہیں— اور تم لوگ...... جب دیکھو ان کے ٹی وی سیریل سے چپکے رہتے ہو۔'

وہ ہنسی تو اس کے سفید دانت موتیوں کی طرح سامنے آ گئے۔

'تمہارے ساس بہو کے ناٹک...... ہمارے یہاں سڑکیں سنسان ہو جاتی ہیں— ٹی وی کو گھیر کر پورا خاندان بیٹھ جاتا ہے۔ اف تمہارے یہاں کی فلمیں...... مجھے تو خان بریگیڈ سے زیادہ اچھا لگتا ہے تمہارا اکشے کمار— مجھے ساڑیاں بے حد پسند ہیں۔ بندی بھی......ایک بات بتاؤں...... پائل اور سندور بھی مجھے بے حد پسند ہے......دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر ایک بھیانک سناٹا تھا— لیکن میرے مذہب میں منع ہے......' وہ پوچھ رہی تھی......''یہ مذہب بنے ہی کیوں ہیں؟ مذہب نہیں ہوتے تو—؟ تقسیم نہیں ہوتی نا......؟ تقسیم نہیں ہوتی تو......؟'

وہ بچوں کی طرح تالیاں بجا کر جیسے نیلے آسمان سے گرتی بارش کی بوندوں کو اپنی مٹھیوں میں بھر رہی تھی......

•

مذہب نہیں ہوتے تو؟ بٹوارا نہیں ہوتا تو؟

شاید سوالوں کے بھنور سے ہم باہر ہی نہیں نکل پاتے۔ ایک کے بعد دوسرا سوال...... نفرت نہ ہوتی تو......؟ بابری مسجد یا گودھرا نہ ہوتا تو؟ کشمیر نہ ہوتا تو؟ رنگ نسل بھید نہ ہوتے تو......؟ جیسے خیالوں کی تنگ گلی میں چلتے چلتے میرے پاؤں تھک جاتے ہیں— آنکھیں کھولتے ہی جیسے نفرت کے رنگوں سے ہم خود ہی جڑنے لگتے ہیں......ارے......وہ نہاتے نہیں......گئو ماس کھاتے ہیں۔ گھر میں تلواریں رکھتے ہیں...... کھانے میں تھوک دیتے ہیں۔ ملیچھ...... چار چار شادیاں کرتے ہیں۔ بہنوں میں بھی شادی ہو جاتی ہے......ارے چچیری، خلیری، ممیری کیا بہنیں نہیں ہوتیں؟ وہ بچپن سے ہی دہشت کی شمشیریں اٹھائے بڑے ہو جاتے ہیں...... ہمارے مندروں کو توڑا......نادر شاہ سے اورنگ زیب تک ایک سے بڑھ کر ایک گھنونی کہانیاں— جیسے بچپن سے پڑھائی نہیں، ذہن میں بھر دی گئی تھیں۔ کافر......ہم سب کافر ہیں ان کے لیے— جنہیں مار دیا جانا ہی مذہب ہے۔ ان کے مذہب میں ایک ہی آپشن ہے— سالے مذہب کے نام پر جانوروں کی قربانی دیتے دیتے ہمیں بھی قربانی کا بکرا سمجھ بیٹھے ہیں— مذہبی کتابوں سے ملک کے سیاسی بٹوارے تک وہی ایک نفرت کا باب اگر چاروں طرف سے آپ کو گھیرتا ہو تو......؟ بچپن سے رٹائے گئے لفظ، جوان ہوتے ہی نفرت کے شور اور بے ہنگم آوازوں میں بدل جاتے ہیں— ڈم......ڈم......ڈم...... جیسے ہزاروں کی تعداد میں آدم خور جمع ہوں۔ سالوں نے پاکستان بنا لیا، اب یہاں بھی پاکستان بنانے کا سپنا دیکھنے لگے...... آپس میں مرو سالو...... ایران...... افغانستان...... چیچنیا...... فلسطین سے لے کر عراق اور افغانستان کی کہانیوں میں عام چہرے والا مسلمان بھی اسامہ بن لادن ہی نظر آتا ہے۔ ہاں، پھر گھر سے باہر نکلتے ہی معصوم چہرے والے مسلم دوستوں میں شاید یہ نفرت کے رنگ ایکدم سے ایسے چھپ جاتے تھے جیسے بادلوں نے سورج کو اپنے محاصرے میں لے لیا ہو...... لیکن کب تک...... پھر کوئی فساد کوئی فرقہ وارانہ فساد— کشمیر سے کنیا کماری تک 'آتنک واد' اور پاکستان کی آتنک۔ فیکٹری...... جہاں مساد سے طالبان اور لشکر طیبہ تک اپنے خونی بیانوں اور فتووں میں عام مسلمانوں سے ہمیں ایک دوری بنائے رکھنے کی صلاح دیتے تھے— اکشر دھام پر حملے سے سنسد بھون کے گلیاروں تک آنکھوں میں ہر ایک

مسلم چہرے کی ایک درندہ صفت تصویر ہی آنکھوں میں باقی رہتی تھی — مغلوں کا حملہ، حکومت، ہندوؤں سے جزیہ لینے سے لے کر نئے اسلامی دہشت گرد مجاہدین تک — ایسے میں کسی بھی مسلم رہنما یا پاکستان کے ذریعے کیا گیا کوئی بھی تبصرہ ان زہر آلود تیروں کو کمان سے نکالنے کی تیاری کر چکا ہوتا تھا —

اور بے حد سادگی کے ساتھ، مجھے یہ تسلیم کرنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں کہ میں ہی سوچتا تھا اور شاید اسی لیے میں مسلمانوں سے کبھی محبت نہیں کر پایا۔ وہ میرے اندر نفرت بھرے رنگوں کا ایک حصہ ہی رہے۔ لیکن شاید تب تک، جب تک شائستہ نہیں ملی تھی — شائستہ فہیم خاں، پاکستان کی دلّی کہے جانے والے لاہور کے میر قاسم محلے میں رہنے والی — اور جیسا کہ میں نے اسے بتایا، کہ ایک ایسا ہی میر قاسم جان محلہ میری دلّی میں ہے تو اس کی آنکھیں بھی، کبوتروں کے محلے میں...... اڑتے کبوتروں کے درمیان 'دلّی' فلم کی اداکارہ کی طرح مٹک...... مٹک جیسے گیتوں پر تھرکنے لگی تھیں — ٹھیک ویسے ہی جیسے سونم کپور اس گیت میں مردوں کی طرح تال ٹھوکتی، کمر لچکاتی، سر پر کبوتر رکھ کر رقص کرتی اپنی بھرپور اداؤں میں ایک بے حد المست سی لہر بن گئی تھی — ٹھیک یہی گیت سرحد پار بھی گایا جا رہا تھا — اداکارائیں بدل گئی تھیں۔ وہاں بھی کبوتروں کے جھنڈ تھے۔ گلی قاسم جان کی طرح میر قاسم محلے کی تنگ گلیاں تھیں — آدمیوں کے شور و غل سے بھرا بازار تھا...... اور شاید سب کچھ وہی تھا جو ہم دلّی۔ دلّی چھ کی گلیوں میں تلاش کرتے تھے۔ مگر تعجب تھا، شائستہ فہیم خاں سے ملنے سے پہلے تک پاکستان صرف ایک ملک تھا میرے لیے — ایک دشمن ملک — جہاں ہمارے ملک کو تباہ کرنے کے لیے دہشت گرد یا فدائین تیار کئے جاتے تھے — پھر دہشت کا ماحول پیدا کرنے کے لیے ہمارے ملک میں انہیں اتار دیا جاتا تھا۔ کشمیر سے مالیگاؤں، دلّی سے راجستھان، ایک خونی، کبھی نہ ختم ہونے والی عبارت لکھنے کے لیے......

لیکن شاید ایسی ہی ایک عبارت محبت کے اندھے یقین کی ہوتی ہے، جہاں دماغ نہیں۔ صرف دل کی سلطنت چلتی ہے۔ ہم عام طور پر شاید ایک دوسرے کے بارے میں صرف اتنا ہی جانتے ہیں جتنا میڈیا، اور سیاست ہمیں بتاتی ہے — نیٹ پر چیٹنگ کرتے ہوئے ہم دیس بدیس کے کتنے ہی لوگوں کو قریب سے جان پاتے ہیں۔ شاید اسی لیے اس بے حد اندھیرے وقت میں نیٹ کا ساتھ مجھے غنیمت لگتا تھا — اور بہت سے اپنے دوسرے دوستوں کی طرح میرے اندر

بھی پاکستانی لڑکیوں کی قربت پانے کی ایک چاہت ظاہر ہو چکی تھی — لیکن کیا وہ بات کریں گی؟ وہ بھی کسی ہندوستانی سے؟ کسی ہندو لڑکے سے؟ ایک بابری کے نام پر جہاں ہزاروں مندر منہدم کر دیئے جاتے ہوں۔ پھر اسلامی جمہوریت کے نظام میں جہاں پردے اور بندشوں کی کہانیاں ہم آئے دن کسی نہ کسی بہانے سنتے رہتے تھے۔

نیٹ روشن تھا۔ پاکستان پر کلیک کرتے ہی بہت سارے موجود ناموں میں ایک نام شائستہ کا بھی تھا— آہستہ سے میں نے اس نام پر کلیک کیا۔ میسج باکس میں آہستہ سے لکھا—ایم 28 انڈیا...... پھر شروع ہوا انتظار کا لمحہ......

میں نے پھر میسج ٹائپ کیا...... آر یو دیئر......

دوسری طرف سے جواب آیا— ناٹ انٹرسٹیڈ۔

مجھے تعجب نہیں ہوا۔ شاید اب میں لڑنے کے موڈ میں تھا...... میں نے ٹائپ کیا...... بٹ وھائی...... کیونکہ میں انڈین ہوں—؟

'ہاں......'

'انڈین ہونا کوئی جرم ہے؟'

'کیونکہ تم لوگ گندے ہو......'

'ہم گندے ہیں یا تم لوگ......؟'

'تم لوگ۔ ہمارے بارے میں افواہیں پھیلاتے ہو۔ الزام لگاتے ہو......'

'ہم الزام نہیں لگاتے۔ یہ تم ہو، جو ہر بار ہم سے صرف جنگ کی خواہش رکھتے ہو......'

اب میسج کا سلسلہ چل پڑا تھا— مجھے احساس تھا، اب اس کے چہرے پر بل پڑ گئے ہوں گے...... اس بار میسج تاخیر سے آیا۔

پوچھا گیا— 'تمہارا نام؟'

'راجندر راٹھور......'

'ہندو ہو......؟'

اچانک میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ ناچ گئی— 'میں نے تو نہیں پوچھا کہ تم مسلمان ہو؟'

'ساری......'

'ساری کی ضرورت نہیں۔ لیکن کیا ہندو ہونا جرم ہے؟'

'نہیں؟'

شاید باتیں کرتے ہوئے، ہم ایک بے حد گھنونا ماضی بھول کر مہذب اور لبرل بننے کی کوشش کرتے ہیں......

میں نے ٹائپ کیا— 'تم مسلمان اس لیے ہونا کہ مسلمان کے گھر پیدا ہوئی......'

'ہاں۔ جیسے تم ہندو اس لیے کہ ہندو کے گھر پیدا ہوئے......'

'تم پاکستان میں جنمی۔ اس لیے نفرت کے ماحول میں یہاں کے دروازے تمہارے لیے بند......'

'جیسے تم ہندوستان میں— دشمنی کی سوغات لے کر آؤ گے تو ہم ٹینک کا رخ تمہاری جانب موڑ دیں گے......'

'اتنی نفرت کیوں ہے؟'

'نہیں جانتی......'

'کیا سب سیاست ہے۔ صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے۔'

'شاید نہیں۔ کیونکہ ہم اس سیاست کے شکار، نوالے ہوتے ہیں— جنہیں نگلتے ہوئے سیاستداں ہمارے بارے میں نہیں سوچتے......'

'اچھا تمہارا نام کیا ہے؟'

'شائستہ فہیم خاں۔'

'شائستہ......اس کا مطلب کیا ہوتا ہے؟'

'پولائٹ......ہمبل......جس کے وجود میں ایک سلیقہ ہو......'

'لیکن تم ایسی دکھتی تو نہیں......'

'شٹ اپ......' لیکن ساتھ ہی اس نے جلدی سے ٹائپ کیا تھا— 'مجھے ہندو اچھے لگتے ہیں۔ بہت دنوں سے کسی ہندو سے بات کرنے کی خواہش تھی......'

شاید سرحد کے اس پار ممکن ہے یہ ایک عام سی خواہش ہو، جیسے یہاں کے ماحول میں ایسی ہی ایک خواہش میرے اندر بھی جاگی تھی......

'تم لوگ اتنے گندے کیوں رہتے ہو— بس...... ذرا سے پانی سے نہا لیا اور وہ باریک سا دھاگا......'

'جینئو......'

'ہاں۔ وہی، باندھ لیا— دھاگا باندھنے سے آدمی کہیں پاک ہو جاتا ہے......؟'

میں نے اپنے سوالوں کو روک لیا تھا۔ اس لیے کہ میں اچانک چونک گیا تھا۔ میں بھی پوچھ سکتا تھا، اچھا جینئو باندھ کر ہم پاک نہیں ہو سکتے...... مگر جو تم لوگ نماز سے پہلے کرتے ہو...... ذرا سا پانی......؟ ماضی کی کہانیوں میں مسلمانوں کو گندہ اور ملیچھ کہے جانے والے کتنے ہی واقعات گھوم گئے...... تو وہاں بھی ایسی ہی ایک رائے ہمارے بارے میں بھی ہے...... وہاں بھی ایک میر قاسم جان گلی ہے...... 'سونم' کی طرح اپنی شرارتی ادائیں دکھاتی ایک اپسرا سرحد پار بھی ہے— جو ادھر ہے۔ وہی کچھ اُدھر ہے۔ امن سے دہشت، اور خواہشات سے سیاست تک۔

شاید اس دن پہلی ملاقات میں ہی ہم دوست بن گئے تھے— بے حد اچھے دوست— اور دوستی کے لیے سرحدیں، ذات پات، مذہب شاید ساری چیزیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ اس دن شائستہ فہیم خان دیر تک ہندوستان، تاج محل، قطب مینار اور اجمیر کے بارے میں پوچھتی رہی۔ ہمارے دیوی دیوتاؤں کو لے کر اس کے اندر عجیب عجیب سوالوں کی ایک لمبی قطار تھی— کیا رام جی سچ مچ سیتا جی سے بہت پیار کرتے تھے؟ لچھمن ریکھا کیا ہے؟ یہ سونڈ والے بھگوان کیوں ہیں؟ کیا ہنومان جی سچ مچ آدمیوں کی طرح بولتے تھے...... یہ مندر میں گھنٹیاں کیوں بجتی ہیں......؟ شنکھ کیا ہیں؟ پوجا سے پہلے کیوں شنکھ بجائے جاتے ہیں......؟

پوجا...... شنکھ...... مندر کی گھنٹیاں، بھگوان...... رامائین اور مہا بھارت سے نکلی کہانیاں...... دوسری طرف اجمیر کی درگاہ، ممبئی کے حاجی علی اور دلّی کے قطب صاحب سے لے کر حضرت نظام الدین...... نیٹ کی روشن دنیا میں نہ جنگ کے بگل بجتے تھے۔ نہ سیاسی توڑ جوڑ...... نہ ٹینک بارود اور توپوں کے شور۔ نہ آر ڈی ایکس اور اے کے 47 کا ذکر۔ مذہب گم تھا۔ شنکھ کی آواز، مندر کی گھنٹیاں اور مسجد سے آتی اذان کی آواز...... جیسے سب ایک دوسرے میں گھل مل گئے تھے۔ سرحدیں ٹوٹ گئی تھیں...... اور شاید جنگ کی تمام ممکنات کے باوجود محبت اور صرف محبت باقی

رہ جاتی ہے جو جنگ کی بھیانک تباہی کے بعد بھی زخمی دلوں میں مرہم لگانا جانتی ہے......

پھر شائستہ سے مکالمے کے دروازے کھل گئے۔

وہ پاکستان، وہاں کے معاشرے، بندشوں اور گھٹن کے بارے میں بتاتی تھی۔ وہ بتاتی تھی کہ ایک نفرت باقی رہ گئی ہے، تم لوگوں کے لیے — نوجوان لڑکے داڑھیاں بڑھا رہے ہیں۔ نفرت اب چہرے کی گھنی ہوتی داڑھیوں سے بھی جھانک رہی ہے۔ یہاں معاملہ مذہب کا نہیں ہے — اخبار، میڈیا اور سیاست نے جو زہر بھرا ہے، اس سے مورچہ لینا آسان نہیں۔ لیکن اب......

شائستہ کے چہرے پر سلوٹیں پڑ گئی ہیں — پہلے میرے لیے یہ ایک عام سی بات تھی۔ لیکن شاید اب نہیں۔ کیونکہ...... وہاں تم بھی رہتے ہو......

'اور اگر میں نہیں رہتا تو......؟'

'نہیں جانتی......'

'شاید یہی احساس میرا بھی ہے۔ تمہارا وہاں ہونا، میرے اس احساس کو، بہت حد تک کم کر چکا ہے، جہاں تم سے ملنے سے پہلے تک صرف نفرت کا بسیرا تھا......'

'نفرت چند لوگوں کے لیے نہیں۔ ایک پورے ملک کے لیے...... وہ پوچھ رہی تھی...... کیا یہ عجیب نہیں لگتا۔ اس گلوبل ولیج میں، جہاں سب ایک چھوٹے سے آشیانے میں سمٹ آئے ہیں۔ یہ کیسی خوشی ہے کہ ہماری حفاظت کے لیے ایک ملک کو بم اور میزائیلوں پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے؟'

'کیم' پر اس کی آنکھیں روشن تھیں۔ ایک بے حد حسین چہرے میں — جیسے خود کو پوری طرح سے ظاہر کرنے کی آزادی سمٹ آئی تھی...... کیم پر ہم ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے...... اور...... ایک دوسرے کو سن رہے تھے......

'ہم بھی اڑنا چاہتے ہیں راٹھور۔ جیسے تمہارے ملک کی لڑکیاں اڑتی ہیں — ہواؤں میں۔ اپنی آزادی کے خوبصورت ڈینوں کے ساتھ — لیکن یہاں کے معاشرے میں پیدا ہوتے ہی ہمارے ڈینے کاٹ دیئے جاتے ہیں۔ ہمیں پڑھایا اس لیے جاتا ہے کہ اس ماحول میں پڑھائی بھی ایک اسٹیٹس سمبل ہے بس — لڑکی کہاں پڑھ رہی ہے؟ کس کانوینٹ میں؟ انگریزی کس

ایکسنٹ میں بولتی ہے؟ تا کہ پارٹی اور نمائشی میلوں میں اپنے اسٹیٹس کی بھی نمائش کی جا سکے۔ لیکن ہم کچھ بھی پڑھ لیں راٹھور، سپنے نہیں ہوتے ہمارے پاس— سپنے بڑی خوبصورتی سے ماں باپ کی تحویل میں ہوتے ہیں۔ اور وہ جانتے ہیں، ان سپنوں کا فیصلہ یا حکومت وہ کرے گا، کل جو ہماری زندگی میں آئے گا— ہمیشہ کے لیے اور اس، ہمیشہ کے لیے زندگی میں آنے والے مرد کو بیوی نہیں، گھر سنبھالنے والی ایک مورت چاہیے۔ لیکن میں اڑنا چاہتی ہوں— میں نے ایم بی اے کیا ہے۔ کچھ کرنا چاہتی ہوں زندگی میں...... لیکن......'

آنکھوں میں نمی سی لہرائی— 'ہمارے ملک میں یا تو عورت نمبر ون ہے یا پھر زیرو— یا بے نظیر یا خالدہ ضیاء یا شیخ حسینہ جیسی عورتیں ہیں، لیکن ان عورتوں کا بھی ایک سیاسی بیک گراؤنڈ رہا ہے— انہیں چھوڑ دیں تو یہاں سے بنگلہ دیش تک سیاست میں بھی عورتیں کہیں نہیں ہیں۔ اور اب...... لشکر ہے، طالبان ہے...... اور کتنے ہی لشکر...... کہ کبھی بھی ہمارے پڑھنے یا باہر نکلنے کے خلاف بھی ایک فتویٰ آسکتا ہے۔ پھر ہم دربے میں بند مرغیاں بن جائیں گے...... صرف گردن مروڑنے والے جلاّد کے انتظار میں......'

وہ رو رہی تھی...... 'یہ کوئی زندگی ہے راٹھور...... اس زندگی سے تو مر جانا اچھا لگتا ہے......'

شائستہ سائین آؤٹ کر گئی تھی۔ کیم پر اندھیرا چھا گیا تھا...... لیکن اندھیرے میں بھی اس کے لفظ چیخ رہے تھے...... یہ کوئی زندگی ہے راٹھور...... اس زندگی سے مر جانا......

اسی دن شاید اس کیفیت میں، میں دیر تک سو نہیں پایا— کبھی ہم کتنے مجبور اور بے یار و مددگار ہوتے ہیں— دیواریں، سرحد پر خاردار تاروں کی قطار...... ان تاروں کے آر پار صرف بجلی کے جھٹکے ہیں یا نفرت کے—

26/11 کی دہشت

اب تک شاید آپ نے اندازہ کر لیا ہو کہ یہ کہانی بے حد نفرت کے دنوں میں شروع ہوئی— یعنی ایسے موقع پر جب دہشت کی بساط پر کٹر بھگوا تنظیموں نے ہندستانی سیاست میں ایک نیا موڑ لیا تھا— سادھوی پرگیہ اور لیفٹیننٹ کرنل پروہت کی گرفتاری سے، مالیگاؤں سے لے کر ممبئی تک کے دھماکوں کے نئے تار جڑنے لگے تھے— لیکن اس بار اسلامی جہاد یا دہشت گردی کی جگہ

ہندو وادی، کٹر وادی تنظیموں نے لی تھی — یہاں یہ اشارہ صاف تھا کہ مشتعل 'ہندوتو' کو اپنائے بغیر چارا نہیں — اور یہ بھی کہ اسلامی دہشت گردی سے نمٹنے کے لیے 'ہندو وادی آتنک واد' کے شعلے بھڑکانا ہی سنگھ کا ایک خاص مقصد ہے — میڈیا کے خلاصے نے دہشت گردی کا ایک نیا چہرہ دکھایا تھا۔ شاید انہیں دنوں پہلی بار شائستہ کی زندگی میں داخل ہونے کے بعد میرے خیالوں اور کٹر پن میں تھوڑی سی کمی آئی تھی۔ لیکن بابو جی کا لہجہ ویسا ہی تیکھا اور شدت آمیز تھا۔

''سب بکواس۔ ہندوؤں کو بدنام کرنے کے طریقے۔ ہمارے سادھو سنتوں پر لگانے والے الزام بالکل بے بنیاد ہیں۔ دراصل کانگریس اقلیتوں کے ہاتھوں پوری طرح بک گئی ہے۔''

لیکن شاید جنگ کا کوئی راستہ نہیں — لیکن نفرت دور بھگانے کا ایک ہی راستہ پیار ہے — پیار — جو اچانک آپ کو ساری ناامیدی، سیاست، داؤں پیچ سے باہر نکال کر صرف ایک ہی راستہ پر ڈال دیتا ہے......

بس...... چلتے...... چلو......

شائستہ پوچھ رہی تھی —

''تمہارا میڈیا ہم سے اتنی نفرت کیوں کرتا ہے — ؟ ایک ہی ملک کے تھے ہم، جیسی باتیں اب شاید گزری تاریخ کا حصہ لگتی ہیں۔ اب یہ دو نفرت کرنے والی آنکھیں ہیں۔ ایک دوسرے کو نہیں دیکھنے والی۔''

'یہ تم کہہ رہی ہو۔ اور جو تمہارے ملک کا میڈیا کرتا ہے —'

'ہمارا میڈیا اتنا اسٹرانگ نہیں جتنا تمہارا ہے۔ تمہارے یہاں سے بس زہریلے گیس کی بارش ہوتی ہے۔'

'ہم تو صرف بارش کرتے ہیں اور تم...... ؟ تم اپنے دہشت گرد بھیجتے ہو...... ہندوستان کو ختم کرنے کے لیے۔ کشمیر سے ممبئی تک......'

'کشمیر کا نام مت لو۔ وہ ہمارا ہے......'

'دوبارہ یہ بولنا بھی مت — کیمپ پر میرے کانپتے چہرے کو یقیناً وہ دیکھ رہی ہوگی۔ مگر جیسے میرا خون کھول گیا تھا — 'ہم جانتے ہیں تمہارا ملک یہ سب کشمیر کے نام پر کر رہا ہے۔ کیونکہ تم کشمیر کو ہمارے ملک کا حصہ ماننے کو تیار نہیں۔ تم ایک سڑے اور بدبودار ماضی میں سانس لیتے ہو اور تمہارا لشکر، کشمیر کو ہتھیانے کے لیے ہندوستان کی بربادی کے مہرے بٹھاتا ہے — تمہارے

مدرسے دہشت کی فیکٹری بن جاتے ہیں۔ اور تمہارا مذہب...... بس کافروں کو مار دو اور اسلام راج قائم کرو، کے بیہودہ اور ناممکن تجربات میں جٹ جاتا ہے۔'
'بکومت مت......' وہ غصے میں چلائی تھی — اور تم لوگ وہاں مسلمانوں کو مارتے ہو۔ زندہ جلاتے ہو۔ دنگے کرتے ہو۔ دوئم درجے کا شہری سمجھتے ہو؟ وہ؟ تم گودھرا میں معصوم مسلمانوں کو بھون دیتے ہو۔ اور بابری مسجد توڑ دیتے ہو......'
'ایک بابری مسجد کا جواب، تم لوگ ہزاروں مندر توڑنے سے دے چکے ہو۔ اور ہاں، یہ بھی سن لو۔ جنہوں نے بابری مسجد توڑی، یہ معاملہ ابھی بھی عدالت میں ہے — اسے ملک میں کسی بھی ہندو نے قبول نہیں کیا — لیکن تم؟ تمہاری مسجدوں سے گولیاں چلتی ہیں — تم اردو بولنے والے کو مہاجر کہتے ہو...... جو کچھ تمہارے یہاں لال مسجد میں ہوا —؟ تم بھول جاتی ہو کہ تمہارے دہشت گرد تمہارا اپنا ملک بھی تباہ کررہے ہیں۔'
وہ ایک لمحہ کو ٹھہری تھی...... ''ہم سیاست لے کر کیوں بیٹھ گئے......؟ ایک آگ یہاں بھی ہے۔ ایک نفرت یہاں بھی بوئی جارہی ہے۔ ایک نفرت وہاں بھی — دہشت کے سوداگر خوف اور وحشت کی زبانیں ہی جانتے ہیں — میں سیاست بھولنا چاہتی ہوں راٹھور اور اس وقت جانتے ہو میں کیا سوچ رہی ہوں۔''
'کبھی ہم ایک تھے...... ایک ملک۔ کتنا نادر اور خوبصورت خیال ہے — جیسے جسم ایک...... ایک روح۔ ایک ملک — فاصلے ہی مٹ جائیں — ایک ہونے کا تصور بھی کتنا عجیب ہے...... ہے نا...... پھر مجھے بلا لو نا...... شادی کرلو مجھ سے......'
کیم پر اندھیرا — مائیک آف تھا......
شائستہ نے آہستہ سے ٹائپ کیا...... ٹی سی اینڈ بائی......
لیکن جیسے ابھی ابھی اس کے بولے گئے الفاظ میزائل، راکیٹ لانچرس، اے کے 47، آر ڈی ایکس جیسے گھنونے ہتھیاروں سے الگ میرے پورے وجود میں ایک ایسی کویتا لکھ گئے تھے، شاید جسے سننے کے لیے میں کب سے بے قرار تھا — مگر سب کچھ ایک یوٹوپیا جیسا۔ سرحد کی دیوار سے بھی بڑی ایک مذہب کی دیوار — لیکن خوف اور دہشت کے ماحول میں ہماری نفرت بھری باتوں کے درمیان اس نے خاموشی سے ایک پیار کا پودا لگایا تھا — لیکن میں جانتا تھا، یہ کوئی برلن کی دیوار نہیں ہے جسے آپسی سیاسی سوجھ بوجھ سے توڑ دیا جائے — اس دیوار کے ایک طرف

سنگھ ہے اور دوسری طرف طالبان......

لیکن شائستہ کا آخری لفظ اس بار مجھے حیران کر گیا تھا—

دو دن تک غائب رہی۔ نہ فون آیا۔ نہ نیٹ پر کوئی بات ہوئی۔ شاید یہ میرے لیے بے حد حیران کرنے والے دن تھے— جہاں ایک انجانی سی کسک اور چبھن مجھ میں جاگ چکی تھی۔

تیسرے دن وہ نیٹ پر ملی......

'کیسے ہو......؟'

رسمی بات چیت کے بعد میں نے ڈرتے ڈرتے ٹائپ کیا— 'اس دن جو کچھ تم نے کہا ،کیا صرف ایک مذاق تھا؟'

'نہیں۔'

'لیکن کیا ایسا ممکن ہے؟'

اب کیم روشن تھا— ہم مائیک پر، ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔

''راٹھور...... دو دن تک میں اس پہیلی میں ڈوبی رہی— جو انجانے میں میرے ہونٹوں سے نکل گئی تھی۔ لیکن اب کہہ سکتی ہوں۔ انجانے میں نہیں: شاید تم سے ملاقات کے بعد مسلسل اس موضوع پر سوچتی رہی تھی۔ دیکھو، میں پیار کو کوئی بندھن، کوئی کانٹکٹ نہیں مانتی کہ پیار کیا ہے تو سامنے والا مل ہی جائے— پیار ان سب سے الگ ایک احساس ہے، جہاں نہ دیکھنا ضروری ہے نہ ملنا— اگر ہم نیٹ پر ایک دوسرے کو نہ دیکھتے، نہ باتیں کرتے تو؟ کیا پیار نہیں ہوتا؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ پیار صرف ایک میل آئی ڈی سے بندھا ہے، جس کا پاس ورڈ تمہارے پاس ہے— ایک دن پاس ورڈ بدل دوں گے۔ یا دوسری آئی ڈی بنادو گے۔ یہ رشتہ بھی ختم ہو جائے گا— لیکن تب بھی تمہارے لیے آخر آخر تک ایک پیار تو رہ ہی جائے گا، میرے پاس—''

کیم پر اس کی آنکھوں میں کشمکش کے آثار تھے— 'لیکن اس دن جو کچھ کہا، بے حد سنجیدگی سے کہا۔ مجھے پائل پسند ہے۔ بندی پسند ہے۔ ساڑی پسند ہے۔ پسند کے معاملے مذہب سے بلند ہوتے ہیں— یہاں مذہب نہیں آتا۔ جیسے تم پسند ہو اور تم میرے مذہب کے نہیں، یہ سوچ کر تمہیں پیار نہ کروں تو یہ ایک طرح کا خود پر ظلم ہوگا— ممکن ہے مجھے تمہارے لباس اور پہناوے پسند ہوں۔ لیکن تمہیں ہمارے لباس یا پہناوے بالکل پسند نہیں ہوں تو کیا ایسی صورت

میں ہمارے پیارے کو خارج کر دو گے؟

'نہیں۔'

'جانتی ہوں۔ آہستہ آہستہ ہم ایک دوسرے کے رسم ورواج بھی پہننے لگتے ہیں اور نہ بھی پہنیں تب بھی کوئی بات نہیں۔'

وہ سانس لینے کے لیے ٹھہری—" ہمالیہ کی چوٹیوں سے پگھلتے گلیشیرس تک ہم اپنی مٹھی میں کرنا جانتے ہیں۔ چاند سے خلاء اور نئی دنیا کی تلاش تک۔ پھر ایک چھوٹا سا چیلنج ہم قبول کیوں نہیں کر سکتے؟ کیا صرف اس لیے کہ کسی بدتر دھماکے سے بھی زیادہ خطرناک ہیں یہ دیواریں، جو مذہب کی ہیں؟'

وہ سنجیدہ تھی— 'چلو ایک بار پنگا لیتے ہیں......'

'لیکن......؟'

مجھے چاہتے ہو یا نہیں، سوال یہ ہے؟

'ہاں۔'

'تو پنگا لو—28 سال کے مرد ہو— جاب کرتے ہو— جہاں دنیا میں اتنی بڑی بڑی باتیں ہو رہی ہیں، ہم ایک چھوٹا سا پنگا نہیں لے سکتے؟'

اس دن ایک بار پھر وہ مجھے حیران کر گئی تھی۔

●

وقت کو حاضر و ناظر جان کر کہ یہ سب کچھ انہیں دنوں واقع ہوا، جب 2008 میں بے حد پراسرار یا بدترین حادثوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا تھا۔ لوک سبھا میں کھلتے ہوئے بیگ— ممبر پارلیمنٹوں کی خرید و فروخت— رام پور، جے پور، بنگلور، احمد آباد اور دہلی کے بم دھماکے— کشمیر کا امرناتھ تنازعہ— ان سے باہر نکلیں تو بش کی طرف جوتا اچھال کر راتوں رات ہیرو بن جانے والا صحافی— نسل کشی اور فرقہ واریت کا ننگا کھیل۔ الگ الگ ماسٹر مائنڈوں کی تلاش۔ شیئر بازار کے لڑھکنے اور گرنے کا سلسلہ— روزگار چھیننے والی گندی پالسیاں اور— 26/11 کا ننگا ناچ— جس سے پورا ملک کانپ اٹھا تھا۔ جیسے پاکستان نے اچانک ایک بار پھر نفرت اور جنگ کے بگل بجا دیئے تھے۔ چار دن تک چلے اس بھیانک دہشت گردانہ حملے نے جیسے سارے ملک کی

نیند اڑادی تھی۔ لیکن سب سے اہم تھا کہ اگر سرحد پار کے فدائین کا اس پورے معاملے میں کوئی رول ہے، تو ملک کے ہر عوام کا فرض ہے کہ وہ نہ صرف اس پر اپنی ناراضگی جتائے بلکہ پاکستانی ہونے کے احساس کو بھی نفرت سے دیکھے۔

مجھے لگا، کہانی ختم ہوگئی ہے— شاید ایسی کہانیاں اسی طرح سنامی کی شدت کے ساتھ شروع ہوتی ہیں اور بکھر جاتی ہیں— جیسے نفرت کے اس ماحول میں پاکستان یا اس ملک کے کسی بھی شخص سے محبت کا رشتہ رکھا ہی نہیں جاسکتا۔ اخبار چیخ رہے تھے۔ میڈیا آگ اگل رہا تھا۔ حملے کی وارننگ کے باوجود رات کے اندھیرے میں گیٹ وے آف انڈیا سے ہندوستان کی اقتصادی دار السلطنت میں داخل ہونے والے درندوں نے دہشت کی وہی کہانی لکھی تھی جو امریکہ میں 9/11 کو پیش آیا تھا۔ لیکن امریکہ اپنی دادا گیری کے ساتھ حالات کو بہتر بنانے میں کامیاب رہا تھا۔ لیکن یہ ہندستان ہے، امریکہ نہیں— جہاں لچر غیر محفوظ کپڑوں میں آئی ٹی ایس کے اعلیٰ افسر اپنی جان گنوا بیٹھتے ہیں— وہاں حفاظت کے بڑے ذرائع یا حل سوچنا بھی مشکل لگتا ہے— لیکن حفاظتی دستوں کے ٹکراؤ میں وہ شخص پکڑا گیا تھا، جس سے ثبوت جتانے کا کام اب بھارت سرکار کر رہی تھی۔ وہی کالے کپڑوں میں ملبوس ایک حیوان چہرہ— دائیں ہاتھ میں بندھی لال ڈوری— بائیں میں کالی— دائیں ہاتھ میں پکڑا ہوا اے کے 47۔ تاج ہوٹل— نریمن ہاؤس اور اوبرائے میں چل رہے موت کے مناظر سارا ملک جیسے سانسیں روک کر دیکھ رہا تھا۔

محبت ہار گئی تھی— آخر یہ ایک دکھ بھری خبر تھی۔ دہشت کی فتح ہوئی تھی......

شائستہ کی آواز ان دھماکوں میں کہیں کھوگئی تھی۔ 'تم ایک پنگا بھی نہیں لے سکتے۔'

یہاں دوبارہ ان خونی کارروائیوں کا ذکر نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن جب میری خیریت کے لیے اس حادثہ کے ساتویں دن شائستہ نے فون کیا، تو جیسے ساری نفرت میرے ہونٹوں پر آگئی تھی—

'مر گیا میں۔ راجندر راٹھور۔ دلّی کی پرائیوٹ سی سی ایل کمپنی میں کام کرنے والا ایک آفیسر۔ اس آفیسر کے پاس اپنے بابو جی کو دیئے جانے والے سارے الفاظ چھوٹے پڑ گئے ہیں۔ تم جانتی ہونا...... ان کا تعلق سنگھ سے ہے......'

'غصے میں ہو؟'

'ہاں۔ بے حد غصے میں۔ کیا سمجھتے ہو تم لوگ؟ دوبار کی جنگیں کافی نہیں تھیں، جو تیسری بار بھی ہماری شانتی بھنگ کرنے چلے آئے......؟

لیکن راٹھور یہ میں تو نہیں تھی......'

'یہ تم ہی تھی...... تم سب ایک ہی ہو۔ پاکستانی — جو اس وقت ہمارے لیے ایک ناسور یا کینسر کے زخم سے زیادہ بدتر ایک ایسا وائرس ہے، جو ہم سے سب کچھ چھین لینا چاہتا ہے۔'

'سیاست کی سزا ہمیں کیوں دے رہے ہو؟'

'سیاست۔ کیا یہ صرف ایک سیاست ہے؟ یعنی میرا ملک اگر اس جنگ کو ٹالتے ہوئے تمہیں ثبوت دے رہا ہے اور تمہارے ان دہشت گردوں کو مانگ بیٹھتا ہے تو یہ سیاست ہو گئی؟'

میں غصے میں ابل رہا تھا — 'شاید وہ تمام رپورٹ میرے سامنے تھی، جو میں اسے بتانا چاہتا تھا — 1998 کے بعد سے اب تک پاک کے ذریعے مارے گئے معصوم لوگوں کی تعداد اتنی بڑھ چکی ہے کہ ہم صرف گھریلو جنگ لڑ رہے عراق سے تھوڑا پیچھے ہیں — صرف سات برسوں میں احمد آباد، جے پور، گوہاٹی، دہلی، ممبئی، بنگلور، گاندھی نگر، مالیگاؤں اور یہ سب ایک ایسے ملک میں جہاں آزادی کے 61 سال بعد بھی 77 فیصد لوگ آج بھی دس روپے روزانہ پر اپنی زندگی گزار رہے ہیں — ہماری ہمدردی ہماری کمزوری نہیں ہے — اب ہم نے بھی آتنک کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہے......'

'بہت غصے میں ہو۔ تمہارا یہ چہرہ پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔ مگر اچھا ہے راٹھور۔ میرے ملک سے نفرت کرو۔ لیکن میں؟ کیا ملک میں رہنے والے عوام سے نفرت جائز ہے؟ یہاں کئی لوگ ہیں، جو تمہاری طرح سوچتے ہیں...... ہم اس بے حد نفرت بھرے نظام کی کٹھ پتلی بن جائیں تو مسئلہ حل ہو جائے گا راٹھور......؟ اس کی آواز بھرا گئی تھی — 'ایک بابری مسجد کے جواب میں جب یہاں ہزاروں مندر توڑے گئے تھے تو بہت سے دلوں میں اس سیاسی نفرت اور نظام کے خلاف غصے کا جذبہ پیدا ہوا تھا۔ نفرت کا حل نفرت نہیں ہے......'

اس کی آواز کانپ رہی تھی...... 'اسی لیے...... مجھے بلا لو نا...... دیکھو کم از کم مجھ سے نفرت مت کرو۔ میں تمہاری نفرت کو قبول نہیں کر سکتی...... مجھے بلا لو راٹھور......'

فون کٹ گیا تھا۔ شاید وہ رو رہی تھی۔ میرے اندر کے دھماکے رک گئے تھے۔ اب

ایک دوسرا دھما کہ شروع ہو گیا تھا۔ لیکن یہ دھما کا پہلے والے دھماکوں سے زیادہ طاقتور تھا...... کیا ایسا ممکن ہے؟ شائستہ کو بلایا جا سکتا ہے؟ اس دہشت بھرے ماحول میں؟ نفرت بھری فضا میں؟ جب یہاں کا سارا ماحول پاکستان کے خلاف ہے۔ جب ٹی وی چینلس اور بالی وڈ فلموں میں کام کرنے والے اداکار بیرنگ پاکستان کو واپس کیے جا رہے ہوں۔ جب پاکستانی گلوکاروں کے نغمے، فلموں سے نکالے جا رہے ہوں۔ یعنی موجودہ دہشت کی ایسی فضا میں کیا یہ ممکن ہے......؟

دو دن کے بعد شائستہ دوبارہ نیٹ پر آئی تو جیسے اس کے حوصلوں کو پر لگ چکے تھے۔ میری الجھنوں پر اس کا سیدھا سا جواب تھا۔

'ہاں سب ممکن ہے۔'

'لیکن کیسے؟'

'9/11 ورلڈ ٹاور میں جو کچھ ہوا، کیا یہ ممکن تھا— ؟ تمہارے ملک میں سمندر کے راستے فدائین آئے اور جان کی بازی لگا کر اپنے ناپاک ارادوں کا کھیل، کھیلتے رہے— ان کی دہشت اگر ممکن ہے تو ہم ایک پیار کے لیے اتنا کیوں سوچتے ہیں۔'

شاید وہ صحیح تھی۔ میں ہار گیا تھا— دہشت گرد اپنی جان پر کھیل کر، انسانی بم بنا کر ایک دہشت بھری کارروائی کو انجام دے رہے ہیں۔ یوں چٹکیوں میں۔ اور ہم...... پیار کی ایک چھوٹی سی ندی کو پار نہیں کر سکتے؟'

'راٹھور سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ کیا تم بھی مجھے اسی شدت سے پیار کرتے ہو...... جیسے......'

میں نے اس کی آواز درمیان میں ہی کاٹ دی— "شاید اس سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ— پیار کوئی پیمانہ نہیں، جہاں اسکیل ڈال کر دیکھنے اور ناپنے کی گنجائش باقی ہو...... لیکن شاید۔ نفرت کے ان شدید حملہ کے باوجود میں ایک لمحہ بھی تم سے دور نہیں رہا...... لیکن جہاں سارا ماحول ہمارے خلاف ہو، وہاں ہم یہ جنگ کیسے جیت سکتے ہیں؟'

'ویسی ہی ہمت، جیسی ان دہشت پسندوں نے ایک ذلیل کارروائی کے لیے دکھائی— اچھا بتاؤ اگر ہم شادی کرلیں گے تو...... ؟ کیا مجھے اپنے مذہب کو بھولنا ہوگا......؟'

شاید اب تک مجھے پیار کی اس بے پناہ طاقت کا اندازہ نہیں تھا— جہاں ایک سنگھ

پریوار کے زیر سایہ ہوتے ہوئے بھی اچانک میں ایک ایسے راستے پر چل پڑا تھا، جہاں فرقہ واریت سے دور ایک عام سا انسان رہ گیا تھا— ہاں عام انسان۔ مٹھی بھر آسمان اور اپنے پیار کے لیے وقف— ایک متوازن اور لبرل چہرے والا عام انسان۔

'نہیں— پیار میں مذہب کوئی رکاوٹ نہیں ہے جان— مذہب پیار کے درمیان آئے تو پیار' پیار نہیں رہ جاتا۔'

'تسلی ہوئی...... ورنہ میں تو ہر روپ میں تمہاری تھی۔ تم جیسے چاہتے...... لیکن چاہتی یہی تھی، ہم اپنے رنگوں میں ایک دوسرے سے پیار کریں— ایسا پیار جو نہ دیکھا گیا ہو نہ سنا گیا ہو......

یکم روشن تھا— آنکھیں روشن تھیں— آواز جیسے سنامی لہروں جیسی موسیقی پیدا کر رہی تھی......

'میں نے سب سوچ لیا ہے...... تم جانتے ہو نا...... محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے......!'

'ہاں۔'

''مجھے کل لڑکے والے دیکھنے آئے تھے۔ تمہیں بتایا تھا— میرا ایک بھائی آرمی میں ہے— اس نے ہی یہ رشتہ لگایا تھا۔ دوسرا بھائی طالبان سے جڑا ہے۔ مجھ سے ایک سال چھوٹا— ابو بوڑھے ہو گئے ہیں— نماز پڑھنے اور قرآن کی تلاوت کے علاوہ کچھ نہیں کرتے۔ کل میں نے سب کی امیدوں کا گلا گھونٹ دیا۔ میں نے صاف منع کر دیا۔ میں یہ شادی نہیں کر سکتی۔ اب گھر والوں کو دال میں کچھ کالا نظر آ رہا ہے۔ میں اسی لمحے کا فائدہ اٹھانا چاہتی ہوں۔''

'لیکن کیسے؟'

''وہ میں نے سوچ لیا ہے۔ ہم فون پر نکاح کریں گے۔ نکاح مسنونہ۔ میرے جاننے والوں میں ایسا ایک نکاح ہو چکا ہے۔''

''نکاح...... لیکن میں ہندو ہوں......' میری آواز کانپ رہی تھی۔ 'تم جھوٹے نکاح کا مطلب سمجھتی ہو؟ کیا ایک ہندو کے ساتھ تمہارے گھر والے نکاح کو مان جائیں گے......''

'نکاح کے وقت تم اور تمہارا خاندان مسلمان ہوگا— مسلمان ہو تم— سمجھو میری بات راٹھور— میں آنا چاہتی ہوں۔ اور اس کے لیے اس بے رحم وقت سے بہتر کچھ بھی نہیں— میں گھر

گئے— پھر جب یہ سنا کہ تم مسلمان ہو اور دہلی میں رہتے ہو، تو ابو کا لہجہ ذرا سا نرم پڑ گیا— ان کا بچپن دہلی میں ہی گزرا تھا۔ خیر یہ لمبی کہانی ہے کہ میں نے یہ مورچہ کیسے فتح کیا۔ لیکن میرے گھر والے راضی ہو گئے ہیں۔ میں نے بتا دیا ہے کہ تمہارا نام محمود ہے۔ اور گھر والے تمہاری شادی جلد کرنا چاہتے ہیں— تمہارے ابو کی طبیعت خراب رہتی ہے۔ اس لیے وہ پاکستان نہیں آسکتے۔ اور اس سے پہلے کہ گھر والے محمود کا نکاح کہیں اور کر دیں، ہم فون پر اپنی نکاح کو منظوری دیں گے اور محمود یہ بات مان گیا ہے۔

شائستہ نے آگے بتایا— ابو، تمہارے ابو سے بات کرنا چاہتے ہیں تاکہ فون پر نکاح کی رسم پوری کی جاسکے۔ میں شاید اندر تک لرز گیا تھا۔

جھوٹ در جھوٹ

زندگی کے اس بے حد اہم موڑ پر، اچانک دنیا کے نظارے بدلے تھے میرے لیے— شاید محبت کی شدت آپ سے آپ کو، چھین لیتی ہے۔ پھر جیسے آنکھوں کے آگے کی پرچھائیوں میں صرف جلتے ہوئے قمقمے رہ جاتے ہیں۔ حیرانیوں کا ایک وہائٹ ہاؤس ہوتا ہے...... جس کے ہر دروازے پر محبت کی ایک بڑی سی مورت ہوتی ہے۔ لیکن اب یہ مورت جھوٹ کی بنیاد پر کھڑی تھی۔ ایک جھوٹ سے نکلنے والا دوسرا جھوٹ۔ جیسے جھوٹ ان دنوں ہندو پاک کے درمیان بولے جارہے تھے۔ پاکستان کے لیے ہندوستان کی انفارمیشن ایک جھوٹ تھی جیسے ہندوستان کے لیے پاکستان مسلسل دباؤ سے بچنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لیتا رہا۔ بابو جی کے الفاظ میں— جنگ ہی اکیلا راستہ ہے۔ اور یہاں، ہمارے لیے شاید محبت ہی اکیلا راستہ۔

شائستہ اپنے جھوٹ کے مہرے چل چکی تھی۔ اور اب یہ جھوٹ کا یہ پانسہ مجھے پھینکنا تھا۔

اور اس کے لیے میں نے اس بے رحم رات کا سہارا لیا۔ جس دن ہندوستان کے مثل، مکیش امبانی جیسے بڑے سرمایہ دار گجرات کے ہتھیارے وزیر اعلیٰ کو ملک کا وزیر اعظم بنانے کا خواب دیکھ رہے تھے— ملک بارود کے ڈھیر پر کھڑا تھا اور بارود کا کھیل، کھیل چکے شخص کو ملک کے وزارت عظمیٰ کی کرسی پر براجمان ہونے کا خواب سجایا جارہا تھا۔

رات کے دس بج گئے تھے۔ ماں بابو جی سے، دفتر سے نکلتے ہوئے میں اپنی بات بتا چکا تھا کہ آج آپ دونوں سے کچھ ضروری بات کرنی ہے— شاید اس ضروری بات کا مطلب وہ سمجھ

چکے تھے— سردی میں ان کے چہرے پر اس بے حد ضروری بات کی تپش کو محسوس کیا جا سکتا تھا— میرے اندر کمرے میں داخل ہونے تک جیسے وہ خود کو تیار کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

'کسی کی زندگی بچانے کے لیے اگر جھوٹ کا سہارا لیا جائے تو......؟ مان لیجئے کوئی شخص ایک گھٹن بھرے قید خانے میں ہے۔ آپ اسے باہر نکالنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لیتے ہیں اور اسے زندگی مل جاتی ہے؟'

ماں' بابو جی پراسرار نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے—

'میں نے شادی کا فیصلہ کیا ہے۔'

ممکن ہے، اچانک کا یہ جملہ 'ماں' بابو جی کے لیے کسی دھماکے کا کام کرتا، لیکن وہ ابھی بھی غور سے میرا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ماں بولی— 'اچھی بات ہے!'

بابو جی بولے— 'میں ریٹائر ہو چکا ہوں۔ ہم دونوں تمہارے ہی بھروسے ہیں۔ نہ بھی ہوتے، تب بھی پریم وِواہ جیسے پرستاؤ کے وِرودھ میں، میں نہیں جاتا۔'

'یہ سن کر بھی نہیں کہ وہ لڑکی ایک مسلمان ہے—؟'

اب چونکنے کی باری ماں کی تھی۔

'مسلمان اور پاکستانی بھی— لیکن اگر یہ نہیں ہوا تو میں بھی نہیں رہوں گا—'

میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو بابو جی کے الفاظ نے مجھے روک لیا۔ 'بیٹھو......'

ان کی آنکھیں کشمکش یا الجھن کا احساس کرا رہی تھیں......

کیسے ملاقات ہوئی......؟

میں نے بتا دیا۔

'دیکھا ہے؟'

'ہاں۔'

'فون پر بات ہوئی ہے۔'

'ہاں۔'

'تم اسے ہندو بناؤ گے؟'

'نہیں۔'

ماں کا چہرہ سناٹے میں ڈوبا تھا—

'میرا رشتہ سنگھ سے رہا ہے۔ جانتے ہو۔ عمر کی اس پائیدان پر بھی ان کی سبھاؤں میں آتا جارہا ہوں۔ لیکن وہ بھی جانتے ہیں کہ بچے اپنا مستقبل خود چنتے ہیں...... حالات اچھے نہیں۔ تم بھی دیکھ رہے ہو۔ دونوں طرف یدھ کے سائے منڈرا رہے ہیں— ایسے میں شادی کا پرستاؤ؟ چلو مان لیا میں تیار ہو جاتا ہوں۔ لیکن وہ لوگ؟ میں قریب سے جانتا ہوں۔ ان پاکستانیوں کو...... بابو جی نے آنکھوں پر ڈھیلے ہو رہے چشمے کو ٹھیک کیا...... 'بچپن پاکستان میں ہی گذرا۔ دنگے پھیلے تو لٹے لٹائے ہم دہلی آگئے— آج بھی اردو اخبار پڑھ لیتا ہوں...... ہم مسلمانوں کے محلے میں تھے...... شاید وہ پرانی یادوں میں گم تھے...... چشمہ اتارا آنکھیں صاف کیں— 'وہ کسی ہندو کو برداشت نہیں کریں گے۔'

'جانتا ہوں۔'

'پھر—؟' اس بار چونکنے کی باری ماں کی تھی۔

'شائستہ کا یہاں کوئی بھی نہیں رہتا......'

'شائستہ......' بابو جی دھیرے سے بڑبڑائے......

'اگر کوئی ہوتا تو شاید کسی بھی جھوٹ کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں پڑتی— ہم جانتے ہیں' حالات خراب ہیں۔ شاید حالات اور بدتر ہوتے چلے جائیں۔ ہم سب ٹھیک کرلیں گے۔ لیکن اس کے لیے صرف ایک راستہ ہے کہ شائستہ ہندوستان آجائے......'

'یہ کیسے ہوگا؟'

'ہم فون پر نکاح کریں گے۔'

'نکاح—؟ پاگل ہو—؟ نکاح کا مطلب سمجھتے ہو— نکاح کا مطلب ہے دھرم پریورتن— تم دھرم پریورتن کروگے—؟ مسلمان بنوگے—؟ کیونکہ نکاح تو تبھی ہوسکتا ہے جب تم مسلمان بن جاؤ— وہ شک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے کہ کہیں اس میں بھی کوئی پاکستانی چال تو نہیں۔

میری آواز کمزور تھی— 'کیونکہ نکاح کے بغیر، شائستہ ہندستان نہیں آسکتی— ہاں، ایک بار وہ ہمارے ملک آجائے۔ پھر سب ٹھیک ہوجائے گا۔'

'ہمیں کیا کرنا ہوگا— بابو جی اب بھی مجھے بغور دیکھ رہے تھے۔
'ہم صدیقی خاندان کے ہیں۔ میں محمود صدیقی— آپ آفتاب صدیقی۔ اور ماں......'

'عارفہ صدیقی......' بابو جی ماں سے بول رہے تھے— 'تم عارفہ ہو نجمی...... بچپن میں پڑوس میں ایک لڑکی تھی عارفہ— میرے ساتھ کھیلتی تھی۔ سپنے کتنی دور نکل گئے۔'
ان کا لہجہ ایک بار پھر بجھ گیا تھا...... ماں باپ بڑے شہروں کے لیے صرف ایک کٹھ پتلی ہوتے ہیں' جنہیں ان کے پڑھے لکھے نوکری کرنے والے بچے نچاتے رہتے ہیں۔'
اپنے کمرے میں آنے تک میں پریشان تھا۔ شاید سب کچھ اتنی جلدی ہو جانے کی امید نہیں تھی۔ لیکن ابھی کئی امتحانات باقی تھے۔ نکاح۔ قاضی، یعنی ایک جھوٹے نکاح کو سچ بتانا۔ کون مسلمان اس کے لیے تیار ہوگا؟

دوسرے دن صبح بابو جی نے اپنے دو پرانے مسلم دوستوں کو بلا لیا تھا۔ میں نے چھٹی لے لی تھی۔ جس وقت میں کمرے میں داخل ہوا، کمرے میں موت جیسا گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ شاید بابو جی مولوی سبحان (جو پڑوس میں ہی رہتے تھے اور صبح بابو جی کے ساتھ مارننگ واک پر نکلتے تھے) اور ہدایت اللہ خاں دونوں سے اس نازک موضوع پر بات کر چکے تھے۔ مولانا ہدایت اللہ کی بابو جی نے کچھ بے حد دشوار کن لمحے میں مدد بھی کی تھی— لیکن اس وقت دونوں کے چہروں سے ناراضگی ظاہر ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں سرمہ۔ دونوں کے چہرے پر بڑھی ہوئی داڑھی، کرتا پائجامہ۔ میں پاس والے صوفے پر بیٹھ گیا......
'مذہب بچوں کا کھیل نہیں......' ہدایت اللہ نے جیسے بغاوت کر دی تھی۔
'وہ لڑکی اگر پاگل ہے اور اسلام سے بے دخل ہونا ہی چاہتی ہے تو کیا تمہارا بھی لڑکا— ؟ میاں جوانی کے جوش دو دن میں بجھ جاتے ہیں......'
مولوی سبحان آہستہ سے بولے— 'تمہاری دوستی میں آ گئے۔ لیکن جھوٹا نکاح۔ نعوذ باللہ...... یہ ممکن نہیں......'
'ویسے بھی فون پر نکاح قبول نہیں ہے۔ یہ بس چند مجبوریوں کی صورت میں ہو سکتا ہے۔ کہا گیا ہے۔ **'لا نکاح الا بولی'** کوئی بھی نکاح بغیر ولی کے جائز نہیں۔'

ہدایت اللہ نے کہا— ''برخوردار، مسلمان بن جائیں پھر کوئی قباحت نہیں...... ویسے بھی یہ آج کل عام ہوگیا ہے۔ شادی کے لیے پریشانی آئے تو مسلمان ہو جاؤ— اسلام ۴۔۴ شادیوں کی اجازت جو دیتا ہے۔''

گفتگو چل رہی تھی۔ سارے تیر میرے خلاف جا رہے تھے۔ میں جیسے یکا یک گہرے سناٹے میں آ گیا تھا۔ جس امتحان کی گھڑی کو آسان مان کر چل رہا تھا وہ اس قدر الجھی ہوئی اور بھیانک ہو سکتی ہے، شاید یہ سوچ پانا بھی میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ مگر ایسا ہو رہا تھا— مجھے محسوس ہوا، یکا یک شائستہ کا وجود میرے اندر سے گم ہونے لگا ہو...... سانس تیز تیز چلنے لگی تھی۔ پھر اچانک جانے کیا ہوا میں زور زور سے بول رہا تھا۔

'جھوٹ کیا ہوتا ہے، میں نہیں جانتا— آپ بڑے لوگ ہیں— ہم تو بچے ہیں۔ لیکن اتنا جانتا ہوں۔ جو جھوٹ کسی کو بچانے کے لیے بولا جائے، وہ جھوٹ، جھوٹ نہیں ہوتا— یہاں بھی دو زندگیاں داؤ پر لگی ہیں— اور دوسری طرف آپ کا مذہب ہے— مجھے پیار گوارا ہے تو مسلم بن جانا بھی گوارا ہے— لیکن شائستہ نہیں چاہتی— جیسے میں نہیں چاہتا کہ شائستہ میرے گھر آ کر اپنا دھرم چھوڑ کر میرے بھگوانوں کو ماننے لگے— دو دھرم کے لوگ اگر ایک دوسرے کو چاہنے والے ہیں تو اپنے اپنے دھرموں کے ساتھ ایک چھت کے نیچے کیوں نہیں رہ سکتے— ؟ اس دنیا میں جب قتل و غارت کے لیے، ہزاروں تسلیاں یا فتوے مل جاتے ہیں، تو دو پیار کرنے والوں کو ایک جھوٹ کا سہارا کیوں نہیں مل سکتا— ؟ بابو جی سنگھ کو ماننے والے ہیں۔ بابری مسجد کے گرنے سے لے کر ہزاروں واقعات ایسے ہیں، جہاں لاشوں کی تجارت ہوئی ہے اور آپ کے یہاں...... فدائین...... اُسامہ جیسے لوگ جو مذہب کے نام پر انسانی معصوم جانوں کا قتل کر رہے ہیں— یہ سب جائز ہے تو پیار کا ایک جھوٹ جائز کیوں نہیں— ؟ میں چلاّیا تھا— وہ وہاں مر جائے گی اور یہاں میں— کیا یہ آپ دونوں کے مذہب کے لیے فخر کی بات ہوگی— ؟ یا وہ جھوٹ، جو دو زندگیوں کو بچالے۔'

شاید میں رو رہا تھا...... کچھ عجیب سے احساس رہے ہوں گے کہ میں زیادہ دیر تک کمرے میں ٹھہر نہیں سکا۔ میرے جانے کے فوراً بعد ہی دونوں مولوی صاحبان بھی اپنے گھر چلے گئے تھے۔

میں گہرے سناٹے میں تھا — اس کے باوجود پرامید۔ اندر جل پریوں کی طرح رقص کرتی شائستہ موجود تھی۔ جو کہہ رہی تھی — 'گھبراؤ مت۔ ڈرتے کیوں ہو سب ٹھیک ہو جائے گا۔'

رات میں ہدایت اللہ اکیلے واپس آ گئے — وہ کئی جگہ بالخصوص گاؤں کی شادیوں میں نکاح کے فرائض انجام دے چکے تھے۔

چائے پیتے ہوئے انہوں نے بابوجی کو اپنے دل کی بات بتا دی — 'رازداری ضروری ہے۔ اب تو جیسے ہونٹوں پر پاکستان کا نام لانا بھی ملک سے غداری جیسا ہو گیا ہے — بیٹے میاں کی باتوں میں وزن تھا — آپ تیاری کرو۔ لیکن یہ فیصلہ دل پر پتھر رکھ کر کیا ہے میاں۔ اللہ معاف کرے۔ اگر اس جھوٹ سے دو زندگیاں بچ سکتی ہیں تو پھر یہ جائز ہے......'

وہ بابوجی کی آنکھوں میں جھانک رہے تھے — 'شاید تم یہ بھی جان جاؤ کہ ایک انسان کی زندگی بچانے کا معاملہ سامنے آتا ہے، تو اسلام پیچھے نہیں ہٹتا — وحشیوں نے اسلام کو درندوں کا مذہب بنا دیا ہے۔'

جاتے ہوئے وہ ٹھہر کر بولے — 'میں نکاح پڑھا دوں گا۔ دو گواہوں کی ضرورت پڑے گی۔ ایک مولوی سبحان ہو جائیں گے۔ دوسرا میں اپنے چھوٹے بھائی کو تیار کر لوں گا۔'

ایک وزنی پتھر میرے وجود سے اتر گیا تھا — اس رات دیر تک پتاجی میرے پاس بیٹھے رہے۔ ان کی آنکھیں جل رہی تھیں۔

''چلو، تم خوش ہو۔ شاید اسی میں ہماری خوشی ہے — لیکن تم نہیں جانتے ان مسلمانوں کو — قریب سے دیکھا ہے ان لوگوں کو — یہ آج بھی اسی مغلیہ دور میں جیتے ہیں، جہاں اپنے ہی دیش میں ہم پر جزیہ لگاتے ہوئے ہمیں دوئم درجے کا شہری بنا دیا گیا تھا — ان کے لیے سب کچھ ان کا دھرم ہے۔ تو پھر ہمارے لیے ہمارا دھرم کیوں نہیں —؟ وہ اپنا پاکستان لے چکے۔ ان کی نفرتوں نے بنگلہ دیش بنوا دیا۔ یہ اپنے بھائیوں کے بھی نہیں ہوتے۔ پھر ہندو کیوں شرماتا ہے اپنے مذہب کی الکھ جگانے میں — ہر بار ایک سیکولر مکھوٹا کیوں پہنتا ہے —؟ ایک بابری مسجد کا موضوع ان سترہ سالوں میں بار بار اٹھتا رہا — اور بنگلہ دیش اور پاکستان میں جو ہزاروں مندر توڑ دیئے گئے، وہاں —؟ دراصل یہاں بھی وہ اسلام کی حکومت چاہتے ہیں۔ یا وہ جہاں بھی ہوتے

ہیں۔ اسلامی حکومت کا خواب دیکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کے مذہب میں لکھا ہے...... کافروں سے جہاد کرو۔ یہ فدائین دھماکے دراصل جہاد کی ہی شکل ہیں، جسے وہ کبھی کم نہیں کریں گے......'

ایک باپ کھو گیا تھا، سنگھ کا سانپ مذہبی چولے سے سامنے آگیا تھا— میں ڈر رہا تھا۔ یا شاید حیران ہو رہا تھا— ہم جھوٹ سے الگ نہیں ہوتے۔ جھوٹ ہمارے ساتھ چلتا ہے۔ ہم اپنی خوشیوں کے لیے بار بار جھوٹ بولتے ہیں۔ لیکن جھوٹ اپنی زہریلی زبان دکھا کر ہمیں ڈراتا بھی رہتا ہے۔

یہ وہی دور تھا، جب قصاب کو لے کر ہند پاک کی سیاست گرما چکی تھی— اور ادھر امریکہ، ایٹمی دھماکوں سے آزاد دنیا کا اعلان کرنے والے ہیرو اوبامہ کے ساتھ ایک نئی تاریخ کا گواہ بننے کی تیاری کر رہی تھی— وہائٹ ہاؤس کے 132 کمرے والے محل میں، جسے کبھی 18ویں صدی کے کالے غلاموں نے مل کر بنایا تھا۔ پہلی بار ایک حبشی صدر کے ذریعے اس محل میں جا کر نئے خوابوں کو پورا کرنے کا وقت آگیا تھا— یہ خوابوں کو سچ کرنے کا وقت تھا۔ شاید اسی لیے ایک نئے خواب کی بنیاد میں بھی رکھ چکا تھا—

دوسرے دن صبح ہی میں شائستہ کو اپنی کامیابی کی خبر دے دی— گجانند راٹھور عرف آفتاب صدیقی سے تقریباً دو بجے شائستہ کے والد کی ایک رسمی بات چیت ہوگئی اور آئندہ جمعرات رات 8 بجے فون پر نکاح کا وقت مقرر کر دیا گیا۔

جیسا میں نے شروع میں بتایا ہے، میرے لیے سب کچھ کسی پریوں کی کہانی جیسا تھا— راکھشس کے چنگل میں قید پری— شہزادہ جنگل جنگل بھٹکتا ہوا، ہزاروں طلسم سے گزرتا آخر کار شہزادی کو اپنے قبضے میں کر لیتا ہے— لیکن شاید میں بھول گیا تھا۔ پریوں کے کرشمے یا فنتاسی عام زندگی کے کرشمے یا فنتاسی کے سامنے بالکل پھیکے ہیں— شاید میرا اصل چیلنج اب شروع ہوا تھا۔

آخر میں مذہب

جمعرات— شام، ساڑھے سات بجے ہی ہدایت اللہ، مولوی سبحان اور ہدایت اللہ کے چھوٹے بھائی آگئے۔ ڈرائنگ روم کا نقشہ بدل چکا تھا۔ صوفے کنارے کر دیئے گئے تھے۔

قالین پر سفید چادر بچھ گئی تھی۔ گئو تکیے لگ گئے تھے۔ اس درمیان پاکستان، شائستہ کے والدین سے دو تین بار بات ہو چکی تھی۔ مجھے آئیڈیا کا اشتہار یاد آ رہا تھا، جہاں ایک موبائل سے گاؤں دیہات کے بہت سارے بچے پڑھ رہے تھے۔ یا ایک نیتا جی کے مال بنائے جانے کے نام پر ملک کے کونے کونے سے رائے مانگی جاتی ہے...... اور عوام کہتی ہے — نا — وہاٹ این آئیڈیا سر جی۔ اور یہاں یہی موبائل — جھوٹ ہی سہی۔ سرحد کی دیواریں توڑ کر دو رشتوں کو ایک بندھن میں باندھنے جا رہا تھا۔

آٹھ بج گئے۔ موبائل کا اسپیکر آن تھا۔ تاکہ نکاح کے الفاظ اور میرے قبولنامے کو وہاں سنا جا سکے — اور لڑکی کے قبول نامے کے لفظ یہاں سب کو سنائی دے سکیں۔ میں نے اپنے دوست فردین کو اس رازداری بھرے جھوٹ میں شامل کیا تھا کہ وہ اپنے موبائل سے اس موقعے کی تصویر لے لے تاکہ اسے ثبوت بنا کر شائستہ کے گھر والوں کو ویزا میں کوئی پریشانی نہ ہو۔

بابو جی سفید کرتے پائجامے میں تھے۔ سر پر ٹوپی — باہر کا دروازہ بند تھا — اس حلیے میں پہلی بار دیکھ کر عجیب سا لگا تھا۔ بابو جی گجانند راٹھور نہیں، جامع مسجد میں نماز پڑھانے والے امام صاحب لگ رہے تھے۔ لباس نے مذہب کا فرق مٹا دیا تھا۔

آٹھ بج گئے۔

ہدایت اللہ نے قرآن شریف کے کلمات پڑھنے شروع کئے...... کمرے کا سناٹا...... ایک بھیانک خاموشی...... آواز گونج رہی تھی...... فردین، بابو جی، مولوی سبحان، ہدایت اللہ کے چھوٹے بھائی...... اور پردے سے جھانکتی ماں۔ میرے لیے ابھی یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا کہ ماں پر کیا گزر رہی ہوگی۔ لیکن شاید ایک جھوٹ کو پہنتے ہوئے بھی سچ کا احساس ہوتا ہے۔

اسپیکر پر شائستہ کے رونے کی آواز سن رہا تھا...... اُف میں، بھیانک سناٹے میں تھا — جھوٹ اب صرف ایک سچ تھا۔ ہمارے ملک، ہمارے خون سے گزرتا سچ...... وہ زار و قطار روئے جا رہی تھی۔ اسپیکر پر مولوی کی آواز ابھر رہی تھی۔ آپ کا نکاح محمود صدیقی ولد محمد آفتاب صدیقی کے ساتھ دو لاکھ روپے، سکّے رائج الوقت دو معزز گواہوں کی موجودگی میں...... آپ نے قبول کیا......؟'

رونے کی آواز کے درمیان شائستہ کی آواز ابھری — ہاں، قبول کیا......

امام کے تین بار شائستہ سے قبول نامے کے بعد اب میری باری تھی......

میری آنکھیں بند تھیں۔ اب شاید یہ جھوٹ نہیں رہا تھا۔ قبول کرنے کے ساتھ ہی وہ میری زندگی میں آگئی تھی — اس کے رونے کی آوازیں ابھی بھی ٹھہر ٹھہر کر میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔

ممکن ہے، دوسروں کے لیے یہ جھوٹ ہو یا ناٹک — لیکن ہمارے لیے زندگی سے کہیں زیادہ — اور یہ بھی سچ تھا، اب وہ مکمل طور پر میری زندگی میں داخل ہو چکی تھی۔

دوسرے دن میں نے نکاح کی فلم، شائستہ کو میل کر دی۔ شائستہ کا فون آیا تھا — وہ چہک رہی تھی۔

'مسز راٹھور بول رہی ہوں۔ اف...... پکّے پاکستانی لگ رہے تھے تم...... ارے اب تو میں تمہاری منکوحہ ہوں۔ کچھ بھی کر سکتے ہو تم۔ لیکن مسٹر ابھی اتنا بے صبر بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ حالات خراب ہیں۔ بڑے بھائی حکومت سے ویزا لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں امی جان اور فرحان آئیں گے۔ فرحان میرا چھوٹا بھائی ہے۔ ابو کے گھٹنوں میں درد رہتا ہے اس لیے وہ نہیں آپائیں گے۔ گھبرانا مت۔ ایمرجنسی ویزا مل جائے گا۔'

اور اس کے ٹھیک سات دنوں بعد اس نے خوشخبری دی — 'ویزا مل گیا ہے۔ سات دنوں کا ملا ہے۔ لیکن ابھی ہم چار دنوں میں لوٹ جائیں گے۔ ہمارے پاس صرف چار دن ہوں گے اور یہ چار دن تمہیں سنبھالنے ہیں۔'

•

زندگی، ناٹک یا ڈرامے سے کہیں زیادہ ایک کڑوی سچائی ہے — ہم زندگی میں ایک معمولی سا بھی قدم اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں تو جیسے ایک ناٹک اپنے بھیانک روپ میں ہمیں نئی صورت حال سے آگاہ کرنے لگتا ہے۔ یہاں تک ہم کامیاب رہے تھے لیکن اب؟ راستے پریشان کن اور الجھے تھے — بھارت آئے ہوئے پاکستانی ایک ایک کر کے واپس بھیج دیئے گئے تھے۔ بیحد ایمرجنسی حالت میں ہی ویزا ملنا ممکن تھا۔ پھر اس فارمالیٹی پورا کرنے کے لیے پولس ویری فکیشن۔ لیکن یہاں بھی ہمارے پڑوسی مولانا سبحان نے مدد کی تھی۔

شائستہ کے بھائی نے وہاں کی ہوم منسٹری دوڑ بھاگ کر کے ویزا حاصل کر لیا تھا اور اب وہ آرہے تھے — پولس انکوائری میں مولوی سبحان نے ساتھ دیا تھا — آفتاب صدیقی ہمارے

کرائے دار ہیں اور اچھے آدمی ہیں۔

ایک بلاٹل گئی تھی لیکن اصل امتحان ابھی باقی تھا۔ شائستہ کو فرحان سے خطرہ تھا، جس کے بارے میں اس کا شک تھا کہ وہ طالبان جیسی دہشت پسند تنظیم سے وابستہ ہے۔ ظاہر ہے، اس شک کے کچھ بنیاد بھی رہے ہوں گے۔ لیکن اب تک کی ساری مہم اتنی کامیابی سے انجام پائے گی، میں نے سوچا نہیں تھا— شائستہ کے پاس صرف چار دن ہوں گے۔ ان چار دنوں کو زندگی بھر کا ساتھ بنانا تھا۔ اصل زندگی کا جوا اب شروع ہوا تھا۔ کتنے ہی خیالات آرہے تھے۔ جارہے تھے۔ وہ معافی مانگ لے گا— گڑگڑا کر اپنی محبت کی بھیک مانگے گا۔ لیکن وہ ایک جھوٹ کو کیوں تسلیم کریں گے—؟

پھر؟

اگر وہ شائستہ کو ساتھ لے کر چلے گئے تو—؟ تو کیا ان حالات میں اس کا پاکستان جا کر شائستہ کو لانا ممکن ہے—؟ شاید نہیں۔ صرف ایک ہلکی سی امید کہ پیار جیت جائے— جیسے مولوی سبحان یا ہدایت اللہ نے اس پیار کی عظمت کو دہشت گردانہ کارروائیوں پر ترجیح دی— شاید شائستہ کی امی جان کا دل بھی پسیج جائے۔

لیکن ابھی سب سے بڑی الجھن تھی، ان چار دنوں میں اس کے گھر والوں کا مسلمانوں کی طرح رہنا اور تواضع کرنا— کیا یہ ممکن ہو سکے گا؟

لیکن یہ ممکن کرنا پڑے گا— قدم قدم پر احتیاط برتنی ہوگی۔ ذرا بھی لاپروائی اور خطرہ سامنے— اور خطرہ بھی ایسا کہ ان نازک اور سیاسی حالات میں، معاملات کے بے حد بگڑ جانے کا خطرہ بھی سامنے تھا۔

ایک ہندو گھر کو مسلمانی گھر بنانے کا کام جاری تھا— دیوار پر ٹنگے دیوی دیوتاؤں کے کلینڈر چھپا دیے گئے تھے— اسلامی کلینڈر دیواروں پر جگہ جگہ لگا دیے گئے— پوجا والا کمرہ بند کر دیا گیا— بابو جی تو سفید کرتا اور پائجامہ پہن کر مسلمان بن جائیں گے اور ماں؟

مشکل ماں کی تھی۔ ماں سیندور پوچھنے، منگل سوتر اتارنے کو راضی نہیں تھی— مر جاؤں گی لیکن نہیں اتاروں گی— لیکن بابو جی کے سمجھانے پر ماں، عارفہ صدیقی بن گئی تھی۔ شلوار جمپر— سر پر آنچل ڈالے— اپنے گھر میں ہو کر بھی، جیسے ہم کسی اجنبی گھر میں تھے— کہاں سے ہندو تھے ہم......؟ گھر کی دیواروں سے لے کر پہناوے تک— کہاں ہیں ہم؟ بس

لباس یا پہناوے کی حد تک؟ لیکن ایک مشکل اور تھی۔ گھر میں نا نو یج نہیں کھایا جاتا تھا۔ بابو جی اور ماں اس کی بو تک سے پرہیز کرتے تھے۔ یہ ذمے داری مولوی سبحان نے قبول کر لی تھی۔ میرے گھر سے آجائے گا۔ انہوں نے اپنے گھر والوں کو بتایا تھا— گجانند بابو کے یہاں، ان کے بچپن کے پاکستانی دوست آرہے ہیں۔

'اس ماحول میں—؟ ممکن ہے، ان سے پوچھا گیا ہو، لیکن جواب آسان تھا— دوست تو کسی بھی ماحول میں آسکتے ہیں۔ دشمن تھوڑے ہی آرہے ہیں۔'

ہمارے طرف سے ساری تیاری مکمل تھی۔ لیکن احتیاط برتنے کے باوجود بھی خطرے کا پہلا سائرن اس وقت بجا، جب گاڑی گھر کے دروازے پر داخل ہوئی— دروازے پر انگریزی میں گجانند راٹھور کی نیم پلیٹ لگی تھی— اس نیم پلیٹ کے بارے میں ہم نے اس سے پہلے غور نہیں کیا تھا— مگر حادثہ ہو چکا تھا۔ چھ بجے صبح یہ لاہور بس سے چلے تھے اور شام چھ بجے لاہور سے چلنے والی بس انہیں دتی گیٹ چھوڑ گئی تھی۔ میں گاڑی لے کر پہلے ہی ان کے استقبال کے لیے کھڑا تھا— مگر شائستہ کو چھوڑ کر امی جان یا فرحان دونوں میں کہیں وہ گرمجوشی نہیں تھی، شاید میں جس کی امید کر رہا تھا۔

گاڑی چلاتے ہوئے میں نے شائستہ کی طرف دیکھا، وہاں قندیل کی طرح روشن مسکراہٹ کے ساتھ ایک گھبراہٹ بھی چھپی تھی۔

گاڑی کے گھر پہنچنے تک سناٹا ہی رہا۔ کسی نے کوئی بھی ذکر چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ اب گاڑی چرمرا کر گھر کے دروازے پر رک گئی تھی۔

'گجانند راٹھور......' فرحان کے چونکنے کی باری تھی۔

مجھے دن میں آسمان کے تارے نظر آگئے۔ -یہ انہیں کا فلیٹ ہے۔ ہم کرائے میں رہتے ہیں۔'

'اوہ......!'

شائستہ کے بے حد پیارے معصوم چہرے پر سناٹا چھایا ہوا تھا— امی جان غور سے ہماری طرف دیکھ رہی تھیں۔

'اپنا مکان نہیں ہے؟'

'ہو جائے گا۔ جلد ہی......'

گاڑی رکنے کی آواز کے ساتھ ماں نے دروازہ کھول دیا تھا۔

فرحان، بابو جی کے گلے ملا۔ علیک سلیک، ہونے کے بعد یہ لوگ صوفے پر بیٹھ گئے۔ دیوار پر لٹکے اسلامی کلینڈر کو دیکھتے رہے۔

'پہلے ناشتہ یا چائے — یا آپ لوگ فریش ہونا پسند کریں گے —؟'

شائستہ کی امی کے چہرے پر ناراضگی کے آثار اب بھی برقرار تھے، جیسے اس شادی میں ان کی رضامندی شامل نہیں ہو۔

'دونوں بھائی بہت پیار کرتے ہیں اس سے۔ ورنہ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا......'

شائستہ سہمی ہوئی تھی۔

فرحان پوچھ رہا تھا۔ 'یہاں تو مسلمانوں پر بہت ظلم ہوتا ہے۔ آپ لوگ کیسے برداشت کر لیتے ہیں اتنا ظلم......؟

بابو جی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا، میں نے روک دیا —

'ظلم تو نہیں ہوتا......'

'نہیں ہوتا —؟ بابری مسجد توڑ دی — گودھرا میں اتنے ظلم ڈھائے — ظلم اور کیا ہوتا ہے......؟'

وہ طالبان کی زبان بول رہا تھا۔

'بابو جی خود کو روک نہیں پائے — آپس میں لڑائی تو ساری دنیا میں چلتی ہے۔ بابری مسجد مسمار ہوئی تو اخبار سے میڈیا سب نے خوب خبر لی — مسلمان یہاں اپنی پوری آزادی کے ساتھ رہتے ہیں۔'

'وہی۔ آپ لوگ شاید ایک خاص طرح کی سینسر شپ میں جیتے ہیں۔ اس لیے ملک کے خلاف بولنے کی آزادی نہیں۔'

'ایسا نہیں ہے......'

ٹھیک یہی وقت تھا، جب پاس کے مندر سے گھنٹہ بجنے کی آواز سنائی پڑی —

شائستہ کی امی چونک پڑی — یہاں پاس میں مندر ہے؟'

فرحان نے پوچھا — 'آپ مندر کے سائے میں رہتے ہیں؟'

'بھارت مسجدوں اور مندروں کا شہر ہے۔ قدم قدم پر مندر — بابو جی بولتے بولتے رہ گئے ...... میں بابو جی کی بے بسی اور لاچاری سمجھ رہا تھا۔

ماں چپ تھی۔ نظریں بچا بچا کر وہ سہمی ہوئی شائستہ کو دیکھ رہی تھی —

'مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ یہاں پاس میں کوئی مسجد ہے؟'

فرحان کے اس اچانک سوال سے ہم سب جیسے سناٹے میں آگئے تھے......

'نہیں ہے......' — میرا لہجہ ڈرا ڈرا سا تھا......

'کوئی بات نہیں۔ گھر میں نماز پڑھ لیں گے۔ پچھم کدھر ہے؟'

شائستہ کی امی، ماں سے پوچھ رہی تھیں......

ہمارے دل ڈوب سے گئے تھے —

ماں چپ تھی۔ ہونٹوں پر تالا۔ اس نئی مصیبت کے بارے میں تو ہم نے غور بھی نہیں کیا تھا......

فرحان کی آنکھوں میں شک کے سائے گہرے ہو گئے تھے...... 'آپ لوگ نماز نہیں پڑھتے کیا؟'

شائستہ کی امی کہہ رہی تھیں — 'وہاں سنا تھا، بھارت کے لوگ غیر مذہبی ہوتے جا رہے ہیں۔ نماز اور قرآن سے کوئی مطلب ہی نہیں...... ناراضگی اب آہستہ آہستہ ظاہر ہو رہی تھی۔

'ہم وضو کریں گے۔ پھر مغرب کی نماز۔ پھر تلاوت کریں گے...... قرآن شریف تو گھر میں ہوگا ہی — ' وہ ماں سے پوچھ رہی تھی — 'غسل خانہ کہاں ہے — جا نماز نکال دیجئے۔ تلاوت کے بعد ہی ہم چائے ناشتہ کریں گے، پھر باتیں کریں گے......'

فرحان، شائستہ اور امی جان کو ان کا کمرہ دکھا دیا گیا تھا — باہر ہم تینوں سکتے میں تھے — ایک دوسرے سے نظر ملاتے ہوئے بھی گھبراہٹ سی ہو رہی تھی۔

●

وہ بھیانک رات گزر گئی۔ مولوی سبحان کے گھر سے جائے نماز اور قرآن شریف ان کا

چھوٹا بیٹا لے آیا تھا اور یہ بات فرحان اور امی جان پر ظاہر ہو گئی تھی۔ رات کھانے کے بعد امی جان نے مختصر میں اپنا فیصلہ سنایا۔

'فون پر نکاح کو ہم صرف ایک رسم مانتے ہیں۔ یہاں آ کر آپ کا گھر گھرانا اور ماحول دیکھنا تھا— محمود میاں کو پاکستان آنا ہوگا— تبھی ہم شائستہ کی رخصتی کر سکیں گے۔

رات جیسے کمرے میں ڈھیر ساری چمگادڑیں جمع ہو گئی تھیں۔ میں جانتا تھا، شائستہ کی امی اور فرحان گھر کا ماحول دیکھ کر خوش نہیں تھے۔ جیسے جبراً بیٹی کی ضد میں ہندستان تو آ گئے، لیکن اب اس آنے پر افسوس ہو رہا ہو— فرحان بار بار بھارت پاک دشمنی کے تذکرے لے کر بیٹھ جاتا—یا پھر کشمیر کی باتیں کرتے ہوئے اس کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں— بابو جی کے لیے یہ سب برداشت کرنا ممکن نہیں تھا لیکن وہ برداشت کئے ہوئے تھے۔ رات کسی طرح کٹ گئی۔ لیکن صبح یعنی دن کا وقت دھماکے جیسا تھا—

ماں نے علی الصباح نظریں بچا کر پوجا والا کمرہ کھول دیا تھا— وہ اپنی پوجا میں مصروف تھیں...... کہ اچانک چونک گئیں۔

دروازے پر لال لال آنکھیں لیے فرحان اور شائستہ کی امی جان کھڑے تھے۔

'تو ہمیں بیوقوف بنایا گیا۔ آپ لوگ مسلمان نہیں ہندو ہیں......'

پھر جیسے ایک کے بعد دوسرے دھماکے ہوتے چلے گئے۔

●

ڈرائنگ روم میں سب اس وقت ایسے بیٹھے تھے، جیسے کسی کی میت میں آئے ہوں— ایک طرف دونوں گھر والے تھے۔ دوسری طرف سر جھکائے مولوی سبحان......

'دھوکہ—'

فرحان کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ 'اتنا بڑا دھوکہ...... مجھے کل ہی شک ہو گیا تھا۔ لیکن جھوٹا نکاح— ؟ اسلام کی بے حرمتی ہم گوارا نہیں کریں گے۔'

شائستہ کی آنکھیں روتے روتے پھول گئی تھیں۔

'ہم پولس میں جائیں گے۔ ایف آئی آر درج کرائیں گے۔ دھو کے بازوں کا ملک ہے یہ۔ اتنا بڑا دھوکہ — میرے لیے یہ بات موت سے زیادہ بھیانک ہے کہ میں ایک کافر کے یہاں ہوں۔'

'ہم ہی بے وقوف تھے، جو اس بے حیا کے بہکاوے میں آ گئے — تھوڑی سی جانچ پڑتال کر لیتے تو شاید اصلیت سامنے آ جاتی۔ نوج یہ نیٹ چیٹنگ جو نہ کرائے۔ بے شرمی کا اکھاڑا ہے......'

''تو پولس کے پاس جائیں گے آپ؟' کافی دیر بعد مولوی سبحان نے منہ کھولا......'الحمد للہ۔ میں بھی مسلمان ہوں۔ سچ اور جھوٹ کے معنی جانتا ہوں۔ لیکن میں دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ ان بچوں نے جو کیا وہ گناہ نہیں۔ کتنا مذہب جانتے ہیں آپ —؟ ہندوستانیوں کا مذہب کیا پاکستانیوں کے مذہب سے الگ ہے —؟ وہی اسلام جو میرے دل میں ہے، وہی آپ کے دل میں ہے — اور اسلام نفرت نہیں، محبت سکھاتا ہے — دلوں کو توڑنا نہیں جوڑنا سکھاتا ہے۔ میں ابھی بھی اپنی بات پر قائم ہوں کہ ان دونوں نے جو کچھ کیا، وہ ذرا بھی غلط نہیں ہے۔'

'اس لیے کہ آپ بھی اس سازش میں شامل تھے — وہ بھی ایک مسلمان ہو کر — شریعت کا پاس ہونا چاہئے — آپ نے جو کچھ کیا وہ ناقابل معافی ہے۔' فرحان کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ 'اتنا بڑا فریب شاید یہ سوچ پانا بھی میزائل کے پھٹنے جیسا ہے۔'

'تو آپ پولس کے پاس جائیں گے۔ فریاد لے کر۔ اور پولس آسانی سے اس پریم کہانی کو سچ مان لے گی؟ ایسے ماحول میں جہاں تلوار سر پر منڈرا رہی ہے۔ جنگ کا ماحول ہے۔ ممبئی پر فدائین حملہ ہو چکا ہے اور ہندوستانی حکومت کے پاس ایک مضبوط ثبوت بھی ہے۔ ایسی صورت میں آپ جانتے ہیں پولس کے پاس جانے کا مطلب —؟ ایمرجنسی ویزا، مشکل حالات میں آپ کی آمد — ان سب کو دہشت گردانہ کارروائیوں کی نظر سے دیکھا جائے گا — جایئے پولس کے پاس......'

جیسے اچانک آنکھوں کے آگے کی دھند آپ کو ایک نہ ختم ہونے والے اندھیرے میں دھکیل دیتی ہے۔ میں جیسے اچانک صفر میں دھکیل دیا گیا...... میں نے پلٹ کر دیکھا۔ شائستہ کی آنکھوں کے آنسو اس کے گال پر جمع ہو گئے تھے۔ آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں — جیسے ڈاکٹر

نے سہارا دیتے دیتے جواب دے دیا ہو......

'ہم سب پھنسیں گے...... پولس میں جانے کے بعد کوئی نہیں بچے گا......' بابو جی کمرے میں ٹہل رہے ہیں۔

'میں بھی سنگھ کا آدمی ہوں۔ ایک کٹر اور مذہبی انسان۔ لیکن کیا کٹر پن بچوں کی خوشی سے زیادہ معنی رکھتی ہیں۔'

پہلی بار بابو جی کی آنکھوں میں آنسو تھے— 'میں نے بس ان بچوں کی خوشی کے لیے یہ بھی سوچ لیا تھا— سیاست کی عمر نہیں رہی اب۔ سنیاس لے لوں گا۔ سنگھ کی سبھاؤں میں جانا بند...... سچ اگر لاکھوں لوگوں کی جان لینے سے زیادہ بھیانک ہے تو ہم ایک سچ کے لیے آگے کیوں نہیں آسکتے—'

'دھوکہ......' فرحان کمرے میں ٹہلتا ہوا بے چین تھا— 'ہم ایک اجنبی دیس میں چند کافروں کے درمیان اپنی غلطی سے پھنس گئے ہیں۔ ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ پولس کے پاس گئے تو شاید وہ ایک نیا قصاب ڈھونڈ لے گی......'

'ہماری پولس ایسی نہیں ہے۔' شاید پہلی بار مجھے احساس ہوا تھا، مجھے بولنا چاہئے— 'شائستہ نے یہ ساری لڑائی صرف میرے لیے لڑی ہے۔ اس وقت پاکستان جیسے ملک سے ساری بندشوں کے باوجود اگر یہاں تک آنے کی ہمت جٹائی ہے تو صرف میرے لیے— لیکن شاید تاریخ کے سارے بے رحم اوراق میں ہمیشہ سے پیار کو شکست ملتی رہی ہے۔'

'مجھے معاف کر دیجئے...... شائستہ کو بھی......' الفاظ ٹوٹ رہے تھے۔ صرف آنکھیں ظاہر کر رہی تھیں...... ہونٹ لرز رہے تھے......'' ہم نے سوچا تھا— سب ٹھیک ہو جائے گا...... ملک کی تقسیم نے سب ٹھیک کر دیا تھا نا—؟ دو ملک— دو الگ ملک— اپنی جگہ چین سے زندگی گزارنے والے دو ملک۔ لیکن کہاں سب ٹھیک تھا—؟ 61 برسوں میں سب ٹھیک کہاں ہوا— لڑتے ہی رہے ہم— نفرت بوتے رہے— نفرت کی فصلیں کاٹتے رہے...... نفرت بھلا کیوں نہیں سکتے ہم......؟'' میں نے آنسو پونچھے— 'بتائیے کیا راستہ ہے؟ راجندر راٹھور سے سچ مچ محمود صدیقی بن جاؤں تو—؟ آپ مجھے پاکستان بلا کر شائستہ مجھے سونپ دیں گے۔'

'نہیں—' امی کا لہجہ برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔

'پھر راستہ بتائیے۔ حل نکالیے......' آنسو ایک بار پھر آنکھوں میں سمٹ آئے تھے—

'ہم نے سوچا تھا سب ٹھیک ہو جائے گا— یہاں آپ کے آنے کے بعد آپکے پاؤں پر گر کر ہم معافی مانگ لیں گے— آپ بدلتے وقت کے ساتھ ہمارے پیار کی گہرائی کو سمجھیں گے اور معاف کردیں گے......'

الفاظ ٹھہر گئے ہیں۔

میں کمرے کی طرف دیکھتا ہوں۔ دیوار پر جھولتے اسلامی کلینڈر میں ایک بچہ قرآن کی تلاوت کر رہا ہے۔ مکہ اور مدینہ کی تصویریں— صرف کمرہ بدلا ہے— ہم حالات نہیں بدل سکتے۔ لیکن برسوں کی تہذیب سے جڑنے کے بعد کسی نئے فیصلے کی حمایت میں ہی سہی، کمرہ ایک نئی تہذیب تو اوڑھ سکتا ہے—؟ پھر حالات کیوں نہیں بدلے جا سکتے......

اور یہ وہی نازک وقت تھا، جب افغانستان اور پاکستان سے طالبان کے فتوے آگئے تھے۔ لڑکیوں کو پڑھانا منع ہے۔ باہر سڑک پر نکلنا، غیر مردوں کو دیکھنا......اور ایسے تمام فتووں میں عورت کی بغاوت کی سزا موت تھی۔ عورت ایک بار پھر پندرہویں صدی میں پہنچ رہی تھی۔ شاید شائستہ کی بغاوت کو بھی اسلامی شریعت سے جوڑ کر دیکھا جائے گا......

موت......موت......

صرف موت کا جان لیوا احساس رہ گیا تھا۔ شاید ہم ہار چکے تھے—

امی چپ تھیں—

شائستہ کی سسکیاں گونج رہی ہیں—

بابو جی ادھ مرے سے کرسی پر بیٹھے ہیں۔ ماں کی آنکھوں کی پتلیاں بے جان ہو چکی ہیں......

فرحان نے فیصلہ سنا دیا۔

''ہم ابھی جائیں گے یہاں سے۔ اب یہاں رکنا مناسب نہیں۔ اور ہاں، محبت جیسی کسی چیز کا واسطہ دے کر ہمیں روکنے کی کوشش مت کیجئے— ہم بے شرمی اور بے حیائی جیسی چیزوں کو غیر اسلامی اور غیر اخلاقی مانتے ہیں۔ ہم جا رہے ہیں۔''

'ایک منٹ......'

شائستہ اپنی جگہ سے اچھلی۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح جل رہی تھیں۔

'یہ نکاح آپ کے لئے جھوٹا سہی۔ میرے لیے نہیں ہے۔ اس لیے خود کو محمود کی منکوحہ سمجھتے ہوئے میں اس سے دو منٹ اکیلے میں باتیں کرنا چاہتی ہوں......'

فرحان نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ لیکن امی جان نے خاموش اجازت دے دی۔

کمرے میں اس وقت صرف ہم دونوں تھے ــ لاچار، بے بس ــ خوفزدہ ــ شائستہ نے مجھے بانہوں میں لیا۔ میرے ہونٹوں پر اپنے ہونٹوں کی آگ رکھ دی۔ پھر جدا ہوئی ــ

'گھبراؤ مت۔ تمہاری بیوی ہوں اب ــ کوئی گناہ نہیں کیا میں نے ــ اور وقت گواہ ہے ــ دشمنی اور دہشت کے ایسے ماحول میں ــ ہم نے ایک دوسرے کو چنا...... اور جو کچھ ہم کر سکتے تھے...... ہم نے کیا......'

'لیکن وہ تمہیں مار ڈالیں گے۔ بے شرمی اور بے حیائی کے مظاہرے کی سزا وہاں صرف موت ہے۔'

وہ مسکرا رہی تھی...... 'تم سے الگ ہو کر زندہ بھی کہاں ہوں۔ مگر اس غلط فہمی میں مت رہنا کہ وہ شائستہ فہیم خاں کو پاکستان لیے جا رہے ہیں ــ میں اپنا جسم، اپنی روح یہیں چھوڑے جا رہی ہوں...... تمہارے پاس......'

وہ جھٹکے سے مڑی۔ پھر باہر نکل گئی......

میں بت بنا اپنے ہونٹوں پر اس کے ہونٹوں کے ذائقے کو ہمیشہ کے لیے اپنے اندر محفوظ کرتا رہا...... باہر ٹھنڈ بڑھ گئی تھی...... لوگ چلے گئے تھے ــ بھیانک تنہائی اور سناٹے کا احساس ہو رہا تھا مجھے۔ آنکھوں کے آگے دھند کی ایک گہری لکیر دور تک بچھ گئی تھی...... لیکن اس دھند میں ابھی تک شائستہ فہیم خان کے چہرے کو میں اندر تک محسوس کر سکتا تھا...... 'میں اپنا جسم اپنی روح یہیں چھوڑے جا رہی ہوں تمہارے پاس......'

کہانی ختم ہو چکی تھی ــ لیکن شاید کہانی کا ایک بے جان حصہ ابھی باقی تھا ــ یہ وہی وقت تھا جب ہندوستان، پاکستان پر دہشت گردوں کو ہندوستان بھیجنے کا دباؤ بڑھا رہا تھا...... اور بدلے میں پاکستان اپنی پالیسی میں الجھا ہوا تھا ــ میں نے ایک چھوٹا سا خط ہوم منسٹری کو بھیجا......

جس میں صرف اتنا لکھا تھا— 'عزت مآب— ملک کا ایک شہری ہونے کے ناطے یہ خط آپ کو لکھ رہا ہوں— اکثر اخباروں میں پڑھتا ہوں۔ سنتا ہوں کہ آپ لوگ پاکستان سے دہشت گردوں کو سونپنے کی مانگیں کرتے رہے ہیں— میں جانتا ہوں، پاکستان ایسا نہیں کرے گا— بدلے میں پاکستان بھی اسی طرح کی کچھ مانگیں آپ کے سامنے رکھتا آیا ہے— یہ خط بے حد تکلیف دہ الفاظ کے ساتھ لکھ رہا ہوں— کہ میری محبت شائستہ فہیم خاں، ولد مرزا فہیم خاں، میر قاسم محلّہ، لاہور پاکستان میں ہے۔ آپ دہشت گرد مانگتے ہیں وہ نہیں بھیجتے— کیا ایک بار میری بات پر غور کرتے ہوئے آپ ان سے ایک محبت کے لیے اپیل نہیں کر سکتے— ؟ صرف ایک بار— شاید اس کے جواب میں وہ بھی ایسی ہی محبت آپ سے مانگ بیٹھیں— پھر ممکن ہے محبتوں کا یہ سلسلہ دور تک چل نکلے— '

میں گہری سوچ میں ڈوبا تھا...... اور ظاہر ہے، اس وقت بھی میری آنکھوں میں شائستہ کی صورت جھلمل جھلمل کر رہی تھی۔ بہت اندھیرے کے باوجود میں ابھی اس لڑائی کو بند نہیں کرنا چاہتا تھا......

ooo

شاہی گلدان

شاہی گلدان نئے گھر میں قدم رکھنے کے بعد بھی موجود تھا۔اور صرف موجود ہی نہیں تھا بلکہ اپنی موجودگی ثابت کرنے کے لیے بھی ہمیں پریشانیوں میں ڈال گیا تھا۔اب اسے رکھا کہاں جائے......؟

'رکھنے' کی یہ بات ابا کو کچھ ایسے ناگوار گزرتی تھی' جیسے کسی نے اچانک شاہی تاج ان کے سر سے چھین لیا ہو۔

'کیا مطلب'......ارے شاہی گلدان ہے۔ کیوں نہ اسے ڈرائنگ روم میں رکھ دیا جائے۔'

'ڈرائنگ روم—؟' فرحین کے لیے اپنے نئے گھر کے خوبصورت ڈرائنگ روم میں اس کی کہیں کوئی جگہ نہیں تھی۔ کیونکہ گھر آنے والے رئیس زادے اور دوست نہ اسے کوئی اینٹک پیس سمجھتے اور نہ اس سے وابستہ کہانی میں ان کی آنکھیں گم ہو چکی شہنشاہیت کی سڑک تک جانے کی ہمت کر سکتی تھیں۔بس وہ کھل کر ہنس دیتے— 'بھابھی......تم بھی نا......کسی کباڑی بازار سے لیا گیا......؟'

اشرف کے لیے اس شاہی گلدان کی کشش صرف اتنی تھی کہ ابا کا احترام اس عمر میں کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تھا۔اور ابا وقت کے ساتھ آج بھی شہنشاہیت کے اسی قلعے میں قید تھے، جہاں سے شاید باہر نکلنا اب اس عمر میں ان کے لیے آسان نہیں رہ گیا تھا۔

ہاں، اگر اس نشانی سے جڑی نفرت کو دیکھنے کی بات تھی تو وہ بس امّی کی آنکھوں میں دیکھی جا سکتی تھی— جہاں گلو کو ما تو اتر آیا تھا، مگر آنکھوں میں چھائے گھنے اندھیرے کے کہرے

کے باوجود شاہی گلدان کی تاریخ تک، بے رحم ماضی کے اوراق پلٹتی ان کی آنکھیں اگر چہ کچھ بول نہیں پاتیں، لیکن خاموشی میں ساری کہانی سنا ڈالتیں...... 'کہ لو کہاں کا شاہی گلدان۔ بچوں نے تو ایک گھر بنا لیا اور ایک ہم تھے کہ شادی کے بعد تمہارے چھپر کھٹے میں آئے تو ساری زندگی تنگی کے سائے میں، اسی چھپر کھٹ میں گذر گئی۔ بس لے دے کر زندگی بھر اس شاہی گلدان کی کہانی کہتے رہے...... کہ بڑے بادشاہوں کے خاندان کے ہو۔ لیکن کہاں کے بادشاہ۔ تین وقت کی روٹی تو سڑک کا بھکاری بھی پیدا کر لیتا ہے......'

•

میرا نام اشرف ہے۔ اشرف جہانگیر۔ بچپن میں تاریخ کی کتابیں مجھے پسند نہیں تھیں۔ بڑا ہوا تو تاریخ سے نفرت ہو گئی۔ تاریخ میرے لیے ایک خوفناک آئینے کی مانند تھا، جس میں اپنی صورت دیکھنے کا احساس ہی مجھ میں خوف بھر دیتا تھا۔ تاریخ کے اوراق مجھے بے رحم لگتے تھے۔ کیونکہ بچپن کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی گھر کی ٹوٹی محرابوں سے جھانکتی خاموشی مجھے زخمی کرتی تھی۔ ابا نے میری پیدائش کے بعد ہی خود کو مسجد کے حوالے کر دیا تھا۔ تنگی کے اس ماحول میں جب امّی کا چڑچڑا پن اور غصہ ابا کے کمزور وجود پر ظاہر ہوتا تو ابا سب کچھ بھول کر بس اس شاہی گلدان کو لے کر اپنی بے چارگی دکھانے آجاتے۔

'لو میں کیا کروں۔ سب تقدیر کے کھیل۔ کسے معلوم تھا کہ تیموریہ خاندان کا زوال آجائے گا اور ایک دن ان کی اولادیں پیسے پیسے کو ترس جائیں گے......'

صبا مجھ سے دو سال چھوٹی تھی۔ امّی ابّو کو لڑتے دیکھ بس خاموشی سے اپنے کمرے میں بند ہو جاتی —— اور تکیے پر گر کر آنسو بہانا شروع کر دیتی۔

تاریخ کے بے رحم اوراق پر 'تیموریہ ٹھونگا بھنڈار' کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھتا ہوں اور اس جھلک میں ابا کی بدقسمتی کی اُس کہانی کو محسوس کر سکتا ہوں، جب انہوں نے شروع، شروع ایک چھوٹی سی دکان میں ٹھونگا کا یہ کاروبار شروع کیا تھا۔ پیٹ کی دوزخ کو شانت کرنے کے لیے شاہی تخت سے ٹھونگے کی طرف ہجرت کرتے ہوئے کتنا کچھ ٹوٹ گیا تھا ان کے اندر۔ تاریخ کے اس بے رحم قلعے میں جھانکتے ہوئے وہ آنسو آج بھی نظر آجاتے ہیں، جو صبح ابا کی خشک آنکھوں میں نظر آیا کرتے تھے۔ سرخ پھولی آنکھیں رات کی ساری روداد سنا ڈالتیں کہ 'شاہی حجرے' سے حال کے مقبرے کو دیکھنے کا تصور کیسے ہوتا ہے —— ابا حال سے پریشان تھے اور تاریخ اُنہیں خوش کرتی تھی۔

شاید انہی دنوں تاریخ سے نفرت کی کہانی کی شروعات ہو چکی تھی۔ تاریخ کی یادگاریں اور مقبرے مجھے بس ان گھنونے مکڑی کے جالوں کی طرح لگتے، جن میں پھنس کر کسی کیڑے کی موت ہوگئی ہے۔ اس وقت کی جدوجہد میں ہم بھی انسان کہاں تھے۔ کیڑے تھے — مردہ کیڑے اور شاہی داستانیں سنانے والا ٹوٹا پھوٹا گھر کسی مقبرے کی طرح لگتا، جس سے نجات حاصل کرنے کی فکر لمحہ لمحہ بڑھتی جارہی تھی۔

کیا تاریخ کو کسی تشریح و توضیح کی ضرورت ہوتی ہے؟ یا تاریخ کسی نہ کسی صورت میں زمانہ اور عہد کے مطابق خود کو نئے سانچے میں ڈھال لیتا ہے۔ میری بڑھتی عمر کے ساتھ گھر کے اجنبی سے ماحول میں امید کی ایک نئی کرن چمکی تھی — اور ساتھ ہی تبدیل شدہ تاریخ یا اس کی تشریح کا ایک نیا چہرہ دیکھا تھا میں نے۔ دو جگہ سے میری بحالی کی خبر آئی تھی۔ ایک جگہ نئے کالج میں لکچرر کے طور پر اور دوسرا ایک ریپوٹیڈ فرم میں فیلڈ افسر کے طور پر — میں نے یہ بات ابا اور گھر کے کسی فرد کو نہیں بتائی۔ کیونکہ ان میں سے ہی کسی ایک کو جوائن کرنے کے فیصلے پر پہنچنا تھا مجھے۔ یہ احساس تھا کہ غربت کی اس تاریخ میں تھوڑی سی تبدیلی تو آئے گی۔ مگر یہ تبدیلی ایک نئی شکل میں بھی آئی تھی — یا تبدیلی ایک نئی تعریف کے ساتھ آئی تھی۔

اُنہی دنوں شہر کے ایک کالج میں طالب علموں کی دو جماعت کے درمیان جھگڑا ہوا اور یہ جھگڑا اتنا طول پکڑا کہ سارا شہر اور شہر کی چھوٹی چھوٹی سڑکیں دہشت میں ڈوبے نوجوانوں کی چیخ و پکار سے لرز گئیں۔ جلدی جلدی دکانیں بند ہونے اور شٹر گرنے لگے۔ جو دکانیں کسی وجہ سے کھلی تھیں وہ لوٹ لی گئیں۔ لوگ چھتوں سے، کھڑکیوں سے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ اس وقت شہر کے کالجوں میں مشتعل طالب علموں کی ایسی جھڑپیں کوئی نئی بات نہیں تھی۔

میں کمرے سے باہر آیا تو اماں اور صبا گھبرائے ہوئے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

''ابا نہیں آئے......؟''

پتہ نہیں...... کہاں ہوں گے؟

سڑک سے آرہی چیخ و پکار کی آوازوں کے درمیان میں خوفزدہ تھا۔ دو گھنٹے بعد ابا لوٹ آئے۔ آواز میں لرزش...... یہ بتانے کہ کمبخت نے دکان لوٹ لی۔ ٹھونگے سڑک پر پھینک دیئے۔

مشین کے کل پرزے الگ کر دیئے۔ ڈرائنگ روم میں رکھے شاہی گلدان کو دیکھتی ابا کی آنکھیں پڑھتا ہوا میں تاریخ اور تشریح وتوضیح کی نئی سڑک سے گزر رہا تھا۔ ابا خوفزدہ اور پریشان ہونے کا ناٹک کر رہے تھے۔ ابا کہیں سے بوجھل یا پریشان نہیں تھے۔ اس بات سے بھی نہیں کہ دکان لوٹ لی گئی تو اب یہ گھر کیسے چلے گا۔ ان کی نظریں ایک ٹک شاہی گلدان پر گڑی تھیں اور اسی احساس نے مجھے تاریخ کی نئی تعریف سے متعارف کرایا تھا۔ موجودہ وقت کے بھیانک اوراق کی جگہ انہوں نے سنہری تاریخ کو ترجیح دی تھی۔

'اب کیا ہوگا؟' اما نے آنگن سے برآمدے میں بھاگتے چمگادڑ کو دیکھ کر گردن جھکالی تھی۔ تب میں آہستہ سے بولا تھا— اب ابا کو کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ میری نوکری لگ گئی ہے۔

شاید اس لمحہ ابا کی آنکھوں میں جو چمک لہرائی تھی، وہ ان تیموریہ بادشاہوں کی آنکھوں میں بھی نہیں ہوگی، جب وہ جنگ کے میدان سے، فتح کے احساس کے بعد محل لوٹتے ہوں گے۔

●

محبت آپ کی زندگی کو بامعنی بنا دیتی ہے۔ شاید اب بہتر اور معقول وقت ہے کہ اس دبلی پتلی سی، لمبی سی فرحین کا تذکرہ بھی کر دیا جائے۔ میری چھت کے سامنے والی چھت پر آنچل کا کونا بار بار ہونٹوں سے دبائے اور بار بار آنچل کے سرکنے سے پریشان۔ میری نگاہوں کا سامنا ہوتے ہی گھبرا جانے والی فرحین۔ کب صبا کی دوست بن کر گھر آنے جانے لگی، پتہ بھی نہیں چلا۔ لیکن اپنی آمد سے اس نے گھر کے سارے لوگوں کا دل جیت لیا تھا— ابا کے سر میں تیل دیتی ہوئی۔ کبھی امی سے چھین کر روٹیاں بناتی ہوئی۔ صبا کے بال سنوارتی یا گھر کے چھوٹے چھوٹے کام میں اپنی حصہ داری کا احساس دلاتے ہوئے اس نے خاموشی سے جیسے اعلان کر دیا تھا— 'میرا گھر ہے، میں جو کچھ کر رہی ہوں اپنے گھر کے لیے کر رہی ہوں— پہلے تھوڑی سی بات چیت پھر جھجک۔ پھر ابا امی اور صبا کی موجودگی میں تھوڑا سا مذاق'

''نماز کیوں نہیں پڑھتے ہیں یہ......؟''

''زیادہ کتابیں پڑھنے سے کیا ہوگا؟''

''کم سے کم جمعہ کے دن تو مسجد جایا کریں۔''

''ابا آپ تو بولا کریں۔''

یا پھر صبا سے — کہ تمہارے بھیا ہر وقت غصے میں کیوں رہتے ہیں؟

اور ایک دن خاموشی سے گھر کے ایک گوشے میں، میں نے اس فرحین کی بچی کو تنہا پا کر اچانک سینے سے بھینچ لیا تھا— 'اوئی اللہ' کہہ کر بھاگنے کے بجائے وہ جیسے میرے سینے میں خرگوش کی طرح دبک گئی تھی۔ آنکھیں نیچی کیے۔ لرزتی ہوئی۔ مگر جیسے برسوں سے پیاسی ندی کو تھوڑا سا سکون ملا تھا۔

وہ آہستہ سے بولی تھی— 'کوئی آجائے گا۔'

''پھر آپ شرارت کرتی ہی کیوں ہیں؟''

اس کے کان کی لویں سرخ تھیں۔ آنکھوں کی پتلیاں لرزتی ہوئی۔ آنچل ذرا سا سرکا تھا۔ وہ ہونٹ دابے آہستہ سے بولی۔

'نماز پڑھنے جایا کیجئے، گھر میں رونق رہتی ہے۔'

'دیکھئے فرحین...... میں نے ایک جھٹکے سے اسے بانہوں میں دوبارہ بھینچا تھا— 'میں مذہب کا احترام کرتا ہوں۔ تم اس ٹوٹتے اجڑتے گھر کی ویرانی دیکھ رہی ہو نا...... اس گھر نے اور اس گھر سے پیدا شدہ بہت سارے سوالات نے میرے اندر کے مذہب کو کب مجھ سے دور کر دیا، میں نہیں جانتا— مگر ڈرو مت۔ میں اتنا دور نہیں گیا کہ واپس بھی نہ آسکوں، مگر مجھے میرے عقیدوں کے لیے مجبور مت کرنا۔'

جاتے جاتے، وہ سہمی سہمی سی آنکھوں سے اتنا کہہ گئی تھی۔ 'چلو تمہارے بدلے کی نماز میں پڑھ لوں گی۔ تمہارے لیے اللہ میاں سے معافی بھی مانگ لوں گی۔'

آنچل برابر کرتی فرحین تیزی سے بھاگ گئی تھی— ٹھیک اسی لمحہ جلد بازی میں دیوار سے ٹکرانے کے دوران سوکھی سفیدی کا ایک بڑا جھول گرا تھا۔ شاید یہ حال کی دستک تھی۔ اور تاریخ کا ذرا سا حصہ اس لمحاتی رومانی ماحول کے احساس سے ٹپک گیا تھا۔

پرانے گھروں کی دیواروں پر چھپکلیاں اتنی کیوں گھومتی ہیں۔ اچانک ہی میری نظر دیوار کی جانب گئی تو وہاں دو چھپکلیاں چونکتی نگاہ سے میری طرف دیکھ رہی تھیں...... میں چھت کی کمزور اور بارش میں لرزرہی دیواروں کو دیکھ رہا تھا۔ آس پاس کی دیواریں بھی چولہے کے دھوئیں سے سیاہ پڑ گئی تھی...... چھت کو سہارا دینے کے لیے بانس کے موٹے لٹھے لگے تھے۔ اب یہ لٹھے صدیاں گزارتے ہوئے تھکے اور پکے آم کی طرح گرنے کے انتظار میں تھے۔ ایک خوشبو بھی چپکے

سے مجھے چھو کر گئی تھی۔ ایک مکان پرانا پڑ گیا تھا۔ ابا کے ٹھونگے لوٹ لیے گئے تھے — اور بے نور شاہی گلدان کی تاریخ کی چمک ابا کی آنکھوں کو سحر زدہ کر گئی تھی — فرحین جاتے جاتے اپنے جسم کی خوشبو اور انگارے میرے جسم میں چھوڑ گئی تھی — اور دو نوکریوں میں سے ایک کو چننے کے خیال میں، اسی لمحہ دہلی والی ریپوٹیڈ مگر پرائیویٹ فرم کو دل ہی دل میں اپنی منظوری دے دی تھی...... چھوٹے آنگن سے بڑے آنگن کا سفر — سیاہ تاریخ سے دہلی کی زندہ اور موجودہ تاریخ کو دیکھنے کی باری تھی — جہاں قدم قدم پر تیموریہ بادشاہوں کی نشانیاں خوبصورت ماضی کی دستکیں سنا رہی تھیں۔

مٹھی بھر تاریخ

گھر میں میرے دہلی جانے کی خبر پھیل گئی تھی۔ اس لیے رات دستر خوان پر طلباء کے ہنگامے یا ابا کی دکان لوٹنے کی کہانی کہیں نہیں تھی۔ ابا کی آنکھوں میں ماضی کی حسین سڑک نظر آ رہی تھی، اور ماضی کی ان سڑکوں پر قلعہ معلیٰ کی لال اور سفید برجوں کے کلس چمک رہے تھے......

'تو تم دہلی جا رہے ہو......'

ابا کی آواز ایسی تھی، جیسے اپنے آبا و اجداد کے گھر جا رہا ہوں — اپنا پشتینی مکان دیکھنے۔

رات کے کھانے کے بعد ہم چھت پر آ گئے — آسمان پر چاند روشن تھا۔ بادلوں کا دور دور تک کہیں پتہ نہیں تھا۔ چھت پر پلنگڑیاں بچھ گئی تھیں...... ایک پر میں، ایک پر صبا اور سامنے والے کارنس کے قریب ابا کی پلنگڑی بچھی تھی۔ ابا چاند نہارتے ہوئے جیسے شاہی گلدان کی تاریخ میں گم ہو چکے تھے......

''مئی کا مہینہ تھا وہ...... اب بھلا کیا یاد رہے گا۔ باتیں بھی پرانی پڑ گئیں۔ اور ایک دن باتیں بس پرانی ہو کر کھو جاتی ہیں۔ پشتینی کہانیاں بس ماہ و سال ہوتی ہوئی ایسی معلوم ہوتی ہیں جیسے سارا واقعہ ابھی ان آنکھوں کے سامنے گزر رہا ہو......

صبا اٹھی۔ ابا کے پائتانے بیٹھی...... آہستہ سے سر دبانے لگی۔ ابا کی آنکھیں بند تھیں۔

'بہت بھاری غدر ہوا تھا۔ غدر۔ لیکن ایک تاریخ کے گزر جانے کے بعد صرف تاریخ کے چھینٹے رہ جاتے ہیں۔ اور ان چھینٹوں کو اگلے زمانے کے لوگ اپنے اپنے طریقے سے دہراتے

ہیں۔ غدر تو بس غدر تھا۔ کون غدّار تھا، اپنے یا انگریز۔ کہنا مشکل— 90 سال کے بوڑھے پینشن یافتہ بادشاہ کو کمی کس بات کی تھی— بیٹھے بٹھائے لاکھ روپے مل جاتے تھے— انگریز حاکم ان کی صلاح سے ہی کام کیا کرتے۔ سات یا آٹھ بجے ہوں گے۔ بادشاہ تسبیح خانے میں تھے۔ شاید نماز پڑھ چکے تھے— کھڑکی کے پاس آئے تو دریائے جمنا سے دھوئیں کے بادل منڈرا رہے تھے۔ بادشاہ نے انجانے خطرے کی بو سونگھ لی۔ گھبرائے ہوئے واپس آئے۔ اونٹ برداروں کی ٹولی کو بھیجا کہ ماجرا کیا ہے۔ اونٹ بردار واپس آئے اور گھبرائے لہجہ میں بتایا کہ میرٹھ سے غدّاروں کی پلٹن آئی ہے۔ تلواریں گھماتے، گھوڑے دوڑاتے پاگل فوجی ہیں جو میرٹھ سے ہنگامہ کرتے ہوئے آرہے ہیں۔ صاحب لوگوں کے بنگلے جلا دیئے گئے۔ جو انگریز سامنے آیا، اس کا قتل کر دیا گیا...... سارے شہر میں بھگدڑ مچ گئی۔ میرٹھ سے آئے انقلابی شہر میں داخل ہونا چاہتے تھے۔ انگریزوں نے ہوشیاری سے اسے بند کرا دیا۔ دہلی پر موت برس گئی۔ غدر کی آگ دور تک پھیل گئی اور اس مار کاٹ، تباہی کے بعد تھوڑا سکون ملا تو یہ آوازیں گردش کر رہی تھیں۔ خلق خدا کا، ملک بادشاہ کا...... لیکن تجربوں کی لمبی راہ داری سے گزرنے والا بوڑھا بادشاہ جانتا تھا کہ ان غداروں نے ان کی زندگی کے چین وسکون کے دن چھین لیے ہیں۔ آنے والے دن بربادی کی کہانیاں لے کر آئیں گے۔ اور وہی ہوا تھا......

ابا نے گلا کھکھارا...... ایک لمحے کو چپ ہوئے پھر جیسے ایک بار پھر وہ تاریخ کی تاریک گپھاؤں میں قید تھے۔

'بادشاہ کی مجبوری تھی، غداروں کا ساتھ بھی دینا تھا اور نہیں بھی دینا تھا۔ ان سے دوبارہ بادشاہ بننے اور انگریزوں کو بھگانے کی اپیل کرنے والی ان کی ہی رعایا تھی— اور اس وقت بادشاہ کی مجبوری تھی یا تیموریہ سلطنت کی سنہری تاریخ کا دباؤ کہ بادشاہ ان غداروں سے ناراض ہوتے ہوئے بھی ان کی ہر بات ماننے کو مجبور تھے...... اور پھر...... بھلا انگریز مکاروں کے سامنے، یہ جذباتی ہندوستانی کب تک چلتے— کشمیری گیٹ، کابلی گیٹ سے انگریزی فوجیں شہر میں داخل ہوگئیں...... چاروں طرف مار کاٹ مچ گئی۔

پھر وقت نے کروٹ بدلی، شاہ زیب، ہمارے خاندان کا شجرہ ان سے ہو کر گزرتا ہے۔ ثنی بیگم پائیں باغ میں تھی۔ بیگمات اور محل کی عورتوں کو ایک بڑے سے ہال میں جمع کیا جا چکا تھا۔ خبر ملی تھی کہ بادشاہ نے ہمایوں کے مقبرے میں، چھپنے کی تیاری کر لی ہے اور حکم ہوا ہے کہ اپنی

اپنی جان بچانے کی کوشش کی جائے کیونکہ انگریزوں کا قہر کسی وقت بھی محل پر ٹوٹ سکتا ہے۔ محل میں افراتفری کا ماحول تھا۔ جان بچانے کی ناکام کوشش کی جارہی تھیں۔ شاہ زیب جانتے تھے کہ اس غدر کے ماحول میں اپنے عزیز ایک دوسرے سے بچھڑ جائیں گے۔ زخمی انگریزوں کے دل میں ہمدردی کہاں — لیکن وہ محل سے کسی شاہی نشانی کے بغیر نکلنا نہیں چاہتے تھے اور یہی شاہی گلدان......

محل چھوڑتے ہوئے بس یہ شاہی نشانی کپڑوں کی ایک پوٹلی میں عقیدت کے ساتھ باندھی۔ منی بیگم کا ہاتھ تھاما اور باہر نکل گئے...... تب تک خبر آچکی تھی کہ بادشاہ قیدی بنا کر دہلی لائے گئے۔ شہزادوں کو خونی دروازے کے نزدیک گولی ماردی گئی...... اور تینوں شہزادوں کے سر نڈھال بادشاہ کے سامنے 'سرخوان پوش' سے ڈھک کر بھجوائے گئے...... 'اُف یہ ظلم کی انتہا تھی'۔

شفاف آسمان پر بادلوں کے کچھ ٹکڑے اچانک آگئے تھے۔ اور ان ٹکڑوں نے اچانک چاند کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔

ابا سونے کی تیاری میں تھے...... 'اور اس کے بعد سے یہ شاہی گلدان'...... وہ بیحد آہستہ سے بولے — 'آخری نشانی...... اسے دیکھ لیتا ہوں تو پھر اپنی بربادی یاد نہیں رہتی'۔

ابا ایک بار پھر ماضی کی گپھاؤں میں چلے گئے۔ اور مجھے دہلی جانے کی تیاری مکمل کرنی تھی۔

تاریخ اور تشریح و توضیح

میں جانتا تھا، ہر عہد اپنے حساب سے تاریخ کی تشریح و توضیح پیش کرتا ہے۔ کبھی وقت اسے خونخوار اور ناقابل برداشت بنا کر پیش کرتا ہے تو کبھی تاریخ کے خوفناک چہرے میں اپنے لیے پانی جیسا ایک شفاف چہرہ بھی ڈھونڈ لیتا ہے۔ لیکن دہلی جانے کے بعد کے تجربے ماضی کی اس سنہری تاریخ سے اس طرح بھی جڑ سکتے ہیں، مجھے اندازہ نہ تھا۔ اس لیے اس تحریر میں صرف شاہی گلدان کی تاریخ نہیں ہے، بلکہ اس تاریخ سے وابستہ شاخیں بھی ہیں، جنہیں چھوٹی چھوٹی ندیوں کی طرح ایک بڑی تاریخ یعنی سمندر میں سما جانا تھا۔ نہیں، شاید اس طرح آپ اس بات کی حقیقت نہیں سمجھ پائیں گے جو میں کہنے جارہا ہوں۔ اس لیے تھوڑا ٹھہر ٹھہر کر مجھے ساری تفصیل صاف کرنی پڑے گی۔ دہلی جاتے ہوئے ابا خوش تھے......

''لو تاریخ نے ہمیں ایک موقع اور دیا......؟''

'لال قلعہ پر پرچم کشائی کا یا شاہی قلعے میں اپنا پشتینی تخت تلاش کرنے اور شہنشاہیت کے اعلان کا......؟' میں بہت آہستہ سے بولا تھا۔

●

دہلی کے چار پانچ برسوں کی زندگی میں اپنے لیے ایک خوبصورت 'فلور' حاصل کرنے میں مجھے زیادہ مشکلوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ہاں، وہ کہانی آپ شروع میں ہی سن چکے کہ ابا شاہی گلدان کو ڈرائنگ روم میں نشانی بنا کر رکھنے کی ضد کر رہے تھے اور اپنی بات کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب بھی ہوئے تھے۔ صبا کی شادی ہوگئی اور وہ اپنے سسرال میں خوش تھی۔ فرحین نے گھر کی ذمے داری سنبھال لی تھی۔ ان چار پانچ برسوں کی خوشیوں اور الجھنوں نے کچھ کچھ دہلی وال تو مجھے بنا ہی دیا تھا — اب یہ اشرف جہانگیر بہت حد تک بدلا ہوا، شاید مضبوط ہونے کی حد تک، تاریخ سے آنکھ ملانے کی ہمت کر رہا تھا۔ شروع میں فرحین نے بھی جاب کرنے کا خیال کیا تھا — مگر آرام دہ زندگی کے احساس نے اسے 'جاب' پر گھر کو فوقیت دی تھی —

گھر کے باہر برآمدے میں پھولوں کے گلدستے ایک قطار سے سجے تھے۔ اس دن چھٹی کا دن تھا۔ لیموں کے بونسائی پودے کو لے کر فرحین سے میری تھوڑی سی جھڑپ ہوئی تھی۔

'پاگل ہو، پودا سوکھ جائے گا......'

'نہیں سوکھا تو......؟'

'سوکھ جائے گا......'

'اور نہیں سوکھا تو......؟'

'چلو وقت آنے پر دیکھیں گے۔'

چھٹی کے دن فرحین برآمدے میں آئی۔ پھر تیزی سے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے برآمدے میں کھینچ لے گئی۔ گلدستے کے پودے میں چھوٹے چھوٹے لیموں کے جاگنے کی پہلی آہٹ مل چکی تھی۔ میں بھونچکا تھا۔ اچانک مجھے یقین نہیں ہوا۔ فرحین ہنسے جا رہی تھی۔ جیسے تاریخ نے اپنے پاؤں پھیلائے۔ جیسے وجود میں برسوں سے سوئی ہوئی شہنشاہیت چپکے سے جاگ گی۔ میں جو کہہ رہا تھا، شاید مجھے بھی نہیں پتہ تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں...... مذاق ہی سہی...... مگر میرے اندر سے شاید کوئی شکست یافتہ شہنشاہ بول رہا تھا۔

'ہاں، چلو ہار گیا۔ بولو کیا مانگتی ہو۔ چاہو تو آزاد ہو جاؤ۔ طلاق لے لو مجھ سے۔''

'طلاق'— فرحین کانپ گئی۔ اچانک نکلے اس مکالمے سے جیسے ہوا ٹھہر گئی۔ پودے سے جھانکتے ننھی لیموں کی کونپلوں نے جیسے ٹھنڈی ہوا کے خوف سے خود کو ہلکے ہرے پتوں میں چھپا لیا......

'کیا...... کیا بولے تم......؟' فرحین ڈری ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

نہیں، مجھے خود حیرت تھی۔ اس بے تکی بات کا یہاں کوئی مطلب نہیں تھا۔ شاید نیوز چینلوں پر آنے والے مسلسل اس طرح کے مکالموں نے مجھے اس حیران کن لمحہ ایک سنگدل حکمراں میں تبدیل کر دیا تھا۔

تو کیا میرے اندر سچ مچ ایک تانا شاہ چھپا تھا۔ ایک ایسی بات جس کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ایک ایسی بات جس نے قہقہہ لگاتی فرحین کی آنکھوں میں ایک بھیانک ڈر پیدا کر دیا تھا۔ میں نے شاید تاریخ کی نکلتی شاخوں میں اس بونسائی لیموں سے نکلے یا ٹپک رہے خون کو دیکھ لیا تھا۔

اس رات فرحین کی آنکھیں نم تھیں۔

'تم نے ایسا کیوں کہا، میں نہیں جانتی، مگر کچھ تو ہوگا تمہارے اندر۔ تم بتاؤ نا بتاؤ۔ گھر سے غائب رہتے ہو۔ بڑے آدمی ہو۔ عورتوں کے فون آتے ہیں۔ مینکس چلتی ہیں۔ سچ بتاؤ اشرف، ایک سکنڈ کے لیے بھی تمہیں فواد کا خیال نہیں آیا؟'

میں نے دیکھا، فواد بستر پر سو گیا تھا۔

'میں شرمندہ ہوں......'

میں خود سے لڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر آخر تک 'میں شرمندہ ہوں' یہ جملہ میرے ہونٹوں پر نہیں آسکا۔ آخر ایسا کیا کیا تھا میں نے۔ بس ایک چھوٹا سا مذاق— مذاق میں طلاق کی بات کرنے سے طلاق تھوڑے ہو گئی۔ میاں بیوی میں ایسے مذاق تو ہو ہی سکتے ہیں'۔ مگر جیسے فرحین زخمی تھی۔

شاید وہ اس مذاق پر دیر تک روتی رہی تھی۔ اس کی آنکھیں پھولی ہوئی تھیں۔

'تم نماز کیوں نہیں پڑھتے؟'

'یہ میرا اور خدا کا معاملہ ہے۔'

'نہیں، یہ صرف تمہارا اور خدا کا معاملہ نہیں— فرحین چیخی تھی— اب فواد بھی ہے۔

پانچ سال کا ہو گیا۔ اسے اپنے مذہب کو جاننا ہے— قرآن شریف شروع کرانا ہے۔ کل ابّا بھی کہہ رہے تھے اشرف مت بنانا...... فرحین ایک لمحہ کو ٹھہری— ''نماز پڑھتے تو اللہ کا ڈر ہوتا تمہیں۔ پھر اتنی بڑی گالی نہیں دیتے۔ تم کیا جانو، ہم شادی شدہ عورتوں کے لیے طلاق موت سے بھی زیادہ ہے۔ ایک بار پھر وہ بلک بلک کر رو پڑی تھی۔ اور شاید اس بار ایک شکست خوردہ شہنشاہ حقیقت میں تیز آواز میں دہاڑا تھا—

'پاگل ہو گئی ہو تم۔ ایک چھوٹے سے مذاق کو بھی ڈائجسٹ کرنے کی کیپسٹی نہیں ہے تم میں۔ کیا تمہارے سامنے مجھے ہر لفظ کو ناپ تول کر بولنا پڑے گا۔ بس ایک مذاق تھا۔ ایک چھوٹے سے مذاق کا افسانہ بنا لیا تم نے۔ چھٹی کا دن مشکل سے ملتا ہے۔ اس چھٹی کے دن کو بھی عذاب بنا دیا تم نے......'

میں اتنے زور سے چیخا تھا کہ شاید لال قلعہ کے بجھے ہوئے کلسوں تک میری آواز گونج گئی ہو۔ فوادا ٹھ کر رونے لگا تھا۔ میں دل کا غبار نکال کر نیچے ڈرائنگ روم میں آیا تو اچانک نگاہ، اس شاہی گلدان کی طرف چلی گئی۔ لگا، اس گلدان سے سچ مچ ایک رشتہ رہا ہے میرا— ایک ایسا رشتہ شاید جسے میں جان رہا تھا— لیکن میں نے جان بوجھ کر اپنے آپ سے چھپانے کی کوشش کی تھی۔

مجھے احساس تھا۔ کمرے سے ابا کی خاموش آنکھیں مجھے دیکھ رہی تھیں۔ اور شاید ان کے پیچھے اماں بھی ہوں گی۔ بے نور آنکھوں والی اماں......شاید یہ میرے لیے تبصرے یا مکالمے کا وقت تھا— تو کیا آج جو کچھ بھی ہوا وہ اس شاہی گلدستے سے جڑی تاریخ کی نئی تشریح و توضیح تھی......؟ میں جس طرح فرحین پر چلایا تھا، یا جس طرح ایک کمزور لمحے حیوانیت یا درندگی مجھ پر سوار ہوئی، وہ شاید اس سے پہلے مجھ پر کبھی نہیں حاوی ہوئی تھی......؟ کیا میرے اندر کے لہو میں سوئے ہوئے حکمراں یا تاناشاہ نے کوئی کروٹ لی تھی۔ یا پھر یہ ایک عام سی بات تھی— ایک ایسی کہانی جو گھر گھر میں روز دہرائی جاتی ہے۔ لیکن شاید میرے اب تک کے 'بی ہیویر' کے خلاف— اور مجھے فرحین کو اس بات کا احساس کرانا تھا کہ بونسائی لیموں والے واقعہ کے ساتھ میں نے جو کچھ بھی کہا' وہ صرف ایک چھوٹا سا مذاق تھا۔ اور شاید اسے مذاق ثابت کرنے کے لیے دو تین بار، ایک بار تو، ایک بیحد رومانی لمحہ فرحین کو بازوؤں میں بھرتے ہوئے، بوسہ لیتے ہوئے، میں نے اس سے کہا— تو تم مجھ سے طلاق کیوں نہیں لے لیتی۔ اور اتنا کہہ کر میں زور زور سے ہنسا تھا— دیکھا، کیسے ڈر گئی۔ ارے......ایسے طلاق تھوڑے ہی ہوتی ہے۔ جسٹ کڈنگ، لیکن تمہارا چہرہ اتنا پھیکا

کیوں پڑ جاتا ہے......'

مگر شاید مجھے یہ علم نہیں تھا کہ کبھی کبھی تاریخ اپنی ہی تشریح و توضیح میں اس قدر سخت ہو جاتی ہے کہ دو زندگیاں داؤ پر لگ جاتی ہیں۔

فتوے کی سیاست

میں دہلی کی جس کمپنی میں، 'ون آف دڈ ائریکٹرس' میں تھا، اس کا نام میکلارڈ کمپنی ہے۔ میکلارڈ نے صابن، تیل سے لے کر باسمتی چاول تک کے پراڈکٹ مارکیٹ میں اتارے تھے۔ اور کچھ ہی برسوں میں میکلارڈ گروپ ہر گھر کی پہلی پسند کے طور پر جانا جانے لگا تھا۔ میرے ذمے ان دنوں فارین ڈیلی گیٹس کو انٹرٹین کرنے سے لے کر نئے پروڈکٹ پر ایڈ فلم بنانے تک کی ذمے داری شامل تھی۔ ایسی ہی ایک ایڈ فلم کے لیے میں نے بالی وڈ کے ایک بڑے اور قیمتی ڈائرکٹر کی خدمات حاصل کی تھیں۔ ڈائرکٹر نے بجٹ اور تھوڑی بہت صلاح کے بعد ایڈ کے لیے کرکٹ کی دنیا کے ایک کھلاڑی کی خدمات لی تھیں۔ اس کھلاڑی کا اب تک کوئی ایڈ کسی چینل پر نہیں آیا تھا۔ اور شاید یہیں سے میری بدقسمتی یا ستاروں کی گردش کی کہانی بھی شروع ہوئی تھی۔ ایڈ فائنل ہوا۔ بجٹ فائنانس سے ہو کر میرے پاس آیا اور میرے سائن کے بعد ڈائرکٹر نے دس سے چالیس سکنڈ تک کی تین تین فلمیں تیار کرلیں۔ فلمیں اچھی بنی تھیں۔ لیکن بدقسمتی کی کہانی کی شروعات بھی یہیں سے ہوئی۔ بورڈ آف ڈائرکٹرس کے پینل کو کھلاڑی پر ایک سنجیدہ اعتراض تھا کیونکہ کھلاڑی کے ڈرگس لینے اور بیوی کو مارنے کی کہانی کچھ ہی دنوں پہلے نیوز چینلوں پر ہائی لائٹ ہوئی تھی۔ بورڈ آف ڈائرکٹرس کا خیال تھا کہ ایڈ آتے ہی ہندستانی خاندان اس اشتہار کی مخالفت کرے گا نتیجہ پروڈکٹ فلاپ کیونکہ ہمارا پروڈکٹ، گھر گھر کا پراڈکٹ کہلاتا ہے۔ یہ معاملہ اتنا طویل ہوا کہ سارے بورڈ ڈائرکٹرس میری مخالفت میں کھڑے ہو گئے۔ دوسری جانب اکیلا میں تھا۔ اور یہی وہ دن تھے' جب فرحین کی ناراضگی کی کہانی بھی شروع ہوئی تھی۔ برآمدے میں بونسائی لیموں کے پودے پر تو شباب آگیا تھا، مگر ہماری گرہستی کو جیسے نظر لگ گئی تھی۔ میری خواہش ہوتی تھی کہ رات کو واپس آؤں تو فرحین سے باتیں کروں مگر فرحین کی ناراضگی کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ گھر آکر جیسے میرا بلڈ پریشر ایک دم سے بڑھ جاتا۔ میں آفس سے گھر لوٹتے ہوئے سکون اور شانتی کی امید لے کر آتا تھا، لیکن فرحین کی موجودگی اب مجھے چڑچڑا کرنے لگی تھی۔ جیسے اس کی حرکت پر گھر

آنے کے بعد میرے اندر بیٹھا جانور خاموشی سے مجھے بتاتا رہتا کہ ان سب کی ذمے دار کوئی اور نہیں فرحین ہے اور جیسے اس وقت میرا دماغ آگ کے شعلوں کی طرح جلنے لگتا۔ میں امید کر رہا تھا کہ ان حالات میں مجھے بیوی کی مدد ملے گی، حوصلہ ملے گا مگر مدد اور حوصلہ دور ہمارے چھوٹے سے مذاق کو جیسے فرحین نے اپنی نہ ختم ہونے والی ناراضگی سے جوڑ لیا تھا۔ میرے ساتھ مشکل یہ تھی کہ آفس میں چلنے والی سازش یا مخالفت پر گھر میں کسی سے بات بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اور اس رات...... شاید اندر دبا لاوا آتش فشاں بن گیا تھا۔ ایک بار پھر ایڈ فلم کو لے کر بورڈ آف ڈائرکٹرس کی میٹنگ ہوئی۔ شاید زندگی میں، میں اتنا ہیومیلیٹ، کبھی نہیں ہوا تھا...... میں گھر آیا تو میرا دماغ سوچنے سمجھنے سے انکار کر چکا تھا۔ ایک فائل کی تلاش میں فرحین سے میری جھڑپ ہو گئی۔ مجھے نہیں پتہ میں غصے میں کیا کیا بولتا رہا۔ میری آنکھیں لال تھیں۔ لوٹتے ہوئے میں نے شراب کے دو پیگ بھی لیے تھے۔ کچھ اس کا بھی اثر تھا۔ میں زور زور سے چلا رہا تھا۔

''کیوں میری جان کی دشمن بنی ہو تم۔ مجھے چھوڑ کیوں نہیں دیتی۔ آئی ہیٹ یو۔ میری زندگی کو دوزخ بنا کر رکھ چھوڑا ہے تم نے۔ اور میں پورے ہوش و حواس میں تمہیں..... طلاق دیتا ہوں..... طلاق..... طلاق......طلاق۔''

جیسے ہوا رک گئی۔

وقت رک گیا۔

بالکل فلمی منظر...... فرحین کا چہرہ سفید پڑ گیا — آنسو پلکوں سے زار و قطار گر رہے تھے — اچانک آواز آئی۔

''قریشہ، دلہن کو اپنے ساتھ کمرے میں لے جاؤ۔'' میں مڑا۔ دروازے پر ابا غصے سے آگ بگولہ کھڑے تھے۔ اماں کا چہرہ فق تھا۔

'اگر مولویوں کے حساب سے یہ طلاق جائز ہے تو دلہن اسی لمحے سے تم پر حرام ہوئی۔'' رات کافی ہو گئی ہے۔ اب صبح مسجد میں جا کر اس پر فتویٰ لینا پڑے گا۔'

ابا کا چہرہ سخت تھا۔ 'مذہب سے کوئی سمجھوتہ نہیں۔'

جب تک مجھے کچھ سمجھ میں آتا، اماں فرحین کا ہاتھ تھامے اپنے کمرے میں جا چکی تھیں — اور اماں کے کمرے سے فواد کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔

●

تنہا کمرہ جیسے کچھ دیر پہلے آئے 'زلزلے' کا گواہ بن گیا تھا۔ غصے کے عالم میں دیئے گئے طلاق کے دو دو گواہ اماں اور ابا کی شکل میں موجود تھے۔ اور میں جانتا تھا، ابا چاہے تیمور یہ سلطنت کے زوال کی علامت یا نشانی کے طور پر ہوں لیکن مذہب کے معاملے میں میں وہ کسی کٹر سلطان سے کم نہیں۔ کمرے میں سگریٹ کا دھواں پھیل رہا تھا۔ خالی بستر مجھے کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ آج ساری رات مجھے اسی خالی بستر پر گزارنی تھی۔ اور اس کے بعد جو ہنگامے شروع ہونے والے تھے، میں نے اس کا اندازہ لگانا شروع کر دیا تھا۔ آفس کی پریشانیاں ہی کم نہیں تھیں، اور اب میں اپنی ہی نادانی سے ایک اور پریشانی کو جنم دے چکا تھا۔

صبح ہوگئی۔

ابا مذہبی معاملوں میں اپنی طرف سے کوئی فیصلہ نہیں لے سکتے تھے۔ فرحین کا سامان میرے کمرے سے اماں کے کمرے میں شفٹ کر دیا گیا۔ میں نے بیماری کا بہانا بنا کر آفس سے چھٹی کر لی تھی۔ آنکھیں فرحین کو ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ معصوم سی شرمیلی لڑکی، چھپ چھپ کر اسے دیکھنے والی۔ میری آہٹ پا کر آنچل کا کونا دانتوں سے دبا لینے والی...... ایک بار پھر تاریخ زندہ تھی اور وقت کے ساتھ اپنی بوسیدگی اور افسردگی کی تشریح و توضیح کر رہی تھی۔

دس بجے ابا مسجد گئے۔ اور آدھے گھنٹے میں ہی مسجد کے 'مولی صاحب' اور دو اماموں کو لے کر آگئے۔ مجھے بلایا گیا۔ ڈرائنگ روم میں ابا سمیت ان تین اماموں کی موجودگی کے باوجود خطرناک حد تک سناٹا پسرا تھا— جیسے یہ امام یا مولوی کسی گھریلو جھگڑے کو سلجھانے نہیں بلکہ کسی کی میت میں آئے ہوں

'......آپ نے بہت اچھا کیا، جو ہمیں خبر کی۔ خوشی ہے، اسلام زندہ ہے، اسلام دراصل ایسی ہی چھوٹی چھوٹی باتوں پر نظر رکھتا ہے۔'

ابا الجھن میں تھے— 'لیکن کیا کیا جائے؟ فتویٰ کیا کہتا ہے، شریعت کیا کہتی ہے؟'

چشمہ لگائے سفید داڑھی والے امام فرقان کو میں پہچانتا تھا۔ ورنہ بڑے شہروں میں جان پہچان کے موقع ہی کیا ملتے ہیں۔ اتفاق سے پڑوس میں مسجد نہ ہوتی اور مسجد کو ابا نے آباد نہ کیا ہوتا، تو ممکن تھا، یہ معاملہ اتنا آگے بڑھتا بھی نہیں۔ لیکن اب یہ معاملہ گھریلو نہیں تھا۔ مذہب کا معاملہ تھا، اور گواہی میں ابا اور امی بھی شامل تھے۔

'لڑائیاں پہلے بھی ہوئیں؟'

'ہاں۔'

'لیکن اس بار تین طلاق...... بڑی بی بھی اس واقعہ کی گواہ ہیں؟'

'ہاں۔' ابا کا لہجہ سہا ہوا تھا۔

'یہاں تو یہ معاملہ مسلک سے بھی جڑا ہے۔ آپ کو تو پتہ ہے بریلویوں کے گاؤں میں، دارالعلوم کے مولوی نے نماز جنازہ پڑھا دی تو کیا فتویٰ آیا—؟

مولوی صاحب کو یہ بات بری لگی تھی— 'ہاں یاد ہے، ایک بریلوی مولانا کا فتویٰ آیا کہ جو لوگ نماز جنازہ میں شامل تھے' ان کی بیویوں کا نکاح حرام ہے۔ پتہ ہے ایسے فتوے دین کا رتبہ گراتے ہیں۔ مذہب کو بدنام کرتے ہیں''

دوسرے امام بولے— وہ غصے میں تھے۔' ایسا آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ بات مسلک کی ہے تو بریلوی مولانا نے کوئی غلط فتویٰ نہیں دیا۔'

کمرے میں شاہی گلدان اپنے نکے پن کی کہانی سناتا ہوا خاموش تھا— میری نگاہ اس طرف گئی پھر جھک گئی۔ تینوں مولانا فتوے کو لے کر الجھ گئے تھے۔ ابا نے بیچ بچاؤ کیا۔

'ارے بھائی...... ہم نے بیٹے کو بلایا ہے۔ اس نے غصے میں طلاق دی۔ اب کرنا کیا ہے؟'

'آپ کا مسلک'...... امام صاحب مسکرائے۔

'مسلک نہیں جانتا۔ نماز پڑھتا ہوں۔ سب کا احترام کرتا ہوں۔'

'لو، مسلک نہیں تو پھر کس کا فتویٰ مانیں گے۔ بریلویوں کا یا دیوبندیوں کا؟'

'اسلام کا—' ابا ناراض تھے— 'قرآن پاک کیا کہتا ہے، حدیث کیا کہتی ہے۔ غصے میں طلاق ہوئی یا نہیں؟'

'طلاق کی پہلی ادائیگی غصے کی ہوتی ہے۔ باقی دو ادائیگی کے درمیان آپ کے سوچنے کی پوری گنجائش رہتی ہے' اسی لیے منہ سے تین بار طلاق، طلاق، طلاق نکالنے کا چلن ہے......'

'کیوں میاں، اس سے پہلے بھی کبھی بیوی کو غصے میں طلاق دینے کی نوبت آئی؟ میرا مطلب ہے منہ سے تین بار بولنے کی نوبت'...... اب تیر میری طرف تھے۔

دوسرے امام صاحب نے بھی دریافت کیا...... 'کبھی اس سے پہلے غصے میں طلاق......؟'

میں نے بات درمیان میں کاٹی— 'غصے میں نہیں مذاق میں۔'

'مذاق ——؟' آنکھیں بند کیے مولانا ابرار جھٹکے میں اٹھ کر بیٹھ گئے —— 'یعنی طلاق مذاق میں بھی دیا جاتا ہے ——؟ امام صاحب ابا کی طرف مخاطب ہوئے ...... 'نوجوانوں نے مذہب کو بھی مذاق بنا رکھا ہے۔'

'یعنی مذاق میں کتنی بار......' امام صاحب جیسے پیچھے پڑ گئے تھے۔

'شاید دو بار......'

'یعنی کل رات ملا کر تین بار......'

اس بار سفید داڑھی والے امام نے ابا کی طرف دیکھا۔ بھائی میں تو یہی جانتا ہوں کہ ایک ساتھ تین طلاق کہنے سے بھی طلاق ہو جاتی ہے۔

'اور انہوں نے تو تین بار......'

'لیکن دو بار مذاق میں ——' مولی صاحب ٹھہرے —— 'کوئی شخص تین بار طلاق دے تو بیوی سے اس کا تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ اب اس سے نکاح کی صورت صرف یہ ہے کہ کسی دوسرے شخص سے اس عورت کے نکاح کے بعد پھر طلاق ہو جائے اور دونوں نکاح کے لیے تیار ہوں......'

سامنے کارنس پر دیکھا شاہی گلدان جیسے مسکرا رہا تھا۔ میرے کان کے پردے پھٹ رہے تھے —— مولانا، امام صاحب اور ابا کی گفتگوئیں کہاں کس مقام تک پہنچیں، میں نہیں جانتا —— لیکن شاید اب میں آگے کچھ بھی نہیں سن رہا تھا...... دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ صرف آدھے ادھورے سے کچھ لفظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ عدت، دوسرا نکاح —— پھر طلاق۔ قرآن شریف اور حدیث کے کوٹیشنس ...... شاید ابا بتا رہے تھے کہ وہ کسی مسلک کو تو نہیں، لیکن دیوبندیوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔

اور بڑے امام نے اٹھتے ہوئے کہا تھا —— پھر دیوبند سے فتویٰ لیا جائے گا۔ آپ گھبرائیں نہیں، لیکن دلہن پر اب عدت لازم ہے۔ کیونکہ یہ شرعی معاملہ ہے......

سب چلے گئے۔

ڈرائنگ روم میں اب کوئی نہیں۔ میں اکیلا ہوں۔ شاید ہمیشہ سے اکیلا رہا ہوں۔ میری نسیں پھٹ رہی ہیں۔ اپنی زندگی جینے کے لیے بھی مجھے مذہب کے فتوی کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ کہاں ہوں میں۔ کہاں کھڑا —— میری اپنی آزادی کہاں ہے؟ انسانی زندگی کو مذہب کے فتووں

سے آزاد کیوں نہیں کیا جاتا......

میں نے کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ لگا، اپنے پشتینی مکان میں ہوں۔ گھومتی چمگادڑیں— دیوار پر دوڑتی چھپکلیاں، ٹوٹتی محرابیں، بے رنگ و روغن دیواریں...... میں ایک بار پھر ماضی کی گپھاؤں میں تھا...... گپھا میں پھیلے ہوئے خوفناک سانپ...... تاریخ چہرہ کہاں بدلتی ہے۔ لوٹ گھوم کر وہیں آجاتی ہے۔ شاید، ہاں...... تشریح و تعریف بدلتی رہتی ہیں۔ کسی فیصلے میں پہنچنے تک میں نے ڈرائنگ روم میں رکھے شاہی گلدان کو اس بار نظر اٹھا کر دیکھا اور ڈرائنگ روم سے باہر نکل گیا۔

اور آخر میں فیصلہ

Give me a theme

The little poet cried

'And I will do my part

'T is not a theme, u need

The world replied

You need a heart.

مجھے کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے— شاید اسی لئے تاریخ مجھے بدہیئت اور بدصورت لگتی ہے— شاید اسی لیے میں نے خود کو حال کی سرنگوں کو سونپ دیا ہے۔ اپنی تمام تر آزادی کے احساس کے ساتھ — میں کچھ بھی پسند کروں — ایک بنجر زمین — خزاں کا موسم، میری گمنامی میری اپنی ہو — میرا لہجہ، میری فکر اور میرے فیصلوں پر میری اپنی مہر ہو — میں کچھ بھی پسند کروں — بچوں کو — پھولوں کو یا عورت — جنگلی اور قبائلی تہذیب سے الگ — سفید سیاہ اور نفرت کے بادلوں سے الگ — میرا راستہ میرا اپنا راستہ ہو —

لیکن — زندگی کے ایسے ہر گوشہ، ہر راستے میں مذہب کیوں آجاتا ہے؟ اس لیے مجھے دنیا کا یہ جواب منظور ہے — کہ تمہیں ایک دل کی ضرورت ہے — ایک دھڑکتے انسانی دل کی — اور اس دل پر کوئی روک کوئی بندش نہیں ہے —

اور اسی لیے اب ضرورت تھی کہ جو فیصلہ میں نے تمام تر غور و فکر کے بعد کر لیا ہے، اسے گھر کے لوگوں کے سامنے بھی رکھا جائے۔ مجھے علم تھا کہ مذہب کی نہ نظر آنے والی شاخیں میرے

گھر میں دراڑ ڈال سکتی ہیں۔ مگر میں نے سب کچھ سوچ لیا تھا۔ شام تک کتنی ہی بار میں فرحین کا چہرہ دیکھنے کے لیے ترس گیا۔ ابا مغرب کی نماز کے بعد لوٹے تو میں اماں کے کمرے سے فرحین کا ہاتھ تھامے ڈرائنگ روم میں لے آیا— فواد، فرحین کی گود میں تھا— فرحین کا چہرہ ایک ہی دن میں کسی بے جان بت میں تبدیل ہو گیا تھا۔

میں نے نگاہیں اٹھائیں۔ ابا کی طرف دیکھا— قدرے ٹھہر کر اماں کی طرف۔ پھر آگے بڑھا— شاہی گلدان کو ہاتھوں میں اٹھایا اور اسے زمین پر زور سے دے مارا۔

'سنیے ابا۔ اب ہم سلطان نہیں ہیں۔ عام آدمی ہیں۔ سلطان ہونے کی نشانی ٹوٹ چکی ہے— 'میں ذرا زور سے بولا— اور یہ عام آدمی کا فتویٰ ہے...... 'میں نے فرحین کا ہاتھ تھام لیا— مجھے فرحین کے ساتھ رہنے سے کوئی بھی نہیں روک سکتا۔ آپ کا فتویٰ بھی نہیں۔'

میری آواز بلند تھی— 'آپ کا مذہب بھی نہیں—'

میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا کہ ابا شاہی نشانی کے ٹوٹنے سے زیادہ زخمی ہوئے تھے یا مذہب کی پیروی نہ کیے جانے سے۔ لیکن ابھی ایک ردِ عمل باقی تھا— بیڈ روم میں داخل ہونے کے بعد، میرا ہاتھ چھڑا کر فرحین نے تلخ لہجے میں دریافت کیا تھا— 'شاہی گلدان توڑنے کی کیا ضرورت تھی—؟'

لیکن اس کے بعد کے لفظ کسی دھماکے سے کم نہیں تھے— 'فیصلہ تم نے اکیلے کیسے کر لیا۔ مجھ سے نہیں پوچھا— کہ میں شریعت کو مانتی ہوں یا نہیں؟'

میں ایک بار پھر سناٹے میں تھا۔ یا ایک بار پھر شاہی گلدان کے ٹوٹنے کے باوجود میرے اندر کوئی سویا ہوا شہنشاہ بیدار ہو گیا تھا۔

مجھے احساس ہوا، بونسائی نیبو کے پیڑ کا قد ذرا سا اور بڑھ گیا ہو—

•❖•

NAFRAT KE DINON ME

(Short Stories)

by

Mosharraf Alam Zauqui
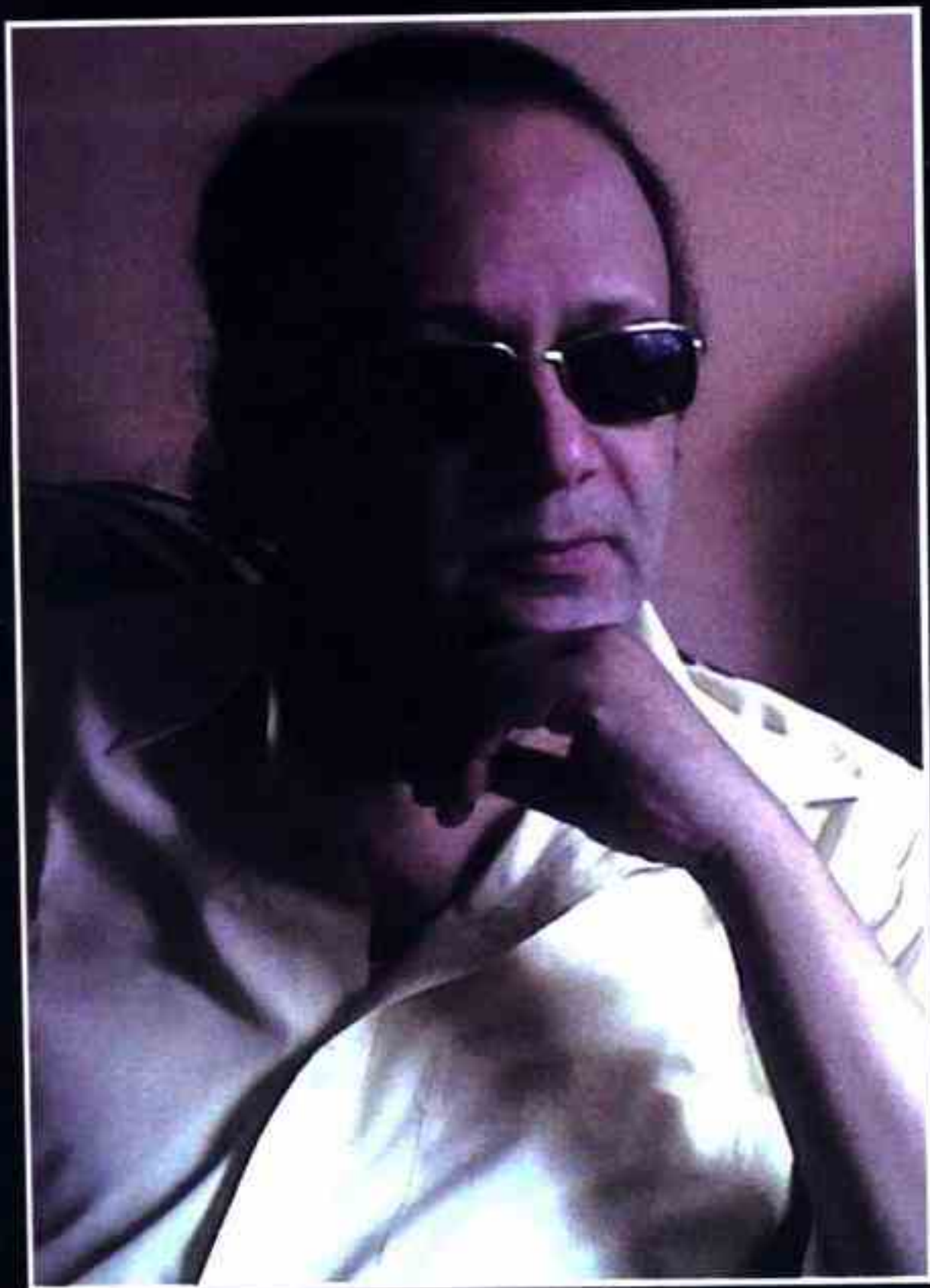
EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE
www.ephbooks.com

₹ 490.00